ماہنامہ
ڈائجسٹ
ڈر
کراچی
اپریل 2016
خاص کہانی نمبر
PDFBOOKSFREE.PK

دہشت سے بھرپور پراسرار کہانیوں کا انتخاب

ماہنامہ

خوفناک کہانیاں

کراچی

بہت جلد منظر عام پر

بہت جلد منظر عام پر

خوفناک، دہشت ناک، حیرت ناک اور خونچکاں بھونچکاں کہانیوں کے متلاشی قارئین کی پسند کے عین مطابق نیا رسالہ

ماہنامہ ''خوفناک کہانیاں''

☆اس میں خوف و دہشت کی سرد لہر پیدا کرتی، دل دہلاتی خون آشام کہانیاں

☆ارواح خبیثہ کا نشانہ بننے والوں کی کہانیاں

☆خوف و ہراس اور سطر سطر سسپنس پر مبنی، ناقابل فراموش کہانیاں جو آپ کبھی فراموش نہیں کر سکیں گے۔

ایسی کہانیاں جو کہ اسرار کے لبادے میں لپٹی، دل و دماغ پر سکتہ و لرزہ طاری کر دیں۔

کہانیوں کے علاوہ من پسند تحریر، شعر و شاعری، پھول کلیاں اور دل پسند پیغامات بھی ہوں گے۔

محترم قارئین جلد از جلد آپ اپنی اچھی تحریریں ارسال کریں تا کہ آپ کی تحریریں ماہنامہ خوفناک کہانیاں میں جلوہ گر ہو سکیں۔

تحریر پر ''خوفناک کہانیاں'' لکھنا نہ بھولئے گا۔

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ خوفناک کہانیاں اردو بازار کراچی

چونکا دینے والی خوفناک کہانیوں کا انتخاب

ماہنامہ ڈائجسٹ

کراچی

جلد نمبر 17 شمارہ نمبر 7 اپریل 2016ء

ای میل ایڈریس: Dardigesto1@gmail.com

مینجنگ ایڈیٹر خالد علی

چیف ایڈیٹر آصف حسن

ایڈیٹر شاہد علی

سب ایڈیٹر محمد ذیشان

قیمت -/60 روپے

سالانہ قیمت -/1080 روپے

ادارہ کا کسی بھی رائٹر کے خیالات سے متفق ہونا ضروری نہیں۔ ڈرڈائجسٹ میں چھپنے والی تمام کہانیاں فرضی ہوتی ہیں کسی کی ذات یا شخصیت سے مماثلت اتفاقیہ ہو سکتی ہے

تمام اشتہارات نیک نیتی کی بنیاد پر شائع کئے جاتے ہیں۔ ادارہ اس معاملے میں کسی بھی طرح ذمے دار نہ ہوگا۔

موت کا کھیل — فلک زاہد — 16
عقل کو حیران کر دینے والا عجیب شاخسانہ جسے پڑھنے والے برسوں دماغ سے محو نہ کر سکیں گے

بھیانک سزا — قاسم رحمان — 41
حرتزلزل ایمان والے کیا ہمیشہ گھاٹے میں رہتے ہیں، کہانی حقیقت کہانی میں پنہاں ہے

پراسرار سفر — ایس امتیاز احمد — 47
دل و دماغ کو لرزا دینے والی پراسرار کہانی جو کہ پڑھنے والے کو دہلا کر رکھ دے گی

رولوکا — اے وحید — 54
وہ واقعی پراسرار قوتوں کا مالک تھا، اس کی حیرت انگیز اور جادوئی کرشمہ سازیاں آپ کو دنگ کر دیں گی

نغمہ شب — ناصر محمود فرہاد — 79
جادو ٹونا کے انکاری لوگوں کے لیے حقیقت پر مبنی اہم راز سے پردہ اٹھاتی حقیقی کہانی

روح کی گواہی — مدثر بخاری — 87
کیا یہ حقیقت ہے کہ کوئی روح بھی کسی کے خلاف گواہی دے سکتی ہے، کہانی پڑھ کر پتہ چلے گا

شیطانی چکر — محمد خالد شاہان — 97
ویران جگہ پر اگر کسی کا واسطہ کسی جن سے پڑ جائے تو وہ کیا کرے گا۔ کہانی پڑھ کر دیکھیں

وبال — ایس حبیب خان — 104
اصل اور نقل میں فرق نہ رکھنے والے اذیت کا شکار ہو جاتے ہیں، کہانی پڑھ کر دیکھیں

ضمیر کی عدالت — شائستہ سحر — 119
کیا مرے ہوئے انسان سے باتیں کرنے والا پاگل ہو سکتا ہے یہ تو پردہ اٹھنے کے بعد پتہ چلے گا

دشمن روحیں — ایم اے راحت — 122
ڈر کے لبادے میں پوشیدہ ذہن سے محو نہ ہونے والی رائٹر کے زور قلم سے لکھی شاہکار کہانی

ایڈیٹر و پبلشر آصف علی نے سٹی پریس تالپور روڈ کراچی سے چھپوا کر شائع کیا۔

آزاد روح — عروہ ہادی — 149
احکام خداوندی سے انحراف لوگوں کا انجام بہت عبرتناک ہوتا ہے۔ حقیقت کہانی میں ہے

سنہری آنکھیں — عامر زمان عامر — 154
اچھی کہانیوں کے متلاشی لوگوں کے لیے دلگداز، دلفریب اچھوتی...... انوکھی اور انہونی کہانی

زندہ مردہ — احسان الحق — 167
کہتے ہیں کہ زیادہ چالاکی اور عقلمندی اکثر گلے پڑ جاتی ہے، اپنی نوعیت کی شاہکار کہانی

روح کا شکنجہ — اقراء قریشی — 173
ایک روح کا لرزہ خیز ہی نہیں بلکہ دل و دماغ پر سکتہ طاری کرتا عجیب و غریب شاخسانہ

آتما کا سایہ — گلاب خان سولنگی — 181
بقول لوگوں کے اس آتما نے سب کی زندگی اجیرن کر کے رکھ دی تھی، حقیقت کہانی میں پنہاں ہے

لٹ کا عاشق — نسرین رانا — 189
لٹ اُلجھی سلجھا جا رے بالم، اس جملے کو احاطہ کرتی ہوئی دلفریب اور دلکش کہانی

ضدی ناگن — این اے کاوش — 194
خود غرضی، اور مطلب پرستی کی ناقابل یقین دل و دماغ کو تھرا دینے والی خونی کہانی

بارہ برس بعد — مریم شاہ بخاری — 219
دماغ پر خوف کا غلبہ کرتی اور دل کو موہتی رائٹر کے زور قلم کی انوکھی شاہکار کہانی

روح کی التجا — عروج سنبل — 227
رات کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں وہ بھی گھنا جنگل میں جنم لینے والی دل کو دہلاتی خونی کہانی

جن زادی — ضرغام محمود — 240
دل و دماغ کو فرحت بخشتی اچھوتی، انوکھی دلکش، دل فریب رائٹر کے قلم کی شاہکار کہانی

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ ڈر ڈائجسٹ کتاب مارکیٹ نیو اردو بازار کراچی: 32744391

قرآن کی باتیں

☆ لیکن اللہ نے تم کو ایمان عزیز بنا دیا اور اس کو تمہارے دلوں میں سجا دیا اور کفر اور گناہ اور نافرمانی سے تم کو بیزار کر دیا۔ یہی لوگ راہ ہدایت پر ہیں۔ یعنی اللہ کے فضل اور احسان سے اور اللہ جاننے والا اور حکمت والا ہے۔
(سورۃ حجرات 49 آیت 7 سے 8)

☆ یہ لوگ تم پر احسان رکھتے ہیں کہ مسلمان ہو گئے ہیں۔ کہہ دو کہ اپنے مسلمان ہونے کا مجھ پر احسان نہ رکھو۔ بلکہ اللہ تم پر احسان رکھتا ہے کہ اس نے تمہیں ایمان کا رستہ دکھایا بشرطیکہ تم سچے مسلمان ہو بے شک اللہ آسمانوں اور زمین کی پوشیدہ باتوں کو جانتا ہے اور جو کچھ تم کرتے ہو اسے دیکھتا ہے۔ (سورۃ حجرات 49 آیت 17 سے 18)

☆ اور جو شخص ایمان کا منکر ہوا اس کے عمل ضائع ہو گئے اور وہ آخرت میں نقصان پانے والوں میں ہوگا۔
(سورۃ مائدہ 5 آیت 5)

☆ اور وہی تو ہے جو تم کو ڈرانے اور امید دلانے کیلئے بجلی دکھاتا ہے اور بھاری بھاری بادل پیدا کرتا ہے۔
(سورۃ رعد 13 آیت 12)

☆ اور اللہ ہی تو ہے جو ہوائیں چلاتا ہے اور وہ بادل کو ابھارتی ہیں پھر ہم اس کو ایک بے جان شہر کی طرف چلاتے ہیں پھر اس سے زمین کو اس کے مرنے کے بعد زندہ کر دیتے ہیں۔ اسی طرح مردوں کو جی اٹھنا ہوگا۔ (سورۃ فاطر 35 آیت 9)

☆ اور اللہ ہی نے تم کو پیدا کیا ہے پھر وہی تم کو موت دیتا ہے اور تم میں بعض ایسے ہوتے ہیں کہ نہایت خراب عمر کو پہنچ جاتے ہیں اور بہت کچھ جاننے کے بعد ہر چیز سے بے علم ہو جاتے ہیں بے شک اللہ سب کچھ جاننے والا اور قدرت والا ہے۔ (سورۃ نحل 16 آیت 70)

☆ اور جنہوں نے برے کام کئے تو برائی کا بدلہ ویسا ہی ہوگا اور ان کے مونہوں پر ذلت چھا جائے گی۔ اور کوئی ان کو اللہ کے عذاب سے بچانے والا نہ ہوگا ان کے مونہوں کی سیاہی کا یہ عالم ہوگا کہ ان پر گویا اندھیری رات کے ٹکڑے اڑھا دیئے گئے ہیں۔ یہی دوزخی ہیں کہ ہمیشہ اس میں رہیں گے۔ (سورۃ یونس 10 آیت 27)

☆ نہ تو ضعیفوں پر کچھ گناہ ہے اور نہ بیماروں پر اور نہ ان پر جن کے پاس خرچ موجود نہیں کہ شریک جہاد ہوں یعنی جبکہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے خیر اندیش اور دل سے ان کے ساتھ ہوں۔ نیکو کاروں پر کسی طرح کا الزام نہیں ہے۔ اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ (سورۃ توبہ 9 آیت 91)

(کتاب کا نام ''قرآن مجید کے روشن موتی'' بشکریہ شمع بک ایجنسی کراچی)

خطوط

شائستہ سحر راولپنڈی سے، السلام علیکم! امید ہے ڈر ڈائجسٹ کے تمام اسٹاف خیریت سے ہوں گے، بہت معذرت چاہتی ہوں ایک عرصے بعد حاضر ہوئی ہوں۔ (بس گھر میں کافی پریشانی اور مصروفیت رہی۔ میرے والد صاحب کو دل کا دورہ دو بار پڑا، ان کی بیماری کی وجہ سے دو ماہ سخت پریشانی میں گزرے۔ اب خدا کا شکر ہے ابو کی طبیعت کافی بہتر ہے۔ کہانی تو کافی عرصے سے لکھی پڑی تھی۔ پر پوسٹ کرنے کا وقت نہیں ملا اس بار کہانی کافی مختصر لکھی ہے پر آئندہ اس کا خیال رکھوں گی۔ یہ مت سمجھئے گا ڈر ڈائجسٹ سے میرا رابطہ ختم ہوگا کبھی جب تک زندگی رہے گی انشاء اللہ یہ رابطہ قائم رہے گا۔ اب اجازت دیں۔

☆☆ شائستہ صاحبہ: ہماری اور تمام قارئین کی دلی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کے والد کو کلی صحت عطا کرے اور آپ تمام اہل خانہ کی چھوٹی بڑی تمام پریشانیاں دور کر دے۔ آئندہ ماہ بھی خلوص نامہ کا انتظار رہے گا۔ Thanks۔

سنبل طہ راولپنڈی سے، ڈر ڈائجسٹ کے پورے اسٹاف، تمام رائٹرز اور تمام قارئین کو میرا پیار بھرا اسلام، سب سے پہلے ڈر کے ایڈیٹر کو بہت سی مبارکباد، ''خوفناک کہانیاں'' ڈائجسٹ پبلش ہو رہا ہے۔ فروری کا ڈائجسٹ خوفناک نمبر تھا۔ شمارے میں عاشق روح، ضدی ناگن، کالا کفن، پراسرار آئینہ اور بدروح کا انجام ٹاپ کی کہانیاں تھیں۔ چلیں اب خطوط کی طرف بڑھتے ہیں۔ اس سے پہلے قرآن کی باتیں دل کو لگیں، طاہرہ آصف میری دل سے دعا ہے آپ کے لئے اور آپ کے بھائی کو اللہ پاک بہت ساری خوشیاں اور صحت عطا فرمائے۔ (آمین) مریم فاطمہ آپ بہت ذہین ہو اور میری طرف سے بیسٹ ویشز آپ کے لئے، رابعہ عباس، برتھ ڈے مجھے پتہ ہے کہ میں لیٹ وش کر رہی ہوں پر آپ قبول کریں، اسد اللہ بھٹی آپ کو سالگرہ مبارک۔ حکیم خان حکیم آپ کی شاعری ہمیشہ ہمارے دل میں اترتی ہے۔ میں آپ کے شعر کی فین بن گئی ہوں جو کہ آپ کے لئے اعزاز کی بات ہے۔ ہاہاہا...... (Its not joke، 15 اپریل کو میری برتھ ڈے ہے، وش کرنا مت بھولئے گا۔ ایڈیٹر صاحب میں اور میری سسٹر دو کہانیاں بھیج رہی ہیں۔ جلدی شائع کیجئے گا۔ میں ساجدہ راجہ اور ایس حبیب خان کو بہت مس کر رہی ہوں۔ ڈائجسٹ میں ان کی غیر موجودگی شدت سے محسوس ہو رہی ہے۔ پلیز اپنی کہانیاں بھیجیں، This is may request، بلقیس خان، آپ بھی کہاں غائب ہو گئی ہیں۔ 6 مارچ کو ہمارے پروفیسر محمد رمضان جانی کی برتھ ڈے ہے۔ پلیز ان کو بھی وش کر دیجئے گا۔ Thanks۔ چلیں اب اجازت چاہتی ہوں۔ باتیں تو بہت ہیں پر خط بہت لمبا ہو جائے گا۔ اس لئے اجازت اور آپ کی دعاؤں کی منتظر ہوں۔ اللہ حافظ۔

☆☆ سنبل صاحبہ: آپ کو اور آپ کے پروفیسر رمضان جانی کو سالگرہ بہت بہت مبارک ہو، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ سب کو ڈھیروں خوشیوں سے نوازے، کہانی شامل اشاعت ہے، خوش ہو جائیں۔

فلک زاہد لاہور سے، السلام علیکم! 20 فروری کو ڈر بذریعہ ڈاک موصول ہوا۔ میرے ابو نے پیار سے آ کر میرے ہاتھ میں تھمایا تو مارچ کا تازہ شمارہ دیکھ کر خوشی کے مارے اس قدر جھوم اٹھی کہ استری کرتے کپڑے بیچ میں ہی چھوڑے اور رسالہ لے کر بیٹھ گئی۔ اس دفعہ کا سرورق اب تک کا سب سے بہترین سرورق تھا۔ اندر گئے تو قرآن پاک کی باتوں سے بہت کچھ سیکھنے کو ملا، کہانیوں کی فہرست میں اس بار ایک سے بڑھ کر ایک رائٹر دکھائی دیا کہ اندازہ لگانے میں بالکل دیر نہیں لگی کہ شمارہ اس دفعہ کا نمبر ون ہے۔ خطوط کی محفل میں سبھی کے خطوط پسند آئے، بالخصوص ان لوگوں کا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں جنہوں نے میری کہانی عاشق روح کو پسند کیا اور نہایت پیارے لفظوں میں مجھے یاد کیا ان میں مریم فاطمہ اور ایس حبیب خان کی خاص شکر گزار ہوں، بہت شکریہ، آپ دونوں بہنوں کا۔ اس کے علاوہ ثوبیہ شہزادی، طارق محمود، محمد اسحاق انجم، ریاض حسین قمر، محسن عزیز حلیم اور اویس نور صاحب آپ سب کا بہت بہت شکریہ، میری کہانی پسند کرنے کا، شمارہ ابھی زیر مطالعہ ہے، تبصرہ اگلے ماہ ارسال کروں گی۔ کیونکہ نئی کہانی لکھنے میں مصروف تھی۔ مجھے گزشتہ ہفتے بخار ہو گیا تھا۔ جس کے باعث میں کوئی کہانی نہ بھیج سکی۔ اب وعدے کے مطابق ایک چھوٹی کہانی ارسال خدمت ہے۔ ڈر سے اس قدر پیار اور پذیرائی ملنے پر مزید دو چھوٹی کہانیوں پر کام جاری ہے۔ جو جلد ہی ارسال کر دوں گی۔ شکریہ۔

☆☆ فلک صاحبہ: ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کی بیماری ختم کر کے بھلا چنگا کر دے، چھوٹی کہانی مل گئی ہے اس کے لئے شکریہ، کہانی

شامل اشاعت ہے اور ہاں یاد آیا اگلے ماہ بھی تجزیہ بھیجنا بھولئے گا نہیں۔

صبا رمضان پنڈ دادن خان سے، السلام علیکم! ڈائجسٹ کو بہت بہت پیار، ہم کافی دنوں بعد آئی ہیں، جس کی وجہ تھی ہمارے پیپرز، سنبل ماہین طہٰ کے M.A کے پیپرز چل رہے تھے جبکہ میرے B.A کے، اس کے علاوہ ہمارے خاندان میں شادیاں تھیں، جو ہمیں مصروف رکھ رہی تھیں۔ چلیں اب فروری کے ڈر کی طرف بڑھتے ہیں۔ فروری میں بہت ڈر تھا کیونکہ ڈائجسٹ میں مدثر بخاری اور احسان سحر کی زبردست کہانیاں تھیں، غیبی وجود نارمل تھی، ملک این اے کاوش آپ سلانوالی کے ہیں، یہ جان کر بہت خوشی ہوئی کیونکہ سلانوالی میں ہمارے رشتہ دار رہتے ہیں اور ہم جنوری میں گئے تھے۔ ظہور احمد صائم آپ کا فروری میں جو لیٹر شائع ہوا تھا وہ بہت پسند آیا۔ بلقیس خان miss you! یار واپس آؤ، کہاں ہو آپ؟ اچھا جی اب اجازت دیں۔ ڈر ڈائجسٹ کے پورے اسٹاف کو سلام۔

☆☆ صبا صاحبہ: امید ہے اب حسب وعدہ آپ ہر ماہ خلوص نامہ ارسال کرتی رہیں گی، کہانیوں کی پسندیدگی اور آئندہ ماہ بھی خط ارسال کرنے کے لئے شکریہ قبول کریں۔

احسان الحق اسلام آباد سے، محترمی ومکرمی ایڈیٹرز حضرات ڈر ڈائجسٹ، السلام علیکم ورحمۃ اللہ، اللہ تعالیٰ کے بابرکت ذات سے امید واثق ہے کہ آپ تمام احباب بمع ٹیم اور تمام وطن عزیز کے ڈر سے منسلک قارئین ولکھاری خواتین وحضرات بخیر وعافیت ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ آپ سب پر اپنے کرم کا سایہ عاطفت تادم قائم رکھے۔ آمین۔ مارچ 2016ء کا ڈر اس وقت خاکسار کے زیر تبصرہ ہے۔ ماہنامہ 22 فروری کو موصول ہوا۔ سب سے پہلے سرورق پر نگاہ پڑی تو پہلا تاثر جو ذہن کے نہاں خانے میں پیدا ہوا وہ یہی تھا کہ ہو نہ ہو، اس مرتبہ سرورق کی طرح کہانیاں بھی وزن دار ہوں گی۔ ''قرآن کی باتیں'' پڑھنے کے بعد دل کو تازہ دم کیا اور پھر خطوط کی جانب ایک ایک کر کے تمام خطوط پڑھے۔ ان خطوط کے حوالے سے گزارش یہ ہے کہ گزشتہ شمارہ ''ڈر'' پر تبصرہ کم اور اپنی کہانیاں شائع کروانے کی بابت زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ امید ہے کہ آئندہ خطوط کے سلیکشن میں صرف تبصرے پر اکتفا کیا جانا چاہئے۔ خیر اب رہی کہانیوں کی بات تو پہلی اور آخری کہانی اس مرتبہ ماہنامہ ڈر کی جاندار کہانیاں تھیں۔ دل دل ور کٹھن راستہ، خوفناک، ڈراؤنا تخیلاتی ادب لکھنا اتنا بھی آسان نہیں ہوتا جتنا کہ عمومی طور پر سمجھا جاتا ہے۔ دراصل اس کی وجہ یہ ہے کہ لکھنے والا اپنے قاری کو حقیقت سے ہٹ کر تخیلاتی دنیا کی سیر پر لے جاتا ہے۔ اگر قاری کو کہیں پر بھی یہ گمان گزرنے لگے کہ یہ تو محض ایک گپ ہے تو کہانی اپنے دم توڑ جاتی ہے۔ اسی لئے لکھنے والا اپنے قلم کو ٹھہراؤ کے ساتھ ایسے الفاظ میں لکھے کہ ہر لفظ قارئین کے ذہن میں جیتی جاگتی حقیقت کے طور پر ثبت ہو جائے۔ اور یہ کمال پہلی اور آخری کہانیوں کے لکھاریوں نے کر دکھایا۔ دوسری کہانی ''راکھ'' تھی جس کا پلاٹ اچھا تھا۔ تسلسل برقرار نہ ہونے کی وجہ سے کہانی میں ہر سطر پر تشنگی کا احساس رہا۔ اس کہانی کو بہت اچھے طریقے وسلیقے اور ٹھہراؤ کے ساتھ لکھا جا سکتا تھا۔ ''پریمی آتما'' ڈر کی تیسری کہانی بہت ہی عمدہ پیرائے پر لکھی کہانی ہے۔ یہ تخیلاتی خوفناک ادب کا مکمل حق ادا کرتی کہانی تھی۔ ''بھٹکتی آتما'' بہت عمدہ اسلوب کے ساتھ لکھی ایک سبق آموز بہترین کہانی تھی۔ کہانی پڑھتے وقت کسی سطر پر بھی تشنگی محسوس نہیں ہوئی اور یہی اس کہانی کی خوب صورتی بھی تھی۔ غیر سلسلہ وار چھٹی کہانی ''لال جوڑا'' کے عنوان سے پڑھنے کی سعادت حاصل کی تو دل سے گواہی دینے کو جی چاہتا ہے کہ بے شک یہ کہانی بہترین تخلیقی صلاحیتوں کے ساتھ لکھی گئی ایک کہانی ہے۔ اگلی کہانی ''فرعون کے سپاہی'' جسے مصریات کے پس منظر میں لکھاری نے اپنے جادوئی قلم سے تحریر کیا اور یہ کہنے میں بندے کو کوئی عار نہیں کہ مصریات کے حوالے سے تخیلاتی ادب لکھنے والوں کی صف میں لکھاری کی یہ کہانی ایک نئی سوچ کے ساتھ لکھی بہترین کہانی ہے۔ نہایت سادہ اور دلفریب اسلوب لئے آغاز سے اختتام تک رگ وپے میں جوش وسسپنس پیدا کرتی کہانی ''حقیقی رنگ'' ہے۔ بہت ہی زبردست اور دلچسپ لکھی گئی تحریر ہے۔ جس کا ڈر ڈائجسٹ متقاضی بھی ہے۔ شاباش۔ اگلی کہانی ''نادیدہ قوت'' جو کہ بہت اچھی کہانی تھی۔ نہایت عمدہ پلاٹ لیکن نا جانے کیوں اس کہانی کو پڑھنے کے دوران اس کہانی میں واقعات کے تسلسل میں توڑ ہونے کی وجہ سے دل میں کہانی کا ادھوراپن محسوس کرتا رہا۔ ''لیپ ٹاپ کا راز'' پڑھ کر یہی کہوں گا کہ پلاٹ اچھا تھا لیکن انگریزی کے الفاظ کی بھرمار نے کہانی کا تسلسل بگاڑ کر رکھ دیا۔ یوں اچھی بھلی کہانی میں ادھوراپن محسوس ہوتا رہا۔ ڈر ڈائجسٹ کی اس ماہ سب سے عام فہم اردو میں لکھی گئی سب سے اعلیٰ کہانی جس کو بس پڑھتے ہی داد دینے کو جی کرتا ہے وہ ہے ''عجیب کہانی'' انتہائی جاندار پلاٹ اور انداز بیان کے ساتھ لکھی یہ کہانی خاکسار کی نظر میں ڈر ڈائجسٹ کا قلب اور روح ہے۔ بہت ہی اعلیٰ پیراہن کی کہانی ہے جس کو لکھنے پر بندے کی جانب سے قلبی مبارک

باد! اس سے اگلی کہانی ''اندھیرے کی آواز'' مغربی ادب سے لی گئی ایک اچھی کہانی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ لکھاری کو سمندر پانی اور اس سے متعلقہ باتوں سے کافی وابستگی ہے۔ درخواست ہے کہ ہو سکے تو کہانی کے اختتام پر مغربی مصنف کا نام بمع کہانی کا نام انگریزی میں ضرور درج کیا جائے۔ یوں حوالہ بھی مل جاتا ہے۔ ''ناگ راجہ'' ایک مافوق الفطرت تخیلاتی لیکن انتہائی جذباتی کہانی ثابت ہوئی۔ یہ کہانی نہایت عمدہ انداز بیان لئے نہایت کمال کی لکھی کہانی ہے جو انسانی جذبات اور دل کو اثر کرتی گزر جاتی ہے۔ ''ہم آہنگی'' غیر سلسلہ وار کہانیوں میں آخری کہانی ثابت ہوئی، جس کو پڑھ کر مغربی رائٹر اسٹیفن کنگ کی کہانی کا ایک پلاٹ یاد آ گیا جو بہت کمال کی کہانی ہے۔ اچھا لکھا۔ کہانی میں ڈر نہیں لیکن انداز بیان میں کشش تھی اور سسپنس بھی، سلسلہ وار کہانیوں پر فی الوقت خاموش رہوں گا۔ دیگر یہ کہ تمام رائٹرز کو اس ماہ ڈر ڈائجسٹ کا معیار اونچا رکھنے پر دل سے مبارکباد دیتا ہوں اور بے شمار دعائیں بھی، اجازت دیجئے۔ اللہ نگہبان۔

☆☆ احسان صاحب: قلبی لگاؤ سے لکھا تجزیہ کے لئے بہت بہت شکریہ، آپ نے اپنے دل کی بات لکھ کر خوش کر دیا اور اب قوی امید ہے کہ پلیز! آپ آئندہ بھی قلبی لگاؤ کے ساتھ خلوص نامہ ارسال کرتے رہیں گے۔ Thanks۔

محمد ابو ہریرہ بہاولنگر سے، مارچ 2016ء کا شمارہ دلفریب ٹائٹل کے ساتھ موصول ہوا، ٹائٹل گرل اپنی انگلی کو دانتوں میں دبائے کسی بات پر پشیمان نظر آئی، جتن کے بعد بھی وجہ تلاش نہ کر سکا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی خطوط کی محفل میں اپنی نشست ڈھونڈ لی۔ آپی انعم شہزادی آپ کی بات واقعی قابل غور ہے کہ آخر آپ کو اگنور کرنے کی وجہ کیا ہے۔ بہرحال شاہین گروپ کا ممبر ہوتے ہوئے میں آپ کے ساتھ ہوں، میری نئی آنے والی کہانی میں بڑا کردار آپ کا ہوگا۔ یہ ایک بھائی کا وعدہ رہا۔ محترمہ نسرین صاحبہ ہماری دعا ہے کہ آپ کی اسٹوری ڈر کے اوراق پر چھپے، ہم ایڈیٹر صاحب سے سفارش کرتے ہیں اینڈ ویلکم بیک۔ جناب احسان الحق صاحب آپ کا تبصرہ کمال کا تھا، یقیناً آپ کی کہانی بھی اسی تسلسل کے زیر اثر ہوگی۔ محمد آصف شہزاد ویلکم بیک، ندیم عباس میواتی صاحب اب آپ بھی کہانی بھیج ڈالو۔ کہانیوں میں عمران قریشی کی دلدل نے عورت کے ناقص العقل ہونے کے ثبوت کے ساتھ خوب صورت انداز میں تردید کی۔ ساحل دعا بخاری کی راکھ نے محبت میں تڑپتے نوجوان کا جنون خوب بیان کیا۔ پریمی آتما رضوان علی سومرو، روح کی انسان سے محبت کا عجب دعویٰ اور ثبوت پر مشتمل تھی، رولوکا، اے وحید تجسس اور خوف سے لبریز کمال کی کہانی ہے۔ بھٹکتی آتما بھی داد وصول کرنے میں کامیاب ٹھہری۔ سنبل عروج نے لال جوڑے میں حیران کیا وہیں ضرغام محمود کی فرعون کے سپاہی مدمقابل نظر آئی۔ دونوں نے خوب محنت کی، طارق محمود کی نادیدہ قوت، ایم اے راحت دشمن روحیں، ناگ راجہ خالد شاہان صاحب ویلڈن ویری ویل، ضدی ناگن این اے کاوش بھی زبردست رہی، غزل لگانے کا شکریہ، اشعار عمدہ رہے۔ کہانی کا منتظر ہوں۔

☆☆ ابو ہریرہ صاحب: آپ کا خلوص نامہ پڑھ کر دلی خوشی ہوئی، اور امید ہے ہر ماہ اسی طرح شکریہ کا موقع دیتے رہیں گے۔ آپ کی کہانی کمپوز ہو چکی ہے۔ اگلے شمارے میں ضرور جلوہ گر ہوگی۔

ذیشان حیدر کاظمی ظفروال سے، السلام علیکم! جناب غرض ہے کہ میں نے ایک چھوٹی سی کوشش کی ہے اور کچھ غزلیں لکھی ہیں اور مجھے آپ کے ڈائجسٹ کے علاوہ کوئی بھی پلیٹ فارم بہتر محسوس نہیں ہوا، تو مہربانی فرما کر میری حوصلہ افزائی کے لئے میرے ان لفظوں کو اپنے قیمتی اوراق میں جگہ فراہم کر دیں......! مہربانی۔

☆☆ ذیشان صاحب: ڈر ڈائجسٹ میں موسٹ ویلکم، چلئے حوصلہ افزائی ہوئی، خوش ہو جائیں اور امید ہے اب آپ حسب وعدہ ہر ماہ نوازش نامہ بھیجتے رہیں گے۔

ایس امتیاز احمد کراچی سے، السلام علیکم! امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا! ماہ رواں کا دلکش شمارہ سامنے ہے۔ خوب صورت ٹائٹل کے ساتھ تمام ترسلسلے خوب رہے۔ آرٹیکلز لگانے کا شکریہ، میٹرز آپ کے پاس ہیں۔ پلیز دیکھئے گا۔ پلیز قریبی اشاعت میں جگہ دیں۔ آپ کو اور دیگر اسٹاف اور ''ڈر'' کے تمام خوب صورت لکھنے والے رائٹرز اور تمام خوب صورت پڑھنے والوں وویورز کو دعا سلام۔ اپنا خیال رکھئے گا!

☆☆ امتیاز صاحب: میں تو ہر ماہ دیکھ رہا ہوں کہ آپ تجزیہ کے لئے فراخ دلی کا مظاہرہ نہیں کر رہے۔ پلیز! پلیز!..... امید ہے غور فرمائیں گے۔ Thanks۔

محمد اسلم جاوید فیصل آباد سے۔ السلام علیکم! خیروعافیت اور نیک دعاؤں کے ساتھ حاضر ہوں، جشن بہاراں کی آمد آمد ہے، خوشیوں اور مہکتے پھولوں کے جذبات کے تحت اپنی مصروفیات سے وقت نکال کے شہر جانا نصیب ہوا، بکسٹال پر پہنچا تو ماہ مارچ کے تازہ پرچے سے ملاقات ہوگئی۔ سرورق بڑا عجیب سا تھا، اندر جھانکا تو رنگ برنگی تحریروں سے ملاقات ہوگئی، خط اور غزل شائع کرنے کا بہت بہت شکریہ! ڈر ڈائجسٹ کے سارے سلسلے اپنی اپنی جگہ پر بہتر ہیں۔ مثلاً قرآن کی باتیں، قوس قزح، غزلیں کہانیاں وغیرہ مثلاً اندھیرے کی آواز، حقیقی رنگ، دلدل، دشمن روحیں، ضدی ناگن، پریمی، راکھ، عجیب کہانی بہت خوب سے خوب تر تھیں۔ غزل ارسال کررہا ہوں، کسی قریبی شمارے میں جگہ دے دیں۔ تو اس کے لئے شکریہ، آئندہ ماہ پھر قلبی لگاؤ کے ساتھ بذریعہ خط ملاقات ہوگی اس وقت تک کے لئے خدا حافظ۔

☆☆ اسلم صاحب: خط لکھنے اور کہانیوں کی خلوص دل سے تعریف کے لئے ویری ویری تھینکس، آپ کا خلوص اور قلبی لگاؤ قابل دید ہے، انسان دنیا سے کیا لے کر جاتا ہے، انسان کا پرخلوص عمل ہی سے قبر میں ہی نہیں بلکہ آخرت میں بھی سرخرو بنائے گا، کیونکہ عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی، ورنہ یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے اور نہ ناری۔

محمد ندیم عباس میواتی چوکی سے۔ السلام علیکم! امید رکھتا ہوں سبھی قارئین ہنستے بستے خیروعافیت سے ہوں گے۔ موسم سرما اختتامی مراحل میں ہے اور ہر دل عزیز ی موسم، موسم بہار کی آمد آمد ہے۔ جس کی سبھی کو بہت چاہت ہوتی ہے۔ انس، پرند اور شجر سبھی خوش نظر آتے ہیں۔ ہر سو ہریالی ہی ہریالی کا راج ہوتا ہے۔ پھول مہکتے اور پرندے گنگناتے ہیں۔ یوں تو ہمارا شہر چوکی، ہر قسم کے رنگ برنگے پھولوں اور پودوں کی بدولت ہر موسم میں شاداب نظر آتا ہے۔ مگر موسم بہار میں تو جنت کا ٹکڑا لگتا ہے۔ ہر سو پھول ہی پھول فضا کو خوشبو سے معطر کئے دیتے ہیں۔ آج میں انہی پھولوں کو لے کر گلشن ڈر کی محفل میں حاضر ہوا ہوں۔ سب سے پہلے نت نئے آنے والے پھولوں کو دلکش مسکراہٹ کے ساتھ خوش آمدید کرتا ہوں، احسان الحق، محمد سفیان اسلم، وقار علی شمس، عثمان رضا، سید عباس حیدر، دعا ہے کہ سب ڈر کے آنگن میں خوب کھیلو، پھول بن کر مہکو، محترمہ انعم شہزادی کو کوئین آف شاہین گروپ میں حاضر ہوں، باقی کو لائیں، ایس حبیب خان، مریم فاطمہ، اسحاق انجم، طارق محمود، ظہور احمد، ریاض حسین، ثوبیہ شہزادی، محترم ابوہریرہ بلوچ، محسن عزیز، قاسم رحمان، اسد اللہ بھٹی، بہت اچھے تبصرے لکھے، ویلڈن سب میری طرف سے گلاب قبول فرمائیں۔ احسان سحر، نادر شاہ، طاہر عباس، کدھر گم ہیں؟؟؟ شاہین گروپ والو جلدی ڈر میں حاضری دو۔ کہانیوں کی طرف سے ہمارے سپر ہیرو ایم خالد شاہان، ''ناگ راجہ'' ملک این اے کاوش ''ضدی ناگن'' اے وحید ''رولوکا'' اور ایم اے راحت کی ''دشمن روحیں'' زبردست کہانیاں ہیں۔ یوں سمجھو کہ ڈر کی جان ہیں، سبھی کو ہماری طرف سے تازہ گلابوں کا گلدستہ، براہ کرام قبول فرمائیں۔

☆☆ ندیم صاحب: نوازش نامہ ارسال کرنے اور کہانیوں کی تعریف کے لئے بہت بہت شکریہ، اللہ تعالیٰ آپ کے شاہین گروپ کو خوش وخرم رکھے، اور خوشیوں سے نوازے، ہر ماہ نوازش نامہ ارسال کرنے کے لئے ڈھیروں شکریہ قبول کریں۔

عثمان رضا اوکاڑہ سے۔ السلام علیکم! امید ہے ڈر کا پورا اسٹاف خیریت سے ہوگا۔ مارچ 2016ء کا رسالہ ہاتھ میں آیا، سرورق سے ہی بہت خوب لگا۔ دلوں کو منور کرتی ہوئی قرآن کی باتیں اچھی تھیں۔ آگے بڑھا تو خطوط کی صف میں اپنا خط دیکھ کر دل خوشی سے باغ باغ ہوگیا۔ خط لگانے کا شکریہ، انشاء اللہ حاضری کو مستقل بناؤں گا۔ کہانیوں کی طرف بڑھا تو عمران قریشی کی دلدل نے خوش کردیا بہت اچھی اسٹوری تھی۔ اس کے علاوہ حافظ بلال اسلم کی بھٹکتی آتما، ساحل دعا بخاری کی راکھ، اے وحید کی رولوکا، ضرغام محمود کی فرعون کے سپاہی، خالد شاہان کی ناگ راجہ عمدہ تھی۔ اس کے علاوہ ملک این اے کاوش کی ضدی ناگن اچھی جارہی ہے۔ ایم اے راحت کی دشمن روحیں بھی اچھی ہے۔ اشعار کا انتخاب زبردست رہا۔ اب اجازت چاہتا ہوں۔ زندگی رہی تو اگلے ماہ پھر حاضری ہوگی۔

☆☆ عثمان صاحب: خوش ہوجایئے، اس مرتبہ بھی آپ کا خط شائع ہوگیا، کہانیوں کی تعریف اور ساتھ ہی آئندہ شمارے کا تجزیہ بھیجنے کے لئے شکریہ قبول کریں۔

ریاض حسین قمر منگلا ڈیم سے۔ السلام علیکم! امید واثق ہے کہ پورا اسٹاف بخیریت ہوگا۔ مارچ 016ء کا ڈر ڈائجسٹ باصرہ نواز ہوا۔ ٹائٹل ڈر ڈائجسٹ کا شایان شان ہے۔ مختصر سے اشتہارات سے گزرتے فہرست میں سے آرٹیکلز کے بارے میں معلومات لیتے، قرآن کی باتوں میں پہنچے اس صفحہ کی پاکیزگی ایک مسلم حقیقت ہے۔ اس صفحہ میں رب ذوالجلال کے پاک کلام کو پڑھ

کر مجھ جیسے گناہگار کے دل کو جو ڈھارس بندھتی ہے۔ وہ میں ہی جانتا ہوں۔ خطوط کی محفل میں اس بار چھبیس بہن بھائی اپنے اپنے خیالات کا اظہار فرمارہے تھے۔ سب بہن بھائیوں کی چاہت بے مثال تھی۔ ان میں سے بعض تبصرے لاجواب تھے۔ قسط وار کہانیوں میں رووکا تو حسب معمول بہت اچھی تھی، رضوان قیوم کی عجیب کہانی واقعی عجیب تھی بلکہ عجیب وغریب تھی۔ ضدی ناگن کی تیسری قسط نے بڑا مزا دیا۔ کہانی میں بڑا سسپنس ہے۔ ان کے علاوہ دلدل (عمران قریشی) پریمی (رضوان علی سومرو، بھٹکتی آتما (حافظ محمد بلال اسلم) راکھ (ساحل دعا بخاری) فرعون کے سپاہی (ضرغام محمود) بھی اپنی اپنی جگہ بہت اچھی کہانیاں ہیں۔ مصنفین کو میری طرف سے بہت مبارکباد، قوس قزح میں سب قارئین کا انتخاب ایک سے بڑھ کر ایک ہے۔ غزلیات میں حکیم خان حکیم، محمد اسلم جاوید، ظہور احمد صائم، شرف الدین جیلانی، ایس امتیاز احمد، سید عباس حیدر بخاری اور قدیر رانا کی غزلیات خوب ہیں۔ جناب عامر زمان عامر کی چھوٹی بحر میں لکھی غزل بھی بہت پسند آئی، نظموں میں رابعہ امانت علی، مریم شاہ بخاری اور سید عبادت کاظمی کی نظمیں خوب ہیں۔

☆☆ ریاض صاحب: یہ حقیقت ہے کہ ہم پاکستانی ہوش کے بجائے جوش سے کام لیتے ہیں، خیر کہانیوں کی تعریف کے لئے بہت بہت شکریہ، نوازش نامہ کا آئندہ بھی شدت سے انتظار رہے گا۔

شرف الدین جیلانی ٹنڈوالہ یار سے۔ ادارے کے سارے احباب مزاج گرامی، امید واثق سے خیریت سے ہوں گے، مارچ کا ڈر حاضر مطالعہ ہے، ضدی ناگن ملک این اے کاوش اور ایم اے راحت جاسوسی انداز میں لکھ رہے ہیں۔ اچھا لکھ رہے ہیں۔ مگر منظر کشی میں کئی صفحے برباد کردیتے ہیں۔ مصروفیات کی وجہ سے دو دو بعض دفعہ تین تین اکٹھے ناولوں کا مطالعہ کرنا پڑتا ہے۔ موبائل نمبر لکھنے کا مطلب تھا خالد بھائی ڈر سے غافل نہ سمجھیں۔ اس بہانے شاہد صاحب سے خوشگوار باتیں ہوئیں۔ آپ صاحبان کی خوش اخلاقی سے ہم لکھنے پر مجبور ہوجاتے ہیں۔ ہم پرنس آف ڈھمپ کے طریقے سے آپ کے آس پاس سے گزرے ہیں مگر ہم اس قابل نہیں کہ اونچی محفل کا رخ کریں۔ ہم پسندیدہ اشعاروں، انتخاب کی غزلوں کے سہارے محفل میں شامل ہوتے رہتے ہیں اور شامل آپ کی دعاؤں سے ہوتے رہیں گے۔ میں آپ سب کے لئے مرکز میں دعا کراؤں گا۔"

☆☆ شرف الدین صاحب: اخلاق اور خلوص سے بڑھ کر دنیا میں کچھ نہیں باشعور لوگوں کے لئے، نوازش نامہ ارسال کرنے اور کہانیوں کی تعریف کے لئے قلبی لگاؤ کے ساتھ شکریہ قبول کریں، ہماری نظر میں آپ بھی بہت خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ محفل میں شمولیت ہمارے لئے باعث خوشی ہوتی ہے۔

خضر حیات روڈہ تھل سے۔ السلام علیکم! انکل جی آپ کیسے ہیں، امید ہے خیریت وعافیت سے اور ٹھیک ٹھاک ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اور آپ کے پورے اسٹاف کو سدا خوش رکھے اور لمبی عمر دے، مارچ کا شمارہ اچھلتا، کودتا اور مسکراتا ہوا ایک خوب صورت اور دلکش ٹائٹل کے ساتھ 21 فروری کو مل گیا۔ شمارہ بہت زبردست تھا۔ سب کہانیاں بہت زبردست، اچھی اور عمدہ تھیں اور ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔ کس کس کہانی کا نام لوں۔ سب ایک سے بڑھ کر ایک سپرہٹ تھیں۔ ہر کہانی کا اپنا مزہ تھا کہ میں بیان نہیں کرسکتا۔ اس کے علاوہ سب شعر بہت اچھے تھے۔ کوئی ایک شعر نہیں ساری شاعری ہی اچھی تھی۔ غزل بھی عمدہ اور اچھی تھیں۔ انکل جی خط، شعر اور غزل بھیج رہا ہوں، یہ میرے دوست صدام حسین کی ہے، پلیز! اپریل کے شمارے میں ضرور جگہ دیجئے گا۔ میری دعا ہے کہ ''ڈر'' دن دگنی رات چوگنی ترقی کرے۔ آمین۔

☆☆ خضر صاحب: خط لکھنے اور کہانیوں کی تعریف کے لئے Thanks۔ آئندہ پلیز ہر تحریر الگ الگ نام سے بھیجئے گا۔

محمد اسحاق انجم کنگن پور سے۔ السلام علیکم! امید ہے آپ سب خیریت سے ہوں گے! مارچ 2016ء کا شمارہ ملا۔ آپ سب کی دعاؤں کے طفیل میں پہلے سے بہتر ہوں۔ مگر دسمبر 2015ء جاتے ہوئے اور نیا سال آتے ہی ہم سے بہت اچھے ادیب جدا کردیئے۔ اشتیاق احمد، انتظار حسین، محی الدین نواب، فاطمہ ثریا بجیا آپا اور ابھی ابھی اطلاع ملی کہ پاکستان کے مشہور اداکار حبیب بھی انتقال کرگئے ہیں ہمارے بہت اچھے دوست تھے! سب کے لئے اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ انہیں اپنی رحمت سے جنت میں جگہ عطا فرمائیں۔ (آمین) دل دکھ سے بھرا ہوا ہے۔ کیا خط لکھوں بس ایس حبیب خان، انعم شہزادی، مریم فاطمہ، طارق محمود، ایس امتیاز احمد، محمد ابوہریرہ اور آپ سب کا شکریہ کہ آپ نے ہمیں اپنی دعاؤں میں یاد رکھا۔ کہانیوں میں دلدل، پریمی، راکھ، فرعون کے سپاہی، ناگ راجہ، دشمن روحیں، ضدی ناگن اور رولوکا ہی پڑھ سکا ہوں۔ پسند آئیں! سب کو مبارکباد۔ اگلے ماہ تک کے لئے خدا حافظ۔

☆☆ اسحاق صاحب: ہماری اور قارئین کی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کی بیماریاں ختم کر کے کلی صحت عطا کرے۔ آپ کا خط پڑھ کر خوشی ہوتی ہے، اور اسے برقرار رکھئے گا۔ شکریہ۔

ناصر محمود فرہاد فیصل آباد سے، السلام علیکم! امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوں گے۔ ایک وقفے کے بعد دوبارہ ملاقات ہو رہی ہے۔ اس تعطل سے بچنے کے لئے اس دفعہ ایک ساتھ تین کہانیاں پیش خدمت کر رہا ہوں تاکہ اگر ملاقات میں وقفہ بھی آ جائے تو حاضری ہر صورت لگتی رہے۔ دراصل یہ تین کہانیاں نہیں ہیں کہانی کی تعریف پر دو ہی تحاریر پوری اتریں گی۔ تیسری کوشش ایک مضمون ہے جو اس چیز سے متعلق ہے جو کہانیوں میں پائے جانے والے ڈر اور خوف کا ایک اہم عنصر ہے یعنی ''ممی'' وہ مردہ لاشیں جو مر کر بھی نہیں مریں اور بے جان ہوتے ہوئے بھی انسانی جسم میں خوف کی پھریری دوڑا دیتی ہیں۔ میں نے کوشش کی ہے کہ معلومات کو یکجا کر کے ایک ایسی تصویر بنا سکوں جسے دیکھ کر قارئین ممی کی حقیقت اور اصل سے واقف ہو سکیں۔ امید ہے پسند آئے گی۔ دعاؤں میں یاد رکھئے گا۔

☆☆ ناصر صاحب: آپ دعاؤں میں یاد رہتے ہیں، ہماری دعا ہے کہ اللہ رب العزت آپ کو ڈھیروں خوشیوں سے نوازے۔ آپ کی تحریر چاہے چھوٹی ہو یا بڑی ہر تحریر قابل تعریف ہوتی ہے، آئندہ شمارہ تک کے لئے اللہ حافظ۔

طارق محمود کامرہ اٹک سے، السلام علیکم! ڈر ڈائجسٹ مارچ 2016ء، 21 فروری کو ملا، سرورق بہت ہی خوب صورت ہے، لسٹ میں اپنی کہانی دیکھ کر خوشی ہوئی، قرآن کی باتیں اور پھر خطوط کی محفل میں تنقید و تعریف پڑھنے کے بعد ''ضدی ناگن'' کی قسط انٹرسٹنگ رہی۔ ''کٹھن راستہ'' شہزادہ چاندزیب اچھی کہانی لکھتے ہیں۔ ایس امتیاز صاحب کی ''اندھیرے کی آواز'' دلچسپ و پراسرار چھوٹی اسٹوری ''ناگ راجہ'' محمد خالد شاہان بہت اچھے جی۔ ''فرعون کے سپاہی'' بالکل انوکھی اور چونکا دینے والی اسٹوری ''عجیب کہانی'' رضوان قیوم جادو کے موضوع پر بھی ایک دلچسپ کہانی تھی۔ ''رولوکا'' میں ناگ ناگنا کی ہارر اور اسرار بھری کہانی بہت عمدہ طرح سے رواں دواں ہے۔ بہت اچھی لگی۔ ''دشمن روحیں'' دل میں ڈر و خوف جگاتی روحوں کی کہانی ''لیپ ٹاپ'' پیا سحر صاحبہ نے واقعی حیرت زدہ کر دیا۔ ''راکھ'' ''پریمی'' ''حقیقی رنگ'' ''ہم آہنگی'' بہت ہی اچھی اور زبردست کہانیاں تھیں۔ میری کہانی ''نادیدہ قوت'' کیسی تھی یہ تو خطوط کی محفل میں پڑھ کر پتا چلے گا۔ ''لال جوڑا'' حیران کر دینے والی پراسرار کہانی تھی۔ عمران قریشی کی ''دلدل'' کی کیا بات ہے، غرض تمام ہی کہانیاں دلچسپ و پراسرار اور ڈر رسالہ کے معیار پر اترنے والی تھیں۔ سب ہی رائٹرز تعریف کے مستحق ہیں۔ آخر میں قوس قزح کے رنگوں کی تعریف بھی ضروری ہے کیونکہ وہ بھی رسالہ کا ایک حصہ ہیں۔ ایک کہانی بنام ''حیرت کہانی'' ارسال خدمت ہے۔ دیکھ لیجئے گا۔

☆☆ طارق صاحب: کہانی مل گئی ہے اس کے لئے شکریہ، آپ کی کہانی کمپوز ہو چکی ہے، آئندہ شمارہ میں ضرور جلوہ گر ہو گی، لیکن پلیز! اپنا تجزیہ ارسال کرنا بھولئے گا مت۔

محمد سفیان دریا خان سے، ایک بار پھر ڈر کے حال احوال میں شریک ہوں، سب سے پہلے شکریہ ادا کرتا ہوں کہ میرے خط کو شائع کیا گیا، کہانی ارسال خدمت ہے، پلیز! دیکھ لیجئے گا، ویسے امید ہے کہ میری کہانی پسند آئے گی، پلیز! نوک پلک سنوار کر شائع کر دیجئے گا۔ اب ذرا کہانیوں کی طرف آتے ہیں تو سچ بات یہ ہے کہ اب تک میں نے صرف رولوکا پڑھی ہے جو کہ مجھے بہت اچھی لگی، میں ان دنوں امتحان کی تیاری میں مصروف ہوں۔ دعاؤں کی درخواست ہے کہ میں اچھے نمبروں سے پاس ہو جاؤں۔

☆☆ سفیان صاحب: خط لکھنے اور کہانی ارسال کرنے کے لئے شکریہ، ہماری اور قارئین کی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو امتحان میں اچھے نمبروں سے کامیاب کرے، کہانی ابھی پڑھی نہیں، اچھی ہوئی تو نوک پلک سنوار کر شائع کر دی جائے گی، آئندہ ماہ بھی خط لکھنا نہ بھولنا۔

محمد سبحان مظفر گڑھ سے، ڈر ڈائجسٹ کے اسٹاف، رائٹرز اور قارئین کو محبتوں بھرا اسلام، امید ہے سب خیریت سے ہوں گے۔ میں ڈر کو بہت پسند کرتا ہوں اور اس میں تمام کہانیاں زبردست ہوتی ہیں۔ عمران قریشی صاحب بہت اچھے رائٹر ہیں ان کی کہانیاں ہمزاد، اذیت پسند، پاگل خانہ، پاگل بتی، پاگل پن، دہقان نو اور اب دلدل بھی بہت اچھی تھی۔ عمران قریشی صاحب سے گزارش ہے کہ پاگل پن پر کچھ اور بھی لکھیں اور ہر ماہ لکھا کریں۔ شکریہ۔

☆☆ سبحان صاحب: ڈر ڈائجسٹ میں خوش آمدید، کہانیوں کی پسندیدگی کے لئے بہت بہت شکریہ، عمران قریشی واقعی اچھے رائٹر ہیں۔

اب ایک ہی موضوع پر ہر ماہ لکھنا ٹھیک نہیں۔ خیر اس کا صحیح جواب تو عمران صاحب ہی دے سکتے ہیں۔

اسد اللہ بھٹی بھکر سے، سلام مسنون! ڈر کا تازہ شمارہ ہاتھوں میں ہے۔ قرآن کی باتوں سے دل کو منور کیا سب کہانیاں اچھی تھیں، رنگ برنگے تجزیے پڑھ کر ڈر کی فیملی ممبرز کی باتیں پڑھیں، عمران قریشی کی دلدل زبردست تھی، چاندزیب کئی ماہ بعد نظر آئے کہانی زبردست تھی۔ خالد شاہان کی کہانی ناگ راجہ زبردست تھی۔ باقی سب کہانیاں اپنی جگہ درست تھیں، خط کے ساتھ کہانی بھیج رہا ہوں، امید ہے پڑھ کر ضرور جواب دیں گے۔ زندگی رہی تو اگلے ماہ پھر ملاقات بذریعہ خط ہو گی۔

☆☆ اسد اللہ صاحب: نئی کہانی بھیجنے کے لئے اور شائع شدہ کہانیوں کی تعریف اور آئندہ ماہ بھی نوازش نامہ ارسال کرنے کے لئے شکریہ، ہماری کوشش ہو گی کہ اگلے ماہ آپ کی کہانی بھی شائع ہو جائے۔

محمد ذاکر ہلال آزاد کشمیر سے، السلام علیکم! سب سے پہلے میں آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں کہ آپ نے میری کہانی آسیبی چکر شائع کی ہے اور ڈائجسٹ ارسال کرنے کا بھی بہت بہت شکریہ، آپ کا ارسال کردہ ڈر ڈائجسٹ مل گیا ہے۔ میں نے دو عدد کہانیاں اور بھی ارسال کی ہیں، وہ بھی جلد از جلد شائع کر دیں۔ شکریہ۔ ماشاء اللہ ڈر ڈائجسٹ کی تمام کہانیاں بہت اچھی ہیں۔ خاص کر پریمی، بھٹکتی آتما، لال جوڑا، حقیقی رنگ، دشمن روحیں، لیپ ٹاپ کا راز، ناگ راجہ اور خاص کر راکھ اچھی کہانیاں تھیں۔ اس کے علاوہ بھی تمام رائٹرز کی کہانی بہت اچھی اور عمدہ تھیں۔ آخر میں۔ پھر ادارہ ڈر ڈائجسٹ کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور اجازت چاہتا ہوں۔ اللہ حافظ۔

☆☆ ذاکر صاحب: فکر نہ کریں آپ کی دیگر کہانیاں بھی شائع ہو جائیں گی۔ مگر اب کوئی اور نئی کہانی ارسال کر دیں۔

کاشف عبید کاوش بنگرام سے، السلام علیکم، سب سے پہلے تو میں ادارہ ڈر ڈائجسٹ میں آیا تو میری سوچ سے بڑھ کر میری عزت افزائی ہوئی۔ اس کے لئے بہت بہت بہت شکریہ، یہ میری پہلی ملاقات تھی جب میں کراچی آیا تھا، مگر افسوس کے مصروفیات کی وجہ سے دوسری ملاقات نہ ہو سکی جس کا مجھے دلی طور پر بہت دکھ ہے۔ اور یہ میرا وعدہ ہے کہ اب میں جب بھی کراچی آؤں گا تو دو کیا تین ملاقاتیں کروں گا۔ اور سب سے اہم بات کہ ادارہ کی طرف سے مجھے دو اعزازی شمارے دیئے گئے۔ اس کے لئے میں بہت شکر گزار ہوں۔ مارچ کے شمارے کی تمام کہانیاں اپنی مثال آپ ہیں لیکن میری نظر میں جو خاص ہیں وہ ہیں: عمران قریشی کی دلدل، رضوان علی سومرو کی پریمی، ضرغام محمود کی فرعون کے سپاہی، اقصیٰ پیا کی لیپ ٹاپ کا راز، طارق محمود کی نادیدہ قوت، خالد شاہان کی ناگ راجہ، اور چاندزیب کی کٹھن راستہ، اس کے علاوہ دشمن روحیں، ضدی ناگن اور مشہور و معروف طویل سلسلہ وار رولوکا، جو کہ اپنی انفرادیت کی وجہ سے بے شمار لوگوں کی دل کی دھڑکن بنی ہوئی ہے۔ میری نظر میں ڈر ڈائجسٹ پاکستان کا وہ واحد رسالہ ہے جو کہ ایک طویل مدت سے صرف اور صرف ہارر کہانیاں شائع کر رہا ہے۔ اور اس میدان میں اس کا کوئی ہم پلہ نہیں ہے، ہر ماہ صرف ایک ہی موضوع پر کہانیاں شائع کرنا انتھک محنت، سوجھ بوجھ اور ہمت و حوصلے کی بات ہے، اور یہی ڈر ڈائجسٹ کی انفرادی خوبی ہے، میری دعا ہے کہ ڈر ڈائجسٹ مزید ترقی کرے۔

☆☆ کاشف صاحب: یہ آپ کی اعلیٰ ظرفی ہے کہ آپ نے ادارے کو اچھے الفاظ سے یاد کیا، ہماری نظر میں تمام رائٹر عزت افزائی کے زمرے میں آتے ہیں، ڈر ڈائجسٹ ہر چھوٹے بڑے رائٹر کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور ان کی کہانیاں شائع کرتا ہے، مگر شرط یہ ہے کہ کہانی کا موضوع اچھا ہو، ہم آپ کا انتظار ہی کرتے رہے کہ آپ دوبارہ شرف ملاقات بخشیں گے مگر آپ اپنی مصروفیات میں الجھے رہے، خیر کوئی بات نہیں، اب ہم آپ کی کہانی کا انتظار کر رہے ہیں، امید ہے مثبت جواب ملے گا۔ شکریہ .... ☆☆

رائٹرز حضرات سے التماس ہے کہ اپنی ہر کہانی پر مکمل ایڈریس اور فون نمبر ضرور لکھا کریں اور ہاں یہ بھی پلیز یاد رکھیں کہ ہر ماہ کہانی نہ سہی مگر تجزیہ کے ساتھ خط ضرور ارسال کریں، اور یہ بھی یاد رکھیں کہ صرف ایک کہانی بھیج کر خاموشی نہ اختیار کریں کیونکہ یہ ضروری نہیں کہ نئے رائٹر کی پہلی ہی کہانی سپر ہٹ ہو۔ وجہ یہ کہ لکھتے لکھتے آدمی لکھاری بنتا ہے۔ **ادارہ**

موت کا کھیل

فلک زاہد-لاہور

قتل پر قتل ہوتے رہے، شہر بھر کی پولیس ہی کیا بلکہ ہر شخص انگشت بدنداں تھا، وجہ یہ کہ قتل کرنے کے بعد قاتل کمرے سے غائب کس طرح ہوتا تھا، کیونکہ دروازہ اندر سے مقفل ہوتا تھا، اصل راز کہانی میں پنہاں ہے۔

عقل کو حیران کردینے والا عجیب شاخسانہ جسے پڑھنے والے برسوں دماغ سے محو نہ کرسکیں گے

میں اس وقت پیرس کے سب سے مہنگے ہوٹل کے کمرے میں کھڑا تھا، جس کے بیڈ پر ایک خوبرو نوجوان لڑکی کا جسم ساکت پڑا تھا اس کے جسم پر لباس نام کی کوئی چیز نہیں تھی لڑکی شکل وصورت کے اعتبار سے اس قدر خوبصورت تھی کہ دیکھنے والے کو پیار آئے، ایک فوٹوگرافر نے لڑکی کے بدن کو سفید چادر سے ڈھانپ دیا اور پھر باقی فوٹوگرافر پورے کمرے کی تصاویر اتارنے لگے، میرے ساتھ میرے سینئر آفیسر انسپکٹر ڈونلڈ بھی یہاں موجود تھے، پورے پیرس شہر میں کہرام برپا تھا۔ ایک مہینے میں یہ تیسرا قتل تھا وہ بھی خاتون کا..... لیکن اب تک ہم یہ پتہ نہیں لگا پائے تھے کہ قاتل کون ہے اور وہ صرف لڑکیوں کو ہی کیوں نشانہ بناتا ہے، اس سے پہلے دو خواتین بھی اسی ہوٹل کے کمرے میں بے جان پائی گئی تھیں کمرے میں کوئی کھڑکی یا بالکونی موجود نہیں تھی صرف ایک دروازہ تھا جس سے اندر باہر آیا جاتا تھا جو اس بار بھی پہلے کی طرح اندر سے مقفل پایا گیا تھا۔

سوچنے کی بات یہ تھی کہ قاتل عورتوں کو مار کر جاتا کہاں ہے اور وہ ایسا کیوں کرتا ہے؟ جبکہ کمرے میں آنے جانے کے لئے صرف ایک ہی دروازہ ہے، تو پھر کمرے کا دروازہ اندر سے مقفل کیوں ہوتا ہے؟

ہمیشہ کی طرح اس بار بھی ہوٹل کے منیجر نے ہمیں فون کر کے اطلاع دی تھی کہ ایک خاتون کمرے میں موجود ہے کئی بار کھٹکھٹانے پر بھی وہ دروازہ نہیں کھول رہی۔

پہلے پہل تو یہ بات ہمیں معمولی سی لگی لیکن پھر جب ہم اپنی ٹیم کو لے کر پہنچے اور دروازہ توڑ دیا تو کیا دیکھا، عورت بیڈ پر بے لباس مردہ پڑی ہے اور آج یہ تیسری بار ہوا تھا۔

ایک نوجوان لڑکی کا مقفل کمرے میں یوں بے لباس مرجانا خودکشی یا پھر نروس بریک ڈاؤن کی جانب اشارہ کرتا تھا مگر لڑکی کی پوسٹ مارٹم رپورٹ نے اس خیال کی نفی کردی تھی اور ساتھ ہی ساتھ حیرت انگیز انکشاف بھی کیا تھا اور پھر جب دوسری لڑکی کا ہو بہو ایسا ہی قتل منظر عام پر آیا تو ہم سب پولیس آفیسر اچھنبے میں پڑ گئے تھے، یہ سب ہماری سمجھ سے باہر تھا اور اب یہ تیسری لڑکی جان سے ہاتھ دھو بیٹھی تھی اور ہم اب تک خالی ہاتھ مل رہے تھے۔

ہوٹل کے منیجر کا اس بار بھی کہنا تھا کہ ''خاتون ہوٹل میں اکیلی ہی داخل ہوئی تھی اور کمرے میں بھی اکیلی ہی موجود تھی جس کا مطلب تھا کہ قاتل پہلے سے ہی منصوبہ بنا کے ہوٹل کے اندر کسی گمنام شخصیت سے

موجود تھا، یہ سب تو سمجھنے میں آتا تھا مگر جب دروازہ اندر سے بند ہوتا تو قاتل مار کر کہاں سے بھاگتا ہے؟ یہ وہ سوال تھا جو کسی طور چین سے بیٹھنے نہیں دیتا تھا۔

پچھلی دو لڑکیوں کا فیملی بیک گراؤنڈ چیک کیا گیا تو وہ اچھے خاندان کی شریف لڑکیاں معلوم ہوئیں ورنہ ان کی لاشوں کا حال دیکھ کر میرے ذہن میں کال گرلز کا خیال آیا تھا کہ ضرور یہ لڑکیاں اور قاتل یہاں اپنے جذبات کی تسکین کے لئے بوس وکنار کررہے تھے اور ہوس پوری کرنے کے بعد قاتل نے لڑکیوں کو مار دیا، یقیناً قاتل نے انہیں اپنے دام محبت میں پھنسا کر یہاں بلا کر اپنی ہوس پوری کی اور پھر انہیں مار دیا۔

مگر میرے اس خیال کی بھی پوسٹ مارٹم رپورٹ نے نفی کردی۔ رپورٹ بتاتی تھی کہ لڑکیوں کو ہوس کا نشانہ نہیں بنایا گیا نہ ہی انہیں مارنے کے لئے کسی زہر کا یا پھر کسی اوزار کا استعمال کیا گیا ہے۔

مگر جو بات میرے رونگٹے کھڑے کرتی تھی وہ یہ تھی کہ لڑکیوں کے جسم سے تمام خون نچوڑ لیا گیا ہے اور یہی ان کی موت کی وجہ بنی۔ ان سب سے صاف ظاہر تھا کہ قاتل مرد ہے لیکن اسے یہ سب کرنے کی کیا ضرورت تھی اور وہ ایسا کیوں کررہا ہے کس کے لئے اور کس لئے کررہا ہے؟'' یہ وہ سوال تھے جنہیں جاننے کے لئے پورے شہر کی پولیس کمر توڑ محنت کررہی تھی۔

آفیسر ڈونلڈ کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

''جی سر۔'' میں نے سنبھلتے ہوئے کہا۔

''اس لڑکی کا بیک گراؤنڈ چیک کروادو اور اس کے والدین کو اطلاع کردو۔'' آفیسر ڈونلڈ نے گویا حکم صادر کیا۔

''جی سر۔'' میں نے احتراماً جواب دیا۔

لڑکی کے والدین ایک ہفتے کے لئے فرانس سے باہر گئے ہوئے تھے اپنی جوان بیٹی کی موت کی خبر سن کر دوڑے چلے آئے اور بیٹی کی لاش پر ماتم کناں ہوگئے۔ ہم پولیس والے انہیں تسلی دیتے رہے اور ساتھ میں یہ یقین بھی دلاتے رہے کہ ہم قاتل کو جلد از جلد پکڑ لیں گے یہ خاندان بھی بھلا معلوم ہورہا تھا لڑکی کی تدفین کے بعد میں نے اس کے والد سے سوال کیا۔

''سر کیا آپ کی بیٹی کا کوئی بوائے فرینڈ تھا؟''

''مجھے نہیں معلوم آفیسر لیکن جہاں تک میں جانتا ہوں وہ سنگل تھی وہ ہماری اکلوتی بیٹی تھی اگر ایسا کچھ ہوتا تو وہ ہمیں ضرور بتاتی۔'' لڑکی کے والد نے روتے ہوئے کہا۔

یہی جواب مرنے والی دو لڑکیوں کے والدین بھی دے چکے تھے جس میں اب شک کی کوئی گنجائش نہ رہی تھی کہ تینوں لڑکیوں کو ایک ہی انداز سے مارنے والا ایک ہی قاتل تھا۔

میں نے مزید کوئی سوال کرنا بہتر نہ جانا اور وہاں سے واپس آگیا۔

خاصا الجھا ہوا کیس تھا اگر قاتل لڑکیوں کو ہوس کا نشانہ بناتا تو یقیناً ان کے جسم پر اس کا ڈی این اے موجود ہوتا جس سے اس کی شناخت ہوسکتی تھی لیکن ایسا کچھ بھی نہیں تھا۔

رپورٹ بتاتی تھی کہ لڑکیوں کو ہوس کا نشانہ نہیں بنایا گیا ان کی موت خون کی کمی کے باعث ہوئی ہے یہ بات صرف میرے لئے ہی نہیں پورے شہر والوں کے لئے حیران کن تھی پہلی بار کسی ایسی موت کا تذکرہ سنا تھا ایک اور بات جو سمجھ میں نہیں آتی تھی وہ یہ تھی کہ اگر لڑکیوں کو ہوس کا نشانہ نہیں بنایا گیا تو پھر وہ بے لباس کیوں پائی جاتی تھیں لڑکیوں کے جسم پر ایسے کوئی نشان بھی نہ تھے جو درندگی کی جانب یا پھر اس جانب اشارہ کرتے ہوں کہ یہاں سے خون نکالا گیا ہے۔ لڑکیوں کی میڈیکل رپورٹ بتاتی تھی کہ وہ بہت صحت مند تھیں اپنی موت سے کچھ دیر قبل..... تو پھر اچانک سے یوں خون کی کمی کیسے اور کہاں سے پیدا ہوئی؟

شہر میں لوگوں نے ہڑتال کر رکھی تھی کہ ہم تینوں لڑکیوں کو انصاف دلوائیں۔ قاتل تک پہنچنا تو میں بھی چاہتا تھا لیکن کیسے؟ قاتل بہت چالاک معلوم ہوتا تھا نجانے کہاں تھا پکڑا گیا تو سزائے موت اس کی یقینی تھی۔

میرا ذہن سوچ سوچ کر تھک گیا تو میں نے ایک اہلکار سے کہہ کر کافی کا مگ منگوایا..... اہلکار کافی رکھ کر چلا گیا اور میں چھوٹے چھوٹے گھونٹ لے کر کافی پینے لگا، میرا ذہن مسلسل کیس کے متعلق سوچے جارہا تھا۔ ہوٹل والوں کا کہنا تھا کہ لڑکیاں اس قدر تندرست اور صحت مند تھیں کہ ان کو دیکھ کر لگتا نہیں تھا کہ ان کو کوئی بیماری ہوسکتی ہے لڑکیوں کے ہوٹل میں قدم رکھنے کے ٹھیک آدھے گھنٹے بعد یعنی رات کے پورے ساڑھے دس بجے تینوں لڑکیوں کی موت واقع ہوئی تینوں لڑکیوں کی موت کا ایک ہی وقت تھا ساڑھے دس اور موت بھی اسی ہوٹل کے اسی کمرے میں ایک ہی حالت میں ہوئی۔ پورے جسم سے خون نچوڑ لینے کے باعث لاشوں کا رنگ سفید پڑا ہوتا تھا۔ تینوں لڑکیوں میں خون کی کمی ایک ہی مقام پر ایک ہی وقت پر کیوں ہوئی؟ ہوٹل کے پورے کمرے کا جائزہ لیا گیا تھا مگر ایسی کوئی چیز ہمارے ہاتھ نہ لگ سکی جس سے کچھ معلومات فراہم ہوسکتی۔

کیا راز تھا ان سب کے پیچھے؟ میں جانے بغیر چین سے نہیں بیٹھ سکتا تھا، میں یہ سب سوچ ہی رہا تھا کہ معاً ایک اہلکار نے اندر آکر مجھے یہ اطلاع دی کہ آفیسر ڈونلڈ مجھے اپنے آفس میں بلا رہے ہیں، میں نے کافی کا مگ اپنے منہ سے لگایا اور ایک ہی سانس میں باقی بچی ہوئی کافی حلق سے نیچے اتار گیا۔ میں اپنا منہ ٹشو سے صاف کرتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا اور آفیسر ڈونلڈ کے آفس کے دروازے پر پہنچ کر میں نے ان سے اندر آنے کی اجازت طلب کی۔ انہوں نے ہمیشہ کی طرح خوش اخلاقی سے مجھے اندر آنے کی اجازت دے دی۔ آفیسر ڈونلڈ ایک ادھیڑ عمر اور سنجیدہ مزاج آدمی تھے باہر سے ان کی شخصیت میں کافی رعب لگتا تھا مگر اندر سے وہ بہت نرم اور رحم دل انسان تھے انہوں نے مجھ سے ہمیشہ اپنے سگے بیٹے جیسا سلوک کیا تھا، میں ان کی قربت پاکر بہت خوش تھا میرے ساتھی کولیگ اس بات پر مجھ سے حسد کرتے تھے مگر مجھے کسی کی کوئی پرواہ نہیں تھی میں اپنے کام سے کام رکھتا تھا۔

میں آفیسر ڈونلڈ کے سامنے براجمان ہوگیا دو تین منٹ وہ کسی فائل کی ورق گردانی کرتے رہے پھر اسے ایک طرف رکھ کر مجھ سے مسکراتے ہوئے مخاطب ہوئے۔

''نوجوان جوزف تینوں لڑکیوں کے قتل کا کیس میں تمہارے حوالے کرتا ہوں آج سے تم باقاعدہ اس کیس پر کام کروگے اور اس کیس میں تمہاری مدد دو آفیسر اور کریں گے جن میں آفیسر ٹام اور لیڈی آفیسر مرلین شامل ہیں تم تینوں مل کر کام کروگے۔''

''سر..... سر میں۔'' مجھے اپنی سماعت پر یقین نہ آیا۔

''کیوں بھئی نروس ہو؟'' سر ڈونلڈ ہلکا سا ہنسے۔

''جی سر۔'' میں نے بہ مشکل کہا۔

''کوئی بات نہیں نوجوان مجھے تم پر پورا بھروسہ ہے۔ تم یہ کیس اپنے پچھلے کیسز کی طرح ضرور حل کرلو گے..... جانتا ہوں کہ یہ کیس آسان نہیں ہے جبھی تو میں نے تم تینوں کے کندھوں پر یہ ذمہ داری ڈالی ہے کیونکہ میری نظر میں تم تینوں جیسا باا عتماد اور قابل آفیسر اور کوئی نہیں ہے۔'' آفیسر ڈونلڈ نے بھرپور انداز سے کہا ان کے لہجے میں اپنے لئے اس قدر بھروسہ اور مضبوطی دیکھ کر میرے اندر بھی حد درجہ حوصلہ پیدا ہوا میرے لئے یہ بات کسی اعزاز سے کم نہیں تھی کہ ایسے مشکل اور پیچیدہ کیس کے لئے انہوں نے میرا انتخاب کرکے مجھ پر بھروسہ کیا تھا۔

میں اثبات میں سر ہلاتا ہوا اٹھ گیا اور انہیں سلوٹ کرکے واپس مڑنے ہی والا تھا کہ انہوں نے مجھے روک لیا وہ اپنی سیٹ سے اٹھے اور میرے ساتھ پورے جوش سے مصافحہ کیا۔

''گڈ لک مائی سن۔'' انہوں نے مضبوط لہجے میں کہا۔

میرے لئے یہ بہت عزت کی بات تھی کہ آفیسر ڈونلڈ نے میرے ساتھ مصافحہ کیا تھا اور مجھے بیٹے کا درجہ دیا تھا ایسا پہلی بار نہیں ہوا تھا وہ تو اکثر مجھے اپنے گھر تو کبھی کہیں لے جاتے تھے اکثر میرے ساتھ بغل

گیر بھی ہوتے تھے غرض وہ مجھے ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتے لیکن پھر بھی میں نے کبھی غرور نہیں کیا تھا بلکہ میں پہلے سے زیادہ اچھی طرح اپنی ڈیوٹی انجام دیتا تھا لیکن اس بار کے مصافحے میں کچھ اور ہی اپنائیت تھی شاید اس لئے کہ وہ مجھ پر بھروسہ کرتے تھے بھی تو انہوں نے ایک اہم کیس میرے حوالے کیا تھا اس سے پہلے میں کئی کیس سلجھا چکا تھا میرا ریکارڈ اچھا تھا۔ لیکن ایسا عجیب وغریب کیس پہلی بار سلجھانے جارہا تھا۔

''میں اس کیس میں اپنی جان لڑادوں گا۔''

میں نے اعتماد سے کہا اور آفیسر ڈونلڈ سے اجازت لے کر ان کے آفس سے اپنے آفس میں آگیا۔

میں یتیم تھا میری ماں مجھے جنم دیتے ہی چل بسی تھی اور والد صاحب کو گزرے ابھی صرف دو تین سال ہی گزرے تھے مجھے خوشی تھی کہ اپنے جیتے جی وہ مجھے ایک پولیس آفیسر کے طور پر دیکھ چکے تھے ان کا شروع سے یہ خواب رہا تھا کہ ان کا بیٹا ایک کامیاب پولیس آفیسر بنے جو میں نے پورا کر دکھایا تھا۔

میری تنخواہ اچھی تھی اور گھر پر اکیلا ہی رہتا تھا میرا کوئی بھائی بہن بھی نہیں تھا کیونکہ میری والدہ کے گزرنے کے بعد میرے والد صاحب نے میرے لئے دوسری شادی نہیں کی اسی ڈر سے کہ نجانے سوتیلی ماں کا میرے ساتھ کیسا رویہ ہو انہوں نے مجھے اکیلے ہی پروان چڑھایا جس وجہ سے میری ان سے محبت دیدنی تھی میں ان کی بے حد عزت کرتا تھا میں روز باقاعدگی سے اپنے والدین کی قبروں پر حاضری بھی دیتا تھا میں خوبصورت، دراز قد، پرکشش اور اسمارٹ سا نوجوان تھا گرے آنکھیں اور گولڈن بال میرے خدوخال کو مزید چار چاند لگاتے تھے کالج کے زمانے سے ہی لڑکیاں مجھ پر جان چھڑکتی تھیں مگر یہ حسن وعشق میرے بس کی بات نہیں تھی شروع سے ہی میرا رویہ ہر لڑکی کے ساتھ خشک رہا تھا جس وجہ سے کچھ برا مان جاتیں تو کچھ مسلسل میرے نزدیک آنے کی تگ ودو میں لگی رہتیں جن میں انہیں کبھی کامیابی نہ ملتی۔

آفیسر ڈونلڈ کی بھی اہلیہ کچھ سال قبل وفات پاگئی تھیں وہ اپنی اکلوتی لاڈلی بیٹی آئرس کے ساتھ رہتے تھے بیٹے کی آرزو ان کی پوری نہ ہوسکی تھی کیونکہ آئرس کے بعد ڈاکٹروں نے مزید کوئی بچہ پیدا کرنے سے منع کردیا تھا، شاید اسی لئے ان کو میری صورت میں ایک بیٹا نظر آتا تھا اور میں ان کی توقعات پر پورا بھی اترتا تھا۔

آئرس اکثر مجھ سے اظہار محبت کرتی رہتی تھی لیکن میں نے کبھی اس کی اس بات پر کان نہیں دھرے تھے جس وجہ سے وہ اکثر مجھ سے ناراض رہتی تھی اور مجھے اس کے خراب موڈ کو ٹھیک کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی اول تو آئرس مجھے پسند نہیں تھی اور دوسرا آئرس کے ساتھ پیار کی پینگیں بڑھا کر میں سر ڈونلڈ کے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچانا چاہتا تھا۔

میں اس وقت اپنے آفس میں یہی بیٹھا سوچ رہا تھا کہ ''اگر میں یہ کیس حل نہ کرسکا تو اپنی جاب سے استعفیٰ دے دوں گا کیونکہ آفیسر ڈونلڈ کے ساتھ لوگوں لڑکیوں کے والدین اور میڈیا والوں کی بھی نظریں جلد مجھ پر ہوں گی جو مجھ سے امید لگائے بیٹھے ہوں گے باقیوں کا تو ابھی مجھے پتہ نہیں لیکن آفیسر ڈونلڈ کے بارے میں مجھے یقین تھا کہ وہ مجھ سے کامیابی کی امید رکھتے ہیں اگر میں کامیاب نہ ہوا تو شاید میں اپنی ہی نظروں میں گر جاؤں گا اور دوبارہ ان سے آنکھ ملانے کی جرأت شاید ہی مجھ میں ہوگی۔'' اس لئے یہ فیصلہ میں نے بہت سوچ سمجھ کر لیا تھا بہرحال یہ بات بعد کی تھی ابھی تو مجھے صرف کامیابی کے بارے میں سوچنا تھا اور لگن سے کام کرنا تھا۔

''کیا میں اندر آسکتا ہوں۔'' جانی پہچانی آواز پر میں سوچوں کے بھنور سے نکل آیا اور نظریں اٹھا کر چونک کر آواز کی سمت دیکھا۔ آنے والا خوبرو نوجوان آفیسر ٹام تھا۔

''آجایئے آفیسر ٹام۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

ٹام میرے سامنے براجمان ہوگیا۔

''بتایئے کیسے آنا ہوا؟'' میں نے گفتگو کا آغاز کیا ہی تھا کہ آفیسر مرلین بھی آدھمکی۔

''جوزف کیا میں اندر آسکتی ہوں؟''

آفیسر مرلین نے ہمیشہ کی طرح اپنے حسن کے جلوے بکھیرتے ہوئے کہا۔

آفیسر مرلین مجھ سے محبت کرتی تھی مگر اس کی یہ محبت یکطرفہ تھی وہ کئی بار مجھ سے اپنی محبت کا اظہار کرچکی تھی مگر میں نے اسے کبھی قابل پذیرائی جواب نہیں دیا تھا جس وجہ سے وہ اکثر مجھ سے ناراض بھی رہتی تھی مگر میں اسے منانے کی زحمت گوارہ نہیں کرتا تھا کیونکہ میرا اس سے ایسا تعلق نہیں تھا۔ جب میری طرف سے وہ کوئی پیش قدمی ہوتے ہوئے نہ دیکھتی تو خود ہی مان جاتی..... مرلین خوب صورت تھی اس پراسٹاف کے کافی لڑکے مرتے تھے مگر وہ تھی کہ صرف مجھے چاہتی تھی وہ گہری نظروں سے دیکھتی ہوئی میرے سامنے براجمان ہوگئی میں نے اہلکار سے کہہ کر کافی کے تین مگ منگوالئے اور گفتگو کا آغاز کردیا۔

''یوں اچانک سے آپ دونوں یہاں کیسے؟''

''مجھے پتہ چلا ہے کہ لڑکیوں کے عجیب وغریب قتل کیس میں میرے اور مرلین کے ساتھ اب تم بھی کام کروگے اس لئے تمہیں مبارک باد دینے چلا آیا۔'' ٹام نے خوش اخلاقی سے کہا۔

ٹام میرے جیسا شریف انسان تھا اور میرا اچھا دوست تھا ایک بہن کے علاوہ دوسرا اور کوئی اس کا اس دنیا میں نہیں تھا..... میں نے ٹام کی بات سن کر صرف مسکرانے پر اکتفا کیا۔

''سر ڈونلڈ ہمیشہ ہم تینوں کی ہی ٹیم تشکیل دیتے ہیں۔ مجھے پوری امید ہے کہ پچھلے کیسز کی طرح ہم مل کر یہ کیس بھی ضرور حل کرلیں گے۔'' مرلین نے خوشی سے کہا۔

''اور انہیں تو کیا..... حل کرکام کرنے میں بہت مزہ آئے گا۔'' ٹام نے مرلین کی بات کا جواب دیا۔

''یہ کیس اتنا آسان نہیں ہے۔ جتنا تم دونوں سمجھ رہے ہو۔'' میں نے کہا۔

''بے شک..... مگر ناممکن بھی نہیں۔'' ٹام نے جواباً کہا۔

کافی کے دوران ہم تینوں کے بیچ صرف کیس کو لے کر ہی گفتگو ہوئی کہ ''کیسا پراسرار کیس ہے ہمیں بڑی احتیاط سے کام لینا ہوگا کیونکہ قاتل بہت ہی ہوشیار ہے وغیرہ وغیرہ۔'' کافی ختم ہونے کے بعد ٹام میرے آفس سے چلا گیا جبکہ مرلین براجمان رہی، میں اسے حیرانی سے دیکھنے لگا کہ وہ اٹھ کر کیوں نہیں جارہی۔

''ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟'' مرلین نے اٹھلا کر کہا۔

''نہیں کچھ نہیں۔'' میں یکدم چونکا۔

''جوزف مجھ میں ایسی کیا کمی ہے جو تم مجھ سے اتنا سرد رویہ اختیار کئے رکھتے ہو۔'' مرلین نے گہری سانس لے کر کہا۔

یہی کہنے کے لئے وہ اٹھ کر نہیں گئی تھی اس نے تنہائی کا فائدہ اٹھا کر مجھ سے یہ سوال کرڈالا مرلین کے روز روز سوالوں سے میں تنگ آگیا تھا وہ اکثر مجھ سے یہی سوال کرتی تھی نجانے کیوں مجھے اس میں کشش محسوس نہیں ہوتی تھی میں نے کبھی اس کے ایسا کہنے کا ناجائز فائدہ بھی نہیں اٹھایا تھا میری جگہ کوئی اور ہوتا تو یقیناً ایسا کرتا۔ مرلین کا اس دنیا میں کوئی نہیں تھا شاید مجھ میں وہ اپنے مستقبل کا شریک سفر دیکھتی تھی مگر میں ایسا بالکل نہیں چاہتا تھا۔

''مرلین یہ پولیس اسٹیشن ہے یہاں ایسی باتیں آپ کو زیب نہیں دیتیں۔ آپ ڈیوٹی پر ہیں فضول باتیں کرنے کی کوشش مت کیجیے۔ اگر آپ کو ایسا کچھ کرنا ہی ہے تو پلیز فلم لائن میں جایئے۔'' میں نے سخت لہجے میں کہا۔

مرلین کو مجھ سے ایسے تلخ جواب کی توقع نہیں تھی۔ اس کی دانست میں ہمیشہ کی طرح اس بار بھی لاپرواہی کا مظاہرہ کرتا مگر آج تو اس کی توقع کے برلاف ہوا تھا جس وجہ سے وہ کوئی بپھری ہوئی شیرنی

سوم ہورہی تھی وہ جھے خون خوار نگاہوں سے گھورتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی اور پاؤں پٹختی ہوئی میرے آفس سے چلتی بنی۔

مجھے مرلین کے یوں ناراض ہوکر چلے جانے سے کوئی فرق نہیں پڑا الٹا میں نے سکون کی گہری سانس لی اور اپنا سر کرسی کی پشت سے ٹکا دیا، میری سوچوں کا رخ ایک بار پھر اسی کیس کی جانب چلا گیا مجھے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ کہاں سے شروع کروں، ایسا کوئی ثبوت بھی نہیں تھا جو ہمیں قاتل تک لے جاسکتا۔

میں نے کل سے اس کیس پر کام شروع کرنے کا فیصلہ کرلیا اور ڈیوٹی آف ہوت ہی گھر کی جانب چل پڑا ،راستے میں پہلے میں نے کھانا کھایا پھر گھر کو۔ آیا میں اپنے اس چھوٹے اور کشادہ گھر میں اکیلے بہت خوش تھا مجھے کبھی تنہائی کاٹتی بھی نہ تھی، میں نے اسے آباد کرنے کے بارے میں کبھی سوچا تھا۔ زندگی بہت مصروف گزر رہی تھی۔ کبھی کوئی کیس تو کبھی کوئی جس وجہ سے ان فضولیات کے لئے میرے پاس وقت نہیں تھا۔ اکثر میرا فارغ وقت آفیسر ڈونلڈ کے ساتھ گزرتا تھا ورنہ میں خود کو اکیلے گھر میں بند کرلیتا۔ مجھے پسند کرنے والی لڑکیاں تو بے شمار تھیں مگر میرے دل نے اب تک کسی کو پسند نہیں کیا تھا، میں اپنے آپ میں اکیلا خوش تھا میرے نزدیک لڑکیاں سردرد تھیں میں لڑکیوں سے دور بھاگتا تھا میرا صرف ایک ہی خواب تھا کہ میں جلد ترقی کرکے بڑے عہدے پر فائز ہوجاؤں، بیڈ پر دراز ہوکر میں نے ہیڈ فون کانوں سے لگالیا اور کب موسیقی سنتا سنتا خوابوں کی دنیا میں چلا گیا مجھے پتہ ہی نہیں چلا۔

صبح ٹھیک سات بجے میری آنکھ کھل گئی نہا دھو کر ناشتہ کرکے میں پورے آٹھ بجے اپنے آفس میں موجود تھا، تھوڑی دیر بعد میں اپنی ٹیم کے ساتھ اس ہوٹل میں گیا جہاں قتل ہوئے تھے، میں نے استقبالیہ کی اس دن کی پوری لسٹ چیک کی جس دن قتل ہوئے تھے اس دن اندر آنے جانے اور ٹھہرنے والوں کے نمبر اور ایڈریس نوٹ کرکے ان سب سے پوچھ گچھ کی گئی لیکن ان سب میں سے کوئی بھی وہ قاتل نہیں تھا۔

میری حیرت دوچند تھی میں نے سختی سے کئی بار استقبالیہ میں نام درج کرنے والے سے پوچھا کہ ”کہیں اس سے کوئی غلطی تو نہیں ہوئی، ہر بار اس کا ایک ہی جواب ہوتا کہ۔ ”اس دن جتنے لوگ یہاں آئے تھے ان سب کے نام یہاں درج ہیں۔ ان کے علاوہ یہاں اور کوئی نہیں آیا۔“ استقبالیہ رجسٹر میں ایسا کوئی نام بھی نہیں تھا جو ہری شخصیت سے ہوٹل میں ٹھہرا ہو۔ یہ سب کرتے کرتے سہ پہر ہوگئی تھی، میں واپس پولیس اسٹیشن آ گیا اور اہلکار سے کہ کر کھانا منگوا کر کھانے لگا کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کافی پراسرار اور الجھا ہوا کیس تھا۔

میری دلچسپی اس میں بڑھتی ہی جارہی تھی کچھ بھی کرکے مجھے اس کیس کی تہہ تک جانا تھا، میں نے شہر کے تمام ہوٹلز کے باہر بغیر وردی کے پولیس کھڑی کردی تھی، ساتھ ہی سختی سے سب کو ہدایت بھی کردی تھی کہ ہر آنے جانے والے آدمی پر کڑی نظر رکھی جائے کہ کون کیا کررہا ہے۔

ڈونلڈ کی طرف سے اجازت تھی کہ اس کیس کو حل کرنے کے لئے جو کچھ بھی کرنا پڑے کرو کیونکہ یہ پولیس والوں کی عزت کا سوال تھا لوگوں نے ہڑتال کررکھی تھی میڈیا والے الگ بات کو اچھال رہے تھے جبکہ تینوں لڑکیوں کے والدین انہیں انصاف دلانے کے لئے کوشاں تھے۔

”لنچ پر مجھے اور ٹام کو جوائن کروگے؟“ آفیسر مرلین کی آواز پر میں چونکا۔

”جی نہیں شکریہ..... میں لنچ کرچکا ہوں۔“ میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ مرلین دو تین منٹ مجھے عجیب نظروں سے گھورتی رہی پھر بغیر کچھ کہے واپس پلٹ گئی..... میں نے بے خیالی میں کندھے اچکائے وہ ایک بار پھر ناراض ہوکر چلی گئی تھی میں نے کرسی سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کرلیں جب ہی فون کی گھنٹی نے مجھے ایک بار پھر چونکا دیا، فون میرے موبائل پر آرہا تھا اور اسکرین پر آئرس کا نمبر جگمگا رہا تھا، میں نے اکتا کر فون اٹینڈ کیا۔

”ہیلو.....“ میں نے کہا۔

”لگتا ہے آپ ہمیں بھول ہی گئے ہیں، اتنے دن سے نہ کوئی میسج نہ فون ملنے بھی نہیں آئے۔“ آئرس نے شوخی سے کہا۔

جب میں آفیسر ڈونلڈ کے ساتھ ان کے گھر جاتا تھا تو میری کوشش ہوتی تھی کہ آئرس سے میرا سامنا نہ ہی ہوا تو اچھا ہے، فون اکثر مجھے وہ خود ہی کرتی تھی۔ میں نے کبھی اسے فون یا میسج نہیں کیا تھا جب بھی اس کا فون آتا تھا تو کبھی اٹھالیتا تو کبھی فون آف کردیتا۔ میسج کا جواب دینا میں ویسے ہی پسند نہیں کرتا تھا۔

”مصروف تھا اسی لئے۔“ میں نے سرد لہجے میں کہا۔

”آپ کو میری یاد نہیں آتی؟“ آئرس نے رومینٹک ہوتے ہوئے کہا۔

دل تو بہت چاہا کہ نہ کروں مگر ہمت نہیں ہوئی۔

”نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔“ میں نے تنگ آ کر کہا۔

آئرس کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ ”پھر کیسی بات ہے؟“

”مجھے نہیں معلوم۔“ مجھے غصہ آ گیا۔

”مجھے تو آپ کی بہت یاد آتی ہے۔ میرا بس چلے تو میں زندگی کا ہر لمحہ آپ کے ساتھ گزاروں۔“ آئرس کی جذبات میں ڈوبی ہوئی آواز ابھری۔

”اچھی بات ہے ہوتا ہے ایسا۔“ میں نے سنجیدگی سے کہا۔

”آپ کتنے بورنگ انسان ہیں۔“ آئرس سمجھ گئی کہ میرے ساتھ اس کی بات نہیں بننے والی۔

”تعریف کا شکریہ۔“ میں نے زیرلب مسکراتے ہوئے کہا۔

”بھاڑ میں جاؤ۔“ آئرس غصے سے بول کر فون بند کردیا۔

میں نے ہنستے ہوئے فون ایک طرف رکھ دیا اور شکر ادا کیا کہ آئرس سے تو جان چھوٹی۔

رات ساڑھے دس بجے میرے ساتھ پورے ملک کے لئے یہ دھماکہ خیز اور حیران کن خبر تھی جو ہم سب کے رونگٹے کھڑے کرگئی۔

وہ یہ تھی کہ اسی ہوٹل کے اسی کمرے میں ایک اور لڑکی کا قتل منظر عام پر آیا، قتل ہونے والی لڑکی کا نام لوسی تھا، ایسا کیسے ممکن تھا؟ میں نے پورے شہر کے ہوٹلوں کے باہر بغیر وردی کے پولیس کھڑی کی تھی اور کافی اچھے سے نظر بھی رکھی جارہی تھی تو پھر یہ سب کیسے ہوگیا؟

میں، ٹام اور مرلین ہوٹل پہنچے تو سب پولیس والے شرمندگی سے سر جھکائے کھڑے تھے شاید وہ سب ہماری ڈانٹ ڈپٹ سننے کے لئے تیار تھے۔ ٹام ان سے باز پرس کرنے لگا جبکہ میں اور مرلین استقبالیہ پر چلے آئے جہاں ہمیشہ کی طرح اس بار بھی بس اتنا ہی پتہ چل سکا کہ لڑکی یہاں اکیلی ہی موجود تھی ایسا کیسے ہوسکتا تھا؟

ہمیں ہوٹل والوں پر شک ہوا کہ کہیں یہ لوگ لڑکیوں کا دھندا تو نہیں کرتے؟ کیا معلوم لڑکیوں کے ان پراسرار قتل کے پیچھے ہوٹل والوں کا ہی ہاتھ ہو؟ کیوں ہم خالی ہاتھ واپس لوٹ جاتے ہیں؟ شاید یہ لوگ جھوٹ بول رہے ہیں اور قاتل انہی کا کوئی بندہ ہے جسے یہ بچانے کی کوشش کررہے ہیں؟ لیکن اگر انہوں نے ایسا کرنا ہی ہوتا تو خاموشی سے کرتے یوں پورے شہر میں ڈھنڈورا کیوں پیٹتے۔ لہٰذا میں نے اس خیال کو اپنے ذہن سے جھٹک دیا مگر کیس کی نوعیت ہی کچھ ایسی تھی کہ مرلین شک کی بنا پر ہوٹل کے تمام افراد سے پوچھ گچھ کرنے لگی حتیٰ کہ یہاں کے منیجر سے بھی.....! کیونکہ قتل سخت سیکورٹی کے باوجود ہوٹل میں پیش آیا تھا جبکہ ہوٹل والوں اور ہماری پولیس ٹیم کے مطابق ہوٹل میں کوئی مشکوک شخص داخل بھی نہیں ہوا۔ تو پھر یہ کیسے ہوا؟

میں چلتا ہوا اس جگہ میں آ گیا جہاں پیش آنے والا یہ اچھوتا قتل ہوا تھا، تھوڑی سی زور آزمائی کے بعد دروازے کو توڑ دیا گیا اور میں اپنی ٹیم کے ساتھ اندر داخل ہوگیا..... میں نے اپنے ساتھ آئے ہوئے

اہلکار ساتھیوں سے کہا کہ وہ اچھی طرح کمرے کا کونا کونا چھان ماریں ہوسکتا ہے یہاں پر کوئی تہہ خانہ ہو، یہ خیال اچانک ہی سے میرے ذہن میں آیا تھا کیونکہ دروازہ ایک بار پھر اندر سے مقفل دیکھ کے مجھ پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے تھے کہ قاتل کہاں سے فرار ہوا؟ کمرے میں تہہ خانے کا نام ونشان نہیں تھا نہ ہی کمرے کی دیواروں کے پیچھے کوئی اور کمرہ تھا۔ میں نے دور سے ہی ایک نظر ڈالی کرمردہ لڑکی کے چہرے کی جانب دیکھا بیس سال سے زیادہ کی نہ تھی اور جسم پر لباس نام کی کوئی چیز نہیں تھی میں نے نظریں چراتے ہوئے اس پر سفید چادر ڈالی کر اس کی دہشت سے کھلی آنکھیں بند کردیں جو یوں کھلی تھیں گویا مرنے سے پہلے اس نے بے حد خوف ناک چیز دیکھی ہو۔ میری ٹیم نے کمرے کا اچھی طرح سے معائنہ کیا لیکن اس بار بھی کوئی قابل بخش چیز ہمارے ہاتھ نہ لگ سکی۔

میرا ذہن ماؤف ہوگیا سمجھ نہیں آرہا تھا کہ یہ کیا اسرار ہے کیس مزید الجھتا جارہا تھا، بہت سے سوالات تھے جن کے جواب میں اب تک سوالیہ نشان لگا ہوا تھا، ہم سب کام ختم کرکے واپس پولیس اسٹیشن آگئے کھانا کھانے کو بھی دل نہیں کررہا تھا بھوک گویا ختم ہوگئی تھی نام اور مرلین بھی میرے ساتھ موجود تھے اور ہمارا ذہن کیس کی ہی زد میں تھا۔

''ہوٹل والے تمام لوگ بے قصور ہیں ان کا لڑکیوں کے قتل سے کوئی لینا دینا نہیں..... میں نے نہایت باریک بینی سے ان کا پتہ لگایا ہے لیکن کچھ ہاتھ نہیں لگ رہا۔'' مرلین نے گفتگو کا آغاز کیا۔

جواب میں، میں نے اور نام خاموش رہے۔ نجانے کیوں اس بار ہمارا دل ہمیں لڑکیوں کے قتل کا ذمہ دار ٹھہرا رہا تھا۔ شاید اس لئے کہ ہم ایک پولیس آفیسر ہوکر اب تک ان کے لئے کچھ کرنے سے قاصر تھے، اسی اثنا میں ایک اہلکار اندر آیا اور اس نے ہم تینوں کو سلوٹ کرکے پیغام دیا کہ۔ ''آفیسر ڈونلڈ ہمیں اپنے آفس میں طلب کررہے ہیں۔''

ہم تینوں کی سانسیں جیسے خشک ہوگئیں بے شک وہ مجھے بیٹا سمجھتے تھے مگر ڈیوٹی کے وقت رشتے داری بھی نہیں چلتی اور پھر یہاں تو معاملہ چار لڑکیوں کے قتل کا تھا لہٰذا آفیسر ڈونلڈ سے رعایت کی کوئی امید نہیں تھی، ہم تینوں جانتے تھے کہ اب ہماری خوب کلاس لگنے والی ہے، ہم تینوں نے بیک وقت ایک دوسرے کو دیکھا اور اپنی اپنی جگہ خود کو آفیسر ڈونلڈ کی ڈانٹ ڈپٹ سننے کے لئے تیار کرنے لگے۔ ہم تینوں نے ان کے آفس پہنچ کر ان سے اندر آنے کی اجازت طلب کی اور انہیں سلوٹ کرکے ان کے سامنے شانے چوڑے کرکے کھڑے ہوگئے..... اس وقت وہ لوسی کی پوسٹ مارٹم رپورٹ کی ورق گردانی کررہے تھے جس پر لکھا تھا۔ ''لڑکی کی موت خون کی کمی ہونے کی وجہ سے واقع ہوئی ہے۔''

آفیسر ڈونلڈ نے پوسٹ مارٹم رپورٹ ایک طرف رکھ کر ہم تینوں کو گہری نگاہوں سے دیکھا اور اپنی کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

''یہ کیا ہورہا ہے تقریباً پونے دو ماہ میں یہ چوتھا قتل ہے اور قاتل اب تک ہماری پہنچ سے دور ہے تم لوگ اپنی ڈیوٹی ٹھیک سے انجام کیوں نہیں دے رہے۔'' آفیسر ڈونلڈ نے نرم مگر اونچے لہجے میں کہا۔

''سر میں نے شہر کے تمام ہوٹلوں کے باہر بغیر وردی کے پولیس کا بڑا سخت پہرہ لگایا تھا مگر اس کے باوجود، قاتل نجانے اندر کیسے آیا.....؟ اس بار بھی دروازہ اندر سے مقفل تھا اور ہوٹل والوں کا کہنا ہے کہ لڑکی یہاں اکیلی ہی موجود تھی اسے کسی کے ساتھ نہیں دیکھا تھا۔'' میں نے تفصیلاً بتادیا۔

''سر ہمیں ہوٹل والوں پر شک ہوا..... میں نے سب کے بارے میں باریک بینی سے چھان بین کی مگر کچھ خاص نہیں ملا وہ سب بے قصور ہیں ان میں سے کوئی بھی وہ قاتل نہیں نہ ہی ان میں سے کسی کا بھی قاتل سے کوئی تعلق نظر آتا ہے۔'' اس بار مرلین نے حوصلہ دکھایا۔

''سر ہم اپنی پوری کوشش کررہے ہیں، چھان

بین ہنوز جاری ہے۔'' ٹام بولا۔

آفیسر ڈونلڈ کو ہماری باتوں کا یقین تھا انہوں نے کہا۔ ''میں سب جانتا ہوں مجھے تم تینوں پر اندھا اعتماد ہے لیکن لوگ نہیں سمجھ رہے وہ سمجھ رہے ہیں کہ ہم پولیس والے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں۔''

''سر آپ فکر نہ کریں ہم جلد ہی یہ کیس حل کرلیں گے۔'' میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔

''رات ہوچکی تھی ڈیوٹی آف ہوجانے کے بعد ہم تینوں ابھی پولیس اسٹیشن سے نکلے ہی تھے کہ میڈیا والوں نے ہمیں گھیر لیا۔

''سر ڈیڑھ ماہ میں چوتھی لڑکی کو مار دیا گیا ہے اس بارے میں پولیس کچھ کر کیوں نہیں رہی؟'' ایک صحافی نے سوال کیا۔

''دیکھیے ہم اپنی پوری کوشش کررہے ہیں قاتل جلد ہی سلاخوں کے پیچھے ہوگا۔'' میں نے لاپروائی سے جواب دیا میں میڈیا والوں سے جان چھڑانا چاہتا تھا ان لوگوں کو کیا معلوم تھا کہ اس کیس کو حل کرنے کے لئے پولیس کے نوجوان کس طرح اپنا خون پسینہ ایک کررہے ہیں انہیں تو اپنا چینل چلانے کے لئے بے تکی خبر چاہئے ہوتی ہے۔

میڈیا والوں سے بہ مشکل جان چھڑا کر ہم تینوں اپنی اپنی گاڑیوں تک آئے اور گھر آگئے۔

میں نے بیڈ پر لٹ کر سکون کی سانس لی میری عادت تھی کہ میں باہر کا کام باہر ہی چھوڑ کر آتا تھا گھر پر اس بارے میں بالکل نہیں سوچتا تھا لیکن یہ کیس ہی کچھ ایسا تھا جس نے میری زندگی اجیرن کرکے رکھ دی تھی ایک پل مجھے چین نہیں آتا تھا ہر وقت کیس کے متعلق سوچتا رہتا تھا اس وقت بھی میرا ذہن کیس کے متعلق سوچ ہی رہا تھا، میں چاہ کر بھی اس کا خیال اپنے ذہن سے نکال نہیں پارہا تھا، آخر کون سی لاپرواہی ہوگئی مجھ سے جو ایک معصوم لڑکی کی جان چلی گئی اگر آج کوئی لاپرواہی نہ ہوتی تو یقیناً لڑکی کی جان بچ سکتی تھی اور قاتل بھی ہماری حراست میں ہوتا یہی سب سوچتے

خوشخبری

طلسماتی انگوٹھی ایک عظیم تحفہ ہے۔ ہم نے سورۂ یاسین کے نقش پر فیروزہ، یمنی، عقیق، پکھراج، لاجورد، نیلم، زمرد، یاقوت پتھروں سے تیار کی ہے۔ انشاء اللہ جو بھی یہ طلسماتی انگوٹھی پہنے گا اس کے تمام بگڑے کام بن جائیں گے۔ مالی حالات خوب سے خوب تر اور قرضے سے نجات مل جائے گی۔ پسندیدہ رشتے میں کامیابی، میاں بیوی میں محبت، ہر قسم کی بندش ختم، رات کو تکیے کے نیچے رکھنے سے لاٹری کا نمبر، جادو کس نے کیا، کاروبار میں فائدہ ہوگا یا نقصان معلوم ہوجائے گا۔ آفیسر اپنی طرف مائل، نافرمان اولاد، نیک، میاں کی عدم توجہ، جج یا حاکم کے غلط فیصلے سے بچاؤ، مکان، فلیٹ یا دکان کسی قابض سے چھڑانا، معدے میں زخم، دل کے امراض، شوگر، یرقان، جسم میں مردو عورت کی اندرونی بیماری، مردانہ کمزوری، ناراض کو راضی کرنے یہ سب کچھ اس انگوٹھی کی بدولت ہوگا۔ یا درکھو سورۂ یاسین قرآن پاک کا دل ہے۔

رابطہ: صوفی علی مراد

0333-3092826-0333-2327650

M-20A الرحمان ٹریڈ سینٹر

بالمقابل سندھ مدرسہ کراچی

اہلکار ساتھیوں سے کہا کہ وہ اچھی طرح کمرے کا کونا کونا چھان ماریں ہوسکتا ہے یہاں پر کوئی تہہ خانہ ہو، یہ خیال اچانک ہی سے میرے ذہن میں آیا تھا کیونکہ دروازہ ایک بار پھر اندر سے مقفل دیکھ کے مجھ پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے تھے کہ قاتل کہاں سے فرار ہوا؟ کمرے میں تہہ خانے کا نام ونشان نہیں تھا نہ ہی کمرے کی دیواروں کے پیچھے کوئی اور کمرہ تھا۔ میں نے دور سے ہی ایک نظر ڈالی کر مردہ لڑکی کے چہرے کی جانب دیکھا بیس سال سے زیادہ کی نہ تھی اور جسم پر لباس نام کی کوئی چیز نہیں تھی میں نے نظریں چراتے ہوئے اس پر سفید چادر ڈالی کر اس کی وحشت سے کھلی آنکھیں بند کردیں جو یوں کھلی تھیں گویا مرنے سے پہلے اس نے بے حد خوف ناک چیز دیکھی ہو۔ میری ٹیم نے کمرے کا اچھی طرح سے معائنہ کیا لیکن اس بار بھی کوئی قابل بخش چیز ہمارے ہاتھ نہ لگ سکی۔

میرا ذہن ماؤف ہوگیا سمجھ نہیں آرہا تھا کہ یہ کیا اسرار ہے کیس مزید الجھتا جارہا تھا، بہت سے سوالات تھے جن کے جواب میں اب تک سوالیہ نشان لگا ہوا تھا، ہم سب کام ختم کرکے واپس پولیس اسٹیشن آ گئے کھانا کھانے کو بھی دل نہیں کرر ہا تھا بھوک گویا ختم ہوگئی تھی ٹام اور مریلن بھی میرے ساتھ موجود تھے اور ہمارا ذہن کیس کی ہی زد میں تھا۔

"ہوٹل والے تمام لوگ بے قصور ہیں ان کا لڑکیوں کے قتل سے کوئی لینا دینا نہیں...... میں نے نہایت باریک بینی سے ان کا پتہ لگایا ہے لیکن کچھ ہاتھ نہیں لگ رہا۔" مریلن نے گفتگو کا آغاز کیا۔

جواب میں، میں نے اور ٹام خاموش رہے۔ نجانے کیوں اس بار ہمارا دل ہمیں لڑکیوں کے قتل کا ذمہ دار ٹھہرا رہا تھا۔ شاید اس لئے کہ ہم ایک پولیس آفیسر ہوکر اب تک ان کے لئے کچھ کرنے سے قاصر تھے، اسی اثنا میں ایک اہلکار اندر آیا اور اس نے ہم تینوں کو سلوٹ کرکے پیغام دیا کہ۔ "آفیسر ڈونلڈ ہمیں اپنے آفس میں طلب کررہے ہیں۔"

ہم تینوں کی سانسیں جیسے خشک ہوگئیں بے شک وہ مجھے بیٹا سمجھتے تھے مگر ڈیوٹی کے وقت رشتے داری بھی نہیں چلتی اور پھر یہاں تو معاملہ چار لڑکیوں کے قتل کا تھا لہٰذا آفیسر ڈونلڈ سے رعایت کی کوئی امید نہیں تھی، ہم تینوں جانتے تھے کہ اب ہماری خوب کلاس لگنے والی ہے، ہم تینوں نے بیک وقت ایک دوسرے کو دیکھا اور اپنی اپنی جگہ خود کو آفیسر ڈونلڈ کی ڈانٹ ڈپٹ سننے کے لئے تیار کرنے لگے۔ ہم تینوں نے ان کے آفس پہنچ کر ان سے اندر آنے کی اجازت طلب کی اور انہیں سلوٹ کرکے ان کے سامنے شانے چوڑے کرکے کھڑے ہوگئے...... اس وقت وہ لوسی کی پوسٹ مارٹم رپورٹ کی ورق گردانی کررہے تھے جس پر لکھا تھا۔ "لڑکی کی موت خون کی کمی ہونے کی وجہ سے واقع ہوئی ہے۔"

آفیسر ڈونلڈ نے پوسٹ مارٹم رپورٹ ایک طرف رکھ کر ہم تینوں کو گہری نگاہوں سے دیکھا اور اپنی کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

"یہ کیا ہورہا ہے تقریباً ڈیڑھ ماہ میں یہ چوتھا قتل ہے اور قاتل اب تک ہماری پہنچ سے دور ہے تم لوگ اپنی ڈیوٹی ٹھیک سے انجام کیوں نہیں دے رہے۔" آفیسر ڈونلڈ نے نرم مگر اونچے لہجے میں کہا۔

"سر میں نے شہر کے تمام ہوٹلوں کے باہر بغیر وردی کے پولیس کا بڑا سخت پہرہ لگایا تھا مگر اس کے باوجود، قاتل نجانے اندر کیسے آیا......؟ اس بار بھی دروازہ اندر سے مقفل تھا اور ہوٹل والوں کا کہنا ہے کہ لڑکی یہاں اکیلی ہی موجود تھی اسے کسی کے ساتھ نہیں دیکھا تھا۔" میں نے تفصیلاً بتادیا۔

"سر ہمیں ہوٹل والوں پر شک ہوا...... میں نے سب کے بارے میں باریک بینی سے چھان بین کی مگر کچھ خاص نہیں ملا وہ سب بے قصور ہیں ان میں سے کوئی بھی وہ قاتل نہیں نہ ہی ان میں سے کسی کا بھی قاتل سے کوئی تعلق نظر آتا ہے۔" اس بار مریلن نے حوصلہ دکھایا۔

"سر ہم اپنی پوری کوشش کررہے ہیں، چھان

بین ہنوز جاری ہے۔" ٹام بولا۔

آفیسر ڈونلڈ کو ہماری باتوں کا یقین تھا انہوں نے کہا۔ "میں سب جانتا ہوں مجھے تم تینوں پر اندھا اعتماد ہے لیکن لوگ نہیں سمجھ رہے وہ سمجھ رہے ہیں کہ ہم پولیس والے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں۔"

"سر آپ فکر نہ کریں ہم جلد ہی یہ کیس حل کرلیں گے۔" میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔

"رات ہوچکی تھی ڈیوٹی آف ہوجانے کے بعد ہم تینوں ابھی پولیس اسٹیشن سے نکلے ہی تھے کہ میڈیا والوں نے ہمیں گھیر لیا۔

"سر ڈیڑھ ماہ میں چوتھی لڑکی کو مار دیا گیا ہے اس بارے میں پولیس کچھ کر کیوں نہیں رہی؟" ایک صحافی نے سوال کیا۔

"دیکھئے ہم اپنی پوری کوشش کررہے ہیں قاتل جلد ہی سلاخوں کے پیچھے ہوگا۔" میں نے لاپرواہی سے جواب دیا میں میڈیا والوں سے جان چھڑانا چاہتا تھا ان لوگوں کو کیا معلوم تھا کہ اس کیس کو حل کرنے کے لئے پولیس کے نوجوان کس طرح اپنا خون پسینہ ایک کررہے ہیں انہیں تو اپنا چینل چلانے کے لئے بے تکی خبر چاہئے ہوتی ہے۔

میڈیا والوں سے بہ مشکل جان چھڑا کر ہم تینوں اپنی اپنی گاڑیوں تک آئے اور گھر آ گئے۔

میں نے بیڈ پر لیٹ کر سکون کی سانس لی میری عادت تھی کہ میں باہر کا کام باہر ہی چھوڑ کر آتا تھا گھر پر اس بارے میں بالکل نہیں سوچتا تھا لیکن یہ کیس ہی کچھ ایسا تھا جس نے میری زندگی اجیرن کرکے رکھ دی تھی ایک پل مجھے چین نہیں آتا تھا ہر وقت کیس کے متعلق سوچتا رہتا تھا اس وقت بھی میرا ذہن کیس کے متعلق سوچ ہی رہا تھا، میں چاہ کر بھی اس کا خیال اپنے ذہن سے نکال نہیں پارہا تھا، آخر کون سی لاپرواہی ہوگئی مجھ سے جو ایک معصوم لڑکی کی جان چلی گئی اگر آج کوئی لاپرواہی نہ ہوتی تو یقیناً لڑکی کی جان بچ سکتی تھی اور قاتل بھی ہماری حراست میں ہوتا یہی سب سوچتے

خوشخبری

طلسماتی انگوٹھی ایک عظیم تحفہ ہے۔ ہم نے سورۂ یاسین کے نقش پر فیروزہ، یمنی، عمیق، پکھراج، لاجورد، نیلم، زمرد، یاقوت پتھروں سے تیار کی ہے۔ انشاء اللہ جو بھی یہ طلسماتی انگوٹھی پہنے گا اس کے تمام بگڑے کام بن جائیں گے۔ مالی حالات خوب سے خوب تر اور قرضے سے نجات مل جائے گی۔ پسندیدہ رشتے میں کامیابی، میاں بیوی میں محبت، ہر قسم کی بندش ختم، رات کو تکیے کے نیچے رکھنے سے لاٹری کا نمبر، جادو کس نے کیا، کاروبار میں فائدہ ہوگا یا نقصان معلوم ہوجائے گا۔ آفیسر اپنی طرف مائل، نافرمان اولاد، نیک، میاں کی عدم توجہ، جج یا حاکم کے غلط فیصلے سے بچاؤ، مکان، فلیٹ یا دکان کسی قابض سے چھڑانا، معدے میں زخم، دل کے امراض، شوگر، یرقان، جسم میں مرد و عورت کی اندرونی بیماری، مردانہ کمزوری، ناراض کو راضی کرنے یہ سب کچھ اس انگوٹھی کی بدولت ہوگا۔ یاد رکھو سورۂ یاسین قرآن پاک کا دل ہے۔

رابطہ: صوفی علی مراد

0333-3092826-0333-2327650

M-20A الرحمان ٹریڈ سینٹر

بالمقابل سندھ مدرسہ کراچی

...اور مجھے ہر طرح کی پریشانی سے نجات مل گئی۔

اگلا دن معمول کے مطابق گزرا ہم تینوں مل کر ڈیوٹی نبھا رہے تھے ہماری پوری کوشش تھی کہ اس بار کوئی غلطی نہ ہو اور قاتل پکڑا جائے ہم دن رات کمر توڑ محنت کر رہے تھے مگر کچھ ہاتھ نہیں لگ رہا تھا۔

لوسی کے والدین کو الوداع کر دیا گیا تھا جوان بیٹی کی موت پر وہ بے تحاشہ رونے لگے ہم بس انہیں تسلیاں دیتے رہے۔

پورا ایک مہینہ ہمیں ادھر ادھر چھان بین کرتے ہوئے گزر گیا مگر ہم تمام کوششوں کے باوجود ناکام تھے میڈیا والوں نے ناک میں دم کر رکھا تھا۔ مقتول لڑکیوں کے والدین روز پولیس اسٹیشن آ کر جواب طلبی کرتے اور ہم ہر دفعہ انہیں ایک نئی امید دلا کر چلتا کر دیتے۔

ہاں اگر اس مہینے میں کوئی خاص بات ہوئی تو وہ یہ کہ کسی اور لڑکی کا قتل نہیں ہوا۔ شاید قاتل پہلے سے زیادہ ہوشیار ہو گیا تھا۔ یا پھر شہر چھوڑ کر کسی دوسرے شہر روپوش ہو گیا تھا کچھ پتہ نہیں تھا مگر کسی دوسرے شہر سے اب تک اس طرح کے قتل کی خبر نہیں آئی تھی جس کا مطلب تھا کہ قاتل اسی شہر میں کہیں موجود تھا اور صحیح موقعہ کی تلاش میں تھا۔ فی الحال مکمل خاموشی چھا چکی تھی۔

ایک اور خاص بات جو اس مہینے پیش آئی وہ یہ کہ آفیسر مریلن کافی دنوں سے سب سے کھنچی کھنچی سی تھی حتیٰ کہ مجھ سے بھی! ہر وقت ہنستی مسکراتی مریلن کا یوں اچانک سے چپ سادھ لینا سمجھ سے بالاتر تھا وہ صحیح طرح سے ڈیوٹی بھی انجام نہیں دے رہی تھی صحیح معنوں میں اس کا کام پر دل ہی نہیں لگ رہا تھا وہ اکثر خیالوں میں کھوئی کھوئی نظر آتی۔

میرے پوچھنے پر بھی اپنے اس رویہ کی وجہ نہ بتاتی بلکہ ہنس کر ٹال جاتی، مریلن کا یہ غیر معمولی رویہ میں سمجھ نہ سکا کہ وہ ایسی کیوں ہوتی جا رہی تھی ایک طرح سے تو میں خوش بھی تھا کہ مریلن سے میری جان تو چھوٹی کبھی کبھی تو مجھے یہ خیال بھی آتا کہ وہ ایسا جان بوجھ کر تو نہیں کر رہی تا کہ میں اس کے قریب آ جاؤں......؟ پھر خود ہی اپنی اس سوچ پر ہنس پڑتا اور اس خیال کو جھٹک دیتا۔

مریلن کے اس خشک رویے کو میرے علاوہ کسی اور نے نوٹ کیا تھا یا نہیں اس بارے میں مجھے کچھ معلوم نہیں تھا۔

آج صبح جب میں پولیس اسٹیشن آیا تو آفیسر مریلن موجود نہیں تھی پتہ کرنے پر پتہ چلا کہ آج وہ چھٹی پر ہے۔ ایسا پہلی بار ہوا تھا ورنہ آفیسر مریلن نے کبھی چھٹی نہیں کی تھی وہ میری طرح اپنے گھر پر اکیلی ہی رہتی تھی لہٰذا چھٹی کرنے کی وجہ سمجھ میں نہ آئی۔ میں نے اپنے فون سے مریلن کے نمبر پر کال کی مگر دوسری طرف سے آواز سنائی دی کہ موبائل بند ہے۔ میں نے کال بند کر کے فون جیب میں رکھ لیا اور آفیسر ٹام کے کیبن میں چلا آیا۔

''آؤ آؤ جوزف بیٹھو آج صبح صبح کیسے؟''

آفیسر ٹام نے خوش دلی سے پوچھا۔

میں کرسی کھینچ کر براجمان ہو گیا...... ٹام آج مریلن نہیں آئی خیریت تو ہے؟'' میں اصل موضوع پر آیا۔

''اس کی طبیعت ٹھیک نہیں...... میں پولیس اسٹیشن آنے سے پہلے اسی کے پاس سے چکر لگا کر آ رہا ہوں۔'' ٹام نے جواب دیا۔

مجھے تسلی ہو گئی۔ میں کچھ دیر ٹام کے آفس میں بیٹھا ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا پھر اپنے آفس میں آ کر براجمان ہو گیا میں نے سوچ لیا تھا کہ ڈیوٹی آف ہوتے ہی مریلن کا حال دریافت کرنے جاؤں گا اس کے بعد میں باقی کاموں میں مصروف ہو گیا ان سب میں کب رات ہو گئی پتہ نہیں چلا مجھے کھانے پینے کا بھی ہوش نہیں رہا تھا۔ ٹھیک ساڑھے دس بجے فون کی گھنٹی بجی میں نے فون کان سے لگا کر کہا۔ ''ہیلو آفیسر جوزف اسپیکنگ۔'' دوسری طرف کوئی لڑکا تھا جس نے ہمیں جلد پہنچنے کے لئے کہا تھا فون اسی ہوٹل سے تھا جدھر پہلے چار قاتل ہو چکے تھے میں نے فون رکھا

اور آفیسر ٹام اور اپنی ٹیم کے ہمراہ ہوٹل کی جانب پولیس موبائل دوڑائی۔

چند ہی لمحوں میں، میں اور ٹام استقبالیہ پر موجود تھے۔

''سر میں نے ہی آپ کو فون کیا تھا۔'' ہوٹل کے ریسپشنسٹ نے کہا۔

''ہاں بولو کیا بات ہے؟'' ٹام نے پوچھا۔

''سر روم نمبر 89 میں ایک لڑکی اکیلی موجود ہے کچھ دیر پہلے اس نے کچھ مشروبات آرڈر کئے تھے مگر اب وہ دروازہ نہیں کھول رہی۔'' لڑکے نے بتایا۔

''کیا اس نے آرڈر کئے ہوئے مشروبات لے لئے؟'' میں نے پوچھا

''جی نہیں۔'' لڑکے نے مختصر جواب دیا۔

ٹام اور میں نے بیک وقت ایک دوسرے کو دیکھا یقیناً اسے بھی وہی لگ رہا تھا جو مجھے لگ رہا تھا یہ معاملہ بھی لڑکیوں کے پراسرار قتل سے ملتا جلتا تھا، ہوٹل میں موجود تمام لوگ چپ سادھے بیٹھے تھے شاید ہماری طرح انہیں بھی یہی دھڑکا لگا ہوا تھا کہ کہیں یہ پانچواں قتل نہ ثابت ہو...... ہر کوئی اپنی اپنی جگہ خیریت کی دعائیں مانگ رہا تھا، میں اور ٹام دل میں کئی سوالات لئے کمرے کی جانب بھاگے ہماری توقع کے عین مطابق دروازہ اندر سے مقفل تھا، ہم دونوں نے مل کر دروازہ توڑ دیا اور سامنے کا منظر دیکھ کر میرے اور ٹام کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی، آنکھوں کے سامنے گویا اندھیرا چھا گیا، سانسیں حلق میں ہی اٹک گئیں۔

سامنے بیڈ پر بے لباس آفیسر مریلن بے سدھ پڑی تھی۔

ٹام نے جلدی سے آگے بڑھ کے بیڈ کی چادر مریلن کے مردہ جسم پر ڈال دی...... میرا دماغ سائیں سائیں کر رہا تھا کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہے اور کیسے ہوا۔؟

ہر آنکھ ایک قابل آفیسر کی موت پر اشک بار تھی ہر کوئی اپنی جگہ بے یقینی کی کیفیت میں مبتلا تھا۔ وہ قاتل واقعی ہم سے دو ہاتھ بلکہ چار ہاتھ آگے نکلا، اس بار ایک طویل خاموشی کے بعد اس کا شکار کوئی عام لڑکی نہیں بلکہ ایک تجربہ کار قابل آفیسر مریلن ہوئی تھی جو خود اس کیس پر کام کر رہی تھی تو پھر یہ سب کیسے ہوا؟

کہتے ہیں ایک پرسکون اور طویل خاموشی کسی بڑے طوفان کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے اسی طرح ایک طویل خاموشی کے بعد آفیسر مریلن کی موت ہمارے لئے گویا بم پھٹنے کے مترادف تھی۔

کچھ کچھ اب میری سمجھ میں آنے لگا تھا کہ مریلن یوں عجیب برتاؤ کیوں کرنے لگی تھی شاید وہ انجانے میں اس قاتل سے دل لگا بیٹھی تھی جس نے اس کی جان لے لی۔ مریلن کی موت نے سب کچھ تو نہیں مگر پھر بھی کافی کچھ واضح کر دیا تھا...... وہ قاتل لڑکیوں کو پہلے اپنی محبت کے جال میں ہی پھانستا ہے جس میں لڑکیاں جلد پھنس جاتی ہیں حتیٰ کہ قابل آفیسر مریلن تھی...... اور پھر وہ انہیں یہاں لا کر ان کا سارا خون نکال لیتا ہے لیکن وہ خون نکال کر اس کا کرتا کیا ہے؟ سمجھ سے باہر تھا۔

پوسٹ مارٹم رپورٹ نے مریلن کے بارے میں بھی وہی کچھ بتایا جو اس سے پہلے چار لڑکیوں کے بارے میں بتا چکا تھا۔ خون کی کمی...... مریلن کو بھی ہوس کا نشانہ نہیں بنایا گیا تو پھر وہ بے لباس کیوں؟ اس بار بھی کمرے سے کچھ حاصل نہ ہو سکا۔ میں ہوٹل کے باہر ہی ایک بینچ پر اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گیا دل میں بے پناہ ٹیسیں اٹھ رہی تھیں مجھے بہت دکھ ہو رہا تھا مریلن کے یوں چلے جانے سے اگر مجھے معلوم ہوتا کہ اس کی زندگی کا یوں اختتام ہو گا تو میں اس سے اپنی بے رخی کی معافی ہی مانگ لیتا یا پھر اس سے کبھی بے رخی برتتا ہی نہیں یقیناً اسے میرے اس رویہ سے کافی تکلیف ہوتی ہو گی بہت شرمندگی ہو رہی تھی خود پر ایک عجیب بوجھ پڑ گیا تھا دل پر...... آخر تک اس نے کوشش کی کہ میں اس کے پیار کو قبول کر لوں مگر میں نے کیا کیا اس سے پیار سے بات کرنا بھی گوارہ نہیں کیا گو کہ اس کا پیار یکطرفہ تھا لیکن میرے پیار سے سمجھانے پر شاید وہ ساری زندگی میری

وجہ نہ ہوتی۔ اس نے اس سے محبت کا ڈھونگ رچا کر اسے موت کے گھاٹ اتار دیا، کاش میں اپنی لاپرواہی کو ایک طرف رکھ کر اس سے کسی طرح پوچھ ہی لیتا کہ وہ عجیب برتاؤ کیوں کرنے لگی ہے کیا پتہ میں اسے بچانے میں کامیاب ہو جاتا مگر اب یہ سب سوچنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا، مرلین ہم سب کو چھوڑ کے ہمیشہ کے لئے اپنے آخری سفر پر گامزن ہو چکی تھی، میں اپنے دونوں ہاتھوں میں اپنا چہرہ چھپائے بلک بلک کر رونے لگا۔ اسی اثناء میں ٹام میرے برابر براجمان ہو گیا اور میرا شانہ تھپتھپا کر بولا۔

''میں جانتا ہوں دوست تم اس وقت کیا سوچ رہے ہو اور کیسا محسوس کر رہے ہو؟..... کسی کا دل دکھا کر جس قدر تکلیف انسان کو ہو سکتی ہے اس وقت وہ تمہیں ہو رہی ہے لیکن اس کی موت میں تمہارا کوئی قصور نہیں لہٰذا خود کو اس کی موت کا ذمہ دار مت ٹھہراؤ، اب وہ بہت دور چلی گئی ہے، آہستہ آہستہ بھول جاؤ گے اسے۔''

ہم سب پولیس والے ہی اس کی موت کے ذمہ دار ہیں کیونکہ قاتل اب تک ہماری پہنچ سے دور آزاد گھوم رہا ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ وہ سچ میں تمہیں چاہتی تھی لیکن تمہاری بے رخی اسے تکلیف دیتی تھی، خیر کوئی بات نہیں کیونکہ میں بھی کسی کو چاہتا تھا مگر اس کی بے رخی مجھے تکلیف دیتی تھی لہٰذا خود کو قصوروار مت ٹھہراؤ۔

مرلین کا پیار یکطرفہ تھا بالکل اسی طرح جس طرح میرا اس انسان کے لئے پیار یکطرفہ تھا۔ میں نے کئی بار مرلین سے پوچھنے کی کوشش کی کہ وہ بدل گئی ہے ایسا کیوں کر ہے؟ مگر وہ ہمیشہ کچھ نہ کچھ کہہ کر ٹال دیتی..... تم کیا سمجھتے تھے کہ اس کا بدلاؤ صرف تم نے نوٹ کیا ہے؟

نہیں دوست تقریباً پورے اسٹاف نے ایسا محسوس کیا تھا مگر اس وقت ہم سب اس منحوس کیس کو لے کر اس قدر مصروف تھے کہ ہمیں خود کا بھی ہوش نہیں تھا تو پھر مرلین پر دھیان کیسے دے پاتے۔''

''شاید تمہارے بعد وہ اس قاتل سے محبت

اعتراف کرتا ہوگا..... میں جانتا ہوں کہ ایسا کچھ ضرور ہے مگر میں یہ نہیں جانتا تھا کہ جس سے وہ پیار کرنے لگی ہے وہی قاتل ہے جس کی ہمیں تلاش ہے، آخری بار جب میں امی سے ملا تو اس نے سیدھے منہ بات نہ کی بس اتنا کہا کہ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں اس لئے وہ آج پولیس اسٹیشن نہیں آ رہی، قاتل بہت ہی شاطر ہے، اس نے مرلین کو خوب اچھے طریقے سے اپنے شکنجے میں پھنسا لیا تھا تب ہی تو وہ اپنا منہ نہیں کھولتی تھی۔''

''نجانے خود مرلین کو اپنی موت کا دکھ ہوگا بھی یا نہیں کیونکہ کچھ کہتے ہیں کہ محبوب اپنے ہاتھوں سے جان لے تو تکلیف نہیں ہوتی کیونکہ محبوب کی بانہوں میں مرنا قسمت والوں کو نصیب ہوتا ہے۔ تو کچھ اسے دھوکہ کہتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔'' ٹام نے گہری سانس لے کر بات ختم کر دی۔

''لیکن وہ اتنی بے وقوف کیسے ہو سکتی ہے کہ اس آدمی کے ساتھ اسی ہوٹل کے کمرے میں چلی گئی؟'' میں نے بھیگی پلکوں کے ساتھ کہا۔

''عشق اندھا ہوتا ہے دوست جب ہو جاتا ہے تو کچھ نظر نہیں آتا اور پھر مرلین کون سا جانتی تھی کہ اس کا محبوب ہی وہ قاتل ہے، سب سے بڑھ کر یہ مت بھولو کہ مرلین آفیسر بعد میں، پہلے ایک لڑکی تھی..... ہر لڑکی کی طرح اسے بھی ایک سچے پیار کرنے والے کی خواہش تھی لہٰذا اگر وہ اس کی جھوٹی محبت میں بے وقوف بن گئی تو اس میں اتنا حیران ہونے والی بات نہیں زیادہ تر لڑکیاں اس معاملے میں بے وقوف ہی ہوتی ہیں اور رہی بات ہوٹل اور اس کمرے کی تو اس بارے میں مرلین نے زیادہ غور نہیں کیا ہوگا کیونکہ اس کا محبوب اس کے ساتھ تھا، وہ اس پر دھیان دیتی نا کہ ہوٹل اور کمرے پر۔'' ٹام نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''ٹام تم نے کہا ابھی کہ تمہیں کسی کی بے رخی تکلیف دیتی تھی تمہارا پیار اس کے لئے یکطرفہ تھا تو کیا میں پوچھ سکتا ہوں وہ کون ہے جس سے تم پیار کرتے ہو،

نے کبھی بتایا بھی نہیں۔'' میں نے آنکھوں سے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔

''بتا کر کیا کرتا۔ جب وہی مجھ میں دلچسپی نہیں رکھتی تھی..... اور پیار کرتا نہیں کرتا تھا۔'' ٹام اتنا کہہ کر اٹھ گیا۔ ''مرلین سے۔'' ٹام نے کہا اور چلا گیا جبکہ میں اسے دم بخود جاتا دیکھتا رہ گیا۔

☆.....☆.....☆

ساری رات کروٹیں بدلتے ہوئے گزر گئی ایک پل کے لئے بھی سکون کی نیند نہ آ سکی مرلین کا چہرہ بار بار آنکھوں میں رقص کرتا رہا اس کے ساتھ گزارے ہوئے پل ایک ایک کر کے ذہن کی اسکرین پر چلتے رہے۔

اگلی صبح مرلین کی تدفین میں آفیسرڈ ونلڈ کے علاوہ اور بھی سینئر آفیسرز موجود تھے، ہر آنکھ ایک قابل آفیسر کی موت پر اشک بار تھی، خود میری اور ٹام کی حالت بھی غیر تھی۔ مرلین کی تدفین کے بعد میں نے جیب سے فون نکال کر آئس کو فون کیا رابطہ ہوتے ہی میں نے اس سے کہا۔ ''اگر میری کسی بھی بات سے تمہیں کبھی تکلیف پہنچی ہو تو پلیز مجھے معاف کر دینا لیکن میں اور تم ایک نہیں ہو سکتے۔'' میری بات پر آئرس بہت حیران ہوئی تھی اس کی حیرت میں ڈوبی ہوئی آواز نکلی۔ ''جوزف یہ تم ہو؟''

''ہاں اپنا خیال رکھنا او کے گڈ بائے۔'' میں نے یہ کہہ کر فون بند کر دیا، اسے کچھ کہنے کا موقع بھی نہیں دیا نجانے وہ کیا سوچ رہی ہوگی مگر مجھے اس بات کی قطعی کوئی پرواہ نہیں تھی میرے دل پر بوجھ تھا وہ میں نے اسے کہہ کر ہلکا کر لیا تھا اب آگے اس کی مرضی۔

میں اپنے آفس میں بیٹھا ایک فائل کی ورق گردانی کر رہا تھا جب فون کی گھنٹی بجی، میں نے چونک کر ٹیلی فون کی طرف دیکھا اور فون اٹھا کر کان سے لگایا۔ ''ہیلو آفیسر جوزف اسپیکنگ۔''

دوسری جانب سے بہت ہی خوبصورت نسوانی آواز ابھری۔ ''سر جوزف میرے پاس لڑکیوں کے پراسرار قتل کیس کے سلسلے میں کچھ معلومات ہیں جو میں آپ کو دینا چاہتی ہوں کہ ان پانچ لڑکیوں کا قتل کس نے اور کیسے کیا ہے؟''

لڑکی نے گویا بم پھاڑا مجھے اپنی سماعت پر یقین نہ آیا، فون میرے ہاتھ سے چھوٹتے چھوٹتے بچا..... اندھیرے میں روشنی کی کرن نمودار ہوئی تھی میں نے جلدی سے کہا۔ ''ہاں ہاں بتاؤ تفصیل سے میں سن رہا ہوں۔'' میں نے ہاتھ میں کاپی پنسل سنبھال لی۔

''نہیں سر میں آپ کو فون پر یہ سب نہیں بتا سکتی۔'' جواب میں لڑکی نے کہا۔

''کیوں.....؟'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔

''یہ سب جاننے کے لئے آپ کو کیفے میں آنا ہوگا میں آپ کا وہاں انتظار کر رہی ہوں وہیں پر ہم اس بارے میں آرام سے تفصیلی گفتگو کریں گے۔'' لڑکی نے کیفے کا نام اور اپنا حلیہ بتا کر رابطہ منقطع کر دیا۔

غصہ تو مجھے بہت آیا مگر ضبط کر گیا کیونکہ قاتل تک پہنچنے کا یہی ایک ذریعہ تھی اگر اس لڑکی سے کچھ پتہ چلتا ہے تو یہ ہمارے پولیس ڈپارٹمنٹ کے لئے بہت اچھا ہوگا۔ کیس ایک نئے موڑ پر جاتا دکھائی دے رہا تھا میں نے سر پر کیپ لی اور پولیس اسٹیشن سے پیدل ہی چل پڑا کیونکہ جس کیفے میں وہ تھی وہ نزدیک ہی تھا چند لمحوں بعد میں کیفے کے اندر ایستادہ تھا میں نے کیفے کے صدر دروازے پر کھڑے ہو کر پورے کیفے میں ایک بھرپور نگاہ دوڑائی کہ معاً ایک میز پر نوعمر حسین و جمیل لڑکی اکیلی ہی بیٹھی دکھائی دی اس کا حلیہ ہو بہو ویسا ہی تھا جیسا فون پر لڑکی نے بتایا تھا وہ گلابی شرٹ کے ساتھ نیلی جینز پہنے ہوئے تھی شولڈر کٹ گولڈن بال، سفید رنگت پر نیلی آنکھیں اور چہرے پر بلا کی معصومیت ایسی خوبصورتی میں نے پہلی بار دیکھی تھی۔

میرا دل خوشی سے اچھلنے لگا جب اس لڑکی نے اپنے خوب صورت چہرے پر دل نشین مسکراہٹ سجا کر مجھے ہاتھ کے اشارے سے ہیلو کہا غالباً فون کرنے والی لڑکی وہی تھی اور وہ مجھے پہچانتی تھی میں ذرا مردانگی سے چلتا ہوا اس کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا اور نرمی سے

"آپ ہی نے مجھے کال کرکے یہاں آنے کے لئے کہا تھا؟"

"جی بالکل..... بیٹھیے۔" وہ مسکرا کر بولی۔

میں کرسی کھینچ کر اس کے سامنے براجمان ہوگیا۔ اپنی اس کیفیت کو میں لفظوں میں کیسے بیان کروں اس کا حسین چہرہ اس قدر نزدیک سے دیکھنے پر میں ناچاہتے ہوئے بھی اس کے سحر میں گرفتار ہوتا جارہا تھا۔ میری یہ کیفیت زندگی میں پہلی بار ہوئی تھی اور اپنی اس بدلتی کیفیت پر میں خود حیران تھا خوب صورت چہرے تو میں نے بہت دیکھے تھے مگر اس چہرے میں کوئی اور ہی بات تھی، میں نے خود کو بہ مشکل سنبھال لیا کیونکہ میں ڈیوٹی پر تھا۔

"جی آپ کا نام؟" میں نے پوچھا۔

"سلینا۔" اس نے میری آنکھوں میں دیکھ کر کہا اور پھر دور کھڑے ویٹر کو پاس بلا کر دو کپ کافی کا آرڈر دیا۔ تھوڑی ہی دیر میں ویٹر کافی کے دو پیالے رکھ کر چلا گیا تو میں نے گفتگو کا آغاز کردیا۔

"آپ نے قاتل کو کہاں دیکھا ہے؟ آپ اس کے بارے میں کیسے جانتی ہیں؟ کیا آپ اس کے ساتھ کسی قسم کے تعلق میں رہ چکی ہیں؟ وہ دکھتا کیسا ہے اور رہتا کہاں ہے؟ مجھے سب تفصیل سے بتائیں۔"

پہلی بار کسی نے قاتل کے بارے میں معلومات دینے کی کوشش کی تھی جس وجہ سے مجھے بہت تجسس ہورہا تھا اور میں نے سارے سوال ایک ہی سانس میں کر ڈالے تھے۔

سلینا الجھن آمیز ہنسی ہنسی کہ یہ اچانک سے مجھے کیا ہوگیا۔ سلینا نے کافی کا کپ اپنے ہونٹوں سے الگ کرکے ایک طرف رکھا اور میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر مسکراتے ہوئے بولی۔

"اتنی بھی جلدی کیا ہے۔"

میں حیرت سے اسے دیکھتا رہ گیا۔

☆.....☆.....☆

میرا ڈیوٹی پر اب دل نہیں لگتا تھا میرا زیادہ وقت اب سلینا کے ساتھ ہی گزرتا تھا ڈیوٹی کے اوقات میں بھی ہم فون پر رابطہ رکھتے فرصت میں تو ویسے ہی وہ میرے ہمراہ ہوتی۔ ہم دونوں اکٹھے ڈنر کرتے اور ادھر ادھر گھومتے پھرتے تھے۔ میں سلینا کے عشق میں بری طرح گرفتار ہوچکا تھا وہ بھی مجھ سے بہت پیار کرتی تھی میں اس کی قربت پاکر بہت خوش تھا میری زندگی سلینا کے آجانے سے مکمل اور خوبصورت ہوگئی تھی۔ میں خود کو دنیا کا خوش نصیب مرد سمجھتا تھا کیونکہ جو ایک نظر میں میرے دل میں آبسی وہ مجھے بنا چاہے بنا مانگے یونہی مل گئی تھی میری نظر میں سلینا سے بڑھ کر کوئی لڑکی خوب صورت نہیں تھی وہ جتنی خوب صورت تھی اتنی ہی دل کی اچھی تھی شاید ہم دونوں بنے ہی ایک دوسرے کے لئے تھے تب ہی تو سلینا سے پہلے میں عشق لفظ سے ہی کوسوں دور تھا مگر سلینا کے آجانے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ پیار کیا ہے..... سلینا کا اس دنیا میں میرے علاوہ کوئی نہیں تھا ایک بھائی تھا جو چند سال پہلے مرگیا اس لئے اس کی تمام محبت صرف میرے لئے تھی اور میری اس کے لئے کیونکہ میں بھی اس کی طرح تن تنہا تھا۔ کیفے کی ملاقات کے بعد میں نے سلینا سے دوبارہ کبھی قاتل کے بارے میں نہیں پوچھا تھا، نہ اس نے مجھے دوبارہ قاتل کے بارے میں بتانے کی کوئی کوشش کی۔

ہم جب بھی ملتے تھے ہمارے بیچ صرف پیار و محبت کی باتیں ہوتیں اور اتنے پیارے لمحوں کے بیچ کوئی بے وقوف ہی ہوگا جو ڈیوٹی نبھائے گا..... میں تو جیسے بھول ہی گیا تھا کہ میں ایک پولیس آفیسر ہوں اور مجھے پانچ لڑکیوں کو انصاف دلوانا ہے۔ میں تو یہ تک بھول گیا تھا کہ میڈیا والے لڑکیوں کے والدین، لوگ اور آفیسر ڈونلڈ نے مجھ سے امیدیں لگا رکھی ہیں اور مجھے خاص طور پر آفیسر مرلین کی موت کا بدلا لینا ہے مجھے کچھ یاد نہیں رہا تھا۔

سلینا جب بھی میرے سامنے آتی اس کا خوب صورت ہنستا مسکراتا چہرہ دیکھ کر میں سب بھول جاتا

ساری تھکن پریشانی لمحوں میں دور ہوجاتی میں دنیا و مافیا سے بے خبر اپنی ہی دنیا میں مست ہوجاتا۔

آج سلینا کی سالگرہ تھی میں نے اسے سرپرائز دینے کا فیصلہ کیا میں نے ایک عالی شان ہوٹل میں خوب صورت کمرہ بک کروایا، بے شک میری تنخواہ زیادہ نہیں تھی مگر پھر بھی میں نے سلینا کے لئے مہنگے ہوٹل کا کمرہ صرف ایک رات کے لئے بک کرایا، میں جانتا تھا کہ وہ یہ سرپرائز دیکھ کر بہت خوش ہوگی کیونکہ وہ اکثر مجھ سے ایسی ہی کسی ملاقات کے بارے میں کہتی رہتی تھی جن کا مطلب تھا دنیا والوں کی نظروں سے اوجھل کہیں دور اکیلے صرف وہ اور میں، مجھے اس کا ایسا کہنا بہت ہی اچھا لگتا تھا لیکن یہ سرپرائز میں اسے اچانک اور خاص دن دینا چاہتا تھا اور آج یہ سرپرائز دینے کا وقت آگیا تھا۔

سلینا کی برتھ ڈے پر ایسا گفٹ دینا مجھے بہت بہتر لگا تھا چنانچہ میں نے تمام تیاریاں مکمل کرلیں۔ یہ دن میرے اور سلینا کے لئے بہت خاص ثابت ہونے والا تھا جس کی یادیں ہم برسوں نہیں بھلا پائیں گے ہم دونوں نے مل کر مستقبل کی بھی پلاننگ کرلی تھی، ہم دونوں ایک دوسرے سے شادی کے خواہش مند تھے میری نظر میں سلینا سے بہتر اور کوئی شریک سفر نہیں تھی۔

میں اس وقت ہوٹل کے کمرے میں ایستادہ تھا کمرہ بہت بڑا عالی شان تھا جس میں نیلا قالین بچھا ہوا تھا شیشے کی دیوار بائیں طرف تھی جہاں سے اسفل نادر کا خوب صورت نظارہ نظر آتا تھا کمرے کے وسط میں خوب صورت طرز کا گول بیڈ موجود تھا جس کے دونوں طرف سائیڈ ٹیبلز پڑے تھے اس کے علاوہ جدید قسم کا ہر فرنیچر بھی آراستہ تھا جس کی ضرورت پڑسکتی تھی، میں نے ملائم بستر کو گھورتے ہوئے نجانے کتنے خوب صورت سپنے اپنی جاگتی آنکھوں سے ہی دیکھ لئے اور پھر جیب سے فون نکال کر سلینا کا نمبر ملایا رابطہ ہوتے ہی اس کی خوبصورت مترنم آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

"جوزف ڈارلنگ کہاں ہو تم کب سے تمہارا انتظار کررہی ہوں۔" میں نے مسکراتے ہوئے سلینا کو ہوٹل کا نام اور پتہ بتا کر اسے سیدھا یہاں آنے کے لئے کہا سلینا کی آواز میں حیرت بھری خوشی تھی اس نے اوکے کہہ کر فون بند کردیا، میں نے اپنا فون ایک طرف صوفے پر پھینک دیا اور ایک بار پھر سلینا کے ان خیالوں میں کھو گیا جو ابھی سے ٹھیک چند لمحوں بعد پیش آنے والے تھے۔ میں اپنی خوشی کو کن لفظوں میں بیان کروں، خوشی کے مارے میں تو جیسے پاگل ہورہا تھا کیونکہ سلینا میری ملکیت ہونے جارہی تھی، یہ سوچ سوچ کر میرا دل خوشی سے پھولے نہیں سمارہا تھا۔

میں نے بہ مشکل دس منٹ ہی انتظار کیا ہوگا کہ سلینا سرخ لباس میں چلتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ میں شیشے کی دیوار سے باہر کی دنیا دیکھنے میں مصروف تھا مجھے اس کی آمد کی خبر اس کے پسندیدہ پرفیوم چلیسمین نے دی جو وہ اکثر لگاتی تھی میں نے پلٹ کر اسے دیکھا تو وہ ہمیشہ کی طرح اپنے چہرے پر خوب صورت مسکراہٹ سجائے کھڑی تھی آج بھی اس کا حسن پہلے دن کی طرح مجھ پر بجلیاں گرا رہا تھا۔ اس کے بدن سے اٹھتی ہوئی مسحور کن خوشبو مجھے مدہوش کررہی تھی۔ شاید سلینا ہوٹل کے کہیں آس پاس ہی تھی جب ہی تو وہ اتنے کم وقت میں میرے سامنے تھی۔ میں چلتا ہوا سلینا کے پاس آیا اور اس کے نرم و نازک ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں لے کر بولا۔ "سالگرہ بہت بہت مبارک ہو۔" میں نے محبت بھرے لہجے میں کہا تو اس کی آنکھوں میں خوشی کی نمی اتر آئی۔

"جوزف تم نے اتنا کچھ میرے لئے کیا۔" سلینا کے آخری الفاظ اس کے گلے میں ہی رہ گئے۔

"آج کی رات رونا ٹھیک نہیں، پلیز آج کی رات رونے کے لئے نہیں ہے۔" میں نے سلینا کی خوب صورت آنکھوں سے موتیوں جیسے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا اور پھر اس کے گلابی لبوں سے تھوڑا سا امرت چرا لیا۔ سلینا کے رخساروں پر حیا کی سرخی دوڑ گئی اور وہ اپنی گھنیری پلکیں جھکا گئی، میں بے اختیار

مسکرا اٹھا۔

گھڑی رات کے نو بجا رہی تھی۔ باہر رات گہری ہوتی جا رہی تھی اور یہاں میرے اندر جذبات کا سمندر ٹھاٹھے مار رہا تھا میں نے ایک بار پھر سلینا کے سرخ لبوں پر اپنا دباؤ ڈال دیا سرور و مستی اور لطف ولذت کے سحر کن دور کا آغاز ہوا، ہم مدہوش ہو کر نجانے کب تک جذبات کے طوفانی تھپیڑوں میں ڈبکیاں لگاتے رہے۔

طوفان گزر جانے کے بعد سلینا نڈھال سی ہو گئی اور میں بھی بے دم ہو گیا ہم دونوں ہی ایک دوسرے کے قریب خاموش لیٹے رہے پھر سلینا بیڈ سے اٹھی اور چلتی ہوئی ٹیپ کے پاس آئی جس پر اس نے مسحور کر دینے والا رومانوی گانا لگایا ہے، وہ مجھے دیکھ کر ادائے قاتل سے مسکرا رہی تھی، وہ چلتی ہوئی میرے قریب آ کر بیٹھ گئی اس کی قربت اور بدن کے ابھرے ہوئے خدوخال مجھے ایک بار پھر ہوش وحواس کی دنیا سے بیگانہ کرنے پر تلے ہوئے تھے، میں اسے اپنی بانہوں میں بھر کے ایک بار پھر پیار کرنا چاہتا ہی تھا کہ اس نے مجھے مسکراتے ہوئے اپنے ہاتھ سے پرے دھکیل دیا اور خود مشروب سے دو گلاس بھرنے لگی۔

سلینا نے مشروب سے بھرا گلاس میری جانب بڑھایا جسے میں نے لے کر اپنے ہونٹوں سے لگا لیا جلد ہی نشے کے باعث میری آنکھیں دھندلی ہونے لگیں ٹیپ پر چلتا ہوا گانا جیسے کہیں دور سے آ کر میری سماعت سے ٹکرا رہا تھا۔ ''ڈو یو لوی می ٹو۔'' میں نے بہ مشکل اپنی بند ہوتی ہوئی آنکھوں کو کھول کر سلینا کو دیکھا جو مجھے مسکراتے ہوئے عجیب نظروں سے گھور رہی تھی۔

''ڈو یو لوی می ٹو'' موسیقی کی آواز ایک بار پھر میری سماعت سے ٹکرائی میرے اعصاب شل ہوتے جا رہے تھے اور اگلے ہی لمحے میں دنیا و مافیا سے بیگانہ ہوتا چلا گیا۔

ہوش جب آیا تو کیا دیکھا کہ سلینا میری کلائی سے اپنا منہ لگائے نجانے کیا کر رہی تھی اور جب مجھ پر حقیقت آشکار ہوئی تو گویا مجھ پر آسمان گر گیا۔

سلینا میرا خون چوس رہی تھی۔

مجھے مکمل طور پر ہوش آ چکا تھا، میں جھٹ سے اٹھا اور بے اختیار سلینا کو ایک طرف دھکا دے دیا، وہ بیڈ سے نیچے جا گری جبکہ میں بیڈ پر ہی بیٹھا تھا۔

سلینا جب کھڑی ہوئی تو اس کی شکل دیکھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے زمین و آسمان گھومتے محسوس ہونے لگے وہ کوئی بپھری ہوئی شیرنی معلوم ہو رہی تھی اس کے آگے کے دو دانت کسی ویمپائر کی طرح بڑے اور نوکیلے تھے جبکہ آنکھیں خدا کی پناہ کتنی دہشت ناک تھیں۔ میری آنکھیں دہشت سے پھٹی ہوئی تھیں اور دل بری طرح سینے میں پھڑ پھڑا رہا تھا، اسی لمحے مجھے اپنی کلائی میں جلن کا شدید احساس ہوا، دیکھا تو وہاں پر دو سوراخ موجود تھے جو سلینا نے اپنے نوکیلے دانتوں سے کئے تھے۔

مجھ پر ایک اور بم پھٹا یہ جان کر کہ سلینا ہی وہ قاتل ہے جس کی ہم سب کو تلاش تھی۔

اسی اثناء میں سلینا مجھ پر حملہ آور ہونے والی تھی کہ میں نے اسے ایک بار پھر اپنی پوری قوت سے دھکا دے دیا اور وہ دوبارہ دوسری طرف جا گری، میں بھی بیڈ سے اتر گیا اگر عین وقت پر میری آنکھ نہ کھلتی تو میرا حال بھی وہی ہوتا جو مجھ سے پہلے لڑکیوں کا ہوا تھا اور ان کی طرح میری موت بھی پراسرار ہوتی۔

سلینا ایک بار پھر اٹھ کر کھڑی ہو گئی وہ ہانپ رہی تھی۔

''سلینا تم یہ سب کیوں کر رہی ہو، تم مجھ سے پیار کرتی ہو نا۔'' میں نے سلینا کو پرسکون کرنے کے لئے ایسا کہا۔

''نہیں، میں تم سے پیار نہیں کرتی، میں ایک بدروح ہوں، میں مر چکی ہوں۔'' سلینا دھاڑی۔

میں دم بخود رہ گیا۔

''میرے بھائی نے پانچ لڑکیوں کا جو حال کیا، میں بھی تمہارا ویسا ہی حال کر کے اپنی پیاس بجھانا چاہتی

ہوں۔'' سلینا غرائی۔

''تمہارا بھائی جو چند سال پہلے مر گیا تھا وہ؟'' میں نے حیرت سے پوچھا سلینا زور زور سے نفی میں سر ہلانے لگی۔

''اپنی موت سے پہلے تم یہ ضرور جاننا چاہو گے کہ ان سب کے پیچھے کیا اسرار ہے تو سنو!''

''میرے بھائی نے ان پانچ لڑکیوں کو جن میں تمہاری ساتھی لیڈی آفیسر مرلین بھی شامل تھی ان سب کو اپنے جھوٹے پیار کے جال میں پھنسایا، ٹھیک اسی طرح جس طرح میں نے تمہیں پھنسایا۔ پھر وہ ان لڑکیوں کو ہوٹل لے آیا جہاں اس نے ان کے ساتھ کچھ رنگین لمحات گزارے تو دوسری طرف ان کا سارا خون چوس کر اپنا پیٹ بھی بھرا۔'' سلینا حقارت بھری ہنسی ہنستے ہوئے بولی۔

مجھے اپنا سر گھومتا ہوا محسوس ہوا۔ آہستہ آہستہ تمام حقیقت سمجھ میں آتی جا رہی تھی..... کہ کیوں لڑکیوں کی پوسٹ مارٹم رپورٹ میں ان کی موت کی وجہ خون کی کمی بتائی جاتی تھی..... سلینا کا بھائی تو ایک بدروح تھا جب ہی لڑکیوں کے جسم پر اس کی ہوس کا ڈی این اے موجود نہیں ہوتا تھا۔ مجھے اپنے دل پر بے تحاشہ چھریاں چلتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں یقیناً مرلین کا حال بھی مجھ سے مختلف نہیں ہو گا یا پھر وہ یہ سب جاننے سے پہلے ہی مر گئی۔ ہم سب تو سچ میں ان بہن بھائیوں کے عشق میں گرفتار ہو گئے مگر یہ تو کچھ اور ہی نکلے۔

مرنے والی لڑکیاں تو پھر لڑکیاں تھیں جو پیار و محبت کے معاملے میں عموماً بے وقوف ہوتی ہیں مگر میں تو مرد ہو کر سلینا کے ہاتھوں بے وقوف بنتا چلا گیا جب مجھ جیسا آفیسر بے وقوف بن گیا تو مرلین اور باقی لڑکیوں کا بے وقوف بن جانا یقینی تھا، اتنی دیر سے قاتل میری نظروں کے سامنے تھا اور میں اس بات سے بے خبر رہا، وہ تو بھلا ہوا کہ میں نے زیادہ نہیں پی تھی جس وجہ سے میری آنکھ کھل گئی۔ ورنہ نشے میں ہی میں یہ دنیا چھوڑ جاتا اور لوگوں کے لئے مزید سوالات پیدا ہو جاتے۔ دل میں ایک درد سا ضرور تھا کہ جس سے میں نے اپنی زندگی کی پہلی اور آخری محبت کی وہ کیا نکلی۔

بہرحال مجھے حقیقت کو قبول کرنا تھا کیونکہ آخر یہی سچ تھا، میں فیصلہ کر چکا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے میں نے بہ مشکل تمام اپنے ٹوٹے دل کی کرچیوں کو سمیٹا کیا اور سلینا سے بولا۔ ''تمہارے بھائی نے ان لڑکیوں کے ساتھ جو کچھ کیا سو کیا مگر میں تمہیں اپنے ساتھ ایسا کرنے نہیں دوں گا۔'' میں نے ایسا کہتے ہی ایک پل کی بھی تاخیر کئے بغیر شیشے کی دیوار توڑ کر نیچے چھلانگ لگا دی، ہوٹل کی تیسری منزل سے کودنے کے باعث مجھے بے تحاشہ چوٹیں آئیں جس کے ساتھ ہی میرا ذہن تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا لیکن اس سے پہلے میں نے سلینا کو ٹوٹے شیشے سے نیچے خود کو جھانکتے ہوئے پایا اور پھر اس کے بعد مجھے کچھ یاد نہ رہا۔

☆.....☆.....☆

میں دہشت کے مارے اٹھ کے بیٹھ گیا تو خود کو اسپتال میں پایا میرے ارد گرد نرسیں اور ڈاکٹرز موجود تے۔ خواب میں بھی میں نے سلینا کا بھیانک روپ دیکھا تھا جو مجھے قتل کرنے کے درپے تھی جس وجہ سے میں دہشت زدہ ہو کر جاگ گیا تھا شاید سلینا کا خوف میرے دل میں بیٹھ چکا تھا اور ایسا ہوتا بھی کیوں ناں..... میری جگہ کوئی بھی ہوتا اس کا حال بھی مجھ جیسا ہی ہوتا۔ یکا یک آہستہ آہستہ سارا منظر میری آنکھوں کے سامنے گھوم گیا ہوٹل میں سلینا کا انتظار..... اس کے ساتھ گزارے ہوئے چند رنگین لمحات اور پھر ایک روح فرسا راز کا انکشاف۔

ان سب کے یاد آتے ہی میں زار و قطار رونے لگا زندگی میں یہ پہلا موقع تھا جب میں یوں بچوں کی طرح بلک بلک کر رو رہا تھا۔ آفیسر ڈونلڈ اور آفیسر ٹام بھی میرے پاس ہی موجود تھے اور مجھے یوں بے تحاشہ روتے دیکھ کر عجیب سی پریشانی کا شکار ہو گئے تھے، مجھ جیسا باصلاحیت انڈر پولیس آفیسر اس طرح کیوں رو رہا تھا غالباً وہ سمجھنے سے قاصر تھے..... اسٹاف کے تمام ممبران مجھے تسلیاں دینے لگے ساتھ میں رونے کا سبب

سوالات کررہے تھے کہ ''میں ہوٹل میں کیا کررہا تھا؟ وہاں کیوں گیا تھا؟ کس کے ساتھ تھا؟ اور ہوٹل سے نیچے کیوں کودا تھا؟'' وغیرہ وغیرہ۔

میری ذہنی حالت پہلے ہی ابتر تھی اوپر سے ان سب کے کوفت میں مبتلا کردینے والے سوالات مجھے مزید پریشان کررہے تھے میں نے جیسے تیسے کرکے ان کے تمام سوالات کے جوابات گول مول انداز میں دے دیئے مگر ان کے چہروں سے صاف لگتا تھا کہ انہوں نے میرے جواب کا یقین نہیں کیا۔

خاص طور پر آفیسر ٹام اور آفیسر ڈونلڈ کے چہروں میں جو میرے بے حد قریب تھے..... میں بھی مجبور تھا کیا کرتا سلینا کے بارے میں بتا کر، میں اپنا مذاق نہیں بنانا چاہتا تھا۔ یقیناً وہ لوگ میری موجودہ حالت کو دیکھ کر میرے سچے بیان کو میری خراب ذہنی حالت ہی گردانتے اور میں ایسا ہرگز نہیں چاہتا تھا لہٰذا خاموش رہا۔

تمام آفیسرز کو پورا بھروسہ تھا کہ میں بلاوجہ اس حال کو نہیں پہنچا، ضرور اس کے پیچھے کوئی بڑا راز ہے، بھلا مجھے ہوٹل کے شیشے سے کودنے کی کیا ضرورت پیش آئی؟ مگر میری نازک حالت کو دیکھتے ہوئے ڈاکٹرز نے ان کو مزید سوالات کرنے سے روک دیا جو میرے لئے خوشی کی بات تھی۔ ڈاکٹرز نے مجھے چیک کیا اور آرام کرنے کا کہہ کر کمرے سے نکل گئے پھر اسٹاف کے باقی ممبران بھی ایک ایک کرکے کمرے سے نکل گئے سوائے ٹام کے۔

ہم دونوں کے سوا اب کمرے میں کوئی نہیں تھا وہ اسٹول کھینچ کر میرے پاس بیٹھ گیا۔ میں بخوبی جانتا تھا کہ وہ کیا جاننا چاہتا ہے چند لمحے وہ میرے چہرے کو بغور دیکھتا رہا پھر بولا۔ ''ہوٹل والوں کا کہنا ہے کہ تم ہوٹل کے کمرے میں اکیلے ہی موجود تھے۔'' ٹام اتنا کہہ کر میرے چہرے کی جانب دیکھنے لگا جہاں اس نے واضح خوف کے تاثرات دیکھے۔

ٹام کی بات نے بلاشبہ مجھے دکھ دیا تھا مگر میں نے خود کو بہ مشکل سنبھالا تاکہ اسے کسی بھی طرح کا شک نہ گزرے مگر شاید میری یہ کیفیت ٹام سے چھپی نہ رہ سکی۔ کافی دیر تک میں نے کوئی جواب نہ دیا تو ٹام اسٹول سے اٹھ کھڑا ہوا میں نے حیرت سے اسے دیکھا میں سمجھا کہ شاید وہ مزید کچھ کہے گا مگر وہ مجھے ''اپنا خیال رکھنا'' کہہ کر کمرے سے نکل گیا..... شاید اسے اپنا جواب میرے خوف زدہ چہرے سے مل گیا تھا۔

سب صاف اور واضح ہوگیا تھا مجھے اپنے ان تمام سوالوں کے جواب مل گئے تھے جو میں کبھی جاننا چاہتا تھا۔

سلینا اور اس کا بھائی بدروح تھے، تب ہی وہ کسی کو ہوٹل کے اندر داخل ہوتے ہوئے دکھائی نہیں دیتے تھے سوائے ان کے جوان کی جھوٹی محبت میں گرفتار تھے اور اسی بنا پر کمرے کا دروازہ اندر سے مقفل پایا جاتا تھا کیونکہ وہ روح تھے اور اپنا کام پورا کرکے غائب ہوجاتے تھے انہیں بھلا دروازے یا کھڑکی سے باہر جانے کی کیا ضرورت تھی۔

اپنے ساتھ یہ گزری تو معلوم ہوا کہ بے چاری مرلین کیسے پھنسی ہوگی۔

میں نے اپنی کلائی کی جانب دیکھا تو وہاں اب بھی دو نوکیلے دانتوں کے واضح نشان تھے..... ان نشانوں کا اب تک میری کلائی سے غائب نہ ہونا میری سمجھ سے بالاتر تھا اور مجھے پورا یقین تھا کہ میرے یہ نشان ڈاکٹرز اور اسٹاف کے آفیسرز سے چھپے نہ رہ سکے ہوں گے۔ مرحوم پانچ لڑکیوں کے بدن پر ایسا کوئی نشان دیکھنے میں نہیں آیا تھا جو ہمیں آدم خور کی جانب سوچنے پر مجبور کرتا تو پھر یہ نشان میرے کیوں رہ گئے تھے؟

اگلے دن میں کافی بہتر محسوس کررہا تھا۔ میں نے آفیسر ڈونلڈ کے سامنے اپنا استعفیٰ پیش کردیا۔ انہوں نے قدرے حیرت سے چونک کر میری جانب دیکھا۔ ''یہ کیا ہے؟''

''میں ریزائن کرتا ہوں سر، میں قاتل کو پکڑنہ

سکا، میں شرمندہ ہوں کہ میں ان پانچوں کو انصاف نہ دلوا سکا۔'' میں نے دوٹوک جواب دیا۔

''لیکن بیٹے کوشش جاری رکھو۔'' آفیسر ڈونلڈ نے کچھ کہا مگر میں نے ان کی بات بیچ میں ہی کاٹ دی۔

''نہیں سر..... میں ہار مانتا ہوں، میں اب اس کیس پر کام نہیں کرسکتا۔'' میں نے اپنا فیصلہ سناتے ہوئے کہا۔

میرے دوٹوک لہجے نے آفیسر ڈونلڈ کو خاموش کردیا وہ میرے استعفیٰ پر ناخوش تھے مگر کچھ بولے نہیں۔

جلد ہی میرے استعفیٰ دینے کی خبر جنگل کی آگ کی طرح ہر سو پھیل گئی۔ آفیسر ٹام کے لئے میرے استعفیٰ دینے کی خبر نہایت حیران کن تھی کسی بھی صورت اس کے حلق سے میرے استعفیٰ دینے کی بات نیچے نہیں اتر رہی تھی۔ ٹام کے علاوہ اسٹاف کے دیگر آفیسرز اور میڈیا والوں نے مجھ سے استعفیٰ کے متعلق کئی سوالات کئے مگر میرا جواب سب کو ایک ہی تھا کہ ''میں ناکام ہوگیا ہوں لہٰذا مجھے معاف کیجیے۔''

ہر کوئی اپنی اپنی جگہ اندازے لگانے کی کوشش کررہا تھا کہ میں نے استعفیٰ کیوں دیا مگر اصل حقیقت تو صرف میں ہی جانتا تھا۔

میں اپنے گھر آکر بیڈ پر دراز ہوگیا سمجھ نہیں آرہا تھا کیا کروں۔ جس گھر کو میں نے سلینا کی صورت میں آباد کرنا چاہا تھا وہ آباد نہ ہوسکا تھا۔ کچھ بھی پہلے جیسا نہیں رہا تھا سلینا کے بعد سب بدل گیا تھا۔ جس گھر میں اتنے سال اکیلے رہنے کے باوجود مجھے تنہائی کا احساس نہ ہوا تھا آج وہی ویران گھر مجھے شدت سے تنہائی کا احساس دلا رہا تھا بے اختیار دل میں درد سا اٹھا اور آنسوں کی صورت آنکھوں سے بہہ کر رخساروں پر پھسل گیا۔ میں نے فوراً سے پہلے اپنی آنکھوں میں آئے آنسوؤں کو رگڑ ڈالا اور خود کو سمجھانے لگا کہ میں مرد ہوں مجھے ایک مری ہوئی لڑکی کے لئے اس قدر کمزور نہیں ہونا چاہئے۔ آج صحیح معنوں میں مجھے محبت کی تکلیف کا احساس ہوا تھا کہ محبوب کی بے وفائی پر دل پر کیا گزرتی ہے۔ ایسا سوچتے ہی مرلین کا معصوم چہرہ آنکھوں میں گھوم گیا۔

نجانے کتنی دیر بستر پر لیٹا میں اپنی بے بسی کا ماتم کرتا رہا۔ پھر جب اکیلے گھر سے خوف محسوس ہوا تو اٹھ کر باہر آگیا..... باہر کی تازہ ہوا اور آتے جاتے رنگ برنگے لوگوں کو یوں دیکھ کر دل کو قدرے اطمینان ہوا۔

یکا یک میرے دل میں ایک خیال بجلی کی طرح کوندا جس نے مجھے پریشان کردیا وہ یہ کہ بے شک میں سلینا کے ہاتھوں بچ گیا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ بھی ہار مان کے بیٹھ جائے ضرور وہ اور اس کا بھائی کسی اور کو پھنسانے کی کوشش کریں گے اور غالباً انکا اگلا شکار ٹام ہوگا کیونکہ ٹام بھی میرے اور مرلین کے ساتھ اس کیس پر کام کررہا تھا۔

مرلین کو موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد انہوں نے مجھے موت کی نیند سلانا چاہا، میں خوش قسمتی سے بچ گیا اور اب یقیناً ٹام کی باری تھی۔ ابھی میں یہ سب سوچ ہی رہا تھا کہ میرا موبائل فون بجنے لگا، میں نے فون لیس کرکے کان سے لگایا فون کرنے والا آفیسر ٹام تھا۔

''ہیلو'' میں نے کہا۔

''جوزف میں تمہیں اچھی طرح سے جانتا ہوں تم ہار ماننے والوں میں سے نہیں ایسا بھی کیا دیکھا تم نے جو تم استعفیٰ دینے پر آگئے؟'' آفیسر ٹام کی آواز سنائی دی گئی۔

''میں بہت پہلے ہی یہ سوچ چکا تھا کہ اگر میں ناکام ہوا تو ریزائن کردوں گا جو میں نے کردیا ہے۔ سچ میں، میں کچھ نہیں کرسکتا۔ اور میرے دوست تم اپنا خیال رکھنا کسی بھی ایسے شخص کی باتوں میں مت آنا جو تمہیں کہے کہ وہ تمہیں کیس کے متعلق کچھ بتائے گا۔'' میں نے تنبیہ کرتے ہوئے کہا۔

''کیا مطلب؟'' ٹام نے سمجھنے والے انداز میں پوچھا۔

''مطلب صاف ہے کہ میرے ساتھ بھی کچھ

"لیکن کیوں؟" ثام نے الجھتے ہوئے پوچھا۔

"بس پلیز! مجھے سمجھنے کی کوشش کرو مجھے مجبور مت کرو۔" میں نے اکتا کر کہا۔ مجھے ثام کے سوال کوفت میں مبتلا کررہے تھے۔

"جوزف جس قدر تم مجھے بے وقوف سمجھتے ہو اتنا میں ہوں نہیں۔" ثام نے تیز لہجے میں کہا۔

"کیا مطلب؟" ثام کے اچانک بدلتے لہجے نے مجھے بوکھلا کر رکھ دیا تھا۔

"تو اور کیا..... تم کیا سمجھتے ہو تمہارے یوں جھوٹ بولنے سے سچ پر پردہ ڈال جائے گا۔" ثام نے ہنوز سخت اور تیز لہجے میں کہا۔

"تم کہنا کیا چاہتے ہو؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میں نے اپنی آنکھوں سے تمہاری کلائی پر دانتوں کے دو واضح نشان دیکھے ہیں..... اس کے علاوہ تمہاری میڈیکل رپورٹ یہ بتاتی ہے کہ تمہارے جسم سے خون وافر مقدار میں نکالا گیا ہے۔ میں تمہیں یہ بتا کر کوئی احسان تو نہیں جتانا چاہتا مگر یہ سچ ہے کہ تمہیں خون عطیہ کرنے والا بھی میں ہی تھا ورنہ خون کی کمی ہونے کی وجہ سے تم اب تک مرکھپ چکے ہوتے۔" ثام نے قدرے غصے اور ناراض لہجے میں کہا۔

ثام کے اس انکشاف پر میں سناٹے میں آ گیا..... وہ سب جاننے کے باوجود اتنی دیر سے انجان بنا ہوا تھا، شاید وہ میرے منہ سے سننا چاہتا تھا۔ میرے استعفیٰ دینے کی بات اس سے ہضم نہ ہو سکی تھی اس لئے آج وہ پھٹ پڑا تھا۔ اس نے اپنا خون دے کر میری جان بچائی تھی پہلے وہ میرا اچھا کولیگ اچھا دوست اور ایک اچھا بھائی تھا مگر اب وہ میرا محسن بھی تھا مجھے اس کی محبت اور اس کے خلوص پر کس قدر پیار آیا میں بتا نہیں سکتا میری حیرت بھی اپنی جگہ قائم تھی اس کرنا جائز تھا۔

"کیا ہوا..... چپ کیوں ہو گئے، کیا یقین نہیں آرہا یا پھر ٹھیک سے سنائی نہیں دیا کہو تو دوبارہ دہراؤں۔" ثام کی غصے میں بھری آواز ابھری۔

اب ثام کو سب کچھ سچ، سچ بتانے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا، میں شکستہ لہجے میں بولا۔ "نہیں یار مجھے دوبارہ دہرانے کی ضرورت نہیں میں ہار مانتا ہوں۔ مگر میں تجھے سب فون پر نہیں بتاؤں گا۔ مجھے ابھی اسی وقت ریسٹورنٹ میں مل، رات تو ہو چکی ہے لہٰذا کھانا اکٹھے ہی کھائیں گے۔"

"ٹھیک ہے میری ڈیوٹی بھی ختم ہونے والی ہے، میں تھوڑی دیر تک تجھے مقامی ریسٹورنٹ میں ملتا ہوں۔" ثام نے خوشی سے کہا تو میں نے اوکے کہہ کر رابطہ منقطع کر دیا۔

کچھ دیر میں یونہی بیٹھا آتے جاتے لوگوں کو دیکھ کر اپنا دل بہلاتا رہا اور پھر کلائی میں بندھی گھڑی پر وقت دیکھا۔ ثام کے آنے میں چند منٹ رہ گئے تھے میں اٹھ کر سامنے والے ریسٹورنٹ میں چلا گیا اور شیشے والی دیوار کے پاس ٹیبل منتخب کر کے اس پر براجمان ہو گیا مجھے زیادہ انتظار نہ کرنا پڑا۔ ٹھیک دس منٹ بعد ثام مجھے ریسٹورنٹ کے داخلی دروازے سے اندر داخل ہوتا دکھائی دیا، ریسٹورنٹ میں چند لوگ ہی بیٹھے کھانا تناول فرما رہے تھے، ثام نے داخلی دروازے پر ہی مجھے بیٹھے دیکھ لیا تھا وہ چلتا ہوا میرے پاس آیا اور میرے سامنے والی کرسی پر براجمان ہو گیا، وہ ڈیوٹی آف ہو جانے کے بعد سیدھا میرے پاس آیا تھا اس بات کا اندازہ اس کے بدن پر موجود وردی سے ہوتا تھا۔

"واہ بھئی کیا میز منتخب کی ہے تجھے شیشے کے پاس بیٹھنے کا بہت مزہ آتا ہے۔" ثام نے سر پر سے کیپ اتار کے میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

"اچھا پہلے یہ بتاؤ کیا کھاؤ گے؟" میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"جو تم کھلا دو۔" وہ دوستانہ انداز میں بولا۔

میں نے ہنستے ہوئے دور کھڑے ویٹر کو پاس بلا کر اسے آرڈر لکھوایا، ویٹر آرڈر لکھ کر چلا گیا تو میں نے ثام سے پوچھا۔ "کیسے ہو؟"

"تمہارے سامنے ہوں۔" ثام مسکراتے ہوئے بولا۔ "مگر تم مجھے کچھ ٹھیک نہیں لگتے۔"

"پہلے کھانا کھائیں گے پھر اس بارے میں بات کریں گے۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"نہیں جی..... میں اب اور انتظار نہیں کر سکتا۔ پہلے ہی خدا خدا کر کے ڈیوٹی آف ہوئی ہے۔" ثام نے دوٹوک لہجے میں کہا۔

اسی لمحے ویٹر کھانا رکھ کر چلا گیا۔

"تم بے شک کھانا نہ کھاؤ مجھے کیا مگر مجھے تو بہت بھوک لگی ہے میں پہلے اطمینان سے کھانا کاؤں گا۔" میں نے جیسے فیصلہ سنا دیا۔

"اوکے جی ہم ہار گئے۔" ثام نے دونوں ہاتھ کہنیوں تک اٹھا کر کہا پھر ہم دونوں خاموشی سے کھانا کھانے لگے۔ کھانے کے دوران ہمارے بیچ کسی قسم کی کوئی گفتگو نہیں ہوئی۔ کھانے کے بعد میں نے بل ادا کیا اور ہم دونوں ریسٹورنٹ سے باہر آ کر بینچ پر براجمان ہو گئے، رات کے کوئی گیارہ بجے کا عمل تھا اکا دکا لوگ آ جا رہے تھے موسم میں کافی خنکی تھی ثام نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکال کر میری جانب بڑھایا، میں نے پیکٹ سے ایک سگریٹ نکال کر اپنے ہونٹوں میں دبا لیا۔ جسے ثام نے لائٹر کی مدد سے سلگا دیا۔ اس کے بعد ثام نے بھی سگریٹ اپنے ہونٹوں میں دبا کر سلگائی اور پھر میری جانب سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔ اب مزید انتظار اس کے لئے محال تھا وہ جلد سے جلد سب کچھ جاننا چاہتا تھا۔ میں نے بھی اب مزید انتظار کروانا مناسب نہ جانا اور شروع سے لے کر آخر تک تمام روداد ثام کے گوش گزار کر دی۔

طویل داستان الم سننے کے بعد ثام کو جیسے چپ لگ گئی، میں نے سگریٹ کا آخری کش لے کر دھواں ہوا میں اڑایا اور پھر ثام کے چہرے کا بغور جائزہ لینے لگا کہ میری اس طویل کہانی پر اس کا کیا ردعمل ہے مگر ثام کا چہرہ کسی بھی تاثر سے یکسر عاری تھا اور یہ بات میرے لئے نہایت حیران کن تھی۔ مجھے تو لگا تھا کہ میری کہانی سننے کے بعد وہ ضرور اسے میری غلط فہمی یا پھر میرا وہم قرار دے گا مگر اس کا چہرہ تو ایک دم سپاٹ تھا وہاں کسی بھی قسم کے حیرت بھرے یا پھر بے یقینی کے تاثرات نہیں تھے اور یہ بات میرے لئے نہایت تشویش کا باعث تھی۔

میں اندازہ نہیں لگا پا رہا تھا کہ وہ کیا سوچ رہا ہے ہمارے بیچ اس قدر گہری خاموشی حائل تھی کہ پاس سے گزرتی شائیں شائیں کرتی ہوائیں بھی شور برپا کرتی معلوم ہو رہی تھیں وہ ہنوز چپ چاپ بیٹھا پیدل آتے جاتے لوگوں کو دیکھ کر سگریٹ کے کش پر کش لے رہا تھا اس کی خاموشی اس وقت مجھے بے حد زہر لگ رہی تھی میں تو سمجھا تھا کہ وہ شدید ردعمل کا مظاہرہ کرے گا مگر اس کا ردعمل تو میری سوچ سے بالکل برعکس تھا۔ وہ مجھے پاگل سمجھ رہا تھا یا نہیں کچھ بھی نہیں میں اندازہ لگانے سے قاصر تھا بالآخر اس طویل خاموشی کو توڑنے کی میں نے ہی ٹھانی۔

"کیا ہوا ثام تم کچھ بولتے کیوں نہیں، کیا تمہیں میری بات کا یقین نہیں آیا؟"

ثام نے سگریٹ کا آخری کش لے کر باقی بچا سگریٹ پھینک دیا اور پھر دھواں ہوا میں اڑا کر دور کہیں ٹکٹکی باندھ کر بولا۔ "ایسی کوئی بات نہیں مجھے تمہارے ایک ایک لفظ پر پورا یقین ہے۔" ثام کے ایسا کہنے پر مجھ پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ اس کا جواب میری سوچ کے بالکل برعکس تھا مجھے اس سے اس بات کی ہرگز توقع نہیں تھی میں بے یقینی سے بولا۔ "تو پھر کچھ کہتے کیوں نہیں چپ کیوں ہو؟"

"بس سوچ رہا ہوں کہ ان کی جھوٹی محبت میں پھنس جانے اور ان کے ساتھ ہوٹل چلے جانے میں تمہارا، مرلین کا اور ان لڑکیوں کا کوئی قصور نہیں تھا وہ بدروح ہیں جس وجہ سے تم سب کو اپنی گرفت میں اپنے

سحر میں جکڑنا ان کے لئے کوئی مشکل نہیں، تم سمجھ رہے ہوناں میری بات؟" ٹام نے دھیمے لہجے میں میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ تو میں نے اثبات میں سرہلایا۔

"جانتے ہو جب تم اپنے فرض سے غافل ہونا شروع ہوئے تھے تب ہی مجھے شک ہوگیا تھا کہ کوئی چکر ضرور ہے کیونکہ تم پہلے کبھی اپنی ڈیوٹی سے لاپرواہ نہیں ہوتے تھے، جس قدر پچھلے چند دنوں میں ہوگئے تھے تمہارے پاس کس قدر اہم کیس تھا، اس کے باوجود تمہارا اپنے فرض سے غافل ہوجانا مجھے کھائے جارہا تھا، سمجھ نہیں آرہا تھا کہ ایسا کیونکر ہے، کئی بار دل میں آیا کہ تم سے پوچھوں مگر پھر کچھ سوچ کر ایسا نہ کرسکا...... میں تمہیں جب بھی یوں ڈیوٹی کے اوقات میں لاپرواہ سا دیکھتا تو مجھے بے اختیار مریلین یاد آجاتی جو خود بھی اپنی موت سے کچھ وقت قبل کچھ ایسی ہی لاپرواہی کا مظاہرہ کرنے لگی تھی، مگر مجال ہے کہ اس نے بھی تمہاری طرح کچھ بتایا ہو اور ایسا صرف اور صرف ان بدروحوں کے پھیلائے سحر کی وجہ سے تھا جس وجہ سے تم لوگ اس بارے میں بالکل کوئی بات نہیں کرتے تھے لیکن افسوس مریلین نہ بچ سکی مگر خوش قسمتی سے تم بچ گئے۔" ٹام نے اتنا کہہ کر توقف کیا اور ایک سگریٹ سلگائی۔

میں سکتے کے عالم میں ٹام کی بات سن رہا تھا وہ میری سوچ سے بھی زیادہ ذہین اور سمجھدار تھا۔

ٹام نے ایک گہرا کش لے کر دھواں ہوا میں اڑایا اور سلسلہ کلام دوبارہ جوڑا۔ "تمہارا ہوٹل کے شیشے سے نیچے کودنا، جسم میں خون کی کمی کا پایا جانا اور سب سے بڑھ کر گلے میں موجود دانتوں کے دو واضح نشان اس بات کا ثبوت تھے کہ تم پر کیا گزری ہے پھر بھی میں چپ رہا کہ شاید تم مجھے خود بتاؤ گے۔ میں تمہیں بتا نہیں سکتا کہ میں کتنا خوش تھا کہ تم موت کو شکست دے کر آئے ہو اور اب ہم مل کر اس کیس کا کوئی حل نکال سکتے ہیں مگر [illegible] کے بعد تو تم نے بالکل چپ سادھ لی حتیٰ کہ استعفیٰ تک دے دیا۔ افسوس تو مجھے اس بات کا ہے کہ تم نے مجھے اس قابل ہی نہیں سمجھا کہ اپنی زندگی کا سب سے بڑا حادثہ تو تم میرے ساتھ شیئر کرتے، تم کیا سمجھتے تھے میں یقین نہ کرکے تمہیں پاگل کہوں گا۔"

"نہیں نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔" میں نے ٹام کی بات بیچ میں ہی کاٹ دی۔

"ایسی ہی بات ہے اگر نہ ہوتی تو تم ٹھیک سے نہ سہی مگر ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں ضرور کچھ بتاتے مگر تم نے بتانے کی کوشش ہی نہیں کی میں تمہارا اچھا دوست ہوتا تو تم مجھے بتاتے نا، تم نے تو غیروں والا سلوک کیا۔" ٹام نے ناراض لہجے میں کہا۔

"ارے یار کیسی باتیں کررہا ہے۔" میں نے اسے سمجھانے کے سے انداز میں کہا۔

"تو پھر اور کیسی باتیں کروں ٹھیک ہی تو کہہ رہا ہوں۔" وہ ہنوز ناراضگی سے بولا۔

"میں تمہیں اس لئے نہیں بتانا چاہ رہا تھا کہ وہ تمہیں کسی قسم کا نقصان نہ پہنچائیں کہ تم ان کے بارے میں جان گئے ہو۔" میں نے ایسے بتاتے ہوئے کہا۔

"نہ جان کر زیادہ نقصان ہوتا جیسے تمہیں، مریلین اور ان لڑکیوں کو ہوا۔" ٹام خفگی سے بولا۔

"اچھا یار سوری۔" میں نے اس کے ناراض چہرے کو دیکھ کر پیار سے کہا۔

"اس کی کوئی ضرورت نہیں۔" وہ کھردرے لہجے میں بولا تو میں مسکرا اٹھا۔

"تو پھر کس کی ضرورت ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

میرے ایسا پوچھنے پر ٹام نے اس طرح میری جانب دیکھا جیسے اسے اس وقت میرا مذاق کرنا اچھا لگ رہا ہو۔

"اچھا یار چھوڑ ان سب باتوں کو یہ بتا تیرے علاوہ میرے یہ نشان کس کس نے دیکھے ہیں؟" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"میرے اور آفیسر ڈونلڈ کے علاوہ اس بارے میں کوئی کچھ نہیں جانتا، میں نے ڈاکٹرز کو کسی کو بھی کچھ بھی بتانے سے منع کردیا تھا۔" ٹام نے سنجیدگی سے کہا۔

"یہ تو تم نے بہت ہی اچھا کیا۔" میں نے پیار سے اس کا گال کھینچا۔

"کیوں تنگ کررہا ہے۔" وہ چڑ کر بولا۔

"تو جو لڑکیوں کی طرح ناراض ہوا بیٹھا ہے" میں نے شرارت بھرے انداز میں کہا۔

"یہ بتاؤ تم نے استعفیٰ کیوں دیا؟" ٹام نے پوچھا۔

"کیونکہ میں ناکام ہوگیا ہوں اب میں اس کیس پر کام نہیں کرنا چاہتا۔" میں نے صاف گوئی سے جواب دیا۔

"مگر تم اس کیس کے چشم دید گواہ ہو۔" ٹام بولا۔

"تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے کون میری بات پر یقین کرے گا جب ہمارا دشمن ہی انسان نہیں ہے تو پھر میں کیا کرسکتا ہوں اور اس منحوس کیس نے مجھے استعفیٰ دینے پر مجبور کردیا ہے ورنہ میں تو مزید ترقی کرنا چاہتا تھا اپنا کیریئر بنانا چاہتا تھا مگر سب ادھورا رہ گیا۔" میں نے غصے سے کہا۔

"لیکن استعفیٰ بھی تو اس کا حل نہیں ہے۔" ٹام نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"تو پھر تم ہی کوئی حل بتاؤ۔" میں نے بے زاری سے کہا۔

"دیکھو جو ہوا سو ہوا، تم نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور اور تم چاہو تو اب بھی قوم کی مدد کرسکتے ہو کیونکہ ابھی خطرہ ٹلا نہیں ہے وہ ضرور کسی اور کو نشانہ بنائیں گے اور ہم دونوں کو انہیں ایسا کرنے سے روکنا ہوگا۔" ٹام نے اپنی بات پر زور دینے کے ساتھ مجھے حوصلہ بھی دیتے ہوئے کہا۔

"اور ایسا کیسے ممکن ہے۔" میں نے نہ سمجھنے کے سے انداز میں کہا تو ٹام نے اپنے گلے میں لٹکی صلیب مجھے دکھائی، میں فوراً سے بیشتر سمجھ گیا کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔

"ارے ہاں یار ایسا تو خیال ہی نہیں آیا میرے دماغ میں۔" مجھے اندھیرے میں روشنی کی کرن نمودار ہوتی دکھائی دی۔

"تمہارے پاس دماغ ہو تب ناں، تم تو خدا سے بھی مایوس ہوکر بیٹھ گئے، ہمیشہ خود کو ہی بیسٹ نہیں سمجھتے دوسرے سے مشورہ لینا بھی بعض اوقات بے حد مفید ہوتا ہے۔" ٹام نے گویا مجھ پر طنز کیا۔

میں مسکرانے لگا اور اس کی عقل مندی پر داد دیئے بغیر نہ رہ سکا۔

"لوگ ویسے ہی بہت پریشان ہیں یہ تو سب جانتے ہیں کہ اس کیس پر ہم تینوں سینئر آفیسرز کام کررہے تھے اور پھر مریلین کا مرجانا، پھر تمہارا استعفیٰ دینا لوگوں کے خوف اور پریشانی میں مزید اضافہ کررہا ہے۔ میڈیا بھی بات کو بڑھا چڑھا کر پیش کررہا ہے اس لئے بہتر یہی ہے کہ اب اس کیس کو خاموشی سے ختم کردیا جائے۔" ٹام نے حتمی لہجے میں کہا تو مجھ میں بھی ایک نئی امید ایک نیا حوصلہ پیدا ہوا۔

"ہوٹل کے کمرے میں شیشے کی دیوار کا ہونا ایک اتفاق ہی اور تمہارا وہاں سے زندہ بچ نکلنا ایک معجزہ...... مگر تم یہ مت بھولو کہ تم اب بھی زندہ ہو، تمہاری زندگی کا مقصد ختم نہیں ہوا اگر خدا نے تمہیں نئی زندگی دی ہے تو ضرور اس کے پیچھے کوئی نیک مقصد ہے اس لئے بہتر ہے کہ تمہیں اب ان کا خاتمہ کرنا ہوگا۔" ٹام کا ایک ایک لفظ مجھے اپنے دل میں اترتا ہوا محسوس ہوا۔ اس نے کس قدر آسانی سے مسئلے کا حل بتادیا تھا۔ مجھے اس کی قابلیت اور ذہانت پر فخر محسوس ہوا۔

اگلی صبح میں نے اور ٹام نے چرچ جاکر فادر کو اعتماد میں لیا اور سب کچھ سچ سچ بتادیا۔ جو کچھ میرے ساتھ پیش آیا اور ان پانچ لڑکیوں کے ساتھ سب کچھ فادر کے گوش گزار دیا۔ فادر نے نہایت تحمل سے ہماری بات سنی کیونکہ وہ بھی ان پراسرار قتل سے واقف تھے۔ پھر کچھ دیر تک وہ کچھ پڑھ کر مجھ پر پھونکتے رہے اور اس کے بعد ہمیں ٹھیک دو دن بعد آنے کے لئے کہہ دیا۔

ٹام اور میں اٹھ کر چرچ سے باہر آگئے۔

"کیا خیال ہے، کیا فادر ہماری کوئی مدد کرسکیں

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

گے؟'' میں نے ٹام سے پوچھا۔

''دیکھو ہوتا کیا ہے، ابھی تو انہوں نے دو دن بعد بلایا ہے۔'' ٹام نے جواب دیا۔

ٹھیک دو دن بعد ٹام اور میں نے چرچ میں حاضری دی۔ فادر نے ہمیں بتایا کہ ''سلینا اور اس کے بھائی کو سر عام کسی نے قتل کر دیا تھا، وہ قاتل مارنے تو کسی اور کو آیا تھا مگر غلطی سے سلینا اور اس کا بھائی نشانہ بن گئے تھے دونوں اذیت سے کراہتے رہے مگر کوئی بھی ان کی مدد کو آگے نہیں بڑھا دونوں کو گولیوں سے مارا گیا تھا، سب انہیں مرتا دیکھتے رہے، یہاں تک کے ان کے جسموں سے سارا خون بہہ گیا اور وہ دونوں بے قصور وہیں مر گئے۔''

مجھے اور ٹام کو سلینا اور اس کے بھائی کی موت کا سن کر دلی دکھ ہوا مگر جس بات سے ہمیں خوشی ہوئی وہ یہ کہ انہیں سکون نصیب ہو گیا تھا۔

سلینا اور اس کا بھائی اب اس دنیا میں موجود نہیں تھے اور یہ سب فادر کی بدولت ہوا تھا، فادر نے یہ سب کیسے کیا، یہ وہی جانتے تھے ہم ان کا ڈھیروں شکریہ ادا کر کے چرچ سے باہر نکل آئے دل کو ایک انجانا سا اطمینان ہو گیا تھا کہ میں نے مزید جانیں ضائع ہونے سے بچالیں اور ایسا صرف ٹام کی مدد سے ہوا تھا اگر وہ مجھے حوصلہ نہ دیتا تو شاید یہ خیال میرے ذہن میں کبھی نہ آتا، میں تہہ دل سے ٹام کا بھی شکر گزار تھا جس نے مجھے ایک نئی راہ دکھائی تھی۔

سلینا اور اس کا بھائی اپنی موت کا کافی بدلا لے چکے تھے اب ان کا یہ دنیا مکمل طور پر چھوڑ جانا بنتا تھا کیونکہ یہ دنیا روحوں کے لئے نہیں، بلکہ زندہ لوگوں کے لئے ہے۔

طویل عرصے تک پھر جب کوئی ایسا قتل دوبارہ نہ ہوا تو اس کیس کی فائل ہمیشہ کے لئے بند کر دی گئی جس پر لوگوں نے شدید احتجاج کیا، میڈیا والوں نے پولیس والوں کو ذلیل کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی پورے ملک میں خوب ہنگامہ آرائی ہوئی مگر پھر خود ہی کچھ دنوں بعد خاموشی چھا گئی سب کچھ پہلے کی طرح نارمل اور معمول پر آ گیا لوگ آہستہ آہستہ ان واقعات کو بھولنے لگے..... کچھ لوگ اسی پر خوش ہو گئے تھے کہ اگر قاتل پکڑا نہ گیا تو کیا ہوا کم از کم ایسے قتل ہونا بند ہو گئے تھے لوگوں کا پولیس والوں پر اعتماد دوبارہ بحال ہو گیا۔

مگر حقیقت میرے اور ٹام کے علاوہ کوئی نہیں جانتا تھا نہ ہی ہم نے اس بارے میں کسی کو بتانا پسند کیا، فادر نے بھی ہمارے کہنے پر اپنی زبان کو تالا لگا لیا تھا آفیسر ڈونلڈ نے مجھ جیسے قابل فرض شناس اور باصلاحیت آفیسر کا استعفیٰ منظور نہیں کیا تھا، جس وجہ سے میں نے پولیس کی نوکری دوبارہ جوائن کر لی اور باقاعدگی سے ایک بار پھر پولیس اسٹیشن آنے لگا، اسٹاف کے تمام آفیسرز میرے دوبارہ ڈیوٹی پر آنے سے بہت خوش تھے۔

میں آج بھی اکیلا ہوں اور دوبارہ پھر کسی لڑکی سے عشق نہیں کیا میرے دل میں آج بھی سلینا ہے، یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ بدروح تھی اور اب اس کا خاتمہ ہو چکا ہے لیکن دل تو پاگل ہے اس کا اصل روپ چاہے جیسا بھی تھا مگر اس کے ساتھ گزارے ہوئے محبت کے وہ چند دن میرے لئے قیمتی سرمایہ ہیں جن کے سہارے میں اپنی باقی زندگی گزار سکتا ہوں۔

میری کلائی پر اکثر جلن کا احساس ہوتا ہے جہاں سلینا نے اپنے نوکیلے دانتوں سے مجھے کاٹا تھا، وہ دو نشان اب بھی میری کلائی پر موجود ہیں جو مجھے یقین دلاتے ہیں کہ سلینا ایک حقیقت تھی میرا وہم نہیں۔

آج اس واقعہ کو چالیس سال گزر گئے ہیں، میں ترقی کر کے بڑے عہدے پر فائز ہو چکا ہوں، لڑکیوں کے پراسرار قتل کیس کے بعد سے ایک کے بعد ایک کیس حل کرتا ہوا یہاں تک پہنچا ہوں۔ سب کچھ بدل کر بھی بدلا نہیں ہے، اتنے سال گزر جانے کے باوجود آج بھی یہ واقعہ اور سلینا کا چہرہ میرے ذہن اور دل کی کتاب میں روشن ہے جیسے ابھی کل ہی کی بات ہو۔

بھیانک سزا

قاسم رحمان-ہری پور

خوبرو نوجوان عورت اذیت سے دو چار تھی اور پھر اس نے ایک خوبصورت بچے کو جنم دیا، وہ ہوش سے بیگانہ تھی اور جب اسے ہوش آیا تو اس کا بچہ غائب تھا، حقیقت جاننے کے لئے یہ کہانی ضرور پڑھیں۔

متوکل ایمان والے کیا ہمیشہ گھاٹے میں رہتے ہیں، کہانی حقیقت کہانی میں پنہاں ہے

شام کے ملگجے اندھیرے کو رات کی دیوی تھپکیاں دیتی ہوئی آگے ہی آگے بڑھ رہی تھی۔ سردیوں کا موسم تھا اور ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ میری گاڑی بہت سلو اسپیڈ سے وحشت ناک پگنڈیوں سے گزر رہی تھی۔ راستہ طویل سے طویل تر ہوتا جا رہا تھا۔ میرے پہلو میں میری خوبصورت، جواں سال، محبوب بیوی بیٹھی ہوئی درد سے کراہ رہی تھی تکلیف کی شدت سے اس کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے تھے۔ لیکن اس منحوس راستے میں کوئی بھی ہماری مدد کرنے والا نہیں تھا۔

میری بیوی تانیہ کی پریگننسی کے آخری ایام تھے اور اب مجھے لگ رہا تھا کہ ولادت کا وقت قریب ہے کیونکہ تانیہ درد کی شدت سے تقریباً کراہ رہی تھی۔

''کیسی یہ بے بسی تھی، میں فطرتاً وہ انسان ہوں کہ اگر کسی کو ایک کانٹا بھی چبھ جائے تو میں تڑپ اٹھتا تھا

مگر آج، آج میں خود اپنی زندگی کے متعلق تکلیف میں کچھ بھی نہیں کر پا رہا تھا۔

میری اور تانیہ کی شادی لو میرج سے ہوئی تھی جس پر ہمارے گھر والے ہم سے تقریباً ناراض ہی تھے انہوں نے ہماری ضد کے آگے ہتھیار پھینک کر ہماری شادی کروائی تھی۔ میں اور تانیہ سمجھتے تھے کہ شادی کے بعد سب ٹھیک ہو جائے گا لیکن یہ ہماری خام خیالی تھی۔ شادی کے بعد میری امی کا تانیہ کے ساتھ رویہ روایتی ساس سے بھی بڑھ کر بہت سخت تھا۔ تانیہ کی ہر بات پر میری امی ناک بھوں چڑھاتی رہتی تھیں۔

صبح سے لے کر شام تک تانیہ کولہو کے بیل کی طرح کام کرتی رہتی لیکن میرے گھر والے تانیہ کی ہر بات ہر کام میں نقص نکالتے، اسے برا بھلا کہتے اور طرح طرح کے نفرت اور حقارت آمیز القاب سے نوازاتے رہتے تھے۔

تانیہ ہر بات میری وجہ سے برداشت کرتی اور کسی صورت بھی وہ مجھ سے کوئی شکایت نہیں کرتی تھی اور نہ ہی میری امی کے سلوک کا مجھے کبھی کوئی طعنہ دیتی تھی، بلکہ ہر بات کو خندہ پیشانی سے برداشت کرتی اور مجھے بھی برداشت کی تلقین کرتی تھی۔

میرے گھر والوں کی طرح تانیہ کی فیملی بھی مجھے اپنا پسندیدہ داماد نہیں سمجھتی تھی جب تانیہ کو چھوڑنے کے لئے میں اس کے گھر جاتا تو تانیہ کی امی کبھی بیٹھنے کا مروتاً بھی نہیں پوچھتی تھیں۔ اگر انہیں یہ خوف نہ ہوتا کہ تانیہ خودکشی کر لے گی یا میرے ساتھ بھاگ کر ان کی عزت کو داغدار کر دے گی تو وہ کبھی ہماری شادی نہ ہونے دیتیں نجانے انہیں مجھ میں کیا عیب دکھتا تھا جب بھی میں تانیہ کے گھر رک جاتا تو میرے سامنے وہ تانیہ سے کرید کرید کر پوچھتیں۔ ”تانیہ تمہارے سسرال والے تم سے بہت کام کرواتے ہیں، میں تو کہتی ہوں لات مار آؤ ایسے سسرال والوں کو۔ خدا کی قسم ایسے لوگ میں نے کبھی نہیں دیکھے۔“ وغیرہ وغیرہ۔

اور ان کی باتوں سے میں خون کا گھونٹ پی کر رہ جاتا۔

تانیہ کی محبت میں میں کر بھی کیا سکتا تھا وہ تو میرے لئے دل و جان سے بھی بڑھ کر تھی اور اسی وجہ سے میں سب کی باتوں کو برداشت کرتا اور ماتھے پر بل نہ ڈالتا کہ کہیں میری پریشانی کی وجہ سے تانیہ ٹینشن میں نہ آ جائے۔

اگر دو سال سے ہماری شادی قائم تھی تو میرے اور تانیہ کی برداشت کی وجہ سے ہی قائم تھی یہ دو سال ہماری زندگی کے بدترین سال تھے۔ تیسرے سال ایک نیا بکھیڑہ کھڑا ہو گیا۔ شادی کے تین برس گزر جانے کے باوجود ہماری کوئی اولاد نہیں تھی اور اب میرے گھر والوں کو ایک وارث چاہئے تھا بچے کی خواہش تو مجھے اور تانیہ کو بھی تھی لیکن امی کا مطالبہ پورا کرنے کا میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

امی کا کہنا تھا کہ ”اب اس منحوس ماری (تانیہ) سے مجھے کوئی اولاد نہیں ملنے والی، مجھے دوسری شادی کر لینی چاہئے۔“

اور سب سے دلچسپ و عجیب بات تو یہ تھی کہ نائلہ آنٹی (تانیہ کی امی) بھی تانیہ کو یہی سبق پڑھاتی تھیں کہ تانیہ کو مجھ سے طلاق لے لینی چاہئے کیونکہ مجھ میں ہی کوئی کمی ہے۔ ان حالات نے ہم دونوں میاں بیوی کو چکرا کر رکھ دیا تھا۔

انہی ٹینشن کے دنوں تانیہ نے مجھ سے کہا۔ ”جواد ہمیں اودھے لال شنکر“ کے دربار میں جانا چاہئے وہاں سے کوئی نامراد ہو کر واپس نہیں آتا۔“

تانیہ کی بات سن کر میں حیرت و غصے سے بولا۔ ”تانیہ میں ایسی توہمات پر یقین نہیں کرتا، جب ہماری قسمت میں اولاد ہوئی تو ہمیں مل جائے گی اور مجھے تم پر حیرت ہو رہی ہے کہ تم ایسی باتوں پر یقین کر بیٹھی ہو۔“

”جواد پھر بھی تم سوچ لو“..... تانیہ نے کہنا چاہا تو میں نے اس کی بات فوراً ہی کاٹ دی۔ ”تانیہ ایسا ناممکن ہے۔ تم یہ بات اپنے دماغ سے کھرچ کر نکال دو۔ یہ سن کر تانیہ کا موڈ آف ہو گیا اور وہ کچھ کہے بنا خاموشی سے سو گئی۔

یہ فرسٹ ٹائم ہمارے درمیان بحث ہوئی تھی اور مجھے افسوس بھی ہونے لگا۔

دو دن بعد تانیہ اپنے میکے والوں سے ملنے کے لئے جانا چاہتی تھی اور میں اس کو چھوڑنے اس کے ساتھ گیا۔ ہم جیسے ہی تانیہ کے گھر میں داخل ہوئے اس کی امی بولیں۔ ”جانی بیٹا شکر ہے کہ تم آ گئی، مجھے تم سے ضروری باتیں کرنی تھیں اور تمہاری یاد بھی آ رہی تھی۔“

”ایسی کیا ضروری باتیں کرنی تھیں امی جان آپ نے۔“ تانیہ میرے ہمراہ اپنی امی کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔

”بیٹھو یہاں۔“ نائلہ آنٹی نے تانیہ سے کہا۔ مجھے یوں اگنور کر دیا جیسے میں وہاں پر ہوں ہی نہیں برا تو مجھے بہت لگا لیکن میں تانیہ کی خاطر برداشت کر گیا۔

وہ بولیں ”بیٹا، مجھ سے تمہارا مرجھایا ہوا چہرہ اب دیکھا نہیں جاتا، سسرال والوں نے تم پر ظلم کا پہاڑ توڑ رکھا ہے اور سب سے بڑھ کر تمہارے شوہر کو تمہارا بالکل خیال نہیں، تم خود پر نظر ڈالو تم کتنی خوب صورت ہو تمہارے ایک اشارے پر کنوارے لڑکوں کی لائن لگ جائے گی تمہارے شوہر میں جو کمی ہے وہ کسی صورت دور نہیں ہو سکتی اور پھر تم اولاد سے محروم رہو گی، میرے پاس کئی لڑکوں کی تصویر ہے جو کہ اب بھی تم سے شادی کرنا چاہتے ہیں تم ان میں سے کسی ایک کو پسند کر لو اور درد بھری پریشان کن زندگی سے نجات حاصل کر لو۔“

”میرے لئے لڑکوں کی تصویریں۔“ تانیہ نا سمجھتے ہوئے الجھن زدہ لہجے میں بولی۔ ”امی کیا مطلب مجھے آپ کی بات سمجھ نہیں آئی۔“

”اور کس سلسلے میں دیکھوں گی، تمہارے لئے لڑکوں کی تصویریں، ظاہری بات ہے کہ تمہاری شادی کے لئے۔“ نائلہ آنٹی نے ایسے الفاظ بہت نارمل لہجے میں کہے۔

”وہاٹ ربیش! یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟ کیا آپ کو نہیں معلوم کہ تانیہ میری بیوی ہے۔ اور آپ اس کے لئے لڑکے دیکھ رہی ہیں۔ یہ کیا بکواس ہے۔“ غصے کی وجہ سے میں اپنے آپ پر کنٹرول نہیں رکھ پایا اور نہایت بدتمیزی سے بولا۔

لیکن نائلہ آنٹی پر میری باتوں کا رتی برابر بھی اثر نہیں ہوا۔ اور وہ پرسکون لہجے میں مجھ سے مخاطب ہو کر بولیں۔ ”تانیہ آج تمہاری بیوی ہے کل نہیں ہو گی۔ میں نے تو سرے سے اس شادی کو مانا ہی نہیں ہے کیونکہ مجھے روز اول سے ہی پتہ تھا کہ میری بچی تم جیسے جاہل لوگوں کے ساتھ کبھی خوش نہیں رہ سکتی۔ اور اب تانیہ کو بھی یہ پتہ چل چکا ہے کہ تم جیسے کھوکھلے مرد کے ساتھ رہ کر اسے سوائے تکلیفوں کے اور کچھ نہیں ملنے والا۔“

ان کی تلخ باتیں مجھے اندر تک سلگا گئیں۔ میں اس وقت ان کی جہت کے نیچے بیٹھا ہوا تھا، اس لئے میں نے ان سے کچھ بھی کہنا مناسب نہیں سمجھا اور تانیہ کو کلائی سے پکڑ کر گھر سے باہر نکل آیا مجھے اس ماں پر حیرت ہو رہی تھی جو اپنی بیٹی کا گھر خود برباد کرنے پر تلی ہوئی تھی۔

تانیہ مجھ سے کچھ کہنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن میرے دماغ میں اس وقت آندھی چل رہی تھی اس لئے مجھے نہیں پتہ چل رہا تھا کہ وہ کیا کہنا چاہ رہی ہے۔

گاڑی میں بیٹھنے کے بعد میں نے گاڑی کو اسٹارٹ کرتے ہوئے تانیہ سے پوچھا۔ ”اودھے لال شنکر کا دربار کہاں ہے اور کون سی جگہ پر ہے؟“

اس وقت تانیہ کی آنکھوں سے زاروقطار آنسو بہہ رہے تھے میری بات سن کر اس نے حیرت و خوشی سے مجھے دیکھا اور بولی۔ ”تم جانے کے لئے تیار ہو۔“

”میں نے کہا۔ ”بالکل لیکن تم پہلے یہ رونا دھونا بند کرو پلیز!“

تانیہ نے جلدی سے اپنی آنکھوں سے آنسو پونچھے اور مجھے راستہ سمجھانے لگی۔

دربار میں کافی لوگ آئے ہوئے تھے جو کہ چڑھاوے چڑھا رہے تھے۔ منتیں مانگ رہے تھے میں نے بھی ایک ہزار کا چڑھاوا چڑھایا اور تانیہ نے وہاں دعا کی اور کوئی منت مانگی اور دربار سے ایک چٹکی مٹی اٹھا کر کھائی۔

پھر میں اور تانیہ واپس آ گئے، گھر میں میری امی

نے شور مچایا ہوا تھا۔ ”لو جی اب ان لوگوں کو سیر سپاٹوں کی پڑی ہوئی ہے گھر کی ذمہ داریوں کا کوئی احساس نہیں ہے، اب میں ان بڈھی ہڈیوں سے اس گھر کے کام کروں ایک بیٹا خدا نے دیا اور وہ بھی جورو کا غلام۔“

میں امی کو چپ کروانے کی کوشش کرنے لگا اور تانیہ جلدی جلدی سارے کام سمیٹنے لگی۔

دو دن بعد پورے گھر میں ایسی ہی بوریت چھائی رہی آفس سے واپس گھر آنے کا دل نہیں کرتا تھا۔ خیر جیسے تیسے کر کے وقت کا پہیہ چلتا رہا اور پھر دوسرے ماہ تانیہ نے خوشخبری سنا ڈالی۔ جسے سن کر پورے گھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ امی کا چڑچڑا پن تو دو گیارہ ہو گیا اور میری شادی شدہ بہن آمنہ بھی فوراً ہمارے ہاں آ گئی وہ تانیہ جس کو ہر پل جلی کٹی سنائی جاتی کام چور ہڈ حرام جیسے خطابات سے نوازا جاتا، اب اسی تانیہ کو سر آنکھوں پر بیٹھایا جا رہا تھا۔

امی اس کو بستر سے پاؤں بھی نیچے نہ رکھنے دیتیں زندگی ایک دم پرسکون ہو گئی تھی میرا اور تانیہ کا صبر رنگ لا رہا تھا۔

وقت کا کام ہوتا ہے گزرنا اس لئے یہ بنا کسی کی پروا کئے گزر جاتا ہے یہ الگ بات ہے کہ اچھا وقت بہت جلدی گزر جاتا ہے اور برے وقت کا ایک ایک پل صدیوں کے برابر محسوس ہوتا ہے ہماری زندگی کے تین برس کیسے گزرے تھے یہ ہم اور ہمارا خدا ہی جان سکتا ہے لیکن خوشی کے وہ ایام بہت تیز رفتاری سے گزر رہے تھے۔

مجھے اپنے بچے کو گود میں کھلانے کے کچھ ہی دن رہ گئے تھے، اور سارے خاندان والے تانیہ کا بہت زیادہ خیال رکھ رہے تھے۔

ایک دن تانیہ نے مجھ سے کہا۔ ”جواد میں ایک مرتبہ پھر اودھے لال شنکر کے دربار میں جانا چاہتی ہوں اور ان کا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں۔“

اس کی بات سن کر میں نے کہا۔ ”تانیہ ہم ولادت کے بعد چلے جائیں گے۔“

”نہیں میں آج ہی جانا چاہتی ہوں جواد پلیز! میری بات مان لو۔ دربار یہاں سے زیادہ دور تو نہیں ہے ناں..... میں ان کا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں۔ ہماری خزاں رسیدہ زندگی میں یہ جو بہار کے پھول نئی کونپلوں کی مانند پھوٹے ہیں یہ ان ہی کی مہربانی ہے۔

ان کے دربار میں ایک مرتبہ پھر حاضری دینا چاہتی ہوں پلیز!“ تانیہ ملتجیانہ لہجے میں مجھے مسلسل جانے پر فورس کر رہی تھی۔

اور میں بھی اس کی باتوں کے آگے بے بس ہو گیا اور اس کی بات مان لی لیکن جب امی کو پتہ چلا تو انہوں نے تھوڑا سا ہنگامہ کیا لیکن بعد میں مان گئیں۔

اور ہم دربار میں چلے گئے وہاں پہلے کی طرح تانیہ نے وہاں کی مٹی کھائی پھر اپنے اور اپنے ہونے والے بچے کی صحت کے لئے منت مانی۔

جس وقت ہم وہاں سے نکلے تھے اس وقت عصر کا وقت تھا لیکن جیسے ہی ہم تھوڑا آگے آئے تو آسمان پر کالے بادل چھا گئے اور شام سے بھی پہلے رات کا سماں ہو گیا ہر طرف اندھیرا چھا گیا۔

میں خوف زدہ تو بہت ہو رہا تھا لیکن تانیہ کے حوصلے کو مضبوط کرنے کے لئے میں اس کے سامنے یوں ظاہر کر رہا تھا جیسے میں بالکل خوف زدہ نہیں ہوں۔

ہمارے شہر سے اودھے لال شنکر کا دربار آگے تھا اور شہر کو جانے کے لئے دو راستے نکلتے تھے جو کہ ایک ساتھ دائیں بائیں واقع تھے۔ بائیں راستے میں جنوب کی طرف موڑ کاٹتے ہوئے راستہ سیدھا شہر کی طرف جاتا تھا اور دائیں جانب جانے سے جنگل کی حدود شروع ہوتی تھی۔

اندھیرے کی وجہ سے گاڑی ڈرائیو کرنی بھی مشکل ہو رہی تھی اور ساتھ میں، میں تانیہ کو بھی دلاسہ دے رہا تھا۔ اس لئے راستے کا پتہ نہیں چلا اور میں نے غلطی سے گاڑی دائیں جانب موڑ لی اور ہم جنگل کی حدود میں جب کافی آگے نکل آئے تب مجھے اس بات کا احساس ہوا کہ ہم بری طرح سے راستہ بھٹک گئے ہیں۔

راستے میں تانیہ کی کنڈیشن بہت نازک ہو گئی، میں اس وقت اپنے آپ کو بہت بے بس محسوس کر رہا تھا تاہم میں بہت سلو اسپیڈ میں گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا کہ شاید کسی طرف سے کوئی مدد مل جائے کہیں آبادی نظر آ جائے اور یہ حقیقت ہے کہ امید پر دنیا قائم ہے۔

ہماری گاڑی جنگل کو کراس کر کے ایک بہت وسیع قبرستان کی حدود میں داخل ہو چکی تھی۔ قبرستان کے ارد گرد ٹنڈ منڈ درختوں اور جھاڑیوں کی بہتات تھی۔ باقی سارا ماحول اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا لیکن قبرستان میں ایک طرف عجیب سی ہلکی ہلکی زرد رنگ کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔

اب تانیہ کی طبیعت ناقابل برداشت ہوتی جا رہی تھی ویسے قبرستان میں سوکھے پتوں کا انبار پڑا ہوا تھا، اچانک میں نے ایک جگہ گاڑی روک دی کیونکہ مجھے اندازہ ہوا غالباً وہ کوئی انسان یا جانور تھا جو اس طرف آ رہا تھا، میں نے اپنی گاڑی اس لئے روکی تھی کہ ہو سکتا ہے کہ وہ انسان ہی ہو اور ہماری کوئی مدد کر سکے۔

چند سیکنڈ بعد میں نے اس انسان کو دیکھ لیا وہ کوئی عورت تھی۔

اس نے ڈھیلا سبز رنگ کا کوٹ نما لباس پہن رکھا تھا اور کمر تک آتے ہوئے اس کے بال ہوا کے دوش پر لہرا کر اس کے چہرے کے ساتھ اٹھکیلیاں کر رہے تھے۔

وہ میری گاڑی کے پاس آئی اور مجھ سے مخاطب ہو کر بولی۔ ”اپنی بیوی کو سنبھالو اور میرے پیچھے آؤ۔“ اس کی آواز پہناٹائز کر دینے والی تھی اس وقت میں کسی معمول کی طرح تانیہ کو سہارا دیا اور اس عورت کے پیچھے چلنے لگا وہ صرف دو منٹ کا راستہ تھا۔

قبرستان کو عبور کرنے کے بعد ایک جھونپڑی تھی اور وہ عورت تانیہ کو لے کر اس جھونپڑی میں چلی گئی اور مجھے باہر انتظار کرنے کا کہہ دیا۔

میں باہر کیا بلکہ اس وحشت ناک قبرستان میں کھڑا تھا۔ قبرستان میں کئی قبروں کے کتبے گرے ہوئے تھے اور کئی قبروں کے آس پاس نیم اور شیشم کے تناور درخت کھڑے تھے۔

تھوڑی دیر بعد وہ عورت باہر آئی اور مجھے اندر جھونپڑی میں ہاتھ کے اشارے سے بلایا۔ اس جھونپڑی میں دو چارپائیاں پڑی ہوئی تھیں ایک طرف کچھ برتنوں کے ساتھ مٹی کا ایک چولہا بنا ہوا تھا اس کے دائیں جانب پانی کے لئے ایک مٹی کا گھڑا رکھا ہوا تھا۔

چارپائی پر تانیہ مدہوشی کی حالت میں آنکھیں موندے لیٹی ہوئی تھی۔ اس کے پہلو میں کالے کپڑے بڑھ کرا اپنے بچے کو آغوش میں بھر لیا۔ وہ مسلسل آنکھیں بنا جھپکے مجھے گھورے جا رہا تھا۔

مجھے اس نومولود بچے پر حیرت ہو رہی تھی پھر اچانک اس بچے نے آنکھیں بند کر لیں اس عورت کی کوئل جیسی آواز جھونپڑی میں گونجی۔

”یقیناً آپ تھک گئے ہوں گے۔ برائے کرم

شادی

ایک وزیر صحت، منتظم ماہر نفسیات کے ساتھ پاگل خانے کے دورے پر تھے۔ مریض کی بگڑی ہوئی حالت دیکھ کر وزیر صحت نے پوچھا۔

”اس کی کیا کہانی ہے؟“

بتایا گیا اس آدمی کو ایک لڑکی چاندی سے شدید محبت ہوئی مگر اس کے ساتھ شادی نہ ہو سکی اور یہ حالت ہو گئی۔

ایک اور مریض جس کے کپڑے پھٹے ہوئے، بکھرے بال اور منہ سے جھاگ بہہ رہی تھی۔

وزیر صحت نے اس کے بارے میں تفصیل جاننا چاہی تو ماہر نفسیات نے بتایا کہ ”یہ وہ آدمی ہے جس کی چاندی کے ساتھ شادی ہوئی تھی۔“

(مہر پرویز احمد دولو۔ میاں چنوں)

دوسری چارپائی پر دراز ہو جائیں اور سو جائیں۔"

نجانے اس کی آواز میں ایسی کیا بات تھی کہ میں نے ایک معمول کی طرح اس کی بات مان لی اور چارپائی پر لیٹ گیا۔ نیند کی دیوی جلد ہی مجھ پر مہربان بھی ہو گئی۔

صبح جب میری آنکھ کھلی تو دن چڑھ آیا تھا تانیہ چارپائی پر ابھی تک سو رہی تھی اس عورت اور میرے بچے کا کہیں نام و نشان بھی نہیں تھا، میں نے اپنے آس پاس دیکھا میرے تکیہ کے نیچے ایک کاغذ پڑا ہوا تھا جس کا تھوڑا سا سرا تکیہ کے باہر بھی تھا، میں نے وہ فولڈ کیا ہوا کاغذ نکالا اور اس کو کھول کر پڑھنے لگا بہت خوشخط کر کے لکھا گیا تھا۔

"جواد تم یقیناً سوچ رہے ہو گے کہ میں کون ہوں؟ اس ویران و سنسان جگہ پر میرا کیا کام؟ تمہارے دماغ میں تو رات کو بھی یہ سوالات آ رہے تھے لیکن رات کو میں نے اپنے علم کے سحر سے تمہارے دماغ کو سن کر دیا تھا میری داستان بہت دکھی ہے لیکن زیادہ طویل نہیں۔ منہ میں سونے کا چمچہ لے کے پیدا ہوئی اور بیس سال تک سوائے خوشیوں اور مسرتوں کے میری زندگی میں کچھ نہ تھا۔

بیس سال کی عمر میں میری شادی حاشر کے ساتھ ہو گئی شادی کے کچھ سالوں کے بعد مجھے پتہ چلا کہ میں ایک بانجھ عورت ہوں۔ حاشر نے بھی مجھ سے منہ موڑ لیا تھا اور یہ سب دیکھتے ہوئے میں نے اپنی کلائی کاٹ کر خودکشی کر لی۔

مجھے ایک ایسے بچے کی تلاش تھی جس کو میں اپنے ساتھ روحوں کی دنیا میں لے کر جا سکوں۔ کئی برس گزر گئے اور میں نے ان سالوں میں کئی بچوں کو حاصل کرنے کی بہت کوشش کی لیکن ہمیشہ نیکی کی طاقتیں میرے اور میرے مقصد کے بیچ حائل ہو جاتی تھیں۔

لیکن تمہارے بچے کو لے کر جانے کی اجازت مجھے نیکی کی طاقتوں نے دے دی۔

جانتے ہو کیوں؟

کیونکہ اس بچے کے لئے تم نے اور تمہاری بیوی نے کبھی خدا کے سامنے فریاد نہیں کی بلکہ اس ڈھونگی اودھے لال شنکر کے دربار گئے جو مرنے کے بعد بھی لوگوں کو گمراہی کے راستے پر ڈال کر دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہا ہے، خیر مجھے اس بات سے کوئی لینا دینا نہیں.....

تم نے اس ڈھونگی سے مدد مانگی لیکن خدا نے تمہاری اس باغیانہ حرکت کو نظر انداز کرتے ہوئے تمہیں خوش کیا لیکن تم نے اس کو بھی اس ڈھونگی اودھے لال شنکر کی طاقتوں کا کرشمہ جانا۔ تھو ہے تم پر۔

اور تمہاری سزا خدا نے یہ تجویز کی ہے کہ تم کبھی اپنے بچے کا منہ نہیں دیکھ پاؤ گے اور یہی مکافات عمل ہے۔"

آگے صفحہ خالی تھا میری آنکھوں سے آنسو گر کے اس صفحے کو بھگو رہے تھے، تانیہ بھی اس وقت تک اٹھ چکی تھی اس نے بھی یہ صفحہ پڑھا اور زار و قطار رونے لگی۔ تقدیر نے ہمیں ایسی بھیانک سزا دی تھی جس کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔

ہم وہاں سے واپس گھر آ گئے راستہ تلاش کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔

امی سے کچھ بھی چھپانا بے کار تھا لہٰذا امی کو سب کچھ صاف صاف بتا دیا اور امی صبر کا گھونٹ بھر کر رہ گئیں۔

لیکن اگلے سال میں اللہ نے ہمیں دو جڑواں بیٹوں سے نواز دیا کیونکہ اس بار ہم اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں تھے۔

میں آپ سب سے بھی یہی کہوں گا کہ جو مانگنا ہے خود اللہ سے مانگیں کیونکہ ہمارے کچھ مانگنے سے اللہ ناراض نہیں بلکہ خوش ہوتا ہے اور ہماری جائز حاجات اور دعاؤں کو درست وقت پر ضرور پوری کرتا ہے۔ لیکن شرط ہے کہ دل میں کوئی شک نہ ہو قلبی لگاؤ کے ساتھ اللہ سے دعا کرنی چاہئے۔

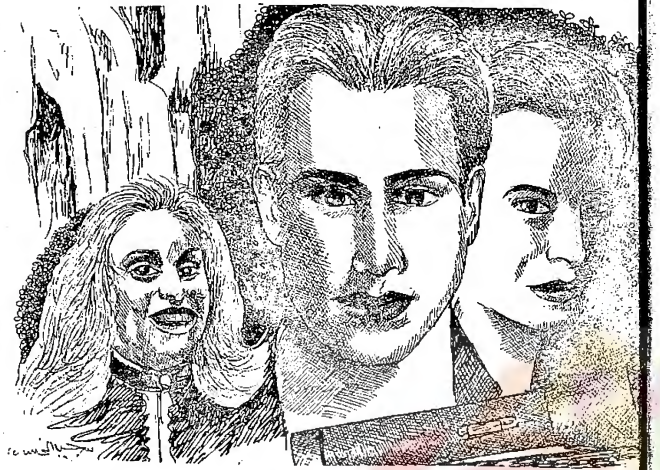

پراسرار سفر

ایس امتیاز احمد۔ کراچی

کیا یہ حقیقت ہو سکتا ہے کہ سالوں پہلے سمندر کے تہہ میں غائب قوی ہیکل جہاز اچانک سمندر میں آگے کو بڑھتا ہوا نظر آجائے..... ناممکن..... مگر یہ حقیقت ہے بغیر کسی انسان کے وہ جہاز چل رہا تھا.....

دل و دماغ کو لرزا دینے والی پراسرار کہانی جو کہ پڑھنے والے کو دہلا کر رکھ دے گی

6 جولائی 1998ء کی ایک یخ بستہ رات کو "چام" نے اپنا سمندری سفر شروع کر دیا۔ یہ مال بردار سمندری جہاز ڈیڑھ ہزار ٹن وزنی تھا اور لاکھوں روپے کی مالیت کی کھالیں اور دوسرا قیمتی سامان اس پر لدا ہوا تھا۔

"سن" کمپنی الاسکا کی ایک بہت بڑی مال بردار جہاز راں کمپنی تھی اس کا یہ جہاز "چام" بے شمار تجارتی سفر کر چکا تھا اور اب یہ ایک طویل تجارتی سفر پر کینیڈا جانے کے لئے قطب شمالی کے سمندر میں رواں دواں تھا، الاسکا سے قطب شمالی کے سمندر تک کے سفر میں اس کو کافی دن لگ گئے تھے۔

جہاز کا کیپٹن مسٹر وال اور سیکنڈ آفیسر کائن عرشے پر کھڑے سمندر کے دور تک پھیلے ہوئے نیلگوں پانی کا نظارہ کر رہے تھے، جہاز کا عملہ سامان کو الٹ پلٹ کرنے اور پھر سے ترتیب دینے میں مصروف تھا۔

"ہیلو کائن..... کیا سوچ رہے ہو؟" وال نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔

کائن ایک لمحے کو چونکا اور پھر مسکرا کر بولا۔ "کچھ نہیں مسٹر وال بس یہ سوچ رہا تھا کہ ہمارے سفر کس قدر طویل ہوتے ہیں ہم کتنا عرصہ اپنے گھروں میں رہتے ہیں اور کس قدر وقت سفر میں گزر جاتا ہے، ہم اپنی زندگی کا کتنا حصہ اس سمندری سفر میں گزار چکے ہیں اور ابھی مزید کتنی زندگی ہم ان سمندری لہروں کو گننے میں صرف کردیں گے۔"

"اوہو..... کائن آج تم بہت سنجیدہ اور اداس ہو..... آخر کیوں؟"

"نہیں ایسی بات نہیں۔" کائن نے جواب دیا۔

"آج سے پہلے تو تم نے کبھی ایسی باتیں نہیں کیں لیکن آج تم اداس اور غم زدہ لگ رہے ہو۔" اور کائن صرف مسکرا دیا۔

"معلوم ہوتا ہے آج تمہیں لاسی شدت سے یاد آرہی ہے۔ کیوں؟" کائن اب بھی خاموش تھا۔ "تمہیں چاہئے تھا کائن کہ اس دفعہ بھی تم اس کو اپنا ہم سفر بنا لیتے تو اس قدر اداس نہ ہوتے..... آخر پہلے بھی تو تم اس کو اپنے سفر میں شریک کرتے رہے ہو۔" وال نے اسے قائل کرنا چاہا۔

"ہاں۔" اس نے ایک سرد سانس لے کر کہا۔ "وہ تو یہی چاہتی تھی کہ جس طرح اکثر وہ میرے ساتھ ہوتی تھی اس دفعہ بھی میرے ساتھ ہوتی اور میں نے چاہتے ہوئے بھی اس کی بات کو مان لیتا۔" لیکن اس دفعہ اس کی ماں نے کہا۔

"کائن..... جب تم واپس لوٹو گے تو لاسی سے تمہاری شادی کردی جائے گی۔"

"دنیا بہت آگے بڑھ چکی ہے، لیکن وہ اب بھی پرانے اصولوں اور روایات کی پابند ہیں۔ ان کے جزائر کی کچھ رسمیں ہیں جن کو وہ اب بھی سینے سے لگائے ہوئے ہیں، میں ان کی مرضی سے باز رکھنے والا کون ہوتا ہوں، لاسی بھی بہت غمگین تھی، اس کے حسین چہرے پر غم کی بدلیاں کچھ اچھی معلوم نہیں ہو رہی تھیں۔ واقعی وہ بہت حسین اور خوبصورت ہے لیکن سنجیدگی اس کے حسن کو غارت کردیتی ہے اور وہ اپنی عمر سے زیادہ معلوم ہوتی ہے..... خوش رہنے والی لڑکیاں حسین ہوتی ہیں اور نوخیز نظر آتی ہیں سنجیدگی اور غم ان کی عمر حسن اور خوب صورتی پر اثر انداز ہوتے ہیں اور وہ زیادہ عمر کی اور بدصورت نظر آنے لگتی ہیں۔"

☆.....☆.....☆

سورج تو نظر ہی نہ آتا تھا، شاید سہ پہر کا وقت تھا برف کے تودے دوربین سے صاف دیکھے جاسکتے تھے ہوائیں بھی کچھ تیز چل رہی تھیں..... جہاز بحر قطب شمالی کے وسط سے گزر چکا تھا، ہوا کے ساتھ برف کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے اڑتے ہوئے صاف نظر آرہے تھے۔ "کوئی خاص بات.....؟" کائن نے وال سے پوچھا جو دوربین آنکھوں سے لگائے فضا میں کچھ تلاش کررہا تھا۔

"کچھ نہیں..... آؤ اندر چلیں۔" وال نے برفانی چٹانوں سے بچنے کے لئے کچھ احتیاطی تدابیر کیں اور اطمینان سے کائن کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف ہوگیا۔ موضوع وہی حسن تھا۔ کائن اب بشاش دکھائی دے رہا تھا اور وال کے ساتھ مصروف گفتگو تھا۔

رات گزرتی جارہی تھی، شاید نصف شب گزر چکی تھی، یہ 31 اکتوبر کی خوف ناک ترین رات تھی۔ چام قطب شمالی کے مغربی حصے کو عبور کررہا تھا کہ اچانک طوفان کی لپیٹ میں آگیا۔ طوفان شدید ہوتا چلا گیا، ہر طرف برف اڑ رہی تھی اور پھر کچھ دیر بعد وہ برفانی چٹانوں سے ٹکراتا ہوا برف میں پھنس گیا۔ یہی غنیمت تھا کہ وہ تباہ نہیں ہوا۔ عملے میں چند ایک کے سوا سب پریشان تھے۔ "چام" برف کے درمیان گھرا ہوا تھا۔ سردی بڑھتی جارہی تھی درجہ حرارت نقطہ انجماد سے بہت کم ہوگیا تھا۔

وال اور کائن نے مشورہ کیا کہ اب جان بچانے کے لئے جہاز کو چھوڑ دینا چاہئے چنانچہ کیپٹن وال نے عملے کے افراد سے کہا کہ "اب وہ جہاز کو چھوڑ دیں اور کہیں پناہ لیں۔"

چند گھنٹوں کی سخت جدوجہد کے بعد وہ برف کی سخت چٹان پر پہنچ گئے، وہ جہاز سے ضروری سامان بھی لے گئے تھے..... جس سے انہوں نے خیموں کی ایک عارضی پناہ گاہ تعمیر کرلی، جہاز کی تباہی یقینی تھی، پھر بھی وال پرامید تھا کہ شاید جہاز کے قیمتی سامان کو بچایا جاسکے، اس نے وائرلیس کے ذریعے امداد طلب کی۔

"سن" کمپنی نے الاسکا کے مغربی حصے سے دو امدادی طیارے روانہ کردیئے، الاسکا کا یہ مغربی حصہ اس برفانی قافلے کی پناہ گاہ سے سات سو میل کے فاصلے پر تھا۔ کیپٹن وال اور کائن نے یہ طے کیا کہ 14 آدمیوں کی ایک ٹیم یہاں رہے اور باقی 22 آدمی واپس چلے جائیں، چنانچہ امدادی طیارے ان آدمیوں کو لے کر روانہ ہوگئے۔

کیپٹن وال کا مشن یہ تھا کہ جہاز پر نظر رکھی جائے برف پگھلنے کا انتظار کیا جائے اور قیمتی سامان کو ضائع نہ ہونے دیا جائے، چام اس پناہ گاہ سے صاف نظر آتا تھا دن گزر رہے تھے کہ ایک رات پھر برف کا طوفان آگیا، وال، کائن اور دوسرے افراد اپنے اپنے خیموں میں اکڑے اور دبکے ہوئے تھے۔ سردی سے بچاؤ کا معقول انتظام ہونے کے باوجود وہ ان برفانی طوفانوں سے ہراساں تھے، ان جیسے طوفانوں سے پہلے بھی ان کا سابقہ پڑا تھا۔ لیکن ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا کہ انہیں جہاز سے محروم ہوکر برفانی چٹانوں پر پناہ لینی پڑی ہو.....

آخر یہ سرد ترین خوف ناک طوفانی رات بھی گزر گئی۔

صبح ہوئی جب وال اور کائن خیموں سے باہر نکلے اور انہوں نے سامنے نظر دوڑائی تو بہت حیران ہوئے جہاز اب وہاں نہیں تھا، دور دور تک نظر نہیں آرہا تھا۔ سب لوگ سخت متعجب اور حیران تھے، کائن اب اکتا چکا تھا اور جلد از جلد الاسکا۔ واپس جانا چاہتا تھا لیکن کیپٹن وال نے اسے سمجھایا کہ وہ سوچ سمجھ کر قدم اٹھائے کیونکہ اس مشن کی کامیابی سے نہ صرف ان دونوں کو بلکہ سب کو فائدہ پہنچے گا اور کائن نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"چام" کے غائب ہونے کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ گزشتہ شب کے طوفان کے بعد درجہ حرارت میں اچانک تبدیلی واقع ہوگئی تھی اور وہ نقطہ انجماد سے چند درجے زیادہ ہوگیا تھا جس کے باعث برف قدرے پگھل گئی تھی اور وہ اس کی گرفت سے آزاد ہوکر سمندر میں آگے بڑھ گیا، ایک خیال یہ بھی تھا کہ وہ سمندر میں غرق ہوگیا ہے۔

پریشانی کے چند روز اور گزر گئے۔

تیسرے دن صبح جب کائن اور وال باتوں میں مشغول تھے تو باہر ملاحوں کے چیخنے کی آوازوں نے انہیں چونکا دیا۔ "وہ چام چام" کے نعرے بلند کررہے تھے اور جب یہ دونوں پناہ گاہ سے باہر نکلے تو ان کی حیرت کی انتہا نہیں رہی تھی۔ چام قریب ہی کھڑا تھا۔ "یہ کہاں غائب ہوگیا تھا کب اور کیسے واپس آگیا؟" کسی کو بھی کچھ معلوم نہ تھا اور نہ معلوم ہوسکتا تھا..... سوچنے سمجھنے کا وقت نہ تھا۔

وال اور کائن اپنے عملے سمیت جہاز میں سوار ہوگئے اور جہاز سے قیمتی سامان اور کھالیں اتارنے کا کام شروع کردیا گیا، مقامی اسکیمو آبادی کی برف گاڑیوں کی مدد سے سامان کو پناہ گاہوں میں منتقل کیا جارہا تھا کیونکہ جہاز سفر کے قابل نہ تھا اور وہ چاروں طرف سے برف کے سمندر میں گھرے ہوئے تھے، جب جہاز کا عملہ دوبارہ اس کی جانب آیا تو چام۔

دوبارہ پراسرار طور پر غائب ہوچکا تھا، اس دفعہ سب کو اس بات کا پختہ یقین ہوگیا کہ چام ڈوب چکا ہے اور اب یہاں کا قیام بے سود ہے چنانچہ کیپٹن وال اور کائن نے رخت سفر باندھا اور چند روز میں وہ اس انوکھی دنیا سے نکلنے کے قابل ہوگئے۔ جس میں انہوں نے حیرت ناک اور کٹھن وقت گزارا تھا، کائن بہت خوش تھا اسے لاسی بے انتہا یاد آرہی تھی وہ الاسکا جلد از جلد پہنچ جانا چاہتا تھا، برف پگھلنا شروع ہوگئی تھی ایک مال بردار امدادی جہاز کا بھی انتظام ہوچکا تھا۔

بچا کھچا سامان اس پر لاد دیا گیا اور پھر تمام افراد ایک بار پھر اس کالے اور نیلے بے کراں سمندر میں رواں

کر رہا تھا کہ ”اس کے سرخ سرخ ہونٹ بڑے دلکش ہیں۔۔۔۔ ایسے سرخ کہ ان کو آتشیں ہونٹ کہا جائے تو بے جانہ ہوگا اور وہ جب سرخ لباس میں ملبوس ہوتی تو شعلہ دکھائی دیتی ہے۔ قیامت نظر آتی ہے اور غضب ڈھاتی ہے۔ اس کے جسم کی بناوٹ ہی قیامت خیز ہے اور اس وقت اس کے سامنے کیا جین ہار ہوگی اور کیا ریٹا ہورتھ اور شاید برجی کے لبوں میں بھی اس قدر گرمی اور شیرینی ہو یا نہ ہو جس قدر کہ لاسی کے سرخ سرخ آتشیں لبوں میں ہے، اس کی تپش میں آج بھی محسوس کرسکتا ہوں۔“

وال یہ سب کچھ خاموشی سے سنتا رہا اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور کہا۔ ”کائن تمہیں لاسی سے جدا ہوئے صرف چھ ماہ ہوئے ہیں اور مجھے اپنے بیوی بچوں سے دور ہوئے دس مہینے ہوچکے ہیں اور ابھی ملنے کی کوئی امید بھی نہیں ہے۔“

ان کے اس سفر کو بھی چند روز گزر چکے تھے۔ کیپٹن وال دوربین سے سمندر کی وسعتوں کا جائزہ لے رہا تھا۔ ”کائن، کائن۔“ اس نے بے تابی سے کہا۔ ”دیکھو یہ کہیں جام تو نہیں ہے۔“ اور کائن نے برا سا منہ بناتے ہوئے دوربین اس کے ہاتھوں سے لے لی۔

”تمہیں تو اب خواب میں بھی جام نظر آئے گا ڈیئر۔“ اتفاق تھا کہ وہ تباہ نہیں ہوا تھا اور دوبارہ نظر آگیا اور پھر تہہ نشین ہوگیا اس نے چند لمحے دوربین سے دیکھا اور اسے وال کو واپس کرتے ہوئے کہا۔ ”کوئی سمندری چٹان ہے جام وام کچھ نہیں ہے۔“

”نہیں کائن...... میں نے ایک جہاز کو تیرتے ہوئے دیکھا ہے، بالکل اسی سے ملتا جلتا۔“

”ہوگا...... ہوسکتا ہے کوئی دوسرا جہاز ہو اور وہ چٹان کی اوٹ میں ہوگیا ہو۔“ اس نے بیزاری کا اظہار کیا، مگر وال کی متلاشی نگاہوں سے دوربین لگی رہی۔

”دیکھو دیکھو کائن جلدی دیکھو۔“ اور کائن نے جلدی سے اس سے دوربین چھین کر اپنی آنکھوں سے لگائی۔ ”کچھ نظر آیا۔“ اس نے پرجوش لہجے میں پوچھا۔

”ہاں ہے تو کوئی جہاز...... لیکن اس پر نہ تو کوئی جھنڈا نظر آرہا ہے اور نہ ہی کوئی اور زندگی کے آثار۔“

”بس تو پھر یہ جام ہی ہے۔ ہمیں فوراً اس تک پہنچنا چاہئے۔“

”میں تمہارے اس فیصلے کی تائید نہیں کروں گا۔“ کائن نے ناخوشگوار لہجے میں کہا۔ لیکن اس وقت تک وال اپنے موجودہ جہاز کے کپتان کے کمرے تک پہنچ چکا تھا، اس نے اس پر صورت حال واضح کیا اور تھوڑی دیر بعد جہاز کا راستہ تبدیل کیا جارہا تھا...... وہ جلد از جلد جام تک پہنچ جانا چاہتے تھے۔

چند گھنٹے بعد انہیں وہ سمندری چٹان صاف نظر آرہی تھی۔ جس کی نشان دہی کیپٹن وال نے کی تھی، کائن کا موڈ اب بھی خراب تھا، گویا اب اسے ان لوگوں کی سرگرمیوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی، وال چٹان کے قرب وجوار میں اور دور تک سمندری لہروں کا تعاقب کرتا رہا۔ لیکن افسوس جام کا کہیں پتہ نہ تھا، کائن سے اس کی بے بسی دیکھی نہیں گئی اور اس نے مصالحانہ انداز میں اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا وہ قدرے فریش نظر آرہا تھا۔ لیکن نہ جانے کیوں وال کے چہرے پر تردد کی لکیروں نے اپنا ہالہ قائم کر رکھا تھا، شاید اس کی وجہ اس وقت کی ناکامی تھی۔ جب اس نے کائن کو خوش گوار موڈ میں پایا تو اس سے کہا۔

”کیوں نہ ہم جہاز کو یہاں لنگر انداز کردیں۔“

”ہاں، وال تم ایسا کرسکتے ہو، لیکن اس کے بعد تمہیں الاسکا سے رابطہ قائم کرنا چاہئے اور ضروری ہدایت مانگنی چاہئیں۔“

”بہت اچھے کائن میں بھی یہی سوچ رہا تھا۔“ جہاز کو لنگر انداز کردیا گیا، دونوں کیبن میں بیٹھے اس پراسرار جہاز کے متعلق گفتگو کررہے تھے، انہیں الاسکا کے مرکز سے ایک ہفتے کی مہلت ملی تھی کہ وہ صرف ایک ہفتے انتظار کرکے اپنا سفر دوبارہ شروع کردیں۔

کائن کہہ رہا تھا ”اگر اس دفعہ لاسی میری ہم سفر

ہوتی تو وہ بہت خوش ہوتی یہ واقعات جو گزر رہے ہیں، اس کی مہم پسندی کے عین مطابق ہیں وہ ایڈوانچر کو پسند کرتی ہے اور اس کی قائل بھی ہے، کاش! وہ میرے ساتھ ہوتی۔“

یہ سن کر وال صرف مسکرادیا عملے کے دوسرے افراد کا جام کے متعلق ملا جلا ردعمل تھا، چند کا خیال تھا کہ یہ مہم بے سود اور بیکار ہے کچھ ان سرگرمیوں سے لطف اندوز ہورہے تھے، البتہ دو تین بوڑھے ملاح ان واقعات کو پراسرار تعبیر کرنے کی بھرپور کوشش کررہے تھے۔ حقیقت کا علم کسی کو نہ تھا۔ ایک ہفتہ بھی گزر گیا۔ وال کا سفر دوبارہ شروع ہونے والا تھا کہ انہیں قریب ہی کوئی مسافر جہاز آتا نظر آیا۔ معلوم ہوا کہ یہ جہاز فرانس سے آرہا ہے اس کے کپتان اور عملے نے جو باتیں بتائیں وہ بعید از قیاس تھیں۔

انہوں نے بتایا۔ ”کہ ایک جہاز جس کی تباہی اور حادثے کی اطلاع انہیں مل چکی ہے۔ تن تنہا سفر کرتے ہوئے دیکھا گیا اور اس کا رخ میسٹری کی اسکیمو آبادی کی جانب تھا۔“ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ ”اس جہاز سے رابطہ قائم کرنے کی بہت کوشش کی گئی، لیکن وہ اس میں نہ صرف ناکام رہے بلکہ وہ جہاز بھی جلد ہی نظروں سے اوجھل ہوگیا۔“

ان اطلاعات سے پورے عملے میں سنسنی پھیل گئی، وال اور کائن بھی حیران تھے کیونکہ وہ جگہ جہاں جہاز نظر آیا اس مقام سے جہاں حادثہ پیش آیا تھا ہزاروں میل دور تھی اور یہی بات حیران کن تھی۔

سوال صرف یہ تھا کہ ”ایسا جہاز جس پر ایک آدمی بھی سوار نہیں برفانی تودوں اور سمندری چٹانوں کے نرغے سے کس طرح بچ نکلتا ہے۔ قطب شمال کے سمندر میں جہاں سینکڑوں برفانی اور پتھریلی چٹانیں پھیلی ہوئی ہیں، کوئی جہاز بغیر کسی تجربے کار امیر البحر کے کسی طرح بھی اپنا سفر جاری نہیں رکھ سکتا۔“

لیکن ”جام“ ان تمام باتوں سے آزاد ہوکر آزادانہ طور پر اپنا سفر جاری رکھے ہوئے تھا اور نہ جانے وہ کون سی غیر معمولی نادیدہ طاقت تھی جو اس کی رہبری کررہی تھی اور وہ کس طرح اپنی مرضی کے مطابق تنہا سفر کررہا تھا۔

انہیں باتوں کی بنیاد پر جام کی پراسراریت بڑھتی چلی گئی اور اس کے متعلق باتیں کہانیوں کا سلسلہ انداز اختیار کرگئیں۔

ایک بار پھر الاسکا کے کنٹرول بورڈ سے رابطہ قائم کیا گیا اور ایک دم تحقیقاتی مشن حرکت میں آگیا، جام کے حادثے تباہی اور دوبارہ نظر آنے کی خبریں دوسرے ممالک میں پھیل گئی تھیں، الاسکا سے ایک تحقیقاتی ٹیم روانہ ہوگئی، اس مشن کے طیارے، بحر قطب شمالی الاسکا کے جنوب اور مشرق حتیٰ کے بحر اوقیانوس کے اوپر پرواز کرتے رہے گویا پورے بحر اعظم کو چھان لیا گیا...... لیکن جام کا کوئی نام ونشان نہ تھا، وہ کہیں بھی نظر نہیں آیا۔

وال اور کائن کے سفر کو پورے چھ ماہ گزر چکے تھے جنوری 99ء کے اوائل میں اس ٹیم کے کچھ اور ساتھی جدا ہوگئے، وال اپنی ضد کا پکا تھا اس نے صاف صاف کہہ دیا کہ ”جس کا دل چاہے وہ اس مہم سے علیحدہ ہوجائے۔“ چند دوسرے مہم جو حضرات نے اس کا ساتھ دیا، کائن اب بھی اس سے جدا نہ ہوسکا بلکہ اب تو وہ بھی وال کا ہم خیال نظر آتا تھا اور اس نے اس مشن میں دلچسپی لینا شروع کردی تھی۔

”ایک بار پھر انہیں اطلاع ملی کہ ”جام“ لاؤ کے علاقے میں سرگرم سفر ہے۔“ کئی دوسرے جہازوں سے معلوم ہوا کہ انہوں نے اسے بڑے قریب سے گزرتے دیکھا ہے۔ یہ جگہ بھی الاسکا سے کئی ہزار میل دور تھی اور بحر منجمد شمالی کا ایک حصہ تھی، گویا اب انہیں واپس قطب شمالی کے اس حصے کی جانب جانا تھا، جہاں سے وہ آرہے تھے یا تقریباً وہ جگہ جہاں جام حادثے کا شکار ہوا تھا، یہ بات عقل کو چکرا دینے کے لئے کافی تھی اور سوائے وال کے کوئی بھی شخص اس سفر کے لئے تیار نہیں ہوسکتا تھا۔

الاسکا سے دوبارہ رابطہ قائم کیا گیا اور وال کی امیدوں پر پانی پھر گیا، اسے مطلع کیا گیا کہ واقعی جام لاؤ

کے علاقے میں دیکھا گیا تھا لیکن اب وہ سمندری چٹانوں سے ٹکرا کر پاش پاش ہو چکا ہے۔ تحقیقاتی مشن کی یہی رپورٹ تھی، سب لوگ بددل ہو چکے تھے۔

کائن توبیزار تھا ہی اب وال کو بھی وحشت سی ہونے لگی تھی، آٹھ ماہ اٹھارہ دن کا فضول سفر سے اسے انتہائی افسوس تھا۔ اسے اس بات کا زیادہ افسوس تھا کہ وہ دوبارہ چام کو نہ دیکھ سکا۔

اب منزل مقصود الاسکا تھی، راستے میں انہوں نے ایک اور چھوٹے سے جہاز کو حادثے کا شکار ہوتے دیکھا۔ اس کے زندہ مسافروں کو بچالیا گیا کچھ لاشیں تیرتی ہوئی کنارے کی طرف چلی گئیں۔ تب ایک بوڑھے ملاح نے کہا تھا۔

"یہ سمندر کا اصول ہے کہ اس میں کوئی مردہ تہہ نشین نہیں ہوسکتا سمندر کسی کو پناہ نہیں دیتا۔"

اور پھر پندرہ دن بعد ان کا جہاز الاسکا کی بندرگاہ کے ساحل پر لگ چکا تھا۔ سب لوگ بہت خوش تھے کائن تازہ دم ہونے کے بعد شہر نکل گیا، لاسی کے لئے کچھ تحفے خریدنا تھے، وہ کہیں سے بھی کچھ نہ خرید سکا تھا، اس لئے اس نے لاسی کے لئے چند چیزیں منتخب کیں اور اس کے گھر کی جانب چل پڑا، اس کا دل آج کچھ زیادہ ہی تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ وہ لاسی کی امیدوں کا مرکز تھا، سارے راستے لاسی کی معصوم صورت اس کی نظروں میں سمائی رہی، وہ اس کے دروازے پر کھڑا تھا، چند لمحے دستک دینے پر دروازہ کھلا اور ایک چنچل لڑکی وہاں نظر آئی۔ "یہاں کے لوگ کہاں گئے؟"

"کون لوگ؟" اس لڑکی نے پوچھا۔ "نام تو بتاؤ۔" وہ قدرے تیزی سے بولی

"یہاں لاسی اور لانی نام کی دو بہنیں رہتی تھیں اور ان کی ماں بھی، وہ لوگ کہاں گئے؟"

تھوڑی دیر بعد اسے سب کچھ معلوم ہو چکا تھا، لاسی کی ماں اس دنیا سے رخصت ہوگئی تھی، لانی شادی کر کے نیویارک چلی گئی اور لاسی..... اس کے متعلق معلوم نہ ہوسکا کہ آیا وہ اپنی بہن کے ساتھ تھی..... یا وہ بھی شادی کر کے کہیں چلی گئی۔

کائن بہت رنجیدہ ہوا آج اس کے غم میں بے پناہ اضافہ ہوگیا تھا، اسے لاسی سے ایسی امید نہیں تھی، اس نے اس سے جدائی کا تصور بھی نہیں کیا تھا اور اب تو ان کی شادی ہونے والی تھی۔

☆.....☆.....☆

دن یوں ہی گزرتے رہے کائن اور وال کی ملاقات اب بھی ہوتی تھی، کچھ ہی دنوں بعد ان دونوں نے چھوٹے چھوٹے سفر شروع کر دیئے، اسی طرح دو برس بیت گئے۔ دوسری دلچسپ بات یہ تھی کہ چام جس کی تباہی کی قطعی تصدیق ہو چکی تھی اور جس کی پراسراریت کی داستانیں قرب وجوار کے ممالک میں پھیل چکی تھیں، وہ اب پھر سمندر میں تیرتا ہوا نظر آرہا تھا۔ وال اور کائن نے کوئی توجہ نہیں دی۔ لیکن جب وہ ایک سفر کے بعد واپس آئے تو یہاں کے سرکاری ذرائع نے اس امر کی تصدیق کی کہ چام واقعی تباہ نہیں ہوا بلکہ وہ اب بھی اسی وسیع وعریض سمندر میں رواں دواں ہے۔

ایک بار پھر تحقیقاتی جماعتیں اس مشن میں مصروف ہوگئیں کچھ ہی دنوں بعد یہ طے کیا گیا کہ ایک مشن میں وال اور کائن بھی شامل ہوں گے۔

کائن کی خوش قسمتی کہ انہیں دنوں اس کی ملاقات لانی سے ہوگئی جو نیویارک سے واپس آگئی تھی اور اس ملاقات کے بعد کائن پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔

دنیا کا سب سے بڑا عجوبہ ناقابل یقین ناقابل فہم لیکن ایک حقیقت، ایسی حقیقت جس کو دلائل سے ثابت کیا جاسکتا ہے..... اس کے پیروں تلے کی زمین نکل گئی جب لانی نے یہ پوچھا کہ "لاسی کہاں ہے؟" اور جب اس نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا تو لانی نے کہا۔

"کائن وہ تو تمہارے ساتھ گئی تھی۔"

"میرے ساتھ گئی تھی!"

اس کا سر گھومنے لگا۔

"ہاں ہاں تمہارے ساتھ۔ اس نے کہا تھا کہ وہ تمہارے ساتھ جارہی ہے۔" لانی نے تقریباً چیختے

ہوئے کہا۔

"نہیں۔" وہ تقریباً چیخ پڑا۔ "وہ میرے ساتھ نہیں گئی، مجھے کچھ علم نہیں، میں نہیں جانتا۔ مجھے کچھ نہیں معلوم۔" وہ چیختا ہوا بھاگتا چلا گیا۔

وال اپنے گھر پر موجود نہیں تھا، وہ عالم اضطراب میں تھا، اس کا اضطراب بڑھتا جارہا تھا، اس کے کانوں میں کسی بوڑھے ملاح کے یہ الفاظ گونج رہے تھے۔

"سمندر مردے کو اپنی تہہ میں پناہ نہیں دیتا۔"

"تو کیا لاسی چام میں دفن ہوگئی۔ سمندر چام کو اگل رہا ہے، کیا چام اسی وجہ سے تہہ نشین نہیں ہوتا۔" کائن پاگلوں کی طرح سوچے جارہا تھا۔

وال نے کائن کی بات کو سمجھنے کی بہت کوشش کی لیکن وہ کیا کوئی بھی شخص اس کی بات کو ماننے سے انکار کر سکتا تھا کہ لاسی جہاز میں چھپ گئی تھی اور وہ وہاں مرگئی۔

بہرحال یہ واقعہ تھا کہ چام دوبارہ نظر آرہا تھا۔ کھوجی طیاروں کی اطلاع تھی کہ چام اسی جگہ دیکھا گیا جہاں اسے پہلی مرتبہ حادثہ پیش آیا تھا، پھر وہ دیکھتے ہی دیکھتے وہاں سے بھی غائب ہوگیا، چند روز بعد یہ دونوں بھی اس مشن پر روانہ ہوگئے ان کا سفر بحری تھا، کائن کی حالت پاگلوں جیسی ہورہی تھی، وہ جلد سے جلد چام کو دیکھ لینا چاہتا تھا..... وہ اس کی تلاش میں تھا۔

چام جس نے پوری دنیا کو حیرت میں ڈال رکھا تھا، وہ چام جس نے اس کی زندگی میں انگارے بھر دیئے تھے اور وہ وہ اس کی تپش سے جلا جارہا تھا۔ "اف میرے خدا۔" اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔ وال اس کی قلبی کیفیت سے واقف تھا۔

رات بہت خوف ناک تھی، اس رات ان کو اطلاع ملی کہ چام "بیوفورٹ" کے سمندر میں ہے، یہ مقام بحر منجمد شمالی کا ایک حصہ ہے اور یہ الاسکا کے جنوب مشرق میں واقع ہے۔

بیوفورٹ وال کے جہاز سے کچھ زیادہ دور نہیں تھا۔ سفر جاری رہا اور اپنی نوعیت کے اعتبار سے یہ ایک تاریخی سفر تھا۔

رات کا آخری پہر تھا..... فضا طوفانی ہوئی جارہی تھی، ان سے صرف ایک میل کے فاصلے پر چام اپنی خوف ناکیت کے ساتھ موجود تھا..... جب وال اس سے رابطہ قائم نہ کر سکا تو کائن کو یقین ہوگیا کہ یہی "چام" ہے کوئی بھی اس سنہری موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دینا چاہتا تھا۔

چند منٹ بعد کائن ہیلی کاپٹر میں بیٹھا، اس کی طرف جارہا تھا، ستاروں کی روشنی میں اس کا ہیولا نظر آرہا تھا، لیکن اسی لمحے انہیں برفانی طوفان نے آگھیرا، وال بہت پریشان تھا۔ ہیلی کاپٹر جہاز پر چکر لگا رہا تھا لیکن وہ ان طوفانی ہواؤں کو برداشت نہ کر سکتا تھا، ادھر وال اپنے جہاز کو بچانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہیلی کاپٹر سمندر میں جا پڑا، اس کے گرنے سے پہلے ہی کائن چام پر کود پڑا تھا، وہ تیزی سے ادھر ادھر کچھ ڈھونڈ تا رہا دہشت ناک آوازیں اس کے چاروں طرف ہالہ بنائے ہوئے تھیں۔

لیکن آج وہ اس کے قبضے میں تھا طوفان شدید ہوتا رہا تھا، چام ایک طرف سے سمندر میں ڈوب رہا تھا، وال کا جہاز بھی کسی چٹان سے ٹکرا چکا تھا، کائن اس وقت ایک غیر مرئی طاقت کے زیر اثر اپنی قوت کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

"تم آگئے کائن۔" سینکڑوں آوازوں نے ایک ساتھ اس سے کہا۔ "یہاں سے جلدی نکلو اور مجھے بھی نکالو ورنہ میری طرح تم بھی ساری زندگی سفر کرتے رہو گے۔ یہ جہاز کبھی نہیں ڈوب سکتا، اس طرح کے سینکڑوں طوفان بھی اس کو تباہ نہیں کر سکتے، جانتے ہو کیوں؟ میرے علاوہ بھی یہاں بہت سے لوگ ہیں۔ جو چام پر آگیا واپس نہیں گیا اور جو واپس آگیا وہ طوفان اور سمندری لہروں کی بھینٹ چڑھ گیا، اس وقت بھی برف کا طوفان چاروں طرف ہے۔ نکل کر بھی کہاں جاؤ گے؟"

غلط یا صحیح لوگ کہتے ہیں کہ چام کا ہیولا بحر قطب شمالی میں اب بھی نظر آتا ہے اور وہ اب بھی تنہا سفر کر رہا ہے۔

رولوکا

تحریر: اے وحید

قسط نمبر: 131

وہ واقعی پراسرار قوتوں کا مالک تھا، اس کی حیرت انگیز اور جادوئی کرشمہ سازیاں آپ کو دنگ کردیں گی

گزشتہ قسط کا خلاصہ

خیروقت آگے بڑھتا رہا اور روپا وقت کا انتظار کرتی رہی.. اس کے دماغ میں ناگ دیوتا کا کہا ہوا گردش کرتا رہتا تھا۔ ناگ دیوتا نے کہا تھا کہ ''روپا تم گھبراؤ نہیں، وقت آنے پر ایک اچھادھاری ناگ آئے گا اور وہ تمہارا جیون ساتھی بنے گا اور ناگ دیوتا کی یہی بات روپا کی ہمت وحوصلے کو بڑھاتی رہتی تھی۔ درمیان میں بہت سارے نشیب فراز آئے مگر روپا کے حوصلے کو متزلزل نہ کرسکے۔ ایک روز ایسا بھی ہوا کہ دو شکاری جنگل میں آگئے اور انہوں نے انسانی شکل میں روپا کو دیکھ لیا اور پھر ان دونوں میں سے ایک نے روپا کی کلائی پکڑ لی۔ اور یہ دیکھ کر روپا پر جیسے سکتہ طاری ہوگیا اور پھر اس شکاری نے روپا کے ساتھ دست درازی شروع کردی، مگر وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوسکا کیونکہ روپ کا ساتھی ناگنا جھاڑیوں میں تھا اور جب اس نے یہ دیکھا تو اس نے شکاری کو ڈس لیا اور اس طرح شکاری اپنی جان سے گیا۔ پھر دوسرے سانپوں نے دوسرے شکاری کو بھی نیست ونابود کردیا۔ ناگنا کی ہمت اور حوصلے کو دیکھ کر روپا بہت خوش ہوئی، پھر وقت آگے بڑھا اور ناگنا نے اپنی عمر پوری کرلی اور اس میں روپ بدل شکتی آگئی، اور پھر ایک روز ناگ دیوتا نے روپا اور ناگنا کو آشیرباد دی اور نئی زندگی شروع کرنے پر دونوں کو بدھائی دی، اور اس طرح روپا نے اپنے نئے جیون ساتھی کے ساتھ نئی زندگی کی شروعات کردی، ادھر مالوتا اپنے بیروں کی کارکردگی پر بہت خوش تھا اور بیر بھی بہت خوش تھے کیونکہ انہوں نے مالوتا کے سب سے بڑے دشمن رولوکا کا خاتمہ کردیا تھا اور اس میں کسی شک وشبے کی بات نہیں تھی، لیکن پھر بھی مالوتا نے بیر کے سرغنہ سے تصدیق کرلی کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ رولوکا نے کوئی چھل کیا ہو اور کسی صورت بچ نکلا ہو مگر بیروں نے اپنے تئیں مالوتا کو ہر طرح سے مطمئن کردیا کہ آقا آپ بے فکر ہوجائیں آپ کا دشمن ابلتے اور دہکتے ہوئے لاوا میں بھسم ہوچکا ہے۔ پھر مالوتا کے ذہن میں آیا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ میرا دشمن مجھ پر حاوی ہوجائے اور مجھے ناقابل تلافی نقصان سے دوچار کردے اور وہ شیطان آقا کی خدمت میں حاضر ہوگیا، اور شیطان سے مخاطب ہوکر بولا۔ آقا برائے مہربانی میری مدد کریں اور اس سلسلے میں آپ کے چرنوں میں سوناریوں کی بلی دوں گا مگر وہاں پر مالوتا کی باتیں سننے والا کوئی نہ تھا، ایسا لگتا تھا کہ آج شیطان آقا نے مالوتا کی آواز سننے کے لئے اپنے کان بند کرلئے ہوں، مالوتا سجدے میں تھا، پھر سجدے سے مالوتا نے اپنا سر اوپر کو اٹھایا اور اس کی نظر دیوار پر گئی تو وہ چونک گیا کیونکہ سامنے دیوار پر ایک سایہ حرکت کرتا نظر آیا تو بدحواسی کی حالت میں مالوتا کے منہ سے نکلا۔ ''کون..... کون ہے تو۔'' تو سائے نے جواب دیا۔ ''رولوکا۔''

(اب آگے پڑھیں)

دیوار پر حرکت کرتا سایہ کو دیکھ کر مالوتا نے بدحواسی کے عالم میں پوچھا۔ ''اوئے تو کون ہے؟''

مالوتا کی آواز سن کر سایہ کی آواز سنائی دی۔

''رولوکا.....''

یہ سننا تھا کہ مالوتا کی سٹی گم ہوگئی..... اس کے پورے جسم میں ایک عجیب سی سنسناہٹ دوڑ گئی..... اور پھر اسے چند لمحے کے لئے ایسا لگا کہ اس کے جسم سے جیسے جان نکل گئی ہو..... مگر پھر اس نے خود کو سنبھالا اور یہ سوچنے لگا۔ ''اوہ میں بھی کتنا بدحواس ہوگیا ہوں..... مجھ پر وہم نے اپنا تسلط جمالیا ہے۔

یہ کسی صورت بھی ممکن نہیں کہ رولوکا زندہ ہے۔ رولوکا کو تو میرے کارندوں اور بیروں نے دہکتے ہوئے آتش فشاں میں جھونک دیا تھا۔''

یہ سوچتے ہی مالوتا نے پھر نظر بھر کر دیوار کی طرف

دیکھا تو دیوار پر سایہ متحرک تھا۔

دوبارہ سایہ پر نظر پڑتے ہی مالوتا کی گھگھی بندھ گئی..... اور پھر تھوک نگلتے ہوئے بولا۔ ”اوئے کون ہے تو..... ارے صاف صاف بتا کون ہے اور کیا چاہتا ہے؟“

یہ سن کر سایہ کی آواز سنائی دی۔ ”میں رولوکا ہوں..... اور تیری موت چاہتا ہوں۔“ اور پھر سایہ خاموش ہوگیا۔

مالوتا کی حالت ایسی ہو رہی تھی کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں..... پھر بڑی مشکل سے اس کے منہ سے آواز نکلی..... ”اوئے..... مجھے گیدڑ بھبکی نہ دے..... تو رولوکا نہیں ہوسکتا..... تو کہیں رولوکا کا کوئی بیر تو نہیں..... اور مجھے ڈرانے آگیا ہے..... تو ٹھہر میں تیرا علاج کرتا ہوں۔“ اور یہ بول کر مالوتا نے اپنی جیب سے ایک چھوٹی سی ہڈی نکالی، وہ ہڈی کوئی چھ انچ کے برابر تھی۔

مالوتا نے ہڈی کو بغور دیکھا اور پھر کچھ پڑھ کر ہڈی پر پھونک ماری تو ہڈی میں سے ہلکی چنگاریاں نکلنے لگیں..... اس کے بعد مالوتا نے ہڈی کا رخ دیوار کی طرف کردیا..... اب مالوتا کی آنکھوں میں عجیب طرح کی چمک تھی۔

مگر یہ کیا..... ہڈی سے نکلی چنگاریاں آگے کو بڑھتے ہوئے دیوار سے کوئی دو فٹ کے قریب جا کر رک گئیں..... مالوتا بار بار کچھ پڑھ کر ہڈی پر پھونک مارتا رہا..... مگر ہڈی سے نکلتی چنگاریاں دیوار تک جانے سے قاصر تھیں۔

بار بار مالوتا جنتر منتر پڑھ پڑھ کر ہڈی پر پھونک مارتا رہا مگر مجال ہے کہ ہڈی سے نکلتی ہوئی چنگاری دیوار تک پہنچ جاتی۔

اور پھر جھلا کر مالوتا دھاڑا۔ ”اوئے بتا کہ تو کون ہے؟“

آواز آئی۔ ”میں رولوکا ہوں۔“

یہ آواز سنتے ہی مالوتا پھر دہاڑا۔ ”اوئے کسی صورت بھی تو رولوکا نہیں ہوسکتا..... تجھے تو میرے بیروں نے آتش فشاں میں ڈال دیا تھا..... اور وہ بھی دہکتے ہوئے آتش فشاں میں۔“

پھر سایہ کی آواز سنائی دی۔ ”مالوتا یہ صرف کہتے ہیں تیرے بیروں نے مجھے زندہ جسم دہکتے ہوئے آتش فشاں میں جھونک دیا تھا۔“

”ہاں..... ہاں..... میں اپنے بیروں کو کسی صورت بھی جھوٹ نہیں مان سکتا، میرے بیر مجھ سے جھوٹ نہیں بول سکتے..... میرے تمام بیروں نے اس بات کی تصدیق کی تھی کہ انہوں نے رولوکا کو دہکتے ہوئے آتش فشاں میں ڈال دیا تھا اور پھر آتش فشاں کے منہ پر ایک بہت بڑی چٹان بھی رکھ دی تھی..... کیا یہ سب جھوٹ ہوسکتا ہے..... میرے بیر جھوٹے نہیں ہوسکتے۔

نابکار..... تو رولوکا نہیں بلکہ..... تو کوئی اور ہے اور..... رولوکا کا نام لے کر مجھے ڈرا رہا ہے تو ذرا دم لے..... میں تیری تباہی اور بربادی کے لئے اپنے آقا..... شیطان کو آواز دیتا ہوں۔ تیرا بھیانک انجام اب شیطان آقا کے ہاتھوں ہوگا۔“

اور یہ بولتے ہی مالوتا نے پھر نہ جانے کیا پڑھ کر ہڈی پر پھونک ماری اور ہڈی کا رخ اوپر کو کردیا..... تو ہڈی میں سے چنگاریاں نکل کر اوپر کو اٹھیں اور پھر روشندان سے باہر کو نکل گئیں۔ مالوتا کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ نمودار ہوگئی۔

اور پھر چند لمحے ہی گزرے تھے کہ باہر کو نکلی ہوئی چنگاریاں واپس آکر مالوتا کے سیدھے ہاتھ میں پیوست ہوگئیں..... تو مالوتا کی فلک شگاف چیخ نکل گئی..... ایسا لگتا تھا کہ مالوتا بہت زیادہ کرب و اذیت میں مبتلا ہوگیا ہو اور پھر اذیت کے پیش نظر مالوتا زمین پر بیٹھتا چلا گیا اور زور زور سے ہانپنے لگا۔

پھر سایہ کی آواز سنائی دی۔ ”بے وقوف مالوتا..... تیرا شیطان آقا بھی تیرا ساتھ چھوڑ گیا.....

تو اپنی دانست میں مجھے بہت ہی کمزور سمجھ بیٹھا تھا۔ ارے بے وقوف میں تیری چال سے باخبر تھا اور دراصل میں تجھے اپنی طاقت دکھانا چاہتا تھا۔

جب تیرے بیروں نے مجھے اپنے شکنجے میں جکڑا

تو..... میں خود نہیں تھا..... بلکہ تیرے بیروں نے میرے وجود کی ڈمی..... کو اپنے قبضے میں جکڑ لیا تھا جس کو انہوں نے میرا گمان کیا..... تیرے بیر خود بھی بہت بدحواس تھے۔ وہ خوفزدہ اور سہمے ہوئے تھے کہ کہیں میں ان پر حملہ آور نہ ہوجاؤں۔ اور پھر وہ آندھی طوفان کی طرح آگے بڑھتے چلے گئے اور میری..... ڈمی کو لے جا کر دہکتے ہوئے آتش فشاں میں جھونک دیا۔

خیر جو ہونا تھا..... وہ تو ہوگیا..... اور اب جو ہونا ہے..... اس کا تو تصور نہیں کرسکتا..... تیرا وجود اب مخلوق خدا کے لئے..... باعث عبرت ہوگا۔“

اور پھر دن کا جب اجالا پھیلا تو..... رولوکا اور مالوتا کے گاؤں کے درمیان..... لوگوں نے دیکھا کہ مالوتا کی مسخ شدہ لاش پڑی تھی۔

مالوتا کی لاش دیکھ کر لوگ خوفزدہ تھے..... لوگوں کی زبان پر تھا کہ ”اچھا ہوا..... اس نے لوگوں پر بہت ظلم کر رکھا تھا..... برے کا ہمیشہ برا انجام ہوتا ہے.....“ لوگوں نے سکھ کا سانس لیا۔

اور رولوکا اپنے آستانے میں بیٹھا..... لوگوں کے سوال کا ہنسی خوشی جواب دے رہا تھا۔ جب لوگوں نے بتایا کہ ظالم مالوتا کا خاتمہ ہوگیا ہے تو رولوکا سن کر مسکراتے ہوئے بولا۔

”خس کم جہاں پاک۔“

☆......☆......☆

طوفان اپنے شباب پر تھا!

قہر آلود اور بپھری ہوئی لہروں کی زد میں جہاز تنکے کی طرح ڈول رہا تھا۔

ترلوچ اور برین نے اپنا توازن برقرار رکھنے کی کوشش کی لیکن تختے پر پھیلے ہوئے خون پر اس کا پیر بری طرح پڑ چکا تھا۔ اسی لمحے سیاہ آسمان پر بجلی کڑک دار اور دل ہلا دینے والی آواز کے ساتھ چمکی، ذرا دیر کی روشنی میں اس نے دیکھا کہ اس کے چاروں طرف بھیانک وحشیوں جیسے چہروں والے دشمنوں کے پرے کے پرے لگے ہوئے ہیں ہر طرف زخمیوں کی چیخ و پکار قیامت کا سماں پیش کر رہی تھی۔ رات کی سیاہ تاریکی میں جہاز پر موت و زندگی کا ایک خوف ناک کھیل جاری تھا۔ زخمیوں کی آوازیں دل ہلا دینے والی ہواؤں کی بپھرے ہوئے سمندر کی بپھری لہروں کی غضب ناک صداؤں نے تاریکی میں ڈگمگاتے ہوئے جہاز کو جہنم کے حصے کا رنگ دے رکھا تھا، یوں لگ رہا تھا جیسے دوزخ کی ساری بلائیں بال کھولے ہوئے رات کی سیاہی میں کوئی بھیانک تانڈو ناچ رہی ہوں۔

موت کا کھیل تیز بھی تھا اور بہت بھیانک بھی ترلوچ کے گرتے ہی بجلی ایک بار پھر چمکی اور چشم زدن میں وہ جسم کی پوری طاقت سے اچھل کر ایک طرف ہوگیا ٹھیک اسی لمحہ وہ بار چلا جانے والے اندھیرے میں کسی کا وزنی تیغ فرش کے ساتھ زور سے ٹکرایا۔ پھر ترلوچ کے ہاتھ میں دبا ہوا کلہاڑا گھوما۔ اندھیرے میں ہی اس نے کلہاڑے کو گوشت میں دھنستا ہوا محسوس کیا، فضا میں گونجتی ہوئی چیخوں میں ایک کریہہ چیخ اور ابھری اور کسی کا وزنی جسم فرش پر پڑی ہوئی دوسری لاشوں پر دھم سے گر گیا۔

پیروں پر کھڑے ہوتے ہوتے اس نے ایک بار پھر اندھوں کی مانند کلہاڑا گھمایا۔ ایک چیخ ابھری اور پھر اچانک اس نے اپنے سر پر قیامت ٹوٹتی ہوئی محسوس کی کسی کا وزنی گرز اس کے خود پر پھسلتا ہوا گرا تھا۔ وہ چیتے کی سی پھرتی سے گھوما بجلی ایک بار پھر کڑکی۔ اور اس ایک لمحہ کے وقفہ میں اس نے اپنے سامنے جو چہرہ دیکھا، وہ اجنبی نہ تھا۔ پھر اس کا اٹھا ہوا ہاتھ نیچے نہ آسکا اور اسے اپنے بائیں شانے پر کوئی وزنی چیز گرتی ہوئی محسوس ہوئی تھی اور پھر اس کا دماغ بھی جہاز پر پھیلی ہوئی تاریکی کا ایک حصہ بن گیا۔

ترلوچ نے ہوش میں آتے ہی سب سے پہلی بات جو محسوس کی وہ یہ تھی کہ وہ پورے جسم سے ننگا ہے اس نے اپنے ہاتھ کو اٹھا کر دیکھتے ہوئے شانے کو ٹٹولنا چاہا اور تب اسے پتہ چلا کہ وہ بندھا ہوا ہے جسے کسی ستون کے ساتھ جکڑا ہوا ہے اس کے لئے ممکن نہ تھا۔ جلد ہی اس کی آنکھیں دیکھنے کے قابل ہوگئیں وہ واقعی اس

جانور نما جہاز کے مستول سے بندھا ہوا تھا جو اس کے دشمن حملہ آوروں کی ملکیت تھا۔ اس کی سمجھ میں نہ آسکا کہ اسے آخر زندہ کیوں رکھا گیا ہے وہ خود بھی ایک قانون شکن تھا اور اس کی کوئی توقع نہ تھی کہ سمندری قزاق اس کی زندگی کے عوض کسی سے بھی کوئی رقم وصول کرسکتے ہیں اور وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ یہ بات حملہ آوروں کو بھی معلوم ہے۔

اس وقت تک تیز ہواؤں کا زور ختم ہو چکا تھا۔ لیکن سمندر کی لہریں ہنوز بپھری ہوئی تھیں، آسمان پر تہی ہوئی سیاہ بدلی جا بجا پھٹ رہی تھی۔ اور کبھی کبھی اس میں سے چاند کا چہرہ نکل کر چند لمحوں کے لئے عرشے کو روشن کررہا تھا۔ جنگ جو اسکاٹش ترلوغ جس کا سارا بچپن اسکاٹ لینڈ کے سواحل پر ہی گزرا تھا فوراً سمجھ گیا کہ جہاز کے انجر پنجر طوفان نے ڈھیلے کردئے ہیں۔ کم از کم جہاز کی رفتار یہی کچھ بتا رہی تھی۔

اس فرانسیسی جہاز کو بھی جس پر ترلوغ سفر کررہا تھا، اسی بھیانک طوفان نے آگھیرا تھا پھر اس کا جہاز کسی تنکے کی مانند اپنے راستے سے ہٹا ہوا جنوب کی سمت ڈولتا اور بھاگتا چلا گیا تھا۔ طوفان کے دوران گزرنے والے دن اور رات محشر خیز تھے اور یہ اسی ایک طوفان خیز اور بھیانک رات کی بات تھی کہ اچانک ہی ایک اور جہاز ترلوغ کے جہاز سے زیادہ بڑا اور بھاری اس کے جہاز سے آ بھڑا تھا یقیناً یہ سانپ نما جہاز، بحری قزاقوں کا تھا جو انہیں کی مانند ڈولتا ہوا بڑھ رہا تھا۔ اور پھر ساری فضا میں لوہے سے لوہے کے ٹکرانے کی آوازیں گونجنے لگی تھیں وہ بحری قزاق یقیناً وحشیوں سے بھی بدتر تھے انہیں کشت وخون سے محبت تھی اور پھر وہ طوفان سے بے پروا ہو کر اپنی بھیانک کھیل میں مگن ہو گئے تھے انہوں نے فرانسیسی جہاز کو گھیر لیا تھا اور پھر دونوں جہازوں کے سواروں کے درمیان موت اور زندگی کا ڈرامہ شروع ہو گیا۔ ترلوغ کو یہ بھی پتہ تھا کہ سمندری لٹیروں کے لئے اس کا جہاز کسی دلچسپ ضیافت سے کم ثابت نہ ہوا تھا فرانسیسی جہاز پر ترلوغ واحد شخص تھا جسے جنگ سے محبت تھی اور جو ایک پیدائشی جنگجو تھا۔ سمندری قزاقوں کے لئے یہ جنگ سے زیادہ ایک ذبیحہ تھا ہاں اسے اتنا ضرور معلوم تھا کہ وہ خوب لڑا تھا اس کے کلہاڑے نے اپنی پیاس خوب جی بھر کے بجھائی تھی اس نے اپنے گرنے سے پہلے عرشے کو لاشوں سے پاٹ دیا تھا اور تب اسے اس چہرے کی یاد آئی۔ اس طویل القامت ہیولے کا خیال آیا جس کی جھلک بجلی کی روشنی میں اپنے گرنے سے قبل اسے دکھائی دی تھی.....

''آخر میں نے اسے کہاں دیکھا ہے، وہ کون ہوسکتا ہے؟'' اور پھر اسے یاد آ گیا۔

''آہا..... یہ تم ہو..... جیالے ڈالکیسین۔ ہم آج کتنی مدت کے بعد مل رہے ہیں!''

ترلوغ نے اس شخص کو دیکھا جو اس سے ذرا دور عرشے پر اپنے دونوں پیر پھیلائے کھڑا ہوا تھا۔ ایک انتہائی لحیم شحیم شخص تھا۔ خود ترلوغ کا قد چھ فٹ سے کم نہ تھا مگر اس کا قد ترلوغ سے بھی نکلتا ہوا تھا اس کا سینہ کسی صندوق کی مانند چوڑا تھا اور آہنی بازوؤں میں فولادی مچھلیاں پھڑک رہی تھیں، وہ عرشے پر کسی قد آور درخت کی مانند تنا کھڑا تھا اس کی داڑھی اس کے جس پر سجی ہوئی زرہ ہی کی مانند بھوری تھی اس کے سر پر جما ہوا سینگوں دار خود اس کے قد کو کچھ اور بلند کر کے پیش کررہا تھا لیکن خود کے اندر سے جھانکنے والی اس کی سفید آنکھوں میں غصہ نہ تھا۔ وہ نرم خوئی لئے ہوئے ترلوغ کی نیلی آنکھوں میں جھانک رہی تھیں۔ ''اتھلان..... لمبے سکین!'' ترلوغ اسے دیکھ کر دوبارہ چلایا!

''ہاں.....'' قد آور اتھلان نے بدستور نرم لہجہ میں کہا۔ ''ہاں ہم آج بہت دنوں بعد ملے ہیں آخری بار جب ہم ملے تھے تو تم نے مجھے یہ تحفہ دیا تھا۔'' رک کر اس نے اپنے خود کو ذرا اونچا کر کے اس گہرے زخم کے نشان پر ہاتھ پھیرا جو وہاں بنا ہوا تھا۔ ''ایسا لگتا ہے گویا ہر کشت وخون کی رات ہمارا تمہارا آمنا سامنا مقدر بن گیا ہو، وہ بھی ایک ایسی ہی رات تھی جب تم نے سردار طوخیل کے جہاز کو نذر آتش کیا اور ہم دونوں کی تلواریں ایک دوسرے سے ٹکرائی تھیں، تم کامیاب رہے تھے اور میں زخم کھا کر گر گیا تھا اس رات تم نے مجھے بردگار لوگوں کے

ہاتھوں موت مرنے سے بچایا تھا اور اس رات یہ میں تھا جس نے تمہیں زمین دکھائی ویسے میں نے پورا خیال رکھا تھا کہ تم کوزخم نہ آئے پھر بھی میں نے اپنے تیغ کو الٹی جانب سے تمہارے سر پر دونوں ہاتھوں میں لے کر مارا تھا۔ مجھے پتہ ہے کہ تم اسکاٹ لوگ کتنے مضبوط ہوتے ہو، اور پھر تم بے ہوش ہو گئے تھے۔ ہماری کشتی کے سردار ''تلوڈبرگ'' نے تمہیں بھی تمہاری کشتی کے دوسرے مسافروں ہی کی طرح یقیناً ذبح کردیا ہوتا اگر میں اس سے تمہیں نہ مانگ لیتا۔ کشتی کے سارے قزاق تمہیں اچھی طرح جانتے ہیں اور اسی لئے انہوں نے یہ شرط لگا دی تھی کہ تمہاری جان بخشی اسی صورت میں ممکن ہے کہ تمہیں باندھ دیا جائے۔''

''ہم لوگ اس وقت کس جگہ ہیں؟'' ترلوغ نے دریافت کیا۔

''مجھ سے نہ پوچھو۔ طوفان نے ہمیں راستے سے بہت دور ہٹا دیا ہے۔ ہم اسپین کے ساحل کی طرف جارہے تھے جب محض اتفاق سے ہمارے اور تمہارے جہازوں کا آمنا سامنا ہو گیا تھا اب ہم سمندر کے دھارے پر بہہ رہے ہیں ہمیں کچھ پتہ نہیں کہ ہم اس وقت کن پانیوں میں ہیں ہمارا جہاز بھی بری طرح ٹوٹ پھوٹ گیا ہے ہوسکتا ہے کہ ہم زمین کے آخری سرے پر سفر کررہے ہوں اب ترلوغ تم قسم کھاؤ کہ تم میرے ساتھ رہو گے میں تم کو آزاد کئے دیتا ہوں۔''

''میں، اور تمہارے ساتھ رہنے کی قسم کھاؤں!'' پھنکارتے ہوئے ترلوغ نے کہا۔ ''میں اسی جہاز کے ساتھ سمندر کی تہہ میں بیٹھ جانے کو لاکھ درجہ بہتر سمجھتا ہوں مجھے اس پر کوئی پشیمانی نہ ہوگی، مجھے دراصل صرف ایک چیز کی پشیمانی ہے اور وہ یہ کہ میں اس وقت بندھا ہوا ہوں اور اپنے ساتھ کئی اور سمندری بھیڑیوں کو موت کا ذائقہ نہیں چکھا سکتا۔''

''ٹھیک ہے بھیک ہے۔'' اتھلان نے بدستور نرمی سے کہا۔ ''مگر بہر حال آدمی کو غذا کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں تمہارے ہاتھ کھولے دیتا ہوں اور پھر تم اس گوشت کے ٹکڑے پر اپنے دانت گاڑ دینا۔'' ہاتھ کھلتے ہی ترلوغ نے اتھلان کے ہاتھ سے وہ ران لے لی جو وہ اس کی طرف بڑھائے ہوئے تھا اور اس پر اپنے دانت تیز کرنے لگا، قوی ہیکل اتھلان اسے چند لمحے گوشت کو نوچتے دیکھتا رہا پھر ایک سمت چلا گیا۔

''کتنا عجیب شخص ہے۔'' ترلوغ نے اسے دیکھتے ہوئے سوچا۔ ''یہ شخص جو بحری قزاقوں کے گروہ میں سب سے زیادہ خوف ناک کہا جاسکتا ہے مگر اس کے سینے میں کتنا نرم دل دھڑکتا ہے..... اور اس کی اسی خوبی نے اسے دوسروں سے کتنا الگ کردیا ہے؟''

جہاز ڈولتا ہوا سمندر کی موجوں پر سرکتا رہا واپسی پر اتھلان نے اسے بتایا کہ آسمان پر ایک بار پھر بادل اکٹھا ہونے شروع ہو گئے ہیں۔ اور جہاز کو راستہ دکھائی نہیں دے رہا ہے۔ اس نے کھانے کے بعد بھی ترلوغ کے ہاتھ کھلے ہی رہنے دیئے، دوسرے قزاقوں کو بہر حال اتنی فرصت نہ تھی کہ قیدی کا خیال رکھتے۔ وہ جہاز کو کسی نہ کسی طرح طوفانی سمندر سے نکال لے جانے کے سلسلے میں بری طرح مصروف تھے۔

کچھ ہی دیر بعد ترلوغ کو محسوس ہوا جیسے جہاز تیز تیز ہچکولے کھانے لگا ہو، اچانک ہی ہواؤں میں شدت پیدا ہو گئی۔ جہاز خوفناک موجوں کے زور سے کسی منہ زور گھوڑے کی طرح بھاگنے لگا اور تب جیسے جادو ہو گیا ہو۔ اچانک بادل پھٹا اور چاند کی روشنی میں انہیں ٹھیک سامنے زمین ابھری دکھائی دی، بظاہر یہ کوئی چٹان معلوم ہوتی تھی جہاز پوری رفتار سے ادھر ادھر دوڑ رہا تھا اور اب اس کی تباہی ذرا دیر کی کسر باقی تھی بیک وقت سارے جہاز پر افراتفری مچ گئی سردار لوڈبرگ پوری قوت سے چیخ چیخ کر ملاحوں کو ہدایات دے رہا تھا مگر ترلوغ کا تجربہ اسے بتا رہا تھا کہ جہاز کے بچنے کا اب کوئی امکان نہیں، اسی لمحہ عرشے پر اتھلان دوڑتا ہوا نمودار ہوا۔

''ہمارے بچنے کا اب کوئی امکان نہیں۔'' اس نے جلدی جلدی ترلوغ کی رسیاں کاٹتے ہوئے کہا۔ اب جو حشر ہمارا ہوگا وہی تمہارا بھی ہوگا۔'' رسی کھلتے

ہی ترلوغ اچھل کر ایک سمت کھڑا ہوگیا اس نے اتھلان سے پوچھا۔ ”میرا کلہاڑا کدھر ہے؟“

”یہاں، ہتھیاروں کے اس بکس میں مگر قسم ہے تھور دیوتا کی“ قدرآور سیکسن نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ ”ترلوغ! اس وقت تمہیں ہتھیار باندھ کر خود کو مزید وزنی نہیں بنانا چاہئے۔“

ترلوغ نے سنی ان سنی کرتے ہوئے بکس میں سے اپنا کلہاڑا نکال لیا کلہاڑا ہاتھ میں آتے ہی اسے اپنی خوداعتمادی لوٹتی محسوس ہوئی۔

وحشی خون رگوں میں تیزی سے اچھلا، اسے یوں لگا جیسے اسے کلہاڑی نہ ملی ہو کوئی بلکہ کھوئی دولت مل گئی ہو۔ سچ مچ اسے اپنے ہتھیار سے اتنا ہی پیار تھا، اس کی خواہش یہی تھی کہ مرتے وقت بھی اس کی کلہاڑی اس کے ہاتھ سے جدا نہ ہو۔ اس نے کلہاڑی کو پٹی میں پھنسا لیا۔

”ان پانیوں میں شارک مچھلیاں کثرت سے ہیں۔“ اتھلان نے اپنے جسم پر لدا ہوا زرہ اتارنے کے لئے ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”ہوسکتا ہے ہمیں تیر کر۔“

اسی لمحے جہاز زمین کے ساتھ پورے زور سے ٹکرایا اور شیشے کے کسی گلاس کی مانند اس کے پرخچے اڑ گئے اس کا سرا آسمان کی طرف اٹھ گیا۔ اور اس کے آدمی الٹ الٹ کر گرنے لگے وقت کھوئے بنا ترلوغ نے چھلانگ لگائی اور عرشے کی دیوار عبور کرتا ہوا سمندر میں جا گرا، اب وہ سمندر کی لہروں سے الجھا ہوا تھا چند لمحوں تک وہ دیوانوں کی مانند تند موجوں سے الجھتا رہا لیکن پھر اسے ایک تختہ تیرتا ہوا مل گیا جو تباہ شدہ جہاز سے علیحدہ ہوکر بہہ رہا تھا جس وقت وہ اس پر چڑھ رہا تھا کوئی شے اس کے ساتھ زور سے ٹکرائی اور پھر سمندر کے پانی میں کھستی چلی گئی ایک لمحہ کھوئے بغیر ترلوغ نے تختہ سے کھسک کر اپنا ہاتھ پانی میں ڈال دیا چند ہی لمحوں میں چمڑے کی ایک پٹی اس کی گرفت میں آچکی تھی، پھر اس نے پورا زور لگا کر اسے کھینچ لیا اور پھر جو جسم ابھرا وہ ترلوغ کو چونکانے کے لئے کافی تھا، یہ قوی ہیکل اتھلان کا جسم تھا۔ اس کے بدن پر اس وقت بھی اس کے تمام ہتھیار سجے ہوئے تھے اور اسے اتنی مہلت ہی نہ مل سکی تھی کہ وہ انہیں علیحدہ کرکے خود کو ہلکا کرسکتا تاکہ سمندر میں تیر سکے۔ وہ نیم بے ہوشی کی سی کیفیت میں محسوس ہورہا تھا اور تختے پر کسی لاش کی مانند بے سدھ پڑا تھا۔

اس لکڑی کے چوگارے کا سفر ایسا نہ تھا جسے ترلوغ بھول سکتا۔ بپھری ہوئی تند لہریں کبھی اسے گہرائی میں لے جارہی تھیں اور کبھی یوں لگتا تھا جیسے وہ آسمان کی سمت اچھال دیا گیا ہو۔ اس کے سامنے کوئی چارہ نہ تھا سوائے اس کے کہ قسمت پر شاکر ہوکر نتیجہ کا انتظار کرے اور وہ صبر کے ساتھ اس کا منتظر تھا۔ اس نے ایک ہاتھ سے قدآور اتھلان کے جسم کو اور دوسرے ہاتھ سے تختے کو تھام رکھا تھا اور یہ ایک صبر آزما کام تھا، یوں لگتا تھا جیسے انگلیاں جلد ہی ٹوٹ کر رہ جائیں گی اسے پتا نہیں کہ کتنی دیر تک وہ اس طرح موجوں سے الجھتا رہا اور پھر یہ قسمت ہی تھی کہ وہ کسی نہ کسی طرح پرسکون پانیوں تک جا پہنچا، سامنے ہی کچھ فاصلے پر خشکی کی ایک نوک دور تک سمندر میں در آئی تھی اور تبھی اچانک ایک لمبی سی خونخوار مچھلی اس سے کوئی ایک گز کے فاصلے پر ابھری۔ ترلوغ نے جلدی سے اتھلان کو چھوڑ کر اپنی کلہاڑی نکالی اور بلاتامل اس مچھلی پر دے ماری ایک ہی لمحہ میں قریب کا سمندر خون سے سرخ ہوگیا اور پھر اس نے ایک خوف ناک منظر دیکھا کئی خونخوار مچھلیاں تیزی سے ادھر جھپٹیں اور زخمی مچھلی پر ٹوٹ پڑیں، اب وہ خود اپنی ہی ساتھی کا گوشت نوچ رہی تھیں۔

ترلوغ نے اتھلان کے جسم کو اپنے جسم تلے دبالیا اور ہاتھوں کہ چپوؤں کی مانند استعمال کرتا ہوا تیزی سے دوسری سمت مڑ گیا اس کا رخ اب اس طرف تھا جدھر خشکی نظر آرہی تھی۔

جب وہ اپنے ساتھ اتھلان کے جسم کو گھسیٹا ہوا خشکی پر پہنچا تو اس کے جسم میں جان نہیں رہ گئی تھی اس کے آہنی بازو جواب دے چکے تھے اور فولادی پنجے آرام کے لئے تڑپ رہے تھے۔

وہ پھر وہیں کسی کٹے ہوئے شہتیر کی مانند گر گیا۔ اس کی آنکھیں بند ہوتی چلی گئیں۔

ترلوغ کچھ اچھی نیند نہیں لے سکا جب وہ جاگا تو سورج نکل چکا تھا باوجود کچی نیند کے وہ اس وقت خود کو خاصا تازہ دم محسوس کررہا تھا، وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا خشکی کا وہ سرا جہاں وہ موجود تھا آہستہ آہستہ ایک ڈھلوان کی صورت میں اٹھتا چلا گیا تھا، اس کے آخری سرے پر انتہائی گھنے درختوں کا ایک طویل سلسلہ پھیلا ہوا تھا، یہ درخت زیادہ لمبے نہ تھے لیکن اس قدر گھنے تھے کہ نگاہ ان کے اندر جانے سے قاصر تھی اتھلان اس سے کوئی دس بارہ گز کے فاصلے پر ریت کے بلند ٹیلے پر کھڑا ہوا اپنی تیغہ نما تلوار کا معائنہ کررہا تھا۔

اچانک ترلوغ کی نظر سمندر کی سمت اٹھ گئی اور پھر اس کے منہ سے اطمینان کی ایک لمبی غراہٹ بلند ہوئی۔ وہ لپک کر اچھلتے پانیوں کی سمت بڑھا، وہاں تباہ شدہ جہاز کے قزاقوں میں سے ایک کی لاش پڑی ہوئی تھی، غالباً یہ لاش کسی طرح بہتے بہتے ادھر آگئی تھی ترلوغ نے دیکھا کہ قزاق کے جسم پر تمام ہتھیار زرہ اور خود سبھی کچھ موجود تھی ترلوغ کو ان چیزوں کی سخت ضرورت تھی، اتفاق سے مردے کا جسم بھی کچھ اسی کے جیسا تھا اس نے جلدی جلدی جنگی لباس اس کے بدن سے جدا کیا اور اپنے بدن پر چڑھانے لگا۔ اس سے فارغ ہوکر وہ تیز قدموں سے چلتا ہوا ادھر بڑھا جدھر قوی ہیکل اتھلان کھڑا ہوا تھا اس وقت ترلوغ کی آنکھوں سے اندر کا بغض صاف جھلک رہا تھا۔

قدموں کی چاپ سن کر اتھلان مڑا ترلوغ کو دیکھ کر اس نے پکارا۔

”ہے..... اسکالس.....“ اسے خوش آمدید کہتے ہوئے وہ بولا۔ ”میرا خیال ہے کہ لوڈبرگ کے جہاز کے سواروں میں ہم ہی دو اشخاص زندہ بچے ہیں، باقی سبھی کو طوفان خیز ٹکراؤ سمندر کی گہرائیوں میں لے جاچکا ہے۔ اور ترلوغ! قسم ہے دیوتا تھور کی، کہ میں تمہارا احسان کبھی نہیں بھولوں گا تم نے میری جان بچائی ہے میرے بھاری جسم کو معہ ہتھیاروں کے یہاں تک لے آنا تمہارے سوا کسی اور کے بس کی بات نہ تھی۔ اور تم نہ ہوتے تو شاید میں یا تو ڈوب گیا ہوتا یا پھر مچھلیاں مجھے کھاجاتیں۔“

”ٹھیک ہے۔“ ترلوغ نے خشک لہجے میں کہا۔ ”تم نے میری جان بچائی، میں نے تمہاری جان بچالی! اب حساب بے باق ہوگیا ہے اور اب تم اپنی تلوار سنبھالو تاکہ ہمارے تمہارے درمیان آخری فیصلہ ہوجائے۔“

”تو..... تم مجھ سے لڑنا چاہتے ہو۔ مگر کیوں..... آخر کیوں؟“ بھونچکا ہوکر اتھلان نے اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔

”میں تمہاری نسل سے اسی طرح نفرت کرتا ہوں، جیسے شیطان سے۔“ چیختے ہوئے ترلوغ نے کہا، اس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ ”تمہاری قوم نے میرے ملک کو پانچ سال غلام بنائے رکھا، میرے ملک ساؤتھ لینڈ کے دھواں ہوتے ہوئے مکانات، سیکسن بھیڑیوں کے ظلم کے شاہد ہیں، ہزاروں لڑکیوں اور بچوں کی کراہتی اور بلکتی ہوئی آوازیں میرے کانوں میں ”انتقام انتقام“ کی صدائیں بلند کررہی ہیں۔ اور میں کسی قیمت پر بھی کسی سیکسن کو معاف نہیں کرسکتا۔ کیا تمہاری بزدل قوم میں ایک بھی مرد ایسا نہیں جو میرے کلہاڑے سے ٹکرا سکے؟“

”مگر تمہارے ملک پر حملہ کرنے والوں میں میں تو شامل نہیں تھا۔“ دیوپیکر اتھلان نے الجھے ہوئے لہجہ میں کہا۔

”شرم کرو۔“ ترلوغ زور سے دہاڑا۔ ”تم اٹھاؤ اپنی تلوار، نہیں تو میں تمہارا قیمہ کردوں گا۔“ اس پر جیسے جنون کا دورہ پڑا ہوا تھا۔

”بہتر ہے..... مگر میں اپنی مرضی سے نہیں لڑرہا ہوں۔“ دیوپیکر اتھلان نے اپنی بھاری تلوار کو دونوں ہاتھوں میں دباتے ہوئے کہا۔ اس کا چہرہ گھمبیر تھا اور چہرے پر کسی قسم کے خوف کے آثار موجود نہ تھے۔ ”لوگ ٹھیک ہی کہتے تھے، تم میں جنون کے کچھ نہ کچھ

آثار ضرور موجود ہیں۔'' وہ آہستہ آہستہ سے بڑبڑایا۔

پھر دونوں طرف خاموشی چھا گئی۔ مقابلے کا آغاز ہونے والا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کے سامنے تن چکے تھے ترلوخ کی نیلی آنکھیں خونخوار انداز میں میں اپنے دشمن کو تولتی رہیں، یکا یک وہ چیتے کی سی پھرتی سے جھپٹا، اس کا ہاتھ بلند ہوا اور اس میں دبی ہوئی کلہاڑی برق کی سی سرعت سے اتھلان کے دائیں شانے پر گری اسی لمحے اتھلان کی تیغہ حرکت میں آیا کلہاڑی تیغے کے ساتھ زور سے ٹکرائی ترلوخ اچھل کر ایک سمت ہو گیا، یہ ایک سخت مقابلہ تھا۔ اتھلان کے ہاتھ میں صرف ایک بھاری تلوار تھی اور ترلوخ کے پاس ڈھال اور کلہاڑی۔ صرف ایک ہی کاری وار دونوں میں سے کسی کو بھی ختم کرنے کے لئے کافی تھا۔

ترلوخ نے ایک بار پھر پینترا بدلا اور ابھی وہ وار کرنے کے لئے کلہاڑی گھمانے ہی والا تھا کہ اسے رک جانا پڑا۔ اتھلان کی گرفت بھی تیغے پر کمزور ہو گئی کیونکہ ٹھیک اسی لمحے فضا کی خاموشی ایک بھیانک آواز سے ٹوٹ گئی۔ یہ لرزا دینے والی آواز جنگل کی سمت سے ابھری تھی اور قطعی غیر انسانی لگ رہی تھی۔ حالانکہ یہ یقیناً کسی چیخ سے مشابہ تھی یہ آواز ایسی ہی تھی جیسے کوئی درندہ اپنے شکار پر جھپٹنے سے قبل دہاڑا ہو۔

''قسم ہے تھور دیوتا کی۔'' دیوپیکر اتھلان نے اپنی تلوار کو جھکاتے ہوئے کہا۔ ''یہ آواز کیسی تھی؟''

ترلوخ کے چہرے پر تردد کے آثار ابھر آئے، اس آواز نے خود اس کے آہنی اعصاب بھی جھنجوڑ دیئے تھے۔ ''پتا نہیں۔'' اس نے اپنے سر کو نفی میں ہلاتے ہوئے کہا۔ ''یوں لگتا ہے جیسے جنگل کی کوئی خبیث روح دہاڑی ہو، یہ ایک عجیب وغریب جگہ ہے، یہ سمندر بھی ہمارے لئے قطعی اجنبی ہے ہو سکتا ہے یہاں شیطان کا مسکن ہو اور یہ اسی کی آواز ہو۔''

اتھلان کے چہرے پر بدستور الجھن طاری رہی ترلوخ کی مانند وہ مذہب پسند نہ تھا۔ وہ تو اس سے بھی زیادہ جنگلی اور وحشی تھا اس کے توہمات ترلوخ کے خیالات سے کئی گناہ زیادہ تاریک قسم کے تھے۔

''کچھ بھی ہو۔'' بے یقینی کی سی کیفیت میں اتھلان نے کہا۔

''ہمیں اپنے جھگڑے کو اس وقت ختم کر دینا چاہئے، کسی بھی انجانے دشمن کے مقابلہ میں ایک کے بجائے دو تلواریں زیادہ موثر ثابت ہوں گی۔''

اسی لمحہ فضا ایک بار پھر کسی چیخ کی آواز سے لرز اٹھی لیکن اس بار گونجنے والی چیخ یقیناً انسانی تھی۔ دہشت سے بھرپور..... دوسرے ہی لمحے بھاگتے ہوئے قدموں کی آوازیں بھی سنائی دینے لگیں، ساتھ ہی ساتھ انہیں درختوں سے رگڑتی ہوئی کسی بھاری اور وزنی شے کی آواز بھی سنائی دی، دونوں چونک کر ادھر مڑے..... یہ آواز ادھر سے آئی تھی جدھر کوئی پچاس ساٹھ گز کے فاصلے پر گھنے درخت کھڑے ہوئے تھے۔

دونوں جنگجوؤں کی آنکھیں اب وہاں درختوں کے جھنڈ کی سمت لگی ہوئی تھیں، جہاں سے نکل کر ایک نیم برہنہ عورت تیزی سے دوڑتی چلی آ رہی تھی، اس کے سنہرے بال ہوا میں بری طرح اڑ رہے تھے اور سپید جسم سورج کی روشنی میں جھمک رہا تھا وہ کسی ڈری ہوئی چڑیا کی طرح ہوا میں اڑتی چلی آ رہی تھی، اس کی آنکھیں دہشت سے پھیل ہوئی تھیں اور اس کے پیچھے.....؟

اس کے پیچھے آنے والی ہستی کو دیکھ کر ترلوخ کے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے، وہ ہیولا جولڑکی کا پیچھا کر رہا تھا، نہ تو جانور تھا نہ آدمی، شکل میں کسی پرندے کی مانند تھا، کسی بہت ہی بڑے پرندے کی مانند۔ کم از کم دنیا میں ایسے پرندے کا وجود سوچا بھی نہیں جا سکتا..... قد میں وہ کم سے کم گیارہ فٹ بلند رہا ہوگا، اس کی گردن میں ایک مڑی ہوئی چونچ موجود تھی کسی گھوڑے کی گردن کی مانند موٹی تھی اس کے بھاری سر میں دو سرخ سرخ آنکھیں ابلی پڑ رہی تھیں، اس کے پیر بھی کسی شکاری چڑیا کے پیر کی مانند نوکیلے پنجوں والے تھے وہ اپنے قوی ہیکل پروں کو پھڑپھڑاتا، پھدکتا ہوا لڑکی کے پیچھے دوڑ رہا تھا۔

چند ہی لمحوں میں دونوں قریب آ گئے، لڑکی ایک

تیز چیخ کے ساتھ ترلوخ کے قریب ہی زمین پر گر گئی..... اور تب ایک لمحے کے تاخیر کے بغیر ترلوخ تیزی سے جھپٹ کر لڑکی اور خبیث پرندے کے درمیان آ گیا، پرندے کا سر ترلوخ کے اوپر موت کے کسی بلند مینار کی مانند گھوم رہا تھا۔ دوسرے ہی لمحے پرندے نے اپنی لمبی چونچ سے ترلوخ کے سر کا نشانہ لیا، چنگھاڑ اسکاٹ نے پھرتی سے اپنی ڈھال اوڑھ لی پرندے کی چونچ کسی گرز کی مانند زور سے ٹکرائی۔ پھر ترلوخ کا ہاتھ گھوما اس میں دبی ہوئی کلہاڑی پرندے کے جسم کے ساتھ پوری قوت کے ساتھ ٹکرائی اور ترلوخ کو یوں لگا جیسے اس کا پھل پروں کے انبار میں دھنس کر رہ گیا ہو۔ ایک بار پھر اسے اپنے سر پر تنی ہوئی ڈھال پر پرندے کی چونچ کی ضرب محسوس ہوئی اور وہ لڑکھڑا کر رہ گیا۔

قریب تھا کہ وہ دوسری ضرب سے گر ہی جاتا، یکا یک اتھلان نے جو بوکھلاہٹ کے باعث ابھی تک کچھ سمجھ ہی نہ پایا تھا۔

یکبارگی اپنی بھاری تلوار سر سے بلند کی اور پرندے کی لمبی اور کسی تنے کی مانند موٹی ٹانگوں پر دے ماری، یہ وار کاری تھا، پرندہ کسی ستون کی مانند زمین بوس ہو گیا، اس کے حلق سے ایک چنگھاڑتی ہوئی آواز بلند ہوئی اور لمحہ بھر کے لئے پورا علاقہ جیسے لرز کر رہ گیا۔ ترلوخ نے وقت کھوئے بغیر اپنی کلہاڑی پوری طاقت سے ان سرخ آنکھوں پر دے ماری جو پرندے کے سر میں گویا جڑی ہوئی تھیں اس نے پھر پے در پے کئی وار کئے حتیٰ کہ وہ خبیث روح بالکل ہی بے جان ہو گئی چند لمحوں تک وہ کئی گز کے دائرے میں اپنے قوی ہیکل بازوؤں کو گھسیٹتا ہوا پھرتا رہا۔ پھر ٹھنڈا ہو گیا۔

''تھور کی قسم۔'' دیوپیکر اتھلان نے جس کی آنکھیں جنگی جنون تھیں کہا۔ ''ہم دنیا کے آخری سرے پر آ نکلے ہیں۔''

''اردگرد کا خیال رکھو۔ ہو سکتا ہے اس قسم کا کوئی درندہ اور بھی آ جائے۔'' ترلوخ نے کہا۔ پھر اس نے مڑ کر عورت کو دیکھا جو اٹھ کر بیٹھ گئی تھی اس کی آنکھوں سے ابھی تک خوف مترشح تھا ان میں حیرت و استعجاب بھی کروٹیں لے رہا تھا۔ ترلوخ نے دیکھا، وہ بے حد خوبصورت اور سفید فام عورت تھی اس کے جسم پر کوہلوں کے پاس صرف سلک کی چند دھجیاں لپٹی ہوئی تھیں اور اس حالت میں اس کا سڈول اور سفید بدن قیامت خیز منظر پیش کر رہا تھا۔

ترلوخ کو اپنی سمت دیکھتے پا کر وہ ہانپتی ہوئی اٹھی اور تیز لہجے میں بولنے لگی اس کا لہجہ صاف بتا رہا تھا کہ وہ جو زبان بول رہی ہے وہ شاید اس نے سالوں سے نہیں بولی ہے، وہ ان سے سیکسن اقوام کے مخصوص لہجہ میں مخاطب تھی

''تم لوگ کون ہو..... کہاں سے آئے ہو..... یہاں ''دیوتاؤں کے جزیرے'' پر کیا کر رہے ہو؟''

''تھور کی قسم۔'' اسے بولتے سن کر اتھلان نے کہا۔

''یہ تو ہماری نسل سے معلوم ہوتی ہے۔''

''صرف تمہاری نسل کی۔ میری نہیں۔'' اس ہنگامے میں بھی ترلوخ سیکسن قوم کے خلاف اپنے تعصب کو دبانے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔

عورت نے نظریں اٹھا کر دونوں کو تعجب سے دیکھا۔ ''معلوم ہوتا ہے میرے بعد دنیا خاصی تبدیل ہو گئی ہے۔'' اس نے کہا۔ ''جبھی تو میں بھیڑیے اور جنگلی بیل دونوں کو ایک ساتھ کھڑا دیکھ رہی ہوں۔'' اس نے اپنے اوپر اس عرصہ میں خاصہ قابو حاصل کر لیا تھا، اور اب وہ بڑے سلجھے ہوئے انداز میں بول رہی تھی۔ ''تمہارے بال سیاہ ہیں اور تم یقیناً ایک اسکاٹ ہو..... اور تم، بھاری شخص، تمہارے لہجہ کا اکھڑپن صاف بتا رہا ہے کہ تم سیکسن ہو.....'' عورت نے دونوں کو تولتے ہوئے کہا۔

''ہم دونوں کے جہاز طوفان نے تباہ کر دیئے تھے..... ادھر کا سمندر ان جہازوں کے لوگوں کی لاشوں سے پٹا پڑا ہے۔ ایک جہاز پر اتھلان..... محافظ دستے کا تیغ زن تھا اور میں اس جہاز کا قیدی۔'' ترلوخ نے جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''میرا نام ترلوخ ہے۔ کبھی میں اوبرین قبیلہ کا سردار ہوا کرتا تھا۔ اور تم کون ہو، یہ

کون سی جگہ ہے؟‘‘

’’یہ جگہ.....‘‘ عورت نے جواب میں کہا۔ ’’بے حد قدیم ہے، روم، مصر اور یونان کی تہذیبیں اس کے آگے بچوں کی مثل کہی جاسکتی ہیں، اس طرح اس خطہ کو دنیا کا قدیم ترین خطہ کہا جاسکتا ہے، رہی میں۔ تو میرا نام برنائی ہے۔ میں آرک نیمز کے حکمران کی پوتی ہوں۔‘‘

ترلوغ نے حیرت کے جذبات کے ساتھ اتھلان کی سمت دیکھا اس کے لئے یہ ساری باتیں عجوبہ روزگار سے کم نہ تھیں۔

’’جو کچھ میں نے یہاں دیکھا ہے اس کے بعد میں ہر بات پر یقین کرنے کو تیار ہوں۔‘‘ قوی ہیکل اتھلان نے منہ چلاتے ہوئے کہا۔

’’مگر کیا واقعی تم سردار طورخن کی پوتی ہی ہو، وہی لڑکی جسے چرا لیا گیا تھا؟‘‘

’’بلاشبہ!‘‘ ہاتھ اٹھا کر چلاتے ہوئے لڑکی نے کہا۔

’’ہاں میں وہی لڑکی ہوں جسے اغوا کرلیا گیا تھا اور یہ تب کی بات ہے جب پاگل بحری ڈاکو ٹوسنگ نے میرے قلعہ پر حملہ کیا تھا اور اسے تاراج کر ڈالا تھا، میرا باپ اور دادا دونوں اس وقت وہاں موجود نہ تھے۔‘‘

’’مگر اس کے بعد ٹوسنگ لاپتہ ہوگیا تھا۔ غالباً اس کا جہاز ڈوب گیا تھا۔‘‘ بیچ میں بات کاٹ کر اتھلان نے کہا۔ ’’تم صحیح کہتی ہوں ٹوسنگ یقیناً پاگل ہی تھا میں خود بھی ایک بار اس کے گروہ میں شریک ہوچکا ہوں اس وقت میں نہایت کم سن تھا۔‘‘

’’اور یہ اس کا پاگل پن ہی تھا کہ انگلستان کے سواحل کو تاراج کرنے کے بعد اس کے دل میں نئی نئی جگہوں پر اپنا پرچم گاڑنے کی دھن سمائی تھی اور پھر وہ سمندر میں انجانے راستوں پر نکل پڑا تھا وہ جنوب کی سمت چلتا رہا، چلتا رہا، حتیٰ کہ اس کے گروہ کے بھیڑیئے تک تنگ آگئے اور پھر ایک بلا خیز طوفان نے اس کے جہاز کو آدبوچا اور وہ ایک جزیرے سے ٹکرا کر پاش پاش ہوگیا، بالکل تمہارے جہاز کی مانند۔ ٹوسنگ اور اس کے سارے ساتھی موت کے گھاٹ اتر گئے۔ البتہ میں ایک تختے کے ساتھ چمٹی ہوئی بہتی رہی، یہاں تک کہ ایک ساحل پر مجھے لہروں نے لا پھینکا، میں اس وقت نیم مردہ حالت میں تھی اس وقت میری عمر صرف پندرہ سال کی اور یہ آج سے دس سال قبل کا واقعہ ہے۔

جہاں میں پہنچی تھی وہ عجیب وغریب علاقہ تھا، یہاں ایک عجیب خوف ناک نسل رہ رہی تھی انہیں سیاہ جادو آتا تھا۔ ان کی رنگت تانبے کی مانند بھوری تھی انہوں نے مجھے ساحل پر پڑے ہوئے دیکھا اور چونکہ میں پہلی سفید فارم عورت تھی جو انہیں صدیوں میں نظر آئی تھی ان کے مہمان پجاری نے اعلان کردیا کہ زمیں بنت بحر ہوں، سمندر کی دیوی جو انہیں سمندر نے بخشی ہے۔‘‘

اس طرح مجھے ایک مندر میں لا ڈالا گیا اور وہاں دوسرے دیوتاؤں اور بتوں کے ساتھ میری پرستش بھی شروع کردی گئی ان کے مہمان پجاری بوڑھے گوتھان کا دیوتا اس پر لعنت نازل کرے مجھے جادو کے اسرار سکھانے شروع کردیئے جلد ہی میں نے ان کی زبان سیکھ لی اور بہت سے رازوں سے بھی واقف ہوگئی جوں جوں میں بڑی ہوتی گئی میرے اندر اقتدار اعلیٰ کی ہوس بھی بڑھتی چلی گئی سبھی جانتے ہیں کہ شمال کے رہنے والے پیدا ہی اس لئے ہوئے ہیں کہ دنیا پر حکمرانی کریں۔ ویسے بھی سمندر کے بادشاہ کی بیٹی کے لئے یہ قطعی مناسب نہ تھا کہ وہ صرف مندر کی مورت بنی بیٹھی رہتی اور جانوروں اور انسانی جانوں کی بھینٹ ہی پر قناعت کرتی رہے۔‘‘

وہ ایک لمحہ کے لئے چپ ہوگئی اس کی آنکھوں میں آگ سی دہک رہی تھی، وہ حقیقتاً اس وقت ایک وحشی نسل کی وحشی بیٹی کا اصل روپ پیش کررہی تھی۔

پھر..... اس نے اپنی داستان جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ’’اسی قوم میں ایک شخص ایسا بھی تھا جو مجھے بہت پسند تھا۔ اس کا نام کوٹار تھا وہ اپنے خاندان کا سردار تھا اس کے اشتراک سے میں نے ایک سازش مرتب کی اور بوڑھے پجاری کی بالادستی کو نوچ پھینکا، وہ ایک ہنگامہ خیز

زمانہ تھا۔ بڑا زبردست کشت وخون ہوا۔ عورتیں اور بچے گلیوں میں مکھیوں کی مانند مارے جانے لگے، بال سا گوتھا کے شہر میں خون کی ندیاں بہہ گئیں لیکن آخر کار جیت ہماری ہوئی کوٹار اور میں بالآخر اپنی سازش میں کامیاب ہوگئے۔ یہ تھا اگار خاندان کی حکمرانی کا اختتام اور میرے اور کوٹار کے اقتدار کا آغاز۔ پورے جزیرے پر ایک دیوی اور ملکہ کی صورت میں اب میرا حکم چلتا تھا۔‘‘

رک کر اس نے اپنا سر بلند کرلیا اس کا عریاں سینہ تن گیا اس کی آنکھوں میں فخر ومباہات کی جھلک عود کر آئی۔ ترلوغ کی نظریں اس کے تنے ہوئے جسم پر پڑیں اور اس پر بیک وقت زبردست کشش اور کینہ دونوں نے حملہ کردیا ترلوغ خود بھی کئی سرداروں کے عروج وزوال کے مناظر دیکھ چکا تھا اور اس داستان کے دوران اس کے تخیل نے پوری طرح اس سارے ماحول کو پرکھا اور سمجھا تھا اس کے سارے احساسات اسے بتا رہے تھے کہ یہ عورت جو اس کے سامنے ہے کتنی دلیر اور کتنی سازشی ہوسکتی ہے۔

’’خوب۔‘‘ ترلوغ نے اسے تولتے ہوئے پوچھا۔ ’’مگر جب تم ایک ملکہ تھیں تو پھر یہاں کیا کررہی ہو اور یہ ہیبت ناک مخلوق تمہارے پیچھے کیوں پڑی ہوئی تھی؟‘‘

جواب میں برنائی نے اپنے ہونٹ کاٹ لئے اس کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ بلند آواز میں اس نے کہا۔ ’’تم خوب جانتے ہو کہ عورت بہرحال کمزور ہوتی ہے، میرے ساتھ بھی وہی ہوا۔ میرے محبوب کوٹار نے میرے ساتھ دھوکا کیا۔ میں نے اسے خاک سے اٹھا کر آسمان کی بلندی عطا کی تھی اس نے میری ہی پیٹھ پر چھرا گھونپ دیا مجھے پتہ چلا کہ وہ پوشیدہ طور پر ایک دوسری عورت سے تعلقات استوار کئے ہوئے ہے، میرا خون کھول گیا اور پھر میں نے دونوں کو ہی ختم کر ڈالا۔‘‘ ترلوغ کے ہونٹوں پر ایک بے رحم مسکراہٹ ابھر آئی۔ ’’بے شک تم ایک سو فصید خالص برنائی ہو۔ میں تسلیم کرتا ہوں۔‘‘

’’کوٹار اپنے لوگوں میں بے حد مقبول تھا، بوڑھے پجاری گوتھان نے موقع سے فائدہ اٹھایا۔ یہ میری غلطی تھی کہ میں نے اس منحوس کو چھوڑ دیا تھا، ویسے بھی میں اسے مروانے کی ہمت نہیں کرسکتی تھی گوتھان نے میرے خلاف محاذ کھڑا کردیا۔ پھر میری وفادار فوج اور باغیوں میں زبردست معرکہ ہوا اور مجھے شکست ہوگئی مجھے قیدی بنالیا گیا لیکن ان میں اتنی جرأت نہ تھی کہ مجھے قتل کرسکے کیونکہ میں بہرحال صرف ملکہ ہی نہیں ایک دیوی بھی تھی سمندر کی بیٹی، لہٰذا صبح ہونے سے قبل ہی محض اس خوف سے کہ عوام نہیں دوبارہ میرے دام میں نہ آجائیں گوتھان مجھے اس کھاڑی کی سمت لے گیا، جو جزیرے کو دو حصوں میں تقسیم کرتی ہے پجاری نے مجھے کھاڑی میں ڈھکیل دیا اور اپنے آدمیوں کے ذریعہ اس پار پہنچادیا اور پھر یہاں مجھے ننگے بدن اور بھوکے پیٹ کے ساتھ چھوڑ دیا گیا، تاکہ میں تقدیر کا لکھا بھگتوں۔‘‘

’’اور وہ تقدیر..... یہ تھی؟‘‘ اتھلان نے پرندے کے جسم کو ٹھوکر مارتے ہوئے کہا۔

برنائی نے تھرتھری سی لی۔ ’’یہاں کی روایت کے مطابق صدیوں قبل اس جگہ ایسی بہت سی مخلوق موجود تھی اور وقتاً فوقتاً یہ درندے بال سا گوتھا پر حملہ آور ہوتے رہتے تھے اور ہر بار ہزاروں جانوں کا زیاں کرجاتے تھے لیکن آخر کار صدیوں کی جدوجہد کے بعد ان کا قلع قمع کردیا گیا تھا اس جزیرے پر اب یہ واحد پرندہ رہ گیا تھا قدیم دور میں اسے بھی ختم کرنے کی بہت سی کوششیں ہوئی تھیں مگر یہ سب سے زیادہ خبیث اور سب سے زیادہ طاقتور تھا اس نے ہر آنے والے کو ختم کر ڈالا نتیجتاً مہمان پجاری نے اسے بھی ایک دیوتا قرار دیدیا اور یہ جزیرہ اسی کو سونپ دیا۔ یہاں کوئی بھی آنے کی جرأت نہیں کرتا تھا البتہ گاہے بگاہے پجاری اسے انسانوں کی بھینٹ دیتا رہتا تھا، جیسے کہ میں یہاں بھیجی گئی تھی اس پرندے کے لئے خلیج کا پار کرنا مشکل تھا کیوں کہ ساری خلیج شارک مچھلیوں سے پر ہے جو اسے کسی طرح زندہ نہ چھوڑتیں۔

اس جزیرے پر پھنکے جانے کے کچھ عرصہ تک تو میں اس موذی درندے کی نظروں سے چھپی رہی لیکن جلد ہی اس نے مجھے درختوں میں بھی تلاش کرلیا

اور پھر بعد میں جو کچھ ہوا اس سے تم دونوں واقف ہی ہو، تم نے میری جان بچائی ہے اور تمہارا یہ احسان میرے سر پر ہے اب تم بتاؤ کہ تم میرے لئے اور کیا کچھ کرسکتے ہو؟"

جواب میں ترلوغ نے استفسارانہ نظروں سے اتھلان کی سمت دیکھا اور پھر بولا۔ "ہم لوگ سوائے اس کے کہ اس اجنبی جگہ پر بھوک سے مرنے کے لئے تیاری کریں اور کیا کرسکتے ہیں؟"

"اوہ......!" یکا یک برنائی کی آنکھوں میں ایک نئی چمک عود کر آئی۔ گویا اس کے تیز رفتار دماغ نے کوئی نئی ترکیب سوچ لی ہو، اس نے اپنے ہاتھ بلند کرتے ہوئے کہا۔ "آؤ! میں تمہیں بتاتی ہوں کہ تم اب کیا کرو۔ مجھے معلوم ہے کہ یہاں کے باشندوں میں ایک قدیم روایت چلی آرہی ہے، کہا جاتا ہے کہ کسی دور میں یہاں لوہے کے آدمی وارد ہوں گے اور ان کی آمد کے ساتھ ہی مملکت بال ساگوتھا کا زوال ہوجائے گا یہاں کے لوگوں نے لوہے کا جنگی لباس کبھی نہیں دیکھا ہے، وہ تمہیں یقیناً لوہے کا آدمی تسلیم کرلیں گے، ویسے بھی تم سمندر کے راستے آئے ہو جیسے کہ میں آئی تھی اور یہ بات بھی ان پر مزید اثر انداز ہوگی۔ اور وہ تمہیں بھی دیوتا کا درجہ دیدیں گے۔ "اے جوانو! آؤ میرے ساتھ میری کھوئی ہوئی سلطنت مجھے واپس دلانے میں میری مدد کرو اور تمہیں اپنے داہنے ہاتھ کی مانند تصور کروں گی۔ تمہیں عظیم الشان محل رہنے کے لئے دوں گی، عمدہ لباس اور اعلیٰ ترین کھانے تمہیں مہیا کئے جائیں گے۔ اور بال ساگوتھ کی حسین ترین دوشیزائیں تمہیں بخش دی جائیں گی۔"

ترلوغ پر ملکہ کی ترغیب آمیز باتیں کچھ زیادہ اثر انداز نہ ہوسکیں۔ البتہ اس کے لئے یہ تصور بڑا ہی پرکشش تھا کہ وہ ایک پوری مملکت کے خلاف تن تنہا صف آرا ہونے کے لئے پکارا جارہا ہے اس کے وحشی خون میں جنگ کے جلترنگ بجنے لگے۔

"خوب!" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ "اتھلان! تمہارا کیا ارادہ ہے؟"

"میرا ارادہ؟" قوی ہیکل اتھلان نے منہ چلاتے ہوئے کہا۔ "میرا پیٹ خالی ہو، مجھے ادھر لے چلو، جدھر خوراک ملتی ہو، پھر مجھے نہ پجاریوں کی پروا ہوگی نہ سورماؤں کی، خواہ وہ ہزاروں کی تعداد ہی میں کیوں نہ ہوں؟"

"ٹھیک ہے۔" ترلوغ نے برنائی سے کہا۔ "چلو ہمیں شہر کی سمت لے چلو۔"

"شاباش!" نعرہ مارتے ہوئے برنائی نے کہا اس کی آواز میں بلا کا جوش ابھر آیا تھا۔ "اب میں گوتھان آسکا اور گلکا سب کو دیکھ لوں گی تمہاری مدد سے اپنا کھویا ہوا تاج جلد ہی واپس چھین لوں گی میں اس بار اپنے کسی دشمن کو نہیں بخشوں گی اور گوتھان کو کتے کی موت ماروں گی، میں دیکھنا چاہتی ہوں کہ مہان پجاری کی سیاہ طاقتیں کس طرح اس تلوار کا مقابلہ کرتی ہیں جس نے خوف ناک پرندے گولکا کی ٹانگیں کاٹ ڈالی تھیں۔ اب تم ذرا اس پرندے دیوتا کا سر کاٹ لو تاکہ شہر کے افراد اس کو دیکھ کر عبرت پکڑیں۔ میں جلد سے جلد شہر پہنچنا چاہتی ہوں اور میرا ارادہ ہے کہ آج کی رات میں اپنے محل ہی میں گزاروں۔"

پھر وہ تینوں اس ڈھلوان پر چڑھنے لگے جو جنگل کی سمت جاتی تھی۔ پورا جزیرہ، گھنے درختوں سے اٹا پڑا تھا اور انہیں راستہ بنا کر چلنے میں سخت دشواری پیش آرہی تھی۔ اندر گھنی تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ البتہ کہیں کہیں سورج کی روشنی چھن کر آجاتی تھی، وہ لوگ اسی طرح چلتے رہے کئی مقامات پر انہیں چند بندر نما جانور نظر آئے لیکن ان میں سے کوئی بھی خطرناک نہیں تھا وہ انہیں دیکھتے ہی چھپ جاتے۔ کافی دیر تک چلنے کے بعد درختوں کا گھناپن لگا حتیٰ کہ دوبارہ ایک ڈھلوان پر نکل آئے۔ جو درختوں سے تقریباً عاری تھی درختوں سے گزرتے ہوئے انہیں جابجا مختلف قسم کے میوہ دار درخت نظر آئے تھے انہوں نے پھل توڑ کر کھائے جس سے دونوں لڑاکوں کی بھوک کسی قدر کم ہوئی ویسے اتھلان کو پھل کھاتے ہوئے کچھ لطف محسوس نہ ہوا تھا وہ گوشت خور شخص تھا اور اس کے دانت پھلوں میں دھنستے ہوئے

بدمزگی محسوس کررہے تھے۔

ایک جگہ رک کر برنائی نے بلند آواز میں کہا۔ "دیکھو، ادھر دیکھو۔ بال ساگوتھ کی عمارتیں یہاں سے نظر آرہی ہیں۔"

ترلوغ اور اتھلان نے دیکھا۔ وہاں سے کافی دور درختوں کے اوپر سے ابھری ہوئی نوکیلی عمارتیں نظر آرہی تھیں، وہ سفید رنگ کی تھیں اور ان پر سورج کی کرنیں چمک رہی تھیں۔

ترلوغ کے ذہن میں کسی جادوئی بستی کے تصورات ابھرنے لگے یہ منظر اس کے لئے بڑا ہی خوش کن اور حیرت انگیز تھا اتھلان کے چہرے پر بھی تعجب کے آثار نمایاں تھے، وہ خاموشی سے ان قدیم طرز کی عمارتوں کی پراسرار خوبصورتی سے گہرا تاثر لے رہا تھا کچھ دیر بعد ہی درختوں کے ایک دوسرے سلسلے نے یہ منظر ان کی نظروں سے چھپالیا لیکن جلد ہی یہ سلسلہ ختم ہوگیا اور وہ جزیرے کے سرے پر جانکلے جہاں سے خلیج کا نیلا پانی شروع ہوتا تھا۔ خلیج کے دوسرے سرے پر بال ساگوتھ اپنی پوری رعنائی اور پراسرار خوبصورتی کے ساتھ کھڑا تھا۔ بظاہر یہ نشیب سے فراز کی سمت مائل تھا عمارتیں آہستہ آہستہ بلند تر ہوتی چلی گئی تھیں۔ اس کنارے پر لمبی گھاس اگی ہوئی تھی۔ اور شہر کے دونوں جانب جزیرے کے کناروں کے ساتھ ساتھ اونچے اونچے درختوں کا ایک طویل سلسلہ پھیلا ہوا تھا برنائی نے انہیں بتایا کہ یہ جنگلات پورے شہر کے چاروں طرف پھیلے ہوئے ہیں اور بال ساگوتھ ان کے عین وسط میں آباد ہے۔

"دیکھو کیا یہ عظیم الشان شہر اس قابل نہیں ہے کہ اس کے لئے جان کی بازی لگائی جاسکے۔" پرارتعاش آواز میں برنائی نے انہیں مخاطب کیا۔ "اب تاخیر نہ کرو، فوراً بانس اور لکڑیوں کا ایک چوگارہ بناؤ تاکہ ہم خلیج پار کرلیں، اس پانی میں تیرنا موت کو دعوت دینا ہوگا کیونکہ اس میں شارک مچھلیاں کثرت سے پائی جاتی ہیں۔"

اسی لمحے دوسرے کنارے پر انہیں لمبی گھاس میں سے ایک شخص کی شکل ابھرتی دکھائی دی، وہ تقریباً نیم عریاں تھا اس کا بدن بھوری جلد کا تھا چند لمحوں تک وہ ان لوگوں کو حیرت زدوں کی مانند کھڑا دیکھتا رہا۔

تب اتھلان نے اپنے حلق سے زور کی آواز نکالی اور پھر اپنے ہاتھ کو اونچا کرکے اسے مارے ہوئے پرندے کا سر دکھایا ننگے وحشی کی نظریں جونہی پرندے کے سر سے ٹکرائیں تو وہ متوحش ہوکر سرپٹ بھاگ اٹھا۔

"یہ پجاری کا چھوڑا ہوا غلام تھا۔" برنائی نے بتایا۔ "اسے یہاں یہ دیکھنے کے لئے چھوڑا گیا ہوگا کہ میں تیر کر واپس آنے کی کوشش تو نہیں کرتی ہوں، اچھا ہے اسے جانے دو یہ جا کر شہر میں ہماری واپسی کی خبر پھیلا دے گا ہمیں جلدی سے چوگارہ تیار کرکے خلیج پار کرلینا چاہئے ورنہ ممکن ہے کہ پجاری ہمارے راستے کو بند کرادے۔"

تھوڑی دیر کی جدوجہد کے بعد ترلوغ ایک بھدا سا چوگاہ تیار کرنے کے قابل ہو ہی گیا پھر ان تینوں نے اسے خلیج میں ڈال دیا اور تیزی سے دوسرے کنارے کی سمت بڑھنے لگے جب برنائی نے دوسرے کنارے پر قدم رکھا تو اس کے منہ سے اطمینان کی ایک لمبی غراہٹ نکلی۔

"اب ہمیں تیز قدموں سے چل کر شہر کی طرف بڑھنا چاہئے اس عرصے میں پجاری کو ہماری آمد کی اطلاع مل چکی ہوگی لہٰذا بہتر ہے کہ ہم دلیری سے آگے بڑھیں، وہ لوگ شہر کی دیواروں سے جھانک رہے ہوں گے کاش میں مہان پجاری کا چہرہ دیکھ سکتی یقیناً جب اسے معلوم ہوا ہوگا کہ میں دو جنگجو جوانوں کے ساتھ واپس آرہی ہوں تو اس کا منہ دھواں دھواں ہوگیا ہوگا اور یہ جان کر کہ ہم ساتھ میں گروتھ گولکا کا سر بھی لا رہے ہیں اس کا اور بھی برا حال ہوا ہوگا۔"

"مگر تم نے اقتدار میں رہنے کے باوجود بھی پجاری کو زندہ کیوں رہنے دیا تھا؟" اتھلان نے پوچھا۔

جواب میں برنائی کے چہرے پر سپیدی چھا گئی۔

"کہنا آسان اور کرنا مشکل۔" اس نے کہا۔ "پجاری کو مارنا آسان نہ تھا۔ شہر کے آدھے باسی اس کے وفادار

اور آدھے اس سے بیزار۔ لیکن اتنی بات طے ہے کہ وہ سب کے سب اس سے خوف زدہ ضرور رہتے ہیں اور یہ حقیقت بھی ہے کہا جاتا ہے کہ وہ کئی صدیوں سے زندہ ہے اور پراسرار قوتوں کا مالک ہے۔

وہ حقیقتاً عجیب و غریب طاقتیں رکھتا ہے خود مجھے بھی اس کا خاصہ تجربہ ہے۔ اس کے قبضے میں کئی خبیث روحیں موجود ہیں جنہیں اس نے اس پہاڑ کی گہرائیوں میں رکھ چھوڑا ہے جس پر شہر بال سا گوتھ آباد ہے بال سا گوتھ میں ایک نہیں، کئی دیوتاؤں کا سکہ چلتا ہے مگر ان سارے دیوتاؤں میں سب سے بڑے دیوتا کا نام ہے "گال گوروتھ" جس کے معنی ہیں سمندر کی دیوی، لہٰذا کسی کو میرے حکم سے سرتابی کی جرأت نہ ہوتی، میں نے کئی مضبوط جوانوں کو بھیجا تھا کہ وہ ہتھوڑوں اور دوسرے ہتھیاروں سے گال گوروتھ کی مورتی کو اکھاڑ پھینکیں لیکن وہ اپنی کوششوں میں کامیاب نہ ہوسکے مجبوراً میں نے اس مندر بند کردیا تھا البتہ میرے تخت سے ہٹنے کے بعد جب پجاری دوبارہ بحال کردیا گیا تب سے یہ مندر دوبارہ کھل گیا ہے وہاں سے میری مورتی کو اٹھا کر سمندر میں پھینکوادیا گیا مگر اب میں سب کو دیکھوں گی۔"

"بلاشبہ تم ایک سچی قزاق ہو۔" اتھلان نے کہا۔

"مگر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسے لوگوں سے جنہیں جادو بھی آتا ہے۔ بھلا ہم تین افراد لڑ کر تخت کیونکر چھین سکیں گے؟"

"پھر....." مسکراتے ہوئے برنائی نے جواب دیا "ٹھیک ہے کہ یہ لوگ پراسرار اور عجیب ہیں لیکن بعض معاملات میں ان سے زیادہ بے وقوف قوم کہیں اور نہیں مل سکتی مجھے یاد ہے کہ جب گوتھان اقتدار میں آیا تھا تو لوگوں نے میرے منہ پر تھوکا تھا اور سارے شہر میں گھمایا گیا تھا مگر اب "آسکا" کی باری ہے۔ جسے مہان پجاری نے نیا حکمران بنایا ہے اور تم دیکھنا کیا ہوتا ہے۔ لو، ہم شہر کے پھاٹک تک آگئے..... اب ذرا حوصلے سے کام لو۔"

وہ تینوں ڈھلان پر چڑھ کر شہر کی فصیل کے نزدیک پہنچ چکے تھے جو ہاتھی کے قد سے بھی زیادہ بلند تھی۔ اسے دیکھ کر ترلوغ نے سوچا کچھ عجیب نہیں کہ اس شہر کو دیوتاؤں نے ہی تعمیر کیا ہو۔ یہ فصیل سنگ مرمر کی بنی ہوئی تھی اس میں جابجا محافظوں کے لئے برجیاں بنی ہوئی تھیں اس کے سامنے روم، نینوا، بابل، نینوا اور دمشق کے قلعے بچوں کا کھیل معلوم ہوتے تھے، پھاٹک تک، پتھریلی ڈھلوان پر ایک سفید چوڑا راستہ بنا ہوا تھا، فصیل کا اوپری حصہ بالکل سنسان لگتا تھا اور یوں معلوم ہورہا تھا جیسے یہ شہر مردوں کا شہر ہو لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ ان خوفناک متجسس اور ہزارہا آنکھوں کی موجودگی کو بھی محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتے تھے جو انہیں روزنوں سے جھانک رہی تھیں..... ان کے ایک ایک قدم کا جائزہ لے رہی تھیں۔

آہستہ آہستہ وہ بڑے سے پھاٹک کے بالکل قریب پہنچ گئے۔ سنگ مرمر کی فصیل میں جڑا ہوا یہ بھاری پھاٹک ٹھوس چاندی کا بنا ہوا تھا اتھلان کی آنکھیں حیرت سے ابل پڑیں۔

"تھور کی قسم!" وہ بڑبڑایا۔ "ہم کسی بہت ہی مالدار ملک کے پھاٹک پر کھڑے ہیں، اس وقت صرف چند سو مضبوط جوان، اور بڑی کشتی میرے پاس ہوتی تو اس شہر کا سارا مال میرا ہوتا۔"

"پھاٹک کو دھکا دے کر فوراً پیچھے ہٹ جاؤ تاکہ کوئی شے تمہارے اوپر نہ گرائی جاسکے۔" برنائی نے ہدایت دیتے ہوئے کہا اور تب ترلوغ کی کلہاڑی پھاٹک کے ساتھ زور سے ٹکرائی اور اس کی گونج پہاڑی کی چوٹیوں تک پھیلتی چلی گئی۔

اسی لمحہ۔ اچانک پھاٹک اندر کی سمت کھلتا چلا گیا اور تب انہوں نے دیکھا کہ ان کے سامنے وحشی جنگ آزماؤں کی ایک پوری پلٹن سینہ تانے کھڑی ہے، ان سے صرف چند گز کے فاصلے پر یہ سارے کے سارے قوی، لمبے قد اور سڈول جسموں والے تھے ان کے جسموں پر چیتے کی کھال جیسا کوئی لباس کمر اور جسم کے ارد گرد منڈھا ہوا تھا، ان کے سروں پر رنگ برنگ کے پروں کی کلغیاں لگی ہوئی اور لباس کے بٹنوں کی جگہ،

ہیرے اور قیمتی پتھر ٹکے ہوئے تھے ان کے پاس ہتھیار قسم کی کوئی خاص چیز نہ تھی البتہ سب کے ہاتھوں میں نہایت مناسب ساخت کی لکڑی کی ڈھالیں ضرور دبی ہوئی تھیں اور کمر سے کوئی ہاتھ بھر لمبے شکاری چاقو اڑسے ہوئے تھے۔ یہ تھے ان کے جملہ ہتھیار۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ ان جنگ آزماؤں کو ہتھیاروں کے وزن سے زیادہ اپنے پھرتیلے پن پر اعتماد ہے۔

اس جنگی گروہ کے عین مقابل تین افراد خاصے نمایاں نظر آرہے تھے، ان میں سے ایک جس کا قد، خود اتھلان کے قد کی مانند لمبا تھا تیکھے نقوش اور سڈول جسم والا تھا اس کی آنکھیں کسی شکرے کی مانند، تیز اور چمکدار تھیں، اس کے جسم پر کاندھے سے کمر تک ایک طلائی زنجیر پڑی ہوئی تھی جس میں دل کے مقام پر ایک نادر روزگار پتھر ٹنکا ہوا تھا اس کے نزدیک کھڑا ہوا دوسرا شخص خاصہ نوجوان تھا لیکن چہرے مہرے سے قطعی اچھا نہ لگتا تھا۔ اس کے بازوؤں کے دونوں جانب کھال کے ساتھ طوطوں کے رنگین پر اڑسے ہوئے تھے۔

تیسرا شخص ان دونوں سے کوئی دو گز کے فاصلے پر تنہا اور خاموش کھڑا تھا اس کی شخصیت سارے گروہ میں سب سے منفرد نظر آتی تھی اس کے جسم پر جنگ آزماؤں جیسا لباس بھی نہ تھا اس نے سادہ لباس پہن رکھا تھا اور پورے مجمع میں یہ واحد شخص تھا، جس کے چہرے پر داڑھی تھی یہ داڑھی بالکل برف کی مانند سفید تھی اس کے سر کے بال بھی بھنوؤں تک سفید تھے یہ بھی اوروں کی ہی مانند قد میں نکلتا ہوا اور ساخت میں منحنی اور دبلا پتلا تھا اس کے چہرے پر سب سے اہم چیز اس کی آنکھیں تھیں۔ تیز، اور شکاری چڑیا کی مانند چمکیلی آنکھیں۔ یوں لگ رہا تھا جیسے یہ کسی اندرونی آگ میں دہک رہی ہوں۔

ترلوغ اسے دیکھتے ہی سمجھ گیا کہ یہ بوڑھے پجاری گوتھان کے سوا اور کوئی نہیں تھا حقیقتاً اس کی پوری شخصیت صدیوں کے رموز اور عجائب کے ایک پراسرار لبادے میں لپٹی نظر آرہی تھی۔

صاف نظر آرہا تھا کہ اس شخص نے اپنے ریاض و مجاہدے کے بل پر کوئی ایسی طاقت حاصل کرلی ہے جس کے باعث عام آدمی کے مقابلے میں اسے ایک ممتاز مقام حاصل ہوگیا ہے۔ اس کی آنکھوں کی سمت دیکھتے ہوئے خود ترلوغ کے آہنی اعصاب جواب دیتے ہوئے محسوس ہوئے اسے یوں لگا جیسے اس نے کسی سانپ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دی ہیں۔

ترلوغ نے جب نگاہیں اٹھائیں تو اس نے دیکھا کہ سنسان فصیل بھی اس عرصے میں آدمیوں کے ہجوم سے بھر چکی ہے گویا خون اور موت کے سنگین ڈرامے کی تیاری مکمل ہوچکی تھی اور اب صرف ذرا دیر کی کسر اور تھی ترلوغ کو اپنے اندر جنگی جنون کا جلترنگ بجتا محسوس ہوا اس کے آہنی اعصاب ٹوٹنے لگے۔ خود اتھلان کی بھی ایسی ہی کیفیت تھی اس کی آنکھوں میں وحشی پن عود کر آیا تھا اس کی وحشی روح جنگ کے تصور سے ہی انگڑائیاں لینے لگی تھی۔

اسی لمحے برنائی اپنے ساتھیوں سے دو قدم آگے نکل کر جا کھڑی ہوئی اس نے اپنے سنہرے بالوں کو جھٹکا دیکر اوپر پھینکا اور سینہ تان کر بلند آواز میں چلائی، سفید فام سورماؤں کے لیے اس کی زبان، اجنبی تھی اور وہ صرف اس کے جسم کی حرکتوں سے ہی مفہوم سمجھنے کی کوشش کررہے تھے البتہ برنائی نے بعد میں انہیں ایک بات سمجھادی تھی۔

"بال سا گوتھ کے شہریو!" برنائی نے بلند آواز میں پکارا "تم نے جس دیوی کے بے عزتی کی تھی وہ تمہارے سامنے دوبارہ موجود ہے اب تم کیا کہتے ہو؟"

"تمہیں کیا کہا جاسکتا ہے۔" جواب میں لمبے قد والے "آسکا" نے کہا جو پجاری کا بنایا ہوا نیا حاکم شہر بھی تھا۔ "تم ایک جعلی دیوی ہو تم نے ہمارے صدیوں پرانے قوانین کی خلاف ورزی کی تم نے ہمارے سب سے بڑے دیوتا کی بے حرمتی کی تم نے اپنے شوہر کو قتل کرایا۔ اب تم دوبارہ ہم سے کیا لینے آئی ہو، سارے شہر کے فیصلے کے مطابق تمہیں شہر بدر کیا جاچکا ہے۔"

"خوب!" برنائی نے طنز کرتے ہوئے کہا۔

دیوی ہوں اور تمہارے سارے دیوتاؤں سے زیادہ
طاقتور بھی۔ میں اپنے ساتھ تمہارے لئے ایک اور تحفہ بھی
لائی ہوں۔" اس نے اتھلان کی سمت دیکھا، اور اشارا کیا
کہ خوفناک پرندے کا سر نمایاں کر کے دکھائے۔

پرندے کا کٹا ہوا سر نظر آتے ہی تمام مجمع میں
حیرت وخوف کی لہر سی دوڑ گئی ہر طرف سے شور بلند ہوگیا۔

"یہ دونوں آدمی کون ہیں؟" آسکا نے پرخیال
لہجہ میں دونوں سورماؤں کو گھورتے ہوئے کہا۔

"یہ لوگ......" برنائی صاف اور نپے تلے لہجے
میں زور سے بولی۔ "یہ آہنی انسان ہیں اور سمندر نے
انہیں بھیجا ہے، بال ساگوتھ کے لوگو تم غدار ہو، تمہارے
حکمران مصنوعی ہیں، اور یہ آہنی انسان اس لئے آئے
ہیں کہ تمہیں تمہارے کئے کا مزا چکھائیں، یاد کرو۔ اپنی وہ
صدیوں پرانی پیشن گوئی جس میں تمہیں ایسے یہ فولادی
آدمیوں کی آمد کی بشارت دی گئی ہے۔"

ان الفاظ کے ساتھ ہی مجمع میں چہ مگوئیاں تیز
ہوگئیں اور یہ بھنبھناہٹ ایک سرے سے دوسرے سرے
تک پھیلتی چلی گئی اور تب گوتھان نے ان اپنا گدھ جیسا
جھکا ہوا سر اٹھایا اور اچانک جمع سہم کر خاموش ہوگیا۔

آسکا کی نظروں میں بھی خوف وہراس کروٹیں
لے رہا تھا اسے اپنے عزائم لرزتے ہوئے نظر آرہے تھے۔

ترلوغ جو دیر سے گوتھان کو دیکھ رہا تھا فوراً تاڑ
گیا کہ اپنی تمام طاقتوں کے باوجود اس لمحے بوڑھا پجاری
بھی سخت فکر مند ہوگیا ہے غالباً اس کے لئے یہ ساری
باتیں قطعی غیر متوقع تھیں اور وہ ان کے لئے بالکل تیار نہ
تھا لوگوں پر اس کی گرفت ڈھیلی ہو چلی تھی۔ وہ دوبار
ابرنائی کی طاقتوں سے مسحور ہو چکے تھے اور اس کے جواز
کے طور پر ان کے سامنے کئی زبردست شواہد موجود تھے۔

"بال ساگوتھ کے لوگو!" چیخ کر برنائی نے
کہا۔ اس کی گردن میں ایک پرتمکنت خم پیدا ہوگیا تھا
اور آواز جذبات سے مرتعش تھی "میں چاہتی ہوں کہ تم
طاقتوں کو تسلیم کر لیا تو میں ماضی کو فراموش کر کے تمہیں
معاف کر دوں گی۔ بے شک میں ایک جابر حاکم تھی لیکن
کیا آسکا زیادہ رحم دل ہے؟ بیشک میری مورتی پر چاند
رات کو ایک انسانی جان کی بھینٹ چڑھائی جاتی تھی لیکن
کیا اب ہر چاند کے ڈوبنے اور نکلنے کے وقت گال گورتھ
کی مورت پر تمہاری بھینٹیں نہیں چڑھتیں؟"

"بال ساگوتھ کے شہریو!" ٹھہر کر وہ دوبارہ
چلائی۔ اس نے دیوانوں کی مانند چیختے ہوئے پجاری کی
سمت اشارا کیا "اس بوڑھے خبیث کو دیکھو جو تم سے
دور کسی بدروح کی مانند کھڑا ہوا ہے۔ یہ انسان نہیں
شیطان ہے، اس کی سفید داڑھی تمہارے خون سے رنگین
ہے، اس کے اشارے پر تمہارا خون صدیوں سے بہایا
جاتا رہا ہے۔ بال ساگوتھ کے لوگو! سوچو اور فیصلہ کرو۔ تم
مجھے چاہتے ہو یا اس شیطان کو، یاد رکھو، اگر تم نے مجھے
ٹھکرایا، تو اس شہر پر دوسرا سورج طلوع نہ ہوگا۔"

اچانک، جمع میں سے ایک نوجوان جنگجو جھپٹ
کر سامنے آیا۔ بظاہر وہ کسی اچھے عہدے پر فائز لگتا تھا
درمیان میں رک کر اس نے زور سے کہا۔ "اوا علے، ہم
تیرے ساتھ ہیں۔"

اسی لمحے اس نعرے کے جواب میں بہت سی
آوازیں تائید اُبھریں اور پھر اچانک فضاء میں لوہے
سے لوہا ٹکرانے کی آوازیں گونجنے لگیں۔ آسکا چند لمحوں
تک بھونچکا کھڑا دیکھتا رہا......

تبھی فضا میں برنائی کی آواز ایک بار پھر ابھری۔

"رک جاؤ......!" وہ پوری قوت سے
چلائی...... اور ایک لمحہ کے لئے تلواریں رک گئیں......
فضا خاموش ہوگئی۔

"بال ساگوتھ کے شہریو!" وہ دوبارہ چیخی۔
"میں نہیں چاہتی کہ تم آپس میں لڑو، میں جانتی ہوں کہ
ہماری روایات کے مطابق تخت اور تاج کے فیصلے ہمیشہ
دعویداروں کے مابین ہی طے ہوتے رہے ہیں! بہتر ہوگا
کہ آسکا خود میرے آدمیوں میں سے کسی کا مقابلہ

کر لے۔ اگر آسکا کامیاب رہتا ہے تو میں بڑی خوشی
سے اپنی گردن تمہیں پیش کر دوں گی۔ اور اگر آسکا
کو شکست ہوتی ہے تو پھر تمہیں میری بالادستی ماننی ہوگی۔
بولو یہ شرط تمہیں منظور ہے یا نہیں؟"

جواب میں چاروں طرف سے تائید کا شور بلند
ہوا۔ اور فضا تھرا گئی تلواریں میانوں میں واپس چلی گئیں۔

"آسکا کیا تم نہیں لڑو گے؟" برنائی نے طنز
کرتے ہوئے لمبے حکمران سے پوچھا۔ "کیا تم اپنا
سر بغیر ہاتھ پیر ہلائے ہی میرے سپرد کر دو گے۔"

"میں تمہارے احمق ساتھیوں کی کھوپڑیوں
کو شراب کا پیالہ بنادوں گا۔" آسکا نے گرج کر کہا اس
پر دیوانگی چھائی ہوئی تھی۔ گوتھان نے جلدی سے آگے
بڑھ کر آسکا کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا پھر اس کے کان میں
کچھ کہا۔ مگر وہ اس مقام پر پہنچ چکا تھا، جہاں عقل سے
زیادہ دیوانگی کا راج ہوتا ہے، وہ گوتھان کے ہاتھوں میں
کٹھ پتلی بنے رہنے کا مزید خواہاں نہ تھا، وہ جوش اور بے
عزتی کے احساس سے پاگل ہوگیا تھا۔

برنائی نے مڑ کر اپنے دونوں آدمیوں کو دیکھا۔"
تم دونوں میں سے آسکا کا مقابلہ کون کرنا چاہتا ہے۔"

"مجھے لڑنے دو!" ترلوغ نے جلدی سے کہا۔
اس کی آنکھوں میں جنگی جنون کروٹیں لے رہا تھا۔ "یہ
شخص آسکا۔ کسی بلی کی مانند پھرتیلا لگتا ہے اور اتھلان
بیل کے مانند بھاری ہے۔ میرا خیال ہے کہ ان دونوں
کو جوڑنا مناسب نہیں رہے گی...... کیونکہ......"

"کیا بکتے ہو......" چیخ کر اتھلان نے کہا۔"
ترلوغ کیا تم مجھے بودا سمجھتے ہو میں......؟"

"جھگڑنے کی ضرورت نہیں۔" بات کاٹ کر
برنائی نے کہا۔ "آسکا کو خود ہی انتخاب کر لینے دو۔"

پھر اس نے آسکا سے پوچھا جواب میں آسکا نے
اپنی سرخ سرخ آنکھوں سے دونوں سورماؤں کو تولا۔
پھر اس کی نظریں بھاری بھرکم اتھلان پر مرکوز ہوگئیں اس
نے اسے اشارہ کیا اتھلان اشارا پاتے ہی نہال ہوگیا
تیزی سے اس نے ہاتھ میں دبے ہوئے پرندے کا
سر ایک جانب پھینک دیا اور اپنی تلوار نیام سے کھینچ لی
بڑبڑا کر ترلوغ پیچھے ہٹ گیا۔ آسکا نے اتھلان کے وزنی
جسم کو دیکھتے ہوئے ہی یہ فیصلہ کیا تھا اس کا خیال تھا کہ
ترلوغ کے مقابلے میں اسے وہ آسانی سے مار گرائے گا
اسے اپنے پھرتیلے اور کسرتی جسم پر ناز تھا۔ "مگر یہ شخص
تو تقریباً ننگ ہے۔" آسکا کو دیکھ کر اتھلان نے کہا
۔"میرا خیال ہے مجھے بھی اپنی زرہ اور خود
اتار دینا چاہئے۔ تاکہ مقابلہ برابر کا ہو۔

"نہیں۔" چیخ کر برنائی نے کہا۔ "تم نہیں
جانتے تمہاری زرہ ہی تمہارا سب سے بڑا بچاؤ ہے، آسکا
اپنی سرعت میں بجلی کی مانند ہے اور اپنی زرہ مت اتارنا۔"

"اچھی بات ہے...... اچھی بات ہے۔" برنائی
کی بوکھلاہٹ کو دیکھ کر اتھلان نے جلدی سے کہا۔ "مگر
پھر بھی یہ انصاف کی بات نہیں ہے؟"

پھر وہ لمبے ڈگ بھرتا ہوا اپنے دشمن کی سمت
بڑھا۔ جو اس کے مقابل متواتر پینترے بدل رہا تھا
اتھلان نے اپنی بھاری تلوار دونوں ہاتھوں سے پکڑ
رکھی تھی اس کی نوک اوپر اٹھی ہوئی تھی اور اس نے اسے
اپنی ٹھوڑی کے مقابل تک اٹھا رکھا تھا۔ تاکہ ہر سمت وار
کر سکے۔

آسکا نے اپنی ہلکی ڈھال پھینک دی تھی وہ سمجھ
گیا تھا کہ اتھلان کی بھاری تلوار کے لئے یہ ڈھال کسی
کام کی نہیں، اس نے اپنے داہنے ہاتھ میں لمبا شکاری
چاقو دبا رکھا تھا اس کے بائیں ہاتھ میں ایک چھوٹا سا
نیزا دبا ہوا تھا، وہ یہ کام بہ سرعت انجام دینا چاہتا تھا
مگر اس کی سب سے بڑی غلطی یہ تھی کہ وہ زردہ اور خود
کو معمولی ہتھیار سمجھ بیٹھا تھا، اسے قطعی خبر نہ تھی کہ اس
چاقو یہاں کتنا بے اثر ثابت ہوگا دراصل اس بے چارے
نے کبھی زرہ اور خود دیکھا تک نہ تھا۔

پھر اچانک ہی وہ سرعت کے ساتھ اتھلان
پر حملہ آور ہوا اس کا بایاں ہاتھ چلا، اس میں دبا ہوا نیزہ
اتھلان کی گردن کی سمت لپکا۔ مگر اتھلان نے بروقت
تلوار گھمائی اگر اس کا ذرہ برابر بھی چوک جاتا تو اس کی

[illegible] اس نے ایک اونچی جست لگائی اور اتھلان کا وار خالی گیا۔ زمین پر آنے سے قبل ہی آسکا کا داہنا ہاتھ اٹھا، پھر اس نے پوری قوت سے اپنا لانبا چاقو اتھلان کے سر پر دے مارا۔ چاقو بھاری آواز کے ساتھ اتھلان کے خود سے ٹکرایا اور فوراً ٹوٹ ہوگیا۔

اور تب اس سے پہلے کہ آسکا کچھ سمجھ سکے پھرتی کے ساتھ اتھلان جھپٹا اس کے منہ سے ایک خوف ناک غراہٹ بلند ہوئی۔ اور پھر اس کا تیغہ برق کی مانند اس پر ٹوٹ پڑا۔ آسکا کو دوسری سانس لینے کی بھی مہلت نہ ملی شانے سے لے کر کمر تک ایک کاری وار لگاتی ہوئی اتھلان کی تلوار جب اوپر اٹھی تو آسکا خاک اور خون میں لتھڑا پڑا تھا سارے مجمع کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔

آسکا کا سر قلم کر کے اپنی تلوار پر لٹکالو۔'' برنائی نے چیخ کر کہا۔ مارے جوش کے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ ''میں اس سر کو سارے بال ساگوتھ میں گھمانا پسند کروں گی۔''

لیکن اتھلان نے انکار میں سر ہلا دیا، اس نے اپنی تلوار صاف کر کے میان میں ڈالتے ہوئے منہ چلایا نہیں، آسکا ایک بہادر جیالا تھا اور میں اس کی لاش کی بے حرمتی نہیں کرسکتا، میں نے جو کچھ کیا وہ کوئی کارنامہ نہیں، یہ برابر کا مقابلہ نہ تھا، اگر وہ بھی میری طرح بکتر بند ہوتا تو اسے برابر کا مقابلہ کہا جاسکتا تھا۔

ترلوغ نے نظر گھما کر دیواروں کی سمت دیکھا جہاں کھڑا ہوا ہجوم اب سنبھل چکا تھا۔ اچانک ہر سمت سے ایک مہیب نعرہ بلند ہوا۔

''اعلیٰ کی جے ہو۔ اعلے دیوی کی زندہ باد!''

اور پھر وہ تمام جنگ آزما جو سامنے صف بستہ تھے گھٹنے ٹیک کر برنائی کے سامنے جھک گئے۔ ترلوغ کو اس لمحہ برنائی میں واقعی کسی دیوی کا سا تقدس اور رعب جھلکتا محسوس ہوا۔

اس لمحہ برنائی نے اپنے قدم آگے بڑھائے، جھک کر اسنے مردہ آسکا کے سینے پر آویزاں قیمتی پتھر نوچ لیا اور اسے بلند کرتے ہوئے چیخی۔ ''بال ساگوتھ کے شہریو! تم نے دیکھا کہ ہمارے فولادی آدمی کتنے طاقتور ہیں۔ اب کیا کہتے ہو!''

''تم ہماری دیوی ہو۔ تم ہماری ملکہ ہو۔'' جواب میں ہجوم نے پھر نعرہ بلند کیا۔ برنائی ہولے سے مسکرائی اس نے اتھلان اور ترلوغ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''اب میدان ہمارے ہاتھ میں ہے ہجوم دوبارہ میرا حامی ہوچکا ہے انکا حافظہ کمزور ہے اور ماضی کو فراموش کرچکے ہیں۔ آؤ ہم آگے چلتے ہیں۔''

پھر وہ تینوں چل پڑے واقعی ہجوم کا حافظہ کمزور تھا۔ ابھی کچھ دنوں قبل اسی ہجوم نے ملکہ کی عجب درگت بنائی تھی اور اب یہی لوگ پالتو کتوں کی مانند اس کے پیچھے چل رہے تھے کل تک جوان کا بادشاہ تھا، اب وہ خاک وخون میں لت پت پڑا تھا اور کسی کو اس کی سمت دیکھنے کی بھی توفیق نہیں ہو رہی تھی۔

وہ آگے بڑھتے گئے۔ ترلوغ نے دیکھا، کشادہ راستے کے اردگرد ہر جانب بہت سی گلیاں موجود تھیں تمام مکانات بلا کسی ترتیب کے بنے ہوئے تھے اور محلات کا سماں پیش کر رہے تھے جابجا عمارتوں کی سربفلک چوٹیاں آسمان سے منہ ملا رہی تھیں اونچے اونچے مینارے اور لمبی لمبی چھتیں ہر چہار جانب بکھری ہوئی تھیں۔ اور یہ ساری عمارتیں سنگ مرمر سے بنی ہوئی تھیں ان میں اعلیٰ درجہ کی لکڑی استعمال کی گئی تھی۔ ان کے نقشے جدید ترین طرز تعمیر کا مضحکہ اڑاتے لگ رہے تھے۔

ان سے آگے بھی بہت دور تک سینکڑوں مردوں عورتوں اور بچوں کا ہجوم زور زور سے ''دیوی'' کے حق میں نعرے لگاتا ہوا چل رہا تھا۔ جابجا مکانوں کی چھتوں پر عورتیں اور بچے کھڑے خوش آمدید کہنے کے لئے ہاتھ ہلا رہے تھے۔ جدھر سے برنائی گزرتی سینکڑوں گردنیں ادب سے خم ہوجاتیں اور عقیدت کے نعرے بلند ہوتے۔

گیٹ سے کوئی ایک فرلانگ آگے جانے کے بعد ایک جگہ برنائی ذرا دیر کے لئے رکی اسی لمحے مجمع کو ہٹاتا ہوا ایک شخص تیزی سے آگے بڑھا اور برنائی کے پاس گھٹنے ٹیک کر بیٹھ گیا۔

اس نے اپنے دونوں ہاتھ بلند کر کے منہ اوپر اٹھایا اور کہا ''اوا علےٰ! تیرا غلام قطار وہ شخص ہے جس نے آج سب سے پہلے تیری بزرگی کا اعلان کیا۔''

برنائی نے ایک شان بے نیازی سے نوجوان پر نظر ڈالی پھر اپنے نازک ہاتھوں کو بڑھاتے ہوئے اس نے نوجوان کے ہاتھ تھام لئے اور اسے اٹھاتے ہوئے بولی۔

''قطار! اسپولی خاندان کے سردار، کھڑے ہوجاؤ۔'' وہ رک مسکرائی۔ ''اعلیٰ تمہاری جان نثاری کے مظاہرے سے بہت خوش ہوئی ہے اور وہ بہادروں کو ضرور نوازا کرتی ہے، تمہاری جان نثاری کا معاوضہ تمہیں ضرور ملے گا، تم آج سے میرے محافظ دستے کے سپہ سالار مقرر کئے جاتے ہو، جاؤ، اپنے دستے کو لے کر آؤ اور میرے اردگرد لوہے کی دیوار کی مانند پھیل جاؤ۔''

''اعلےٰ کی جے ہو۔'' نوجوان نے اچھل کر کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ پھر سر کو خم کرتا ہوا مجمع میں گھس گیا چند ہی لمحوں بعد اس کے آدمی اعلےٰ کے گرد جمع ہوگئے اب برنائی سب سے آگے تھی، اس کے دائیں اور بائیں جانب اتھلان اور ترلوغ چل رہے تھے اور ان کے پیچھے قطار اور اس کا دستہ تھا چند لمحوں بعد قطار پھر آگے بڑھا اس نے برنائی سے اپنی زبان میں کچھ کہا، اور تب برنائی مسکرا کر اپنے دونوں آہنی آدمیوں سے بولی۔

''قطار کہہ رہا ہے کہ اس کے آدمی تم دونوں کو اپنے کاندھے پر اٹھا کر لے کر چلنا چاہتے ہیں، یہ ان کے خیر سگالی کے مظاہرے کا الگ طریقہ ہے مگر وہ خوف زدہ ہیں اور تمہارے جسموں کو چھوتے ہوئے ڈرتے ہیں۔'' اتھلان برنائی کی بات سن کر بدکتے ہوئے بولا۔ ''تھور کی قسم کسی نے مجھے ہاتھ لگایا تو اس کی گردن توڑ دوں گا، کیا میں کوئی بچہ ہوں جسے اٹھا کر چلا جائے۔

برنائی نے ایک قہقہہ لگایا اس کی مترنم آواز آئی۔ ''فکر نہ کرو اتھلان بس میں نے انہیں منع کردیا ہے بہتر ہوگا کہ وہ یہ جانیں کہ تم گوشت پوست کے بنے ہوئے ہو بہتر ہوگا کہ وہ اسی غلط فہمی میں رہیں کہ تم لوہے کے آدمی ہو۔''

دوستی

کہتے ہیں کہ ہزاروں سال پہلے محبت اور حسن آپس میں دوست تھے۔ ایک رات دونوں ساتھ ساتھ تھے کہ اتنے میں چاند نکل آیا، محبت چاندنی کی بے حد تعریف کر رہی تھی، یہ بات حسن کو بری لگی۔ اس نے غصے میں آ کر محبت کی آنکھیں نوچ لیں۔ بس اس دن سے محبت اندھی اور حسن ظالم ہوگیا۔

(محمد اسحٰق انجم۔ کنگن پور)

اچانک ترلوغ کو پجاری گوتھان کا خیال آیا چونک کر اس نے ملکہ سے پوچھا۔ ''آخر وہ سانپ کی سی آنکھوں والا کدھر غائب ہوگیا؟''

''وہ......!'' برنائی نے بے نیازی سے جواب دیا۔ ''وہ کسی طرح موقع پا کر کھسک گیا ہوگا تا کہ میرے لئے بعد میں مزید مشکلات کے ساتھ نمودار ہو، بہرحال اس وقت تم اس کی فکر نہ کرو۔ میں اس کے بارے میں جلد ہی کچھ سوچوں گی۔''

ان کا جلوس شاہی تزک واحتشام کے ساتھ باجے گاجے اور نعروں کے شور میں آگے بڑھتا رہا۔

رات قدیم ترین شہر بال ساگوتھ کو اپنے پروں تلے ڈھانپ چکی تھی، برنائی اس لمحے اپنے شاہی محل کے ایک کمرے میں اتھلان اور ترلوغ کی معیت میں بیٹھی ہوئی تھی وہ ایک مخملی چھپر کھٹ پر نیم دراز تھی جبکہ اس کے دونوں جانب بچھی ہوئی عظیم آبنوسی کرسیوں پر دونوں جنگ آزما بیٹھے تھے ان کے سامنے میزوں پر طرح طرح کے مشروبات اور کھانے سجے ہوئے تھے۔ اس محل کی چھت کسی قیمتی پتھر کی اور فرش سنگ مرمر کا بنا ہوا تھا۔ تمام دیواریں بھاری مخمل سے ڈھانکی گئی تھیں۔ ستونوں

پر طلائی خول چڑھے ہوئے تھے۔

شراب کا ایک بڑا پیالہ خالی کرتے ہوئے اتھلان نے کہا۔ ”برنائی، یہ شراب تلخ نہیں ہے اور مجھے مزہ نہیں آرہا ہے ویسے بھی تم نے ہمیں دھوکا دیا ہے، ہم تو سمجھے تھے کہ ہمیں زبردست جنگ اور کشت وخون سے سابقہ پڑے گا مگر یہاں تو کچھ ہوا ہی نہیں ابھی میری تلوار میری طرح پیاسی ہے، اور ترلوغ کی کلہاڑی نے تو خون کا ذرتی بھر مزہ نہیں لیا ہے۔“

”ہاں.....“ برنائی نے مسکرا کر قد آور دیوں کی سمت دیکھا پھر بولی۔ ”فکر نہ کرو اتھلان! تم نہیں جانتے تخت کا حصول آسان ہوتا ہے مگر قائم رکھنا مشکل، اس وقت یہاں کے عوام میرے وفادار بن گئے ہیں لیکن جلد ہی گوتھان جو ہنوز روپوش ہے ظاہر ہوگا اور ایک بار پھر عوام اس کے ورغلانے میں آجائیں گے، میں سب کچھ اچھی طرح سمجھ رہی ہوں۔ اتھلان! تم نہیں جانتے اس محل اور اس شہر میں ہزاروں خفیہ راستے پوشیدہ ہیں جن سے صرف وہی بوڑھا شیطان واقف ہے خود مجھے اس نے اس راز سے بے خبر رکھا ہے۔

اس وقت سارا شہر مجھ سے دہشت زدہ ہے، وہ لوگ تم دونوں کو واقعی آہنی انسان سمجھ رہے ہیں، تمہاری زرہوں اور خود کو بھی وہ تمہارے جسم کا ایک حصہ سمجھتے ہیں۔“

”یہ قوم جو بہت ہی عقلمند اور ترقی یافتہ ہے بعض بعض معاملات میں واقعی سخت بے وقوف بھی ہوسکتی ہے۔“ ترلوغ نے کہا۔ ”آخر یہ لوگ یہاں کب سے آباد ہیں، ان کا اصل وطن کون سا تھا؟“

”یہ لوگ.....!“ برنائی نے کہا۔ ”کسی بے حد قدیم نسل سے ہیں۔ ان کی قدامت کا اندازہ لگانا مشکل ہے کسی زمانے میں یہ لوگ کسی بہت بڑی سلطنت کا ایک حصہ تھے جو متعدد جزیروں پر مشتمل تھی، پھر بہت سے جزیرے تہہ آب ہوگئے اس کے علاوہ سرخ جلد والے وحشیوں کی یلغار بھی ان پر ہوتی رہتی تھی، یہ لوگ ہزاروں کی تعداد میں مارے جاتے تھے۔ حتیٰ کہ یہ آخری جزیرہ رہ گیا جہاں یہ آج تک موجود ہیں، بے شک ان میں اپنے اجداد کی سی زیرکی اب موجود نہیں ہے اور یہ بہت سی باتیں بھول چکے ہیں ان کی کشتیاں لاعلمی کے باعث سڑ گل چکی ہیں اور اب انہیں یہ بھی نہیں معلوم کہ سمندر کے سوا کہیں اور بھی کوئی دنیا موجود ہے، ہاں انہیں اتنا ضرور معلوم ہے کہ کہیں آس پاس ہی وہ آبادی بھی موجود ہے جہاں سرخ جلد والے وحشی آباد ہیں، یہ وحشی قبائل بگاہے گاہے بال ساگوتھ کے حسن کو لوٹنے آتے رہتے ہیں، بہرحال ہماری فصیلیں ان کے لئے ابھی تک ناقابل تسخیر ثابت ہوئی ہیں اور ہم نے ہر بار انہیں مار بھگایا مگر وحشیوں کے خوف سے بال ساگوتھ کے شہریوں کی نیندیں حرام رہتی ہیں کیونکہ کچھ پتہ نہیں ہوتا کہ وہ کب حملہ آور ہوجائیں۔ مگر۔ یہ وحشی میرے لئے کچھ خطرہ نہیں مجھے صرف گوتھان کا خوف ہے، یہ بوڑھا خبیث بے حد خطرناک انسان ہے متعدد درندوں اور جانوروں کو اس نے اپنے قبضے میں کر رکھا ہے جن میں سانپ، مکڑیاں، بن مانس اور خدا معلوم کون کون سے درندے شامل ہیں، وہ ایک جادوگر ہے اور اس کا مسکن پہاڑی کے وہ غار ہیں جن کی تھاہ کا پتا عام آدمی آج تک نہیں لگا سکا ہے اس نے ان غاروں میں کسی جگہ ایسی مخلوق چھپا رکھی ہے جو نیم انسان، اور نیم حیوان کہے جاسکتے ہیں، گوتھان خود بھی عام آدمیوں سے کوئی الگ ہی شے ہے اس نے حیات دوام کا راز پالیا ہے اس نے ایسی زندگیوں کی ایجاد کی ہے جس سے وہ خود بھی خائف رہتا ہے مجھے خوف ہے کہ وہ ان درندوں کو میرے مقابلہ میں نہ لا اتارے بہرحال اب رات بھی چکی ہے میں اس بغل کے کمرے میں سونے جارہی ہوں میرے کمرے میں سوائے اس دروازے کے دوسرا اور دروازہ نہیں۔ میں اندر تنہا ہی سوؤں گی جبکہ تم دونوں اس کمرے میں رہو گے، بیرونی دروازہ اچھی طرح بند ہے پھر بھی بہتر ہوگا کہ تم میں سے کوئی ایک جاگتا رہے میں نے قطار، اور اس کے آدمیوں کو رابداری میں تعینات کردیا ہے تاکہ وہ ساری رات گشت لگاتے رہیں، مجھے اس وقت سوائے تم دونوں کے اور کسی پر اعتبار نہیں۔“

پھر وہ اپنے چھپر کھٹ سے ایک ادا کے ساتھ اٹھ گئی اپنے کمرے میں جاتے جاتے اس نے تشکیلی نظروں سے ترلوغ کی طرف دیکھا اور پھر اپنے پیچھے دروازہ بند کرلیا۔

اتھلان نے تب کرسی پر پیر پسارتے ہوئے ایک طویل جماہی لی۔ اور پھر بولا۔ ”ترلوغ! ہم سمندر کی چڑیوں کی زندگیاں بھی خوب ہیں ابھی کل تک میں ایک جہاز کا شمشیرزن تھا اور تم میرے قیدی۔ صبح ہوئی تو ہم دونوں ایک انجانی زمین پر تھے جہاں تمہاری کلہاڑی سے میری تلوار ٹکرا رہی تھی اور اب ہم دونوں بھائیوں کی مانند ایک ملکہ کا داہنا بازو بنے یہاں اس اجنبی محل میں بیٹھے ہوئے ہیں..... اور..... میرا خیال ہے ترلوغ! تم اب بہت جلد بادشاہ بننے والے ہو۔“

”خوب!“ مسکرا کر ترلوغ نے پوچھا۔ ”وہ کیسے؟“

”تم نے شاید برنائی کی آنکھیں نہیں دیکھیں، میرے دوست! اس نے جاتے جاتے تمہیں جس نظر سے دیکھا ہے..... وہ بڑی معنی خیز کہی جاسکتی ہے۔“

”بس چپ ہوجاؤ!“ خشک لہجہ میں ترلوغ نے کہا..... ”میں عورت کو کسی بھیڑیئے سے کم خطرناک نہیں سمجھتا..... اور یہ ایک عورت ہی تھی جس کے باعث.....“ وہ اچانک چپ ہوگیا۔

”ہاں ہاں، میں سمجھتا ہوں۔“ دیوپیکر اتھلان نے سنجیدگی سے کہا۔ ”مجھے معلوم ہے کہ تمہاری سرداری ایک عورت کی سازش ہی کے باعث ختم ہوئی تھی مگر میرے دوست دنیا میں ہر قسم کی عورتیں ہوتی ہیں مجھے دیکھو میں خود بھی اپنے وطن کے قانون کا مجرم ہوں۔“ اس نے رک کر سانس لی۔ پھر بولا ”مجھے بچپن ہی سے سمندر سے پیار تھا اپنی نوجوانی کے دنوں میں میں نے ایک لڑکی کو قتل کردیا تھا پھر مجھے بھاگ کر آرکینی میں پناہ لینی پڑی۔ یہیں بحری قزاقوں سے میرا ملنا ہوا ان کے طریقے میری جبلت سے بے حد میل کھاتے تھے بس پھر میں ان کے ساتھ شریک ہوگیا۔ میں نے متعدد جہاز لوٹے جلد ہی مجھے مشہور قزاق کینوٹ کا نائب بننے کا شرف حاصل ہوگیا یہیں میرے دو بدترین دشمن پیدا ہوگئے یہ دونوں اس وقت بھی میرے پیچھے لگے رہے، جب مجھے شاہ انگلستان نے ایک بڑا عہدہ تفویض کیا۔

غصہ میں آکر میں نے ان دونوں کو قتل کردیا اور اس طرح شاہی عتاب کا شکار ہوگیا انگلستان میں میرا داخلہ ممنوع قرار دیا اور ایک بار پھر مجھے قزاقی کے پیشے میں دوبارہ لوٹنا پڑا.....“

رک کر اس نے جماہی لی اور اس کے پپوٹے بھاری ہوگئے اس نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولنا چاہا لیکن پھر اسے ہوش نہ رہا۔

”اس نے خوب پی ہے۔“ ترلوغ بڑبڑایا۔ ”خیر اسے سونے دو میں جاگتا رہوں گا۔“

وہ اپنی کرسی پر قدرے نیم دراز سا ہوگیا۔ چند ہی لمحوں میں اسے خود بھی غنودگی سی محسوس ہونے لگی لیکن بہرحال اس کے حواس بیدار ہی تھے اسی غنودگی کی سی کیفیت میں اسے ایک عجیب سا خواب نظر آیا۔ اسے یوں لگا جیسے دروازے کے مقابل دیوار پر چڑھا ہوا مخملی پردہ بری طرح لرزا ہوا اور پھر اس کے پیچھے سے کسی کا چہرہ ذرا سا ابھرا اور پھر اس کی شکل واضح ہوئی۔ ترلوغ بھنوئیں سکیڑے اسے دیکھتا رہا۔ اسے یقین تھا کہ وہ کوئی خواب دیکھ رہا ہے۔ مگر پھر بھی اس کے اندر ایک عجیب سی بے چینی پیدا ہوچلی تھی نظر آنے والا چند لمحوں تک غیر متحرک رہا اور پھر باہر نکل آیا۔ ترلوغ کے سامنے اب ایک عجیب سی مانوس الفطرت مخلوق کھڑی ہوئی تھی، اس کا جسم کسی بن مانس کی مانند تھا جس پر سیاہ روئیں موجود تھے گردن کے پاس سے ایک لمبی دم کمر تک جھول رہی تھی، چہرہ کسی ایپ بندر کی مانند تھا اور آنکھیں سرخ انگارے کی مانند دہک رہی تھیں یوں لگتا تھا جیسے کوئی خبیث جہنم سے نکل کر زمین پر آگیا ہو۔

لمبے قدموں سے چلتا ہوا وہ زندہ نما انسان ترلوغ کے نزدیک آکھڑا ہوا اور پھر اچانک اس کا پنجہ بڑھا اور ترلوغ کی گردن پر آٹپکا اور تب۔

ترلوغ کو پہلی بار احساس ہوا کہ وہ خواب سے نہیں حقیقت سے دوچار ہے۔ تمام جسم کی طاقت صرف

کرتے ہوئے وہ کسی چیتے کی مانند مچلا اور کرسی سمیت دور جا گرا۔ درندے نے ایک منٹ کی تاخیر کیے بغیر اس پر چھلانگ لگائی لیکن ترلوغ پھرتی سے دوسری جانب الٹ گیا۔ اب ترلوغ کی باری تھی وہ سرعت کے ساتھ اٹھا اور پوری طاقت سے درندے کی پشت پر جا گرا۔ اس نے درندے کو کمرے سے اٹھا کر فرش پر پٹخنے کی کوشش کی لیکن خود اس کے ساتھ ہی فرش پر گر گیا۔ دیر تک دونوں میں خاموشی کے ساتھ زور آزمائی ہوتی رہی۔

اس دوران اتھلان متواتر خراٹے لیتا رہا۔ ترلوغ نے کئی بار فرش پر پڑے پڑے اتھلان کو پکارنے کی کوشش کی۔ لیکن اتھلان پر اس کی آواز کارگر نہ ہوئی متعدد بار درندہ اس پر اور بھی وہ درندے پر غالب آیا لیکن پھر اس کی سانسیں اکھڑنے لگیں حیوان نما انسان ہنوز تازہ دم لگتا تھا۔ اچانک اس کا ہالدار وزنی ہاتھ بڑھا اور اس نے ترلوغ کو گردن سے پکڑ لیا۔ جنگجو ترلوغ نے دونوں ہاتھوں کا زور صرف کر دیا کہ اس کی گرفت کمزور کر سکے لیکن اب وہ گرفت بتدریج سخت ہوتی جا رہی تھی اس کے لمبے ناخون آہستہ آہستہ بتدریج سخت ہوتی جا رہی تھی اس کے لمبے ناخون آہستہ آہستہ ترلوغ کی گردن میں گھستے جا رہے تھے اور خون بری طرح رسنے لگا تھا۔

اور تب ترلوغ نے اپنی جان بچانے کے لئے ایک آخری کوشش کی، وہ دیوانوں کی مانند مچلا اور پورے جسم سے مچھلی کی طرح اچھل کر ایک سمت جا گرا۔ اس کی پیٹھ کسی سخت سی چیز سے ٹکرائی ایک لمحے کی تاخیر کے بغیر اس نے تیزی سے کروٹ لی درندہ پورے زور میں فرش سے ٹکرایا۔ اور تب ترلوغ نے دیکھا کہ وہ چیز جس پر وہ گرا تھا اتھلان کے شکاری چاقو کے علاوہ کچھ اور نہ تھی جسے دیو پیکر اتھلان نے بے خیالی میں نیچے گرا دیا تھا۔

پھر اس نے بجلی کی سرعت سے چاقو اٹھایا اور اس سے قبل کہ درندہ سیدھا ہو سکے، چاقو کا پھل اس کے سینے میں دستے تک گھونپ دیا۔ ایک کریہہ چیخ اس درندے کے منہ سے خارج ہوئی اور وہ کسی کٹے ہوئے درخت کی مانند فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ اس کا خون بہہ بہہ کر فرش کو رنگین کرنے لگا۔

نیم بے ہوشی کی کیفیت میں ترلوغ لڑکھڑاتا ہوا سیدھا ہو گیا۔ اس نے ایک نظر اس کی لاش پر ڈالی پھر اتھلان کی سمت دیکھا جو بدستور غافل سویا ہوا تھا پھر وہ اپنے سر کو جھٹکتا ہوا ادھر لپکا جس سمت سے حیوان نما انسان اندر داخل ہوا تھا اس بار وہ اپنی کلہاڑی ساتھ لینا نہیں بھولا تھا۔ مخملی پردے کو ہٹانے کے لئے اس نے اپنا ہاتھ بڑھانا چاہا۔ لیکن تبھی اسے یوں لگا جیسے اس کا دماغ بھاری ہو گیا ہو، جیسے اس کے ہاتھ مفلوج ہو گئے ہوں۔ اس نے ایک اور کوشش کی، مگر یوں لگتا تھا جیسے کوئی خوف ناک قوت اسے روک رہی ہو، اس کا اٹھا ہوا ہاتھ گر گیا لیکن اس بار ترلوغ نے اپنی ساری قوت ارادی صرف کر دی۔

پاگلوں کی مانند اس نے پردے کو پکڑا۔ اور اسے نوچ ڈالا۔ ایک لمحے کے لئے اس کی آنکھیں کسی نیم عریاں شخص کے ہیولے سے ٹکرائیں جس نے پروں کا لبادہ پہن رکھا تھا۔ اور دوسرے لمحہ بلا تامل اس نے اپنی کلہاڑی اس پردے ماری۔ جو گوشت کے پہاڑ میں دھنستی چلی گئی اور جب اس نے اپنی بھنچی ہوئی آنکھیں کھول کر دیکھا تو حیران رہ گیا۔

اس کے قدموں کے سامنے ایک اور لاش خون میں ڈوبی پڑی تھی۔

اسی وقت اتھلان نے ایک لمبی سانس لی اور آنکھیں کھول دیں، ہڑبڑاتے ہوئے سیدھا ہو کر وہ بولا۔ ”کیا ہے، کیا بات ہے؟“ وہ جلدی سے اٹھ پڑا۔ ”یہ لاش کیسی ہے؟ اور..... بھوری قسم، ترلوغ! یہ مردہ غنیبث کہاں سے آ گیا؟“ وہ بالکل بھونچکوں کی مانند دونوں لاشوں کو تکے جا رہا تھا۔

”یہ غنیبث اس منحوس شہر کی کوئی بدروح تھی۔“ ترلوغ نے کہا۔ ”اور یہ پجاری یہاں چھپا ہوا ہم لوگوں پر سحر کر رہا تھا اس نے ہم دونوں پر نیند طاری کر دی تھی مگر شکر ہے کہ کامیاب نہیں ہو سکا۔ ان دونوں کو یہاں بھیجنے والا گوتھان ہی ہو گا۔“

اتھلان نے منہ چلا کر کہا۔ ”مگر آخر یہ دونوں یہاں آئے کیونکر؟“

”میرا خیال ہے، یہاں کوئی چور دروازہ موجود ہے..... مگر اب وہ دکھائی نہیں دے رہا ہے۔“

دھم.....!

اچانک بغلی کمرے میں کوئی شے زور سے گری، یہ ایک بھاری آواز رہی ہو گی مگر بند دروازوں سے گزر کر آتے ہوئے کمزور ہو گئی تھی۔

”برنائی.....!“ ترلوغ دہاڑا اور جواب میں ایک عجیب سی بڑبڑاہٹ سنائی دی ترلوغ نے دروازے کو زور کی ٹکر ماری۔ مگر فضول۔ دروازہ خاصہ مضبوط تھا۔ اور اندر سے بند! اور تب اتھلان لپکا۔ اس نے اپنے قوی جسم کو پوری قوت سے دروازے پر گرا دیا۔ ایک زور کی چرچراہٹ کے ساتھ دروازہ ٹوٹ گیا۔ اتھلان نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اندر چھلانگ لگا دی اور ششدر رہ کر رہ گیا۔ اندر ایک سیاہ بھاری سایہ موجود تھا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں میں برنائی۔ بال سا گوتھ کی ملکہ کو، کسی گڑیا کی مانند اٹھا رکھا تھا۔ ان کے اندر داخل ہوتے ہی سیاہ سائے نے مڑ کر دیکھا۔

یہ سایہ، دو انتہائی قد آور ٹانگوں پر کسی انسان ہی کی مانند کھڑا تھا۔ لیکن اس کا چہرہ کسی بن مانس سے مشابہ تھی۔ یوں لگتا تھا، جیسے اس کا جسم کسی درندے اور انسان کے ملاپ سے ہوا ہو۔ اس کے ہاتھوں میں برنائی کسی گڑیا کی مانند تڑپ رہی تھی۔ اسی لمحے اس عجیب الخلقت مخلوق کا منہ کھلا اور اس میں سے ایک ٹیڑھا سا ہاتھ نکل پڑا۔ برنائی دہشت زدہ ہو کر زور سے چیخی اور خوف سے آنکھیں بند کر لیں۔ اور تب اتھلان کو جیسے ہوش آ گیا اس نے اپنی تلوار میان سے کھینچ لی اور پوری قوت سے اسے درندے کی پیٹھ میں گھونپ دیا درندے نے ایک قیامت خیز چیخ ماری اور محل کے در و دیوار لرز اٹھے۔ اور پھر ابھی ترلوغ نے وار کے لئے ہاتھ اٹھایا ہی تھا کہ سائے نے برنائی کو زمین پر پٹخ دیا اور تیزی سے بھاگتا ہوا اس چور دروازے میں گھس گیا جو کمرے کی ایک دیوار میں بنا ہوا تھا۔ اتھلان نے بھی وقت کھوئے بغیر اس کے پیچھے چھلانگ لگائی اور دونوں آگے پیچھے دوڑتے ہوئے دروازے کے اندر پھیلی ہوئی تاریکی میں غائب ہو گئے۔

ترلوغ نے خود بھی اس کے پیچھے جانا چاہا لیکن برنائی تیزی سے اٹھی اور اس سے لپٹ گئی چیختے ہوئے اس نے کہا۔ ”مت جاؤ۔“ خوف سے اس کی آنکھیں نکلی پڑ رہی تھیں۔ ”اس راہداری میں مت جاؤ۔ یہ موت کا راستہ ہے۔ اس میں جانے والا کبھی واپس نہیں آتا۔ میں نہیں چاہتی کہ اتھلان کے ساتھ تمہیں بھی گنوا دوں۔“

”عورت! چھوڑ دے مجھے۔“ ترلوغ پاگلوں کی مانند خود کو چھڑاتے ہوئے غرایا۔ ”میرا ساتھی، موت سے جنگ کر رہا ہو۔“

مگر برنائی نے اسے چھوڑے بغیر دوبارہ چیخ کر کہا۔ ”رک جاؤ۔ کم از کم مجھے محافظوں کو بلا لینے دو۔“

مگر ترلوغ تو جیسے دیوانہ ہو گیا تھا اس نے برنائی کو ایک جانب دھکیل دیا اور دوڑتا ہوا خود بھی تاریک راہداری میں جا گھسا۔

برنائی نے جھپٹ کر موگری اٹھائی اور اسے قریب لگے گھنٹے پر دے مارا، گھنٹا پرغور آواز میں بجا۔ چند ہی لمحوں بعد دروازے کے باہر بہت سے دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں ابھریں۔ پھر کوئی زور سے چیخا۔

”اعلےٰ! تیرا غلام قطار دروازے کے پیچھے آ کھڑا ہوا ہے۔ حکم دے کہ میں اس دروازے کو توڑ دوں۔“

”جلدی کرو۔“ چیخ کر برنائی نے کہا۔ دوڑ کر اس نے دروازہ کھول دیا۔

ترلوغ چند لمحوں تک تاریک راہداری میں دوڑتا رہا۔ اس کے کان زخمی درندے کی کراہ اور اتھلان کی بھاری سانسوں کی آوازیں صاف سن رہے تھے جو دور سے آ رہی تھیں پھر یہ آوازیں رک سی گئیں۔ وہ اب دوڑتا ہوا ایک ایسی جگہ آ نکلا جو خاصی چوڑی تھی اور جہاں جا بجا دیواروں پر مشعلیں روشن تھیں یہاں اسے زمین پر ایک

حص کی لاش پڑی نظر آئی جس کا سر کھل گیا تھا۔

اس ہال کی دیواریں بے حد اونچی تھیں ہاتھی کے قد سے بھی زیادہ بلند اور بیچ ہال میں ایک بلند محراب آسمان تک اٹھتی چلی گئی تھی۔ ترلوغ نے محسوس کیا جیسے وہ کسی مندر میں آ گیا ہو (اس کے عین عقب میں ایک اونچی سی پتھریلی قربان گاہ بنی ہوئی تھی۔ اس قربان گاہ کے قریب ایک دیو قامت مورتی نصب تھی جو یقیناً تباہی کے دیوتا۔ گال گوتھ کی مورت تھی۔

مگر ترلوغ کو اس مورت کے معائنہ کی مہلت نہ مل سکی اس کی آنکھوں کے سامنے اس وقت ایک اور ہی ڈرامہ ہو رہا تھا اس نے دیکھا اس وقت اتھلان اپنی تلوار جھکائے ادھر دیکھ رہا جدھر گیارہ فٹ اونچے قد والے سیاہ درندے کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ اس لاش کے بالکل قریب ایک انسانی جسم اور بھی پڑا ہوا تھا۔ اور یوں لگتا تھا جیسے درندے نے مرتے مرتے اسے بھی ختم کر دیا ہو۔ یہ دوسری لاش ایک دبلے پتلے لمبے قد کے آدمی کی تھی جس کی داڑھی برف کی مانند سفید تھی جس کی آنکھیں موت کے بعد بھی کسی سانپ کی آنکھوں کی مانند خوف ناک اور سحر خیز نظر آ رہی تھیں۔

"گوتھان!" ترلوغ چیخ اٹھا۔

"ہاں۔ یہ وہی منحوس بوڑھا ہے۔ میں اس درندے کا پیچھا کرتا ہوا ادھر آیا تھا مگر میرے آنے سے قبل ہی اس نے گوتھان کو ختم کر ڈالا۔ اس سے قبل ایک اور پجاری نے بھی درندے کو روکنے کی کوشش کی تھی مگر درندے نے ایک ہی وار میں اس کا بھیجا بکھیر دیا تھا۔ تھوری قسم۔ یہ مخلوق سیدھی گوتھان پر جھپٹی تھی اور اس کا تیا پانچا کر کے رکھ دیا تھا۔

ترلوغ نے نظریں گھما کر اس عجیب و غریب درندے کو گھورا جو فرش پر کسی وسیع اور لمبے سیاہ سائے کی مانند مردہ پڑا تھا۔

اسی لمحے برنائی بھی اپنے محافظوں کے ساتھ اندر آ پہنچی جبکہ بیرونی دروازے سے بہت سے پجاری بھی آہستہ آہستہ آنے لگے۔ دیکھتے دیکھتے وہاں سپاہیوں، پجاریوں اور عام آدمیوں کا ایک عظیم مجمع لگ گیا۔

اچانک برنائی کے حلق سے ایک بھیانک چیخ بلند ہوئی۔ جب اس نے گوتھان کو زمین پر پڑے ہوئے دیکھا۔ اس کی آنکھیں دیوانوں کی مانند سلگ رہی تھیں۔

"آخر کار۔ بال ساگوتھ کی سب سے عظیم طاقت بھی فنا کر دی گئی۔" اس نے پجاری کی لاش کو ٹھوکر مارتے ہوئے کہا پھر وہ پاگلوں کی مانند ہاتھ اٹھا کر عظیم مورتی کے سامنے جا کھڑی ہوئی اور چیخ چیخ کر اسے گالیاں دینے لگی۔

اور پھر اسی لمحے..... پورے مندر پر، جیسے زلزلہ طاری ہو گیا۔ گال گوتھ کی عظیم مورتی ڈولنے لگی۔ پھر اس سے قبل کہ ترلوغ، برنائی کو کھینچ سکتا، مورتی جڑ سے اکھڑ کر حیران و ششدر عورت کے سر پر آ گری۔ ایک زور کا دھماکہ ہوا اور مورت ہزاروں ٹکڑوں میں بٹ کر دور دور تک بکھر گئی۔

اس جگہ جہاں بال ساگوتھ کی ملکہ برنائی کھڑی تھی وہاں فرش پر اب صرف گاڑھا گاڑھا سرخ خون آہستہ آہستہ چاروں طرف پھیلتا جا رہا تھا۔ برنائی کی لاش کئی من وزنی مورتی کے نیچے دب کر غائب ہو گئی تھی۔

پورا مجمع یوں کھڑا تھا جیسے اسے سانپ سونگھ گیا ہو خود اتھلان اور ترلوغ پر ایک سناٹے کی سی کیفیت طاری تھی۔

اور تب..... گالکا، گوتھان کا نائب۔ یکبارگی چلایا۔ "لوگو!" اس کی آواز نے خاموشی کو جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ "گال گوتھ نے مصنوعی دیوی کا پول کھول دیا دیکھا تم نے جس جگہ وہ کھڑی تھی وہاں اب سوائے اس کے ناقص اور ناپاک خون کے کچھ نہیں۔ وہ جھوٹی تھی اور دیوتا نے اسے انجام تک پہنچا دیا۔ اور یہ دونوں" اس نے اتھلان اور ترلوغ کی سمت انگلی اٹھائے ہوئے کہا۔ "آہنی انسان نہیں ہیں یہ دونوں ہمارے اور تمہارے جیسے ہی جسموں کے بنے ہوئے ہیں۔ دیکھو ان میں سے ایک کی گردن سے ہنوز خون بہہ رہا ہے۔"

اور تب پورے مجمع نے ایک زور کا نعرہ لگایا۔۔

(جاری ہے)

نغمۂ شب

ناصر محمود فرہاد۔ فیصل آباد

اچانک ایک آواز گونجی تو خونخوار بلائیں جو کہ لنگوروں کی شکل میں تھیں، وہ آگے بڑھیں اور مطلوب کو دبوچ لیا..... اور چند لمحے بعد ہی وہاں پر مطلوب کا ڈھانچہ پڑا تھا، اور پھر ایک اور آواز گونجی تو وہاں کچھ بھی نہ تھا۔

جادو ٹونا کے انکاری لوگوں کے لئے حقیقت پر مبنی اہم راز سے پردہ اٹھاتی حقیقی کہانی

ڈاکٹر خوب فربہ آدمی تھا۔ چھوٹے قد کے اس آدمی نے میڈیکل کی ڈگری ایڈن برگ سے حاصل کی تھی۔ کچھ عرصہ گلاسکو میں پریکٹس کی مگر پھر شادی کے بعد وہ جنوبی افریقہ آ گیا کیونکہ گلاسکو میں اس کی پریکٹس اتنی زیادہ نہیں چلی جتنی اس کو توقع تھی۔ زیادہ کمانے کی آس اس کو افریقہ کھینچ لائی۔ اس کا خیال تھا کہ وہاں ڈاکٹر کم ہیں تو پریکٹس بھی کامیاب رہے گی۔ مگر یہ پسماندہ سیاہ فام افریقی ہر اس نئی چیز کے خلاف تھے جو ان کی ثقافت سے متصادم تھی۔ وہ عام بیماریوں کے لئے جدید طریقہ علاج کے بھی خلاف تھے۔

"میں ایسی کسی بات پر یقین نہیں کرتا جس کا عملی ثبوت موجود نہ ہو۔" ڈاکٹر نے کیپ ٹاؤن کی طرف کشتی کے سفر کے دوران اپنے ایک ہم سفر سے یہ بات کہی جو اس کی بات سن کر بولا۔

"کیا تم سمجھتے ہو کہ تم نے جنوبی افریقہ جانے کا فیصلہ کر کے عقل مندی کا ثبوت دیا ہے؟"

"میرا تو یہی خیال ہے کیونکہ مجھے بتایا گیا ہے کہ ایک قابل آدمی کے لئے وہاں بہت مواقع موجود ہیں۔" ڈاکٹر نے جواب دیا جو اپنی جیب کا آخری سکہ بھی کرایہ کی نذر کر چکا تھا۔

"میں اس حد تک تم سے اتفاق کرتا ہوں مگر کیا تم جانتے ہو افریقہ کے یہ دیہاتی لوگ مافوق الفطرت چیزوں پر کس قدر یقین رکھتے ہیں؟" ہم سفر نے سر ہلاتے ہوئے پوچھا۔

"مگر مجھے یقین ہے کہ میں ان کا علاج کر سکتا ہوں شاید یہی میری مشکلات کا اختتام ہو۔" ڈاکٹر کا لہجہ پرعزم تھا۔

جنوبی افریقہ پہنچ کر جب اس نے ڈربن سرگ پہاڑ کے دامن میں واقع اس چھوٹے سے گاؤں میں اپنی پریکٹس کا آغاز کیا تو جلد ہی محسوس کر لیا کہ اس کے مریض اس پر بمشکل ہی بھروسہ کرتے ہیں۔ وہ کم گو اور کم ملنسار لوگ تھے انگریزی اور انگریزوں سے نفرت کرنے والے مگر جب پیٹ میں درد اٹھتا تو اس توقع پر بھاگے بھاگے اس کے پاس آتے کہ اسے ایک اہم مرض سمجھا جائے اور ان کی طرف پوری توجہ دی جائے مگر جب ڈاکٹر انہیں صرف سوڈیم بائی کاربونیٹ کی گولیاں دے کر رخصت کر دیتا تو وہ چہرے پر بے اطمینانی کے سائے لے کر وہاں سے چلے جاتے۔

کچھ عرصہ بعد ڈاکٹر نے محسوس کیا کہ اسی گاؤں کی ایک جادوٹونہ کرنے والا تانترک جس کا نام "ہمپنی" ہے اس سے زیادہ بزنس کر رہا ہے اور اس کے پاس مریض بھی زیادہ ہیں۔ یہ چیز ڈاکٹر کی پیشہ ورانہ عزت نفس کے لئے تازیانہ سے کم نہ تھی۔ جب ضلعی پولیس کا ایک اعلیٰ افسر اس گاؤں کے دورے پر آیا تو ڈاکٹر نے اس بات کی شکایت اس سے کی۔ اس کے علاوہ علاقہ کے رکن اسمبلی کے پاس بھی اس بارے میں ایک عرضی بھیجی لیکن ان دونوں اقدامات کے نتیجے میں اس کو پولیس کی مخالفت کا سامنا بھی کرنا پڑ گیا اور رفتہ رفتہ اس کی پریکٹس مزید کم ہونے لگی۔ پریشانی کے اس عالم میں ایک دن اس نے اپنی بیوی سے اس معاملے کا تذکرہ کیا جو ایک روایتی گھریلو عورت تھی اور اپنا دائرہ کار صرف گھر کی چار دیواری کو ہی سمجھتی تھی۔

"یہ جاہل لوگ صرف جادوٹونے پر یقین رکھتے ہیں مجھے اس کے خلاف لڑنا ہوگا مگر مقابلے کے لئے نہیں بلکہ یہ اصولوں کی جنگ ہوگی۔" ڈاکٹر کا لہجہ جذباتی تھا۔

"مجھے بھی اس چیز کا احساس ہو رہا ہے اس لئے میں نے مسز ناڈوڈ سے اس بارے میں بات کی تھی۔" ڈاکٹر کی بیوی نے مقامی دکان دار کی بیوی کا حوالہ دیتے ہوئے بتایا۔ "اس کا کہنا ہے کہ مقامی جذبات کو برداشت کرنا ہی تمہارے لئے بہتر ہے۔ وہ کہہ رہی تھی کہ تم بجائے اس کے کہ انتظار میں رہو کہ وہ لوگ خود تمہارے پاس آئیں تمہیں ان لوگوں کو سمجھ کر ان کی مرضی کے مطابق کام کرنا چاہئے۔"

"شاید مجھے یہی کرنا ہوگا۔ مجھے خود بھی انہی جیسا بننا پڑے گا۔" ڈاکٹر نے نیم دلی سے جواب دیا لیکن اس کا بھی کوئی فائدہ نظر نہ آیا اور جب اس کے تقریباً سارے مریض اس کا ساتھ چھوڑ گئے تو اس کی بیوی نے ایک مرتبہ پھر اس سے بات کی۔

"ایک چھوٹا سا دھوکہ کرنا پڑے گا۔" اس کی بیوی نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"کیا مطلب.....؟" ڈاکٹر چونک گیا۔

"جب اچھا کرنا تو ضمیر ملامت کرتے۔" وہ آہستگی سے بولی۔ "ان دیہاتیوں کی کھانسی کی دوائی کی شیشی پر خوبصورت لیبل لگانا ہوگا اور اس کے ساتھ تھوڑا سا جعلی جنتر منتر اور جھاڑ پھونک جو وہ سب چاہتے ہیں..... تمہیں اپنے خیالات کاروبار کے مطابق ڈھالنے ہوں گے۔ اس میں کسی کا نقصان نہیں۔"

"میں ان باتوں کو نہیں مانتا۔ ان جاہلوں کو میرے مطابق چلنا ہوگا یا پھر یہ سب ایسا ہی رہے گا جیسا ہے۔" اس نے مستحکم لہجے میں کہا۔

"میں گاؤں کے واحد دکان دار سے بہت قرض اور ادھار چیزیں لے چکی ہوں اب وہ شاید مزید نہ دے

سکے۔" اس کی بیوی نے یاد دلایا۔

"میں نے اس کے دانت کے درد کا علاج کیا تھا جس کی فیس اس نے ابھی تک ادا نہیں کی۔ ہم اس کے مقروض نہیں ہیں۔" ڈاکٹر نے یاد دلایا۔

اب ڈاکٹر اور جادوگر کی منافقت کھل کر سامنے آ گئی۔ اگر اتفاق سے ان دونوں کا کسی رستے پر آمنا سامنا ہو جاتا تو ڈاکٹر بمشکل اپنے غصے پر قابو کر پاتا کیونکہ اس کو علم تھا کہ اس سے سوائے جھگڑے کے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ لہٰذا خاموشی ہی میں عافیت ہے اگرچہ اس کو یقین تھا کہ وہ حق پر ہے۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ صرف اصول پیٹ بھرنے کے لئے کافی نہیں مگر وہ اپنے اصولوں پر ڈٹا رہا۔ ضرورت کی اس گھڑی میں قدرت نے اس کی مدد کی اور ایک ایسا مریض اس کے پاس بھیج دیا جو جادوٹونے اور تانترکوں سے اتنی ہی نفرت کرتا تھا جتنی ڈاکٹر خود۔

وہ ایک کسان تھا جو گاؤں کے باہر پہاڑ کے اوپر جنگل میں رہتا تھا۔ اس کا نام "ہورب" تھا وہ ایک بدہیت اور اونچا لمبا بے ڈھنگا شخص تھا۔ اس کا بازو زخمی جس کی مرہم پٹی کروانے وہ ڈاکٹر کے پاس آیا تھا۔ ہورب بہت کم گو شخص تھا۔ پٹی کروانے کے بعد اس نے رقم ادا کی اور خاموشی سے واپس ہو لیا۔ اس دوران میں ان دونوں کے بیچ بمشکل دس الفاظ کا تبادلہ ہوا ہوگا۔ فیس وصول کرتے ہوئے ڈاکٹر خوشی سے تقریباً رو پڑا کیونکہ کئی روز کے بعد اس کو کچھ رقم ملی تھی۔

گاؤں میں ہر شخص ہورب سے نہ صرف نفرت کرتا تھا بلکہ اس سے بری طرح خوف زدہ بھی تھا۔ جب وہ اس کو آتا ہوا دیکھتے تو راستے سے ہٹ کر کناروں پر سمٹ جاتے اور اسے گزرنے کے لئے کھلا راستہ دے دیتے۔ اس کے دائیں رخسار پر شاید خنجر کے زخم کا ایک لمبا ترچھا نشان تھا۔ اس کی اندر کو دھنسی ہوئی چھوٹی چھوٹی آنکھیں تھیں جن پر گھنی بھنوئیں ایک جھالر کی مانند جھکی ہوئی تھیں اپنے طویل قد اور آگے کو جھکے ہوئے چوڑے کندھوں کے ساتھ جب وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا چلتا تو دیکھنے والے خوف زدہ ہو جاتے۔ اپنی ضرورت پوری کرنے کے بعد وہ ایک لمحہ بھی گاؤں میں رکنا پسند نہ کرتا اور نہ ہی بلا ضرورت اپنے پہاڑی کھیتوں سے اتر کر گاؤں میں آتا۔

کوئی اس کی عمر کا اندازہ پچاس برس لگاتا تو کوئی ساٹھ سال۔ ایک بوڑھے کا تو خیال تھا کہ وہ اس پہاڑ پر اپنے چوڑے کندھوں اور سانپ جیسی آنکھوں کے ساتھ اس وقت سے رہ رہا ہے جب سے خدا نے اس پہاڑ کو بنایا ہے اور اس وقت تک رہے گا جب تک صور اسرافیل پھونک نہیں دیا جاتا۔ تاہم ڈاکٹر ہورب کے متعلق مثبت سوچ رکھتا تھا اور وہ بھی ڈاکٹر پر مکمل اعتماد رکھتا تھا۔

چند روز بعد ہورب پھر گاؤں میں نظر آیا وہ گھوڑے پر سوار تھا اور بہت عجلت میں نظر آ رہا تھا۔ وہ ڈاکٹر کے گھر کے سامنے رکا اس زور سے دروازہ کھٹکھٹایا جیسے دروازہ اکھاڑ کر ہی دم لے گا۔ ڈاکٹر کی بیوی سبزی خریدنے بازار گئی ہوئی تھی اور ڈاکٹر غسل خانے میں تھا۔ اس وحشت ناک دستک کو سن کر وہ خوف سے اچھل پڑا۔ جسم پر تولیہ لپیٹتے ہوئے دروازے کو آفت سے بچانے کے لئے پھرتی سے باہر کو لپکا۔ جونہی ڈاکٹر نے دروازے کی زنجیر ہٹائی ہورب ایک لمحے کا انتظار کئے بغیر دروازہ دھکا دیتے ہوئے اندر گھس آیا ڈاکٹر گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا۔

"میرا ایک دوست بیمار ہے اور شاید قریب المرگ ہے۔ تمہیں میرے ساتھ چلنا ہوگا ڈاکٹر۔" اس نے کسی توقف کے بغیر بولنا شروع کر دیا۔

"رکو..... میں ابھی تیار ہو جاتا ہوں۔" ڈاکٹر بولا۔

"جلدی کرو....."

"مجھے کپڑے تو پہن لینے دو۔" ڈاکٹر کو بھی غصہ آ گیا۔ "میں چند منٹ میں تیار ہو جاتا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے ڈاکٹر نے ہورب کو وہیں چھوڑا کپڑے بدلنے گھر کے اندر چلا گیا۔ وہ ایک عجیب سی طمانیت اور فخر کے احساس کے ساتھ کپڑے بدل کر اپنا بیگ سنبھالتا ہوا تیزی سے واپس آیا۔ ہورب ابھی تک وہیں کھڑا تھا اور کسی ان دیکھی چیز کو گھورے جا رہا تھا۔

"مجھے اپنا گھوڑا تیار کرنے میں بھی دیر نہیں لگے

گی۔" اس نے ہورب کو مخاطب کیا اور خود اصطبل کی طرف لپکا جہاں اس کے دو گھوڑے بندھے ہوئے تھے ایک گھوڑا تو معمول کے مطابق تقریباً تیار کھڑا تھا۔ ڈاکٹر نے اپنا بیگ گھوڑے کی زین کے ساتھ لٹکایا اور اس پر سوار ہو کر گلی میں نکل آیا۔ ہورب پہلے سے ہی وہاں گھوڑے پر سوار اس کا منتظر تھا۔ ڈاکٹر کو دیکھتے ہی اس نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور بنا کچھ کہے آگے آگے چل پڑا۔ ڈاکٹر اس کے پیچھے تھا۔ گاؤں کے لوگ ان کو حیرت سے دیکھتے ہوئے مختلف قسم کی قیاس آرائیاں کر رہے تھے۔

ان کا سفر خاموشی سے طے ہوتا رہا۔ تقریباً بیس میل چلنے کے بعد ڈاکٹر کا جوش کم پڑنے لگا پھر جب وہ وسیع کھیتوں اور میدانوں کو ایک طرف چھوڑ کر کچے راستے کے ذریعے پہاڑ کی بلندیوں کی طرف گامزن ہوئے تو ڈاکٹر کو اپنی بے پایاں تنہائی کا احساس زیادہ شدت سے ستانے لگا۔ ہورب کے متعلق زبان زد عام کہانیاں، اس کا لوگوں کے ساتھ خواہ مخواہ ہاتھاپائی پر اتر آنا اور اس کی پراسرار شخصیت اس کے ذہن کے گوشوں میں کلبلانے لگی۔ اگرچہ وہ کوشش کر رہا تھا کہ ایسی باتوں پر دھیان نہ دے اور صرف اپنے پیشہ ورانہ فرائض کو سامنے رکھے۔

چلتے چلتے اب وہ ان جھاڑیوں میں داخل ہو گئے تھے جو پہاڑ کے دامن میں دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ گھنے درختوں کی وجہ سے تاریکی محسوس ہونے لگی تو ڈاکٹر کے دل و دماغ میں ایک انجانا خوف سمانے لگا۔ رستے پر جھی کائی کی وجہ سے پھسلن بہت زیادہ تھی اور چلنا دشوار ہو رہا تھا۔ کنکر پتھر گھوڑوں کے سموں تلے آ کر آوازیں پیدا کرتے ہوئے ادھر ادھر لڑھک رہے تھے۔ درختوں کی گھنی شاخیں ڈاکٹر کے چہرے سے ٹکرا رہی تھیں۔ کانوں اور آنکھوں میں گھس رہی تھیں۔ جھاڑیوں میں پھیلی سرسراہٹ کے باعث اس کا دل اچھل اچھل کر حلق میں آ رہا تھا لیکن ہورب ان سب باتوں سے بے نیاز خاموشی سے محوِ سفر تھا۔ اب تک اس نے ایک بار بھی پیچھے مڑ کر دیکھنے کی کوشش کی نہیں کی کہ ڈاکٹر اس کے پیچھے آ بھی رہا ہے یا نہیں۔

افریقہ اپنی پوری وسعت، آب و تاب اور دہشت سمیت ان کے آس پاس بکھرا پڑا تھا چلتے چلتے وہ ایک چھوٹے سے جھرنے کے قریب سے گزرے جس کا پانی چٹان کے نیچے ایک تالاب کی شکل میں جمع ہو رہا تھا جس کے کنارے جابجا پھن پھیلائے سانپ اپنی لپلپاتی زبانوں کے ساتھ کنڈلی مارے پڑے ہوئے تھے۔ راستے میں ایک جگہ ڈاکٹر کو چند ہرنوں اور چیتوں کے سر بریدہ ادھڑے ہوئے جسم نظر آئے جن کی کھوپڑیاں علیحدہ بکھری پڑی تھیں۔ یہاں پہنچ کر ہورب نے اپنا سر اوپر اٹھایا اور اپنی بل کھاتی انگلی سے ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دانت کچکچا کر بولا۔

"دیکھ رہے ہو ڈاکٹر..... یہ سب لنگوروں کی کارستانی ہے۔" اس کے چہرے پر طیش کی سرخی چھا رہی تھی۔ وہ پھر بولنے لگا۔

"یہ سب لنگوروں کا کیا دھرا ہے۔ ان پر خدا کی لعنت ہو۔ میں نے بھی ان کو نہیں چھوڑا جو ہاتھ لگا اس کا سر ایسے ہی قلم کر دیا جیسے انہوں نے ان ہرنوں کے ساتھ یہ کیا ہے۔ ان پر خدا کی لعنت ہو..... خدا کی لعنت....."

ہورب کی آنکھوں میں نفرت کے شرارے ناچ رہے تھے۔ ڈاکٹر نے اس کی نظروں کی تاب نہ لا کر نظریں چرا لیں۔ وہ بے چینی محسوس کر رہا تھا مگر ہورب مسلسل ہذیانی انداز میں بولے جا رہا تھا۔

"کیا تم سمجھتے ہو کہ میں ان سے خوف زدہ ہوں۔ ان لنگوروں سے..... یہ شیطان کے بچے ہیں..... وہ بھی یہ سمجھتے ہیں کہ میں ان سے خوف زدہ ہوں۔ لیکن میں ان میں سے ایک ایک کو جان سے مار دوں گا۔ ان کے سر پھاڑ دوں گا بالکل ان ہرنوں کی طرح..... تم سن ہو رہے ہو نا..... میں خوف زدہ نہیں ہوں۔" وہ اپنے پاؤں رکاب میں جما کر زین سے اوپر اٹھ گیا اور دہشت ناک آواز میں چیخنے لگا۔

"کیا تم سن رہے ہو..... میں خوف زدہ نہیں ہوں..... کیا تم سن رہے ہو؟" اس کی آواز بلند پہاڑوں سے ٹکرا کر گونجنے لگی۔

ڈاکٹر نے ایک گہری سانس لی اور محسوس کیا کہ

ماحول کی ساری ویرانی اور خاموشی میں ایک عجیب سی پراسراریت ہے جو اس کو اپنی طرف بلا رہی ہے۔ لمحے تیزی سے پھسلتے جا رہے تھے کچھ دیر کی خاموشی کے بعد اچانک ہورب نے اپنے سر کو جھٹکا دیا اور دیوانوں کی طرح قہقہے لگانے لگا۔ اس کے قہقہوں میں ایک عجیب سا خوف رچا ہوا تھا۔ اس قسم کی ہنسی ڈاکٹر نے پہلے کبھی نہیں سنی تھی۔ ان عفریتی قہقہوں سے خوف زدہ ہو کر اس کا گھوڑا بھی اپنے سم زور زور سے زمین پر مارنے لگا اور پھر تیزی سے آگے کو بڑھا۔

جھاڑیوں کے سائے میں مزید ایک گھنٹہ سفر کرنے کے بعد سامنے وسیع قطعہ زمین پر فارم ہاؤس کی عمارت نظر آنے لگی وہ ایک روایتی زرعی عمارت تھی جس کی چھت ٹین کی بنی ہوئی تھی جس پر مٹی کی لیپ کیا گیا تھا چند مرغیاں ادھر ادھر کچرے سے دانہ دنکا تلاش کر رہی تھیں ایک طرف سے کتے کے بھونکنے اور رونے کی آواز بھی آئی لیکن کہیں بھی کوئی انسان نظر نہیں آ رہا تھا۔

وہ جنگلی پیڑوں کے پاس سے مڑے اور فارم ہاؤس کے بالکل سامنے پہنچ گئے۔ کتے کے رونے کی آواز اب صاف سنائی دے رہی تھی۔ آس پاس ماحول پر پھیلا سناٹا اس آواز کو مزید گہرا اور خوف ناک بنا رہا تھا۔ ہر تھوڑی دیر کے بعد یہ آواز ابھرتی اور پھر آہستہ آہستہ سناٹوں میں گم ہو جاتی لیکن جب دوبارہ ابھرتی تو پہلے سے زیادہ خوف کو اپنے ساتھ لاتی۔

ہورب اپنے گھوڑے کو برآمدے کی سیڑھیوں کے سامنے لے آیا۔ باگیں کھینچ کر اس کو روکا اور پھر ڈاکٹر کا گھوڑے سے نیچے اترنے کا انتظار کرنے لگا۔ وہ بالکل خاموش تھا لیکن اس کا چہرہ گھوڑا ہولے ہولے مسلسل ہل رہا تھا۔ ڈاکٹر اپنے گھوڑے سے کود کر اترا۔ بیگ خرجین سے نکالا اور اسے لے کر برآمدے کی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

"کتے کا رونا سن کر تو لگتا ہے ہمیں دیر ہو گئی ہو۔" ہورب اپنا سر ہلاتے ہوئے کہنے لگا۔

"مریض کہاں ہے؟" ڈاکٹر نے پوچھا۔

ہورب کوئی جواب دیئے بغیر گھوڑے سے اترا اور چپ چاپ مکان کے اندر چلا گیا۔ ڈاکٹر بھی اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ تاریک سیلن زدہ کمرے میں جانوروں کے جسم سے اٹھنے والی ناگوار بھوپھلی ہوئی تھی لیکن کہیں بھی کوئی جانور نظر نہیں آ رہا تھا۔ جب اس کی آنکھیں تاریکی میں دیکھنے کے قابل ہوئیں تو اس کو پتہ چلا کہ یہ ایک کھانے کا کمرہ تھا۔ فرنیچر بالکل عام سا تھا اور بچا کھچا کھانا ابھی تک میز پر موجود تھا۔ ایک ٹوٹی ہوئی کرسی کے ٹکڑے فرش پر بکھرے پڑے تھے۔ ایک کونے میں ایک کوئی چیز حرکت کرتی محسوس ہوئی تو وہ ٹھٹک کر رک گیا۔ لنگوروں کے دو بچے خوف زدہ انداز میں دیوار سے چمٹنے کی کوشش کر رہے تھے ان کی آنکھوں میں وحشت تھی۔ جب اس نے ان کی طرف دیکھا تو اسے اپنے پورے جسم میں سرسراہٹ محسوس ہونے لگی۔ لنگوروں کے یہ بچے انسانوں کی مانند چیخ رہے تھے۔ ان میں سے ایک مادہ تھی اور ایک نر۔ ان کی رنگت سیاہ تھی۔ جونہی ہورب ان کی طرف بڑھا وہ مزید خوف زدہ ہو کر اور زیادہ شدت سے دیوار کے ساتھ چمٹنے کی کوشش کرنے لگے۔ ان کے لبوں سے وحشت کے عالم میں انجانی سی کراہیں بلند ہو رہی تھیں۔ ہورب کی آواز نے کمرے کے سناٹے کو توڑ دیا۔

"لنگوروں کا ایک عمدہ جوڑا....." پھر وہ آگے بڑھا اور ان کے قریب جا کھڑا ہوا۔ اپنا کوڑا کھولا اور اس کو شڑاپ شڑاپ لہرانے لگا۔ لنگوروں کی چیخیں دہشت ناک ہو گئیں جنہیں سن کر ہورب وحشیانہ انداز میں قہقہے لگانے لگا، ہنستے ہوئے اس نے ڈاکٹر کو مخاطب کیا۔

"سن رہے ہو ڈاکٹر..... دیکھو یہ لنگور کیسے مجھ سے خوف زدہ ہیں میں صرف اپنا پاؤں اٹھاتا ہوں اور یہ چیں چیں کرنے لگتے ہیں۔ دیکھو یہ مجھ سے خوف زدہ ہیں اور تم سمجھے کہ میں ان لنگوروں سے خوف زدہ ہوں۔" وہ ہنستے ہوئے تیزی سے اپنا کوڑا ہوا میں لہرانے لگا اور ان لنگوروں کو مخاطب کرنے لگا۔

"دفع ہو جاؤں یہاں سے بدبختو.....! اپنی گندگی میں واپس چلے جاؤ۔" وہ بری طرح دھاڑ رہا تھا۔

دونوں بچے خوف زدہ انداز میں گرتے پڑتے باہر کی طرف بھاگے ہورب ان کے پیچھے دروازے کے باہر تک لپکا۔ نر کا پاؤں پھسلا اور وہ زمین پر گر گیا۔ پتھر سے ٹکرانے کے باعث اس کے سر سے خون بہنے لگا۔ خوف زدہ انداز میں سسکتی ہوئی اس کی ساتھی رک گئی اور اسے پاؤں پر کھڑے ہونے میں مدد دینے لگی پھر وہ دونوں گھنے پیڑوں کے بیچ غائب ہوگئے۔

کتا جو اس دوران یں خاموش ہوگیا تھا ایک مرتبہ پھر اپنی کریہہ اور رونگٹے کھڑی کردینے والی آواز میں بین کرنے لگا۔ اب ہورب اسے ڈانٹنے کے انداز میں چیخا تو کتا ایک دم سہم کر خاموش ہوگیا۔ ہورب نے اپنا کوڑا سمیٹا اور کمرے میں واپس آگیا اور ڈاکٹر کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے کمرے کے ایک کونے کی طرف اشارہ کیا اور آگے بڑھ کر پردوں کے پیچھے چھپے ایک دروازے کو کھولتے ہوئے بولا۔

''وہ ایک حادثہ تھا۔ ممکن ہے اب تک وہ مر بھی چکی ہو۔''

ڈاکٹر کمرے میں داخل ہوتے ہی ٹھٹک کر رک گیا۔ باہر کی طرف کھلنے والی کھڑکی کے نیچے بچھے بستر پر ایک درمیانی عمر کی عورت کمبل اوڑھے لیٹی تھی۔ وہ تیزی سے آگے بڑھا اور جھک کر اس کو معائنہ کرنے لگا۔ عورت کا نچلا جبڑا بری طرح ٹوٹ کر عجیب سے زاویے پر لٹک گیا تھا۔ کمبل خون میں بھیگا ہوا تھا۔ ڈاکٹر نے آہستگی سے کمبل تھوڑا سا ہٹا کر اس کے کندھوں کا معائنہ کیا اور پھر مڑ کر اپنے پیچھے ہورب کو دیکھا جو ابھی تک اپنے تاثرات سے عاری چہرے کے ساتھ دروازے میں بے حس و حرکت کھڑا تھا۔

''یہ عورت تو مر رہی ہے۔'' ڈاکٹر سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ کیا کہے۔

ہورب اپنا سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''یہ صرف ایک حادثہ تھا۔''

اس کی بات سن کر ڈاکٹر کو ٹوٹی ہوئی وہ کرسی یاد آگئی جو باہر والے کمرے میں اس نے دیکھی تھی وہ کہنے لگا۔ ''پھر تو یہ پولیس کا کیس ہے ڈاکٹر کا نہیں۔''

ہورب آہستگی سے چلتا ہوا بستر کے قریب پہنچا اور سخت لہجے میں بولا۔

''پولیس یہاں نہیں آئے گی اگر یہ مر گئی تو میں اسے یہیں دفن کردوں گا۔''

''تم ایسا نہیں کرسکتے......'' ڈاکٹر تیزی سے بولا۔ اتنا مختصر سا جملہ بولنے کے لئے اس کو اپنی ساری جرأت اور ہمت مجتمع کرنا پڑی تھی۔ عین اسی وقت اس نے اپنے عقب میں ایک آہٹ سنی تو وہ تیزی سے پیچھے مڑا۔

کمرے میں ایک چوتھا شخص بھی موجود تھا جو ایک اندھیرے کونے میں بیٹھا ہوا تھا۔ سوکھے ہوئے سیاہ جسم والے اس شخص کا چہرہ بڑھاپے کی منزلوں کو ظاہر کررہا تھا۔ وہ خاموشی سے ان کو گھورے جارہا تھا۔ اس کی نگاہوں کی تیزی سے خوف زدہ ہوکر ڈاکٹر دو قدم پیچھے ہٹ گیا اور وہ ہذیانی انداز میں چیخا۔

''وہ کون ہے؟''

ہورب نے بھی چونک کر اس کونے کی طرف دیکھا۔ جونہی اس کی نظر منحنی بوڑھے پر پڑی وہ پاگل سا ہوگیا اور اپنا کوڑا لہراتے ہوئے اس کی طرف جھپٹا اس کے ساتھ ہی وہ ناقابل فہم زبان میں بری طرح چیخ رہا تھا مگر کوڑا لگنے سے پہلے ہی وہ کونا خالی ہوچکا تھا۔ بوڑھے چھلاوے کی مانند جست لگا کر کھلی کھڑکی سے باہر کود گیا تھا۔

ہورب غصے سے بری طرح کانپ رہا تھا۔ اس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ وہ پورے کمرے میں دیوانہ وار کوڑا لہرا رہا تھا۔ ڈاکٹر تھوڑا سا پیچھے ہٹ گیا وہ بھی اس منحنی بوڑھے کو پہچان گیا تھا۔ وہ جادو ٹونہ کرنے والا تانترک ''امپنی'' تھا۔ اب ڈاکٹر کا غصہ بھی ہورب کی طرح بے قابو ہورہا تھا۔

بستر پر موجود عورت نے اپنی آنکھیں کھولیں اور تاثرات سے عاری نگاہوں سے انہیں دیکھنے لگی۔ اس پر موت کے سائے منڈلا رہے تھے۔ ہورب اس کی طرف مڑا اور چلا کر اس سے پوچھنے لگا۔

''تم نے اس خبیث کو یہاں بلایا تھا۔'' وہ کراہا اور اس کے ساتھ ہی کوئی جواب سننے سے پہلے اس کا بے رحم کوڑا اس کے معذور جسم پر لہرایا۔ ڈاکٹر کا ذہن فوراً بیدار ہوگیا اور اس نے ہاتھ بڑھا کر ہورب کے کوڑے کو دوبارہ لہرانے سے روک دیا اور اسے ہورب کے ہاتھ سے چھین کر ایک طرف پھینکتے ہوئے بولا۔

''کیا تم پاگل ہوگئے ہو۔ یہاں سے دفع ہوجاؤ اور اس بے چاری کو سکون سے مرنے دو۔''

کہنے کو تو ڈاکٹر نے یہ بات کہہ دی مگر اب اس نے سوچا یہ بات سن کر یقیناً ہورب خالی ہاتھ ہی اس پر پل پڑے گا اور اس کا تیاپانچہ کرکے رکھ دے گا لیکن ہورب کا ردعمل غیر متوقع تھا وہ بیرونی دروازے کی طرف مڑ گیا۔ اس کی نگاہیں کسی غیر مرئی نقطے پر جمی ہوئی تھیں اور وہ بڑبڑانے لگا۔

''یہ بدبخت عورت اس خبیث جادوگر کو میرے گھر میں لائی ہے۔ اس پر خدا کی لعنت ہو۔'' یہ کہتے ہوئے وہ دروازے کی چوکھٹ کے ساتھ ٹک گیا اور اپنی سانس درست کرنے لگا۔ چند لمحے بعد وہ پھر بولا۔

''چونکہ میں نے اس کو بری طرح پیٹا تھا اس لئے مجھے قتل کروانے کے لئے اس نے اس جادوگر کو یہاں بلایا ہے۔''

''باہر دفع ہوجاؤ......'' ڈاکٹر نے جی کو کڑا کرکے کہا۔ اس کو اندازہ ہوگیا تھا کہ یہ آدمی غصے سے نہیں بلکہ خوف سے پاگل ہورہا ہے۔

ہورب ایک لمحہ تذبذب کے عالم میں وہاں کھڑا رہا پھر اس نے جھک کر زمین پر پڑا اپنا چرمی کوڑا اٹھایا اور لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ دروازے سے نکل گیا۔ ڈاکٹر اس کے قدموں کی چاپ ڈائننگ روم سے ہوتے ہوئے برآمدے کی سیڑھیاں اترنے تک سنتا رہا۔

عورت نے بستر پر حرکت کی تو ڈاکٹر فوراً اس کی طرف متوجہ ہوگیا۔ وہ کچھ کہنے کی کوشش کررہی تھی اس کے ٹوٹے ہوئے جبڑے کے عضلات مسلسل حرکت کررہے تھے۔ ڈاکٹر اس کی طرف جھک گیا۔

''وہ آرہے ہیں...... دیکھو وہ آرہے ہیں۔''

عورت نے سرگوشی کرتے ہوئے نقاہت کے عالم میں اپنا ایک ہاتھ اٹھا کر کھڑکی کی طرف اشارہ کیا۔

ڈاکٹر نے آہٹ سننے کی کوشش کی جب کچھ سنائی نہ دیا تو وہ غیر ارادی طور پر کھڑکی کی طرف بڑھا اور باہر جھانکا۔ باہر نظر پڑتے ہی وہ اپنی جگہ ٹھٹک کر رک گیا اس کے قدم جہاں تھے وہیں جم کر رہ گئے۔ وہ جو کچھ دیکھ رہا تھا اس پر خود اسے بھی یقین نہیں آرہا تھا۔ باہر اندھیرا چھا رہا تھا مگر ابھی اتنی روشنی باقی تھی کہ وہ بخوبی دیکھ سکتا تھا۔

ہورب بالکل سیدھا اور بے حس و حرکت کھڑا تھا۔ اس کی پھیلی ہوئی آنکھوں میں خوف چمک رہا تھا۔ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ اس کے آس پاس نیم دائرے کی شکل میں تقریباً پچاس ساٹھ لنگور موجود تھے اور ان کی تعداد مستقل بڑھتی جارہی تھی۔ وہ انسانوں کی مانند اکڑوں بیٹھے ہوئے تھے اور ہورب کو ایک ٹک گھورے جارہے تھے۔

نجانے کتنی دیر تک ڈاکٹر کھڑا انہیں دیکھتا رہا۔ باہر کوئی حرکت ہورہی تھی نہ آواز سنائی دے رہی تھی سب بت بنے یوں بیٹھے تھے جیسے کسی انجان پہیلی کے کردار ہوں۔ ہورب کھڑا انہیں گھور رہا تھا۔ لنگور بھی اپنے نیم دائرے میں دم سادھے اسے گھور رہے تھے۔ ہوا بھی ساکت تھی اور یوں لگتا تھا جیسے اسی صورت حال میں زمین بھی اپنی گردش بھول گئی ہو۔ کچھ دیر بعد ہورب نے دھیرے سے اپنا سر ہلایا اور ادھر ادھر دیکھنے لگا جیسے وہ لنگوروں کی تعداد گن رہا ہو۔ لنگور اپنی جگہ یوں جمے ہوئے تھے جیسے پتھروں سے تراشے ہوئے ہوں۔ ڈاکٹر کے کوٹ کی جیب میں پڑی گھڑی کی ٹک ٹک کی آواز کسی لوہار کے ہتھوڑے کی ضرب جیسی محسوس ہورہی تھی۔

تب کہیں دور سے ایک مدہم دھن کی آواز سنائی دے رہی تھی لیکن اس کی سمت کا اندازہ نہیں ہو پا رہا تھا۔ وہ چاروں طرف سے پھوٹتی محسوس ہورہی تھی۔ دھن کی آواز آہستہ آہستہ تیز ہوتی چلی گئی۔ اب یہ آواز دماغ کو سن کررہی تھی جس میں کوئی لے، کوئی تال، کوئی الفاظ نہیں تھے۔ بس یہ معصوم چیخیں تھیں جو ظالم کے ظلم کے خلاف

تھیں اور شاید ہورب ان کو خوب جانتا تھا۔ وہ لنگوروں پر سے نظریں ہٹائے بغیر ٹٹولتا ہوا الٹے پاؤں گھر کی طرف بڑھا۔ ابھی وہ دو قدم بھی پیچھے نہ ہٹا تھا کہ جیسے کسی جادوئی عمل سے لنگوروں کا نیم دائرہ ایک دم مکمل ہوگیا اور انہوں نے اس کی راہ روک لی اب لنگور ہر طرف سے بڑھتے چلے آرہے تھے۔

ایک لمحہ پہلے ہورب کے عقب میں گھر کی طرف راستہ صاف تھا لیکن اب اس طرف بھی لنگور اس کا راستہ روکے کھڑے تھے۔ وہ اپنے خمیدہ جسموں کے ساتھ زمین پر بیٹھے اس کو یک ٹک گھورے چلے جارہے تھے۔ لرزا دینے والی خوف ناک دھن مسلسل یوں جاری تھی جیسے شہد کی مکھیوں کے جتھے نے بند کھڑکی کے شیشے پر دھاوا بول دیا ہو یا پانی کسی بانسری کے سوراخوں میں سے گزر رہا ہو۔

ہورب کانپ رہا تھا اور اس کا سانس دھونکنی کی مانند چل رہا تھا جس کی وجہ سے اس کے لحیم شحیم جسم کو مسلسل جھٹکے لگ رہے تھے۔ جب اس نے مڑ کر دیکھا تو ایک لمحہ کے لئے اس کی نظریں ڈاکٹر کی نگاہوں سے ٹکرائیں اور ڈاکٹر کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔ وہ چاہتے ہوئے بھی اس کی کوئی مدد کرنے سے قاصر تھا۔

تب اچانک دھن بدل گئی اور ایک ہلکی سی جنبش کے ساتھ لنگوروں کا حلقہ اندر کی طرف سمٹنے لگا ان کا گھیرا تنگ ہورہا تھا۔ ہورب کے حلق سے مہمل آوازیں بلند ہونے لگیں لیکن وہ ابھی تک وہیں کسی کھمبے کی طرح جما کھڑا تھا۔ لنگور دوبارہ اپنی جگہ پر بے حس و حرکت ہوگئے تھے مگر ان کی نگاہیں ابھی تک اس پر جمی ہوئی تھیں۔ دہشت ناک طاغوتی دھن مسلسل بج رہی تھی پھر اچانک ہورب نے دلوں میں خوف اور دہشت بھر دینے والی آواز میں ہنسنا شروع کردیا۔ اس کے قہقہے کی آواز ابتداء میں ہلکی تھی جو جلد ہی کسی مجنون کے بلند آہنگ بے ہنگم ہذیانی قہقہوں میں بدل گئی۔

ڈاکٹر اپنی جگہ مبہوت کھڑا یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا کہ اچانک بستر کی طرف سے ہونے والے شور نے اسے اپنی طرف متوجہ کردیا۔ عورت کا ہاتھ فضا میں بلند تھا۔ دہشت ناک دھن کی لے اب اور زیادہ شدید اور تیکھی ہوتی جارہی تھی۔ ڈاکٹر نے لمحہ بھر کے لئے مڑ کر دوبارہ کھڑکی کے باہر دیکھا جہاں تک وہی پہلے والا منظر تھا۔ ہر کوئی اپنی جگہ جما ہوا تھا۔ لنگور اپنی شت باندھ چکے تھے اور اب حملہ کرنے کے حکم کے منتظر تھے اور پھر...... عورت کا بازو ایک دم نیچے گرا اور بے جان ہوکر بستر سے نیچے لٹکنے لگا۔ اسی لمحے جیسے لنگوروں کے لئے طبل جنگ بج اٹھا ہو۔ وہ موت کے چھلاوے کی طرح جھپٹ پڑے اور ہورب کی دہشت ناک چیخیں اس کے حلق میں دم توڑنے لگیں۔

ڈاکٹر نے گھبرا کر آنکھیں بند کرلیں تھوڑی دیر بعد جب اس نے دوبارہ آنکھیں کھولیں اور کھڑکی کے باہر دیکھا تو میدان بالکل خالی تھا صرف ہورب کا چرمی کوڑا ایک طرف گرا ہوا تھا۔ ڈاکٹر کے دیکھتے ہی دیکھتے منحنی جادوگر درختوں کی اوٹ سے برآمد ہوا اور اس نے وہ کوڑا اٹھالیا۔ پھر وہ چلتا ہوا کھڑکی کے نیچے آیا اور ادب سے اپنا ہاتھ بلند کرتے ہوئے بولا۔

"محترم ڈاکٹر...... آپ یقیناً گھر واپس جانا پسند کریں گے۔"

"یقیناً......" ڈاکٹر لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں بولا۔ اس کے چہرے پر مردنی چھارہی تھی۔

آدھی رات کا وقت تھا جب ڈاکٹر نے گاؤں کے تھانے میں اس واقعہ کی رپورٹ کی اور واپس اپنے گھر پہنچا۔ اس کی بیوی رات کا کھانا لئے ابھی تک اس کا انتظار کررہی تھی۔ جب اس نے ڈاکٹر کا اترا ہوا چہرہ دیکھا تو بے تابی سے اس کی طرف لپکی۔

"کیا ہوا......؟ کیا تم ٹھیک ہو......؟ تمہارے لئے پانی لاؤں......؟" اس نے چلاتے ہوئے سوالات کی بوچھاڑ کردی۔

"مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں......! مجھے صرف ایک تانترک کی ضرورت ہے ایک تانترک کی۔" وہ بے بسی سے کراہا۔

روح کی گواہی

مدثر بخاری-شہر سلطان

رات اور گھری ہوگئی تھی، دھند ہر چیز پر چھاگئی تھی، ہیٹر آن تھا کہ اچانک لائٹ چلی گئی اور مکمل اندھیرا مسلط ہوگیا، نوجوان نے ٹیبل پر ہاتھ مارا تو اسے لگا کہ جیسے ہزاروں وولٹ کا کرنٹ لگا ہو اور پھر اس کا ہاتھ پکڑلیا گیا۔

کیا یہ حقیقت ہے کہ کوئی روح بھی کسی کے خلاف گواہی دے سکتی ہے، کہانی پڑھ کر پتہ چلے گا

اگر ایک وقت میں ایک آدمی کے پاس تین فون کالز آجائیں تو صورتحال کس قدر گھمبیر ہوجائے گی اور اس کا اندازہ آپ بخوبی لگا سکتے ہیں اور یہی صورت حال اس وقت میرے یعنی انسپکٹر کامران کے ساتھ ڈراونی صورت میں پیش آچکی تھی جی ہاں آج کی صبح کس قدر خوف ناک تھی اس کا اندازہ تو آپ کو اس طرح ہوسکتا ہے کہ ایک وقت میں تین نسوانی فون کالز ریسیو ہوئیں ایک فون میرے سیل نمبر پر دوسرا لینڈ لائن پر اور تیسرا میرے اس موبائل پر جو ہمیشہ میری بیک پاکٹ میں رہتا ہے۔

فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ سب سے پہلے کس کا فون ریسیو کیا جائے فیصلہ سازی کا مرحلہ کٹھن اور تکلیف دہ تھا کیونکہ کون کتنا زیادہ مشکل میں تھا اس کا اندازہ مجھے فون اٹینڈ کرنے سے پہلے بالکل نہ تھا خیر میں نے لینڈ لائن والی کال موصول کی۔

"ہیلو...... انسپکٹر کامران اسپیکنگ......" میں نے کہا۔

"ہیلو...... سر آئی ایم مونا......" وہ ایک خوب صورت آواز کی مالک لڑکی تھی جو بڑے خوب صورت انداز سے بولی تھی۔

"جی فرمائیے...... میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں؟"

"سر...... کیا آپ اس وقت اندھیر گلی آسکتے

ہیں؟'' مونا نے پوچھا۔
''اندھیر گلی، لیکن خیریت تو ہے؟'' میں نے پوچھا۔
''جی سر...... میری چھوٹی بہن رات کو اچھی خاصی سوئی تھی وہ بالکل صحت مند تھی لیکن صبح اس کی حالت خراب تھی اس کے سر کے بال اتر گئے قریب گنجی ہوگئی تھی پھر اچانک ہی اسے بلائنڈنس کا دورہ پڑا اس کی بینائی اچانک ختم ہوگئی ہم نے فیملی ڈاکٹر کو فون کیا ڈاکٹر نے اسپتال منتقل کیا ٹیسٹ ہوئے لیکن کچھ سمجھ نہیں آئی کیونکہ ٹیسٹ بالکل نارمل ہیں۔'' وہ بولی۔
''اوہ...... کافی پریشان صورت حال ہے...... لیکن اس صورت میں، میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں۔''
''سر...... یہ پولیس کیس ہے کیونکہ میری بہن کی حالت بتا رہی کہ کسی نے جان بوجھ کے اس طرح کی ہے۔ اور اس کے کچھ ثبوت بھی میرے پاس موجود ہیں......'' مونا بولی۔
مطلب آپ کو کسی پر شک ہے کہ کسی نے آپکی سسٹر کو جان بوجھ کے بیمار کیا ہے؟''
''جی ہاں...... آپ پلیز اندھیر گلی محلہ میں آجائیں مکان نمبر 232 جہان ہاؤس۔''
''اوکے...... میں پہنچتا ہوں آپ حوصلہ رکھیں اگر کوئی مشکوک بات ہے تو میں ہینڈل کرتا ہوں۔'' میں نے فون منقطع کیا۔
اور اپنی کیپ سر پر جما کر باہر آ گیا معاملہ فی الحال تو سنگین تھا کیونکہ بقول مونا کے اس کی بہن کی حالت کافی خراب تھی اور اسے کسی پر شک تھا اور اس کے پاس ثبوت بھی تھے، میں نے فوراً ہی اندھیر گلی کا رخ کیا، اے ایس آئی ہمت خان، حوالدار سیلاب خان اور کانسٹیبل روشن خان میرے ساتھ تھے۔
وہ ایک نارمل گھر تھا مڈل کلاس فیملی تھی، مونا ایک حسین اور سلجھی ہوئی لڑکی تھی اس کی آنکھوں میں اداسی کی گہری پرچھائیں تھی ایسا لگتا تھا جیسے روتی رہی ہو، اس کی آنکھیں جتنی اداس تھیں اتنی خوب صورت بھی تھیں، ایک لمحے کو میری نگاہیں اس کی آنکھوں کی سحر انگیزی میں کھوگئیں۔ اتنی خوب صورت آنکھیں میں نے اپنی زندگی میں پہلی دفعہ دیکھی تھی...... آنکھوں سے اداسی کی گہری پرچھائیں کچھ عجیب لگی۔
''وہاں چار لوگ تھے...... مونا، اس کی امی، چچا اور نانی...... جبکہ مونا کی چھوٹی بہن اسکارف پہنے اور کمبل اوڑھے بیڈ پر سوئی ہوئی تھی، چودہ پندرہ سال کی خوب صورت لڑکی تھی جس کے چہرے پر معصومیت واضح تھی۔
''اس کا نام کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔
''سحر...... میری چھوٹی بہن۔'' مونا بولی۔
''مجھے تفصیل سے بتائیں کیا معاملہ ہے؟ اور آپ کس پر شک کررہی ہیں؟''
''سر...... نویں کلاس میں پڑھتی ہے۔ ذہین اور کلاس کی ٹاپ اسٹوڈنٹ...... کل رات یہ اچھی خاصی صحت مند سوئی تھی کہ صبح جب یہ اٹھی تو اس کے سر سے بال غائب تھے ابھی ہم اس مسئلے پر غور کررہے تھے کہ اس کی بینائی ختم ہوگئی، ڈاکٹرز نے چیک کیا رزلٹ عجیب وغریب تھا، آئی سینٹر کی حیران کن رپوٹ ہے کہ ان کی بینائی تو بالکل اوکے ہے۔ رپورٹ کے مطابق یہ نابینا نہیں ہوئی ہیں جبکہ سحر کو کچھ نظر نہیں آرہا تھا اور ابھی بھی اسے کچھ نظر نہیں آرہا۔
سر...... میں آپ کو کچھ دکھانا چاہتی ہوں۔ پلیز! میرے ساتھ آیئے۔'' مونا نے کہا اور وہ ایک راہداری کراس کرکے دوسرے کمرے میں آگئی...... میں نے اسے فولو کیا پھر کمرے میں ایک سنگل بیڈ تھا جبکہ دیواروں پر ہاتھ سے بنی ہوئی چھوٹی چھوٹی پینٹنگز کاغذ کے ٹکڑوں پر بنا کر ٹیپ سے چسپاں کی گئی تھیں، تصویروں میں مختلف قسم کی فیلنگ نمایاں تھی غالباً یہ سحر کا کمرہ تھا۔
''یہ سحر کا روم ہے اور یہ ساری پینٹنگز سحر نے بنائی ہیں، آپ کو بتاؤں کہ سحر ایک نفیس لڑکی ہے صفائی ستھرائی اس کی عادت ہے وقت کی پابند ہے اور بہت زیادہ حساس اور اسی حساسیت نے اسے اتنی مشکل میں ڈال دیا ہے۔'' مونا بولی۔
''آپ مجھے اس حساسیت کے بارے میں بتائیں جو مجھے لگتا ہے ضرور اہم بات کی طرف لے جائے گی؟''

معصوم لڑکا جس پر کئی لڑکیاں فدا ہوئیں...... لیکن اس کی شرافت کہ اس نے کبھی کسی کو لفٹ نہ دی۔ وہ یہی کہتا تھا کہ ''میں کسی اور کو پسند کرتا ہوں اور میں کسی کو دھوکہ نہیں دینا چاہتا۔'' لیکن سحر اس کو بہت پسند آئی اس نے سحر کو اپنے دل کی بات بھی بتادی اور سحر نے مجھے یہ بات راز کے طور پر بتائی۔ ہم دونوں بہنیں بہت اچھی دوست بھی ہیں، ہر چیز شیئر کرتے ہیں سحر نے مجھے اپنے دل کی بات بتادی کہ ظفر بھی اس کی دل کی آواز ہے۔''
ظفر سے ایک دفعہ میری ملاقات بھی ہوئی۔ وہ ایک خوبرو لڑکا تھا...... سحر کو پسند کرنے والا...... لیکن...... !وہ خاموش ہوگئی۔ لیکن...... پھر...... وہ رونے لگی تھی۔
''آپ پلیز روئیں مت...... اور تسلی سے مجھے بتائیں۔'' میں نے اسے بیٹھا دیا۔ وہ رو رہی تھی مجھے افسوس ہوا اس کی حالت دیکھ کر۔
''سر...... یہ سارے کارنامے نائلہ کے ہیں...... جو میری بہن کو تنگ کرتی رہی اور پھر اس کو اس حالت تک پہنچا دیا۔''
''نائلہ کون ہے؟'' میں نے پوچھا۔
''ظفر کو پسند کرتی ہے، ظفر کو بھی مار ڈالا اور اب میری بہن کے پیچھے پڑگئی ہے۔''
مجھے کچھ سمجھ نہ آئی کہ آخر وہ کس کی بات کررہی ہے نائلہ کون تھی؟ ظفر کو بھی جس نے مار ڈالا؟ آخر یہ کیا گڑبڑ تھی؟
ظفر کو نائلہ نے شادی کی آفر کی وہ ایک امیر لڑکی تھی جس نے ظفر کو دولت کے ذریعے حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن ظفر اس کی باتوں میں نہ آیا اور نائلہ کے پرپوزل کو ریجیکٹ کردیا، نائلہ کو پتہ لگا کہ سحر اور ظفر کی دوستی عروج پر ہے تو اس نے سحر کو دھمکیاں دینا شروع کردی ایک خط بھی مجھے سحر کی دراز سے ملا ہے۔ مونا نے دراز سے ایک تہہ شدہ خط نکالا جو اس نے مجھے پڑھنے کے لئے دیا خط میں درج تھا۔
میری دشمن سحر۔
میری زندگی کی دشمن ہو، تم نے میری زندگی میں عذاب پیدا کردیا ہے تم نے میرے دوست میری محبت کو مجھ سے چھین کر بہت غلط قدم اٹھایا ہے، میں تم سے ہر صورت اپنے ظفر کو حاصل کروں گی تم جتنا بھی زور لگالو...... ظفر کو تم حاصل نہیں کرسکتی، تم تیار رہنا...... کسی بھی قدم پر تم منہ کے بل گرسکتی ہو۔ نائلہ
میں نے اس خط کو اپنی جیب میں رکھا اور مونا سے پوچھا۔
''سحر کے بارے میں بتائیں وہ ظفر سے بھی اتنی ہی محبت کرتی تھی جتنا کہ ظفر کرتا تھا۔''
''ہاں...... دونوں کی محبت قابل دید تھی پتہ نہیں کیوں نائلہ یہ سب کررہی ہے؟''
''میرے خیال میں صرف یہ خط ثبوت کے لئے کافی نہیں...... کیونکہ جس رات سحر کے بال کاٹے گئے، اس رات وہ گھر پر ہی تھی۔'' میں نے پوچھا۔
''ہاں وہ گھر پر ہی تھی، لیکن اس رات وہ معمول سے ایک گھنٹہ لیٹ آئی تھی...... اس کی ذہنی حالت ٹھیک نہیں تھی اور وہ اسکارف میں تھی۔'' وہ بولی۔
''اسکارف وہ ہر وقت استعمال کرتی ہے یا کبھی کبھی؟'' میں نے پوچھا۔
''وہ روزانہ جب باہر جاتی ہے تو اسکارف پہنتی ہے لیکن رات وہ کچھ گھبرائی ہوئی تھی۔ خاموش اور کنفیوژ بھی۔'' وہ بولی۔
''آپ نے اس سے کچھ پوچھا نہیں کہ وہ اتنا کنفیوژ کیوں ہے؟''
''پوچھا تھا لیکن سر درد کا کہہ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔''
''جب وہ اپنے کمرے میں گئی تو اس کے پیچھے کوئی گیا یعنی بعد میں کسی کام کے سلسلے میں کوئی گیا ہو؟''
''میرے خیال میں کوئی نہیں گیا...... سب لوگ سرشام ہی سوجاتے ہیں۔''
''ویسے حیرت ہے آپ نے اپنی بہن سے

پریشانی کی وجہ تک پتہ نہیں کی آپ کو سحر سے وجہ پتہ کرنی چاہئے تھی۔" وہ خاموش ہوگئی۔

"بہرحال آپ سحر کا خیال رکھیں...... میں مزید تفتیش کرتا ہوں۔" تب ہی میں نے بیڈ کے نیچے کچھ دیکھا اور ہاتھ بڑھا کر جیب میں ڈال لیا وہ جو کچھ بھی تھا بہت اہم تھا اس کارروائی کا مونا کو خبر تک نہ ہوئی۔

☆......☆......☆

وہ ایک اہم کال تھی جو میں نے فرسٹ ٹائم اگنور کردی تھی اور جو میرے پرسنل نمبر پر آئی تھی۔ میں مونا کے گھر سے واپس تھانے کی طرف آرہا تھا کہ اچانک کال موصول ہوئی۔

"ہیلو...... انسپکٹر کامران اسپیکنگ۔" میں نے کہا۔

"تھینک گاڈ آپ نے کال اٹینڈ کرلی۔ میں صبح سے ٹرائی کررہی تھی آخر آپ نے کال اٹینڈ کرلی۔" وہ ایک خوب صورت آواز تھی جو شیرینی سے بھرپور تھی۔ میری سماعتوں نے ایسی آواز پہلے کبھی نہیں سنی تھی دل میں اترنے والی اور میٹھی۔

"چلیں آپ شکرانہ کے نفل ادا کریں کہ ہم نے آپ کی کال اٹینڈ کرلی۔" میں نے خوش گوار لہجے میں کہا۔

"اچھا جی...... ضرور ادا کریں گے۔ جو حکم...... !میں عاصمہ بات کررہی ہوں آپ کو ایک اہم معلومات فراہم کرنی تھی۔"

"جی ضرور فراہم کریں ویسے سیکرٹ ایجنٹ ہیں کیا آپ؟"

"خواہش تو تھی کہ سیکرٹ ایجنٹ بن جاؤں لیکن ہماری ایسی قسمت کہاں۔" وہ ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے بولی۔

"انسان کو وہ سب حاصل ہوتا ہے جو وہ چاہتا ہے، جذبے سچے ہوں اور لگن کا ساتھ ہو تو منزلیں خود بخود قریب آجاتی ہیں۔ خیر آپ کس قسم کی معلومات فراہم کرنا چاہتی ہیں؟"

"سر...... میں ایک پرائیویٹ ٹیچر ہوں اور الائیڈ اسکول میں پڑھاتی ہوں...... اہم بات یہ ہے کہ ہمارا گھر قبرستان کے ساتھ ہے، یہ رات کی بات ہے کہ میں نے ایک عورت کو قبر کھودتے ہوئے دیکھا، وہ عورت نقاب میں تھی، میں کل رات گھر کی چھت پر گئی تھی کہ اچانک اتفاق سے میری نظر قبرستان کے وسط میں موجود ایک عورت پر پڑی جو کدال سے قبر کھود رہی تھی، اس نے بلیک لباس پہن رکھا تھا اور نقاب پوش عورت نے قبر کھودنے کے بعد شاید اس قبر میں رکھ دیا اور چلتی بنی۔"

دوسری طرف مکمل خاموشی ہوئی تو میں بولا۔

"آپ کہاں سے بول رہی ہیں...... ایڈریس لکھوائیں۔" میں نے کہا۔

"بلیو ایریا...... نیو اسٹریٹ پرانا قبرستان۔" دوسری طرف سے بتایا گیا۔

"اوکے...... جس طرح کے حالات چل رہے ہیں اس کے تناظر میں ہمیں ہر چھوٹی سے چھوٹی چیز پر بھی توجہ دینا ہوگی، آپ کا نمبر میرے پاس سیو ہے اور آج شام تک یہ معاملہ بھی دیکھا جائے گا، ویسے کچھ لوگ جادو ٹونا بھی کرتے ہیں اور اس طرح کے لوگ بھی کیفر کردار تک پہنچنے چاہئے۔"

"بالکل سر...... میں خود بھی یہی چاہتی ہوں کہ آپ اس طرف بھی توجہ دیں تاکہ شر پسند عناصر اپنے انجام کو پہنچیں۔ چاہے جس طرح سے بھی نقصان پہنچانے والے لوگ سامنے آئیں ان کو سزا ہونی چاہئے اور میں اس معاملے میں ہر قسم کے تعاون کے لئے تیار ہوں۔" عاصمہ بولی۔

"جی بہت شکریہ...... مجھے مزید معلومات چاہئے ہوگی تو میں آپ کی خدمات لینا چاہوں گا۔"

"میں حاضر ہوں...... ملک وقوم کے لئے میں ہمہ وقت حاضر ہوں۔" اس کا انداز سچا اور جاندار تھا۔

"مجھے اچھا لگا آپ کا یہ جذبہ۔"

میں نے کال اینڈ کی۔

تب تک ہم تھانے پہنچ گئے تھے۔ وہاں الگ تماشہ ہوا پڑا تھا...... ہیڈ محرر اور ایک نوجوان شخص بحث مباحثے میں الجھے ہوئے تھے مجھے دیکھتے ہی دونوں چپ ہوگئے۔

وہ ایک خوبرو نوجوان تھا جس کی آنکھوں میں اداسی کے گہرے بادل تھے۔

"کیا بحث ہورہی ہے؟" میں نے ہیڈ محرر سے پوچھا۔

"سر...... یہ نوجوان خوامخواہ ہی الجھ رہا ہے بات ہی نہیں سنتا۔" ہیڈ محرر بولا۔

"کیا مسئلہ ہے ان کا؟"

"سر میرا نام ظفر ہے اور میں یہاں اپنی دوست کی موت کا مقدمہ درج کرانے آیا ہوں۔" وہ بولا۔

اس کا نام ظفر تھا میرے نئے کیس کا اہم کردار۔

اوہ...... آپ میرے روم میں آئیں۔" میرے دماغ میں کئی سوال ابھرے۔

راہداری کراس کرکے ہم لوگ آفس تک پہنچ گئے۔ آفس میں پہنچ کر میں نے ظفر کو کرسی پر بیٹھنے کے لئے کہا۔

کرسی پر بیٹھتے ہوئے وہ بولا۔

"سر...... اس کی ڈیتھ ہوگئی ہے اسے مارا گیا ہے اسے ضرور مارا گیا ہے۔"

"پلیز...... !خود پر کنٹرول رکھیں اور مجھے بتائیں کہ...... کس کو مارا گیا ہے؟"

میں نے سپاہی سے پانی کے لئے کہا۔

"سر...... اس کا نام سحر ہے۔ اور اسے نائلہ نے مارا ہے سحر اور میں ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے جبکہ نائلہ نے مجھے پرپوز کیا تھا، جسے میں نے ریجیکٹ کردیا تو اس نے سحر کو جان سے مار ڈالا۔"

"آپ اتنے وثوق سے کیسے کہہ سکتے ہیں کہ اسے جان سے مارا گیا ہے؟"

مجھے دلی طور پر افسوس ہورہا تھا کہ اس لڑکی کی موت ہوگئی تھی کچھ دیر پہلے تو وہ زندہ تھی۔

"سر اس نے دھمکیاں دی تھیں کہ وہ سحر کو نہیں چھوڑے گی اور ایسا ہی ہوا۔"

"اوکے...... ہم ضرور چھان بین کررہے ہیں۔ میں ابھی سحر کے گھر سے آرہا ہوں تب تک وہ زندہ تھی لیکن میرے یہاں تک پہنچتے ہی اس کی موت ہوگئی۔

مجھے افسوس ہے؟ اس کی موت کا اور آپ کے احساسات کا مکمل احترام کرتا ہوں کہ اور میں وعدہ کرتا ہوں اگر یہ قتل ہے تو قاتل کو ضرور سزا ملے گی۔" میں نے کہا۔

"میں آپ کا احسان مند ہوں کہ آپ نے اس قتل کے کیس کو حل کرنے کی حامی بھری ہے، بس میں یہی چاہتا ہوں نائلہ کو ضرور سزا ملے۔"

"نائلہ کو نہیں...... بلکہ اصل قاتل کو۔" میں نے کہا۔

سحر کی موت ہوگئی تھی میں نے ڈیڈ باڈی کو پوسٹ مارٹم کے لئے بھیجا، رپورٹ کے مطابق یہ ایک طبعی موت تھی کسی قسم کا زہر یا آلہ قتل کا نشان، کچھ بھی ثابت نہ ہوا گویا یہ ایک نارمل کیس تھا لیکن میرے اپنے دماغ میں کچھ اور چل رہا تھا بعض اوقات جو نظر آتا ہے وہ اصل نہیں ہوتا حقیقت اور بظاہر نظر آنے میں فرق بہت فرق ہوتا ہے بظاہر یہ کیس اختتام کو پہنچ گیا تھا لیکن ابھی حقیقت کا سامنے آنا باقی تھا۔ بہت سی چیزیں مخفی تھیں جن سے پردہ اٹھانا لازمی تھا۔

وہ شام کا وقت تھا جب سحر کو آخری آرام گاہ تک پہنچا کے ہم مونا کے گھر پہنچ گئے۔

سب لوگ اداس تھے میں نے مونا سے کچھ مزید معلومات لینے کے لئے ملاقات کی۔

"پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق یہ طبعی موت تھی یعنی قدرتی ڈیتھ ہوئی تھی لیکن میں ابھی مزید اس کی چھان بین کرنا چاہتا ہوں کیا آپ مجھے نائلہ کا نمبر دے سکتی ہیں اور ایڈریس بھی۔"

"مونا نے نائلہ کا نمبر اور ایڈریس دیا تو میں اس کے گھر چل پڑا۔"

"سر...... یہ کیس تو جیسے شروع ہوا تھا ویسے ہی ختم ہوگیا۔" سیلاب خان بولا۔

"نہیں...... یہ کیس ابھی ختم نہیں ہوا بلکہ شروع ہوا ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"بظاہر کیس اوکے نظر آرہا ہے لیکن اس کے اندر کچھ پیچیدگیاں موجود ہیں جو ابھی سلجھانی ہیں۔" میں نے کہا۔

☆......☆......☆

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY

رات کافی سرد تھی سردی میں چائے اور ہارر ناول پڑھنے کا الگ مزہ آتا ہے، میں نے نائلہ کا نمبر ٹرائی کیا لیکن نائلہ کا نمبر پاور ڈ آف ملا..... میں نے کئی مرتبہ نمبر ٹرائی کیا لیکن نمبر آف ہی رہا۔

رات کافی بیت چکی تھی رائیڈر ہیگرڈ کے ہارر ناول نے جب مزہ دینا شروع کیا تو مجھے نیند کی دیوی نے آدبوچا..... نیند بھی کیا چیز ہے کانٹوں پر بھی آتی ہے اور موت کے بستر پر بھی..... یہ تو پھر بھی نرم وگداز بستر تھا۔

اگلی صبح ہنگامہ خیز تھی..... میں نے اپنا واٹ سپ چیک کیا وہاں عاصمہ کی طرف سے ایک ویڈیو بھیجی گئی تھی۔

وہ ایک قبرستان کا منظر تھا جہاں شام کے بعد کا وقت تھا، وہاں قبرستان کے وسط میں ایک عورت بیٹھی ہوئی تھی اس کے ہاتھ میں کدال تھی اور قبر کو کھود رہی تھی وہ پکی قبر تھی جو بالکل تازہ تھی، قبر آہستہ آہستہ کھلتی چلی گئی، نقاب پوش عورت نے سائیڈ میں رکھے شاپر کو قبر کے اندر رکھا قبر کو بند کیا اور چپکے سے باہر نکل گئی۔

میں نے عورت کو غور سے دیکھا ایسا لگتا تھا جیسے اس عورت کو کہیں دیکھا ہو..... وہ درمیانے قد کی عورت تھی اس عورت کو کہیں نہ کہیں ضرور دیکھا تھا..... لیکن کہاں؟ میں نے عاصمہ کو فون کیا جو اس نے دوسری کال پر اٹینڈ کیا۔

رسمی علیک سلیک کے بعد میں نے ویڈیو کا پوچھا تو اس نے بتایا کہ اس نے اس شام ویڈیو بھی بنالی تھی جو اس نے مجھے سینڈ کردی تھی۔

نہا دھو کے یونیفارم پہن کے میں نائلہ کے گھر پہنچ گیا..... لیکن وہاں سے پتہ چلا کہ نائلہ ایک ہفتے سے اپنے نانا کے گھر گئی ہوئی تھی۔ اس کے نانا کا گھر لاہور میں تھا..... مطلب نائلہ پچھلے ایک ہفتے سے اپنے نانا کے گھر گئی ہوئی تھی جبکہ اسلام آباد میں، ہم سب لوگ موجود تھے۔

سوال یہ تھا کہ نائلہ اگر لاہور میں تھی تو ظفر اور مونا کا شک صرف شک ہی تھا لیکن وہ دونوں جس وثوق سے نائلہ کو مورد الزام ٹھہرا رہے تھے اس سے تو ثابت ہوتا تھا کہ اندر کی کہانی کچھ اور ہی تھی جو فی الحال مخفی تھی اور جسے سامنے لانا ابھی باقی تھا، قانونی طور پر سحر کی موت کا الزام کسی کو بھی نہیں ٹھہرایا جاسکتا تھا کیونکہ موت طبعی تھی لیکن میرے دماغ نے اس تجسس کو مزید ابھارا کہ آخر نائلہ کون ہے اور سب لوگ اسے ہی مورد الزام کیوں ٹھہرا رہے تھے؟"

میں نے سیلاب خان اور ہمت خان کو ایک اہم ذمہ داری سونپی جس سے مجھے اہم معلومات معلوم ہوتی تھی آگے جا کر وہ معلومات اس کی کاٹرننگ پوائنٹ ثابت ہوا۔

نائلہ کا بیان چونکا دینے والا تھا۔

"سر..... میں اس حقیقت کو تسلیم کرتی ہوں کہ میں نے ظفر کو پسند کیا تھا اسے پروپوز بھی کیا تھا لیکن ظفر کسی دوسری لڑکی میں دلچسپی لے رہا تھا تو میں نے اس سے دوری اختیار کرلی اور یہی میرے لئے بہتر تھا۔ جو شخص آپ کو پسند ہی نہیں کرتا اس کے ساتھ زندگی اچھی نہیں گزرتی۔ کچھ اہم فیصلے کئے اور لاہور چلی گئی لاہور میں میری نانی کی فیملی ہے سب نے پیار کیا عزت دی۔ اب میں بہت خوش ہوں امید ہے ظفر بھی اپنی دوست کے ساتھ خوش ہوگا۔" وہ نم آنکھوں مگر مصنوعی طور پر مسکراتے چہرے سے بولی، گویا محبت تو اب بھی اس کے دل میں تھی۔

"کیا آپ نے کوئی دھمکی آمیز خط لکھا تھا سحر نامی لڑکی کو؟" میں نے پوچھا۔

"سر..... میں نے آج تک کسی بھی شخص کو دھمکی نہیں دی چیونٹی تک مارنے کی نوبت نہیں آئی..... میں بہت ڈرپوک ہوں۔" وہ بولی۔

"یہ خط آپ کا ہے؟" میں نے دراز سے لیٹر نکال کے دکھایا جو مجھے مونا نے دیا تھا۔

"سر..... یہ لکھائی میری نہیں ہے..... بے شک آپ مجھ سے کچھ لکھوالیں..... بلکہ یہ لکھائی تو....." وہ خاموش ہوگئی۔

"یہ لکھائی کس کی ہے؟"

"یہ لکھائی مونا کی ہے..... سوفیصد اسی نے لکھا ہے۔" نائلہ چونک کر بولی۔

"آپ کو پتہ ہے مونا کی بہن سحر کی موت ہوگئی ہے اور ہمیں شک ہے کہ اس میں آپ کا ہاتھ ہے۔" میں نے اندھیرے میں تیر چھوڑا۔

"اوکے..... میں آپ کا انتظار کررہی ہوں..... قبر کی نشاندہی میں خود کروں گی۔" وہ بولی۔

"Good..... میں روانہ ہوتا ہوں....." میں روانہ ہوا اور قبرستان میں پہنچ گیا۔ عاصمہ نے قبر کی نشاندہی کی اور قبر کو کھودا گیا۔

سرخ شاپر میں الگ کہانی تھی۔

وہاں کسی لڑکی کے لمبے بال تھے اور بال میں گانٹھیں لگی ہوئی تھیں گانٹھ کے درمیان میں لکڑی کی چھوٹی چھوٹی اسٹیک تھی اس کے ساتھ میں ایک چھوٹی سی ہاف لیٹر بوتل تھی جس میں سرخ رنگ کا گاڑھا مادہ تھا جو غالباً خون ہی تھا..... میں نے دونوں چیزیں ٹیسٹ کے لئے لیب ٹیسٹ بھجوادیں۔

مجھے اسی لمحے نائلہ کی کال موصول ہوئی۔

"ہیلو..... سر نائلہ بات کررہی ہوں۔"

"بولیں۔"

"سر..... میرے کمرے سے کچھ چیزیں گم ہوگئی ہیں آپ پلیز!..... میرے گھر کا وزٹ کریں۔"

"مثلاً کیا گم ہوا ہے.....؟"

"کچھ کیش، جیولری....."

"اوہ..... میں آتا ہوں..... تھوڑا ویٹ کریں۔"

ایک مسئلہ حل ہوتا نہیں تھا کہ دوسرا شروع ہوجاتا تھا جب کہ چوری کی واردات بھی ہوگئی۔

جب تک بال اور خون کی رپورٹ آتی تھی میں نے نائلہ کے گھر کا وزٹ کیا۔

وہ نائلہ کا روم تھا وہاں ایک بیڈ اور کچھ صوفے تھے نفیس سا کمرہ وہاں اس کی الماری کھلی ہوئی تھی اور اس نے مجھے تجوری دکھائی جس کا لاک ٹوٹا ہوا تھا اور کچھ جیولری بھی غائب تھی اس کے مطابق وہ اندر سے لاک لگا کے سوئی تھی اور صرف ایک ہی چابی ہے اس کے پاس..... وہ ایک ہفتے بعد آئی تو یہ چیزیں غائب تھیں اس لئے اندازہ نہ ہوسکا کہ چوری کی اصل واردات کب ہوئی۔

میں نے رپورٹ درج کی اور انکوائری کو اپنے

انڈر لیتے ہوئے دائرہ کار بڑھایا۔

اس دوران ایک چیز واضح ہوگئی کہ واقعی نائلہ لاہور گئی ہوئی تھی نائلہ کے گھر والوں نے یہ بات کنفرم کردی کہ نائلہ پچھلے ایک ہفتے سے گھر سے باہر نانا کے پاس تھی..... اس دوران کوئی بھی اس کے روم میں نہیں گیا تھا..... گھر میں ایک ہی نوکر تھا جو دو ہفتوں سے چھٹی پر تھا۔اس کے علاوہ نائلہ کے امی ابو اور دادی تھے۔

"انسپکٹر صاحب..... سحر کے کیس کا کیا بنا؟" نائلہ نے کمال اعتماد سے پوچھا۔

"تفتیش چل رہی ہے..... آپ بھی مکمل تفتیش کے دائرے میں ہیں..... بہت جلد کوئی نہ کوئی کلیول جائے گا۔"

"سر..... اگر میں آپ کو ایک بات بتاؤں تو آپ کو کیس حل کرنے میں آسانی ہوگی۔"

"ہاں..... ضرور بتائیں۔"

پھر اس نے کچھ ایسی چیزیں بتائیں جو اس کیس کو حل کرنے میں اہم کردار ادا کرنے والی تھی..... جو آگے آئیں گی..... فی الحال تو میں نے نائلہ کو انڈر آبزرویشن رکھا ہوا تھا..... کیونکہ ابھی کوئی حتمی فیصلہ نہیں ہوا تھا۔

رپورٹ آئی اور دھماکہ کر گئی۔

بوتل میں موجود خون سحر کا تھا اور بال بھی..... لیب تجربات کے بعد ثابت ہوا تھا کہ قبر کے اندر رکھے گئے بال اور خون سحر کے تھے۔ جو حیرت انگیز بات تھی بھلا یہ کیا مقصد تھا اور اس کا سحر کی موت سے کتنا تعلق تھا..... تعلق تھا بھی سہی یا نہیں..... یہ تو آنے والا وقت بتائے گا۔

فی الحال ایک چیز تو ثابت ہوگئی تھی کہ ضرور کوئی جادوئی عمل کیا گیا اور کرنے والی ایک عورت تھی جس کا قد اور چال ڈھال نائلہ سے ملتے جلتے تھے۔ جبکہ نائلہ لاہور گئی ہوئی تھی۔

جس رات قبرستان میں یہ شاپر رکھا گیا تھا وہ 20 جنوری کی رات تھی۔

"آپ 20 جنوری کو کہاں تھیں.....؟" میں نے نائلہ سے پوچھا۔

ہوٹل المائدہ..... مجھے نانا ابو نے المائدہ میں خاص آئسکریم کھلائی تھی۔

"گڈ..... ویسے آپ کی ذہانت کو داد دے کیا آپ بتا سکتی ہیں اس رات آپ نے کون سی آئسکریم کھائی تھی؟"

"چاکلیٹ/ٹوٹی فروٹی۔"

"آپ کو 20 جنوری کی تاریخ..... آخر کیوں یاد رہ گئی؟" میں نے پوچھا۔

"کیونکہ یہ میری برتھ ڈے کا دن ہے۔" وہ بولی۔

"آپ نے برتھ ڈے منائی۔"

"ہاں..... المائدہ میں ہی منائی تھی۔"

"کوئی تصاویر.....؟"

اس نے تصاویر دکھائی..... میں نے کیچر ڈیٹ بھی دیکھ لی۔

نائلہ کس حد تک بے قصور تھی؟ ابھی بھی سوالیہ نشان لگا ہوا تھا۔

میں نے مونا کو شامل تفتیش کیا وہ سحر کے غم میں ابھی تک نڈھال تھی۔

"آپ کو جس پر شک تھا وہ یقین میں بدل چکا ہے۔"

"وہ کیسے؟"

"ہاں..... وہ جادو گرنی ہے..... اس نے سحر کے بال کاٹے اور خون کی آدھی بوتل نکال کر قبر کے اندر جادو کے لئے رکھ دیئے۔ رزلٹ میں سحر کی موت ہوگئی۔"

"سر..... آپ اس کو سزا دلوائیں..... قاتل ہے وہ..... نائلہ قاتل ہے.....!" وہ بولی۔

"لیکن میں نے نائلہ کا نام تو نہیں لیا.....!" میں نے کہا۔

"کیا مطلب؟ وہ قاتل ہے....." وہ بولی۔

"وہ قاتل نہیں..... قاتل آپ ہیں۔" میں نے کہا۔

"یہ جھوٹ ہے..... الزام ہے..... کوئی اپنی بہن کو کس طرح قتل کرسکتا ہے..... اور میرا بھلا کیا مفاد.....؟" وہ کنفیوژ ہوگئی۔

"تمہارے بیان کے مطابق موت سے ایک

رات پہلے سحر کچھ کنفیوژ تھی اور اس نے اسکارف اوڑھا ہوا تھا۔" میں نے کہا۔

"ہاں..... ایسا ہی تھا۔"

"لیکن ایسا نہیں تھا..... وہ نارمل آئی تھی اور وہ اسکارف میں نہیں بلکہ دوپٹے میں بھی نہیں آئی تھی اس کے بال کھلے ہوئے تھے..... اس بات کی گواہی آپ کی نوکرانی دے سکتی ہے۔"

"یہ غلط ہے..... آپ میری بات کو جھٹلا کر نوکرانی کی بات کو اہمیت دے رہے ہیں۔"

"اور آپ کو اتنا بتا دوں ..... وہ نوکرانی مر چکی ہے۔" میں نے کہا۔

"سر..... آپ ضرور دماغی مریض ہیں۔ جو آپ بہکی بہکی باتیں کر رہے ہیں۔"

مجھے ہلکا سا غصہ ضرور آیا..... لیکن برداشت کر گیا۔

"کیا تم جانتی ہو وہ نوکرانی کون ہے؟ وہ تم سے پہلے کی ہے ابھی تم پیدا نہیں ہوئی تھی..... خیر تم ان باتوں کو نہیں سمجھ پاؤ گی۔"

"سر..... آپ کیا بول رہے ہیں کس نوکرانی کی بات کر رہے ہیں مجھے نہیں علم..... میں بھلا کیوں سحر کو قتل کروں۔"

"تاکہ آپ ظفر سے شادی کرلیں۔"

مونا پریشان ہو چکی تھی۔

☆.....☆.....☆

رات اور گہری دھند ہر چیز پر جیسے سفید چاندی سی بچھائی تھی میں اپنے کمرے میں ہیٹر کے مزے لے رہا تھا کہ اچانک لائٹ آف ہوگئی..... اور مکمل اندھیرا چھا گیا..... میں نے UPS کے چلنے کا انتظار کیا لیکن UPS آن نہ ہوا تو میں نے اپنا سیل اٹھانے کے لئے سائیڈ ٹیبل پر ہاتھ مارا تو جیسے ہزار وولٹ کا کرنٹ لگا کسی نے میرا ہاتھ پکڑ لیا تھا وہاں ایک انسانی ہاتھ تھا..... جس کی گرفت کافی مضبوط تھی..... میں نے ہاتھ چھڑانے کی مزاحمت نہ کی کیونکہ اگر ہاتھ چھڑاتا تو ہاتھ ٹوٹنے کے چانسز تھے۔

"تم اچھے انسان ہو..... اس لئے تمہاری مدد کو آئی ہوں۔" وہ بوڑھی مگر سخت آواز تھی۔

"کون ہو تم..... اور میری مدد کیوں کرنا چاہتی ہو؟"

"گھبراؤ مت..... تم جس کو اچھا سمجھ رہے دراصل وہی اصل قاتل ہے۔"

"تم کس قتل کی بات کر رہی ہو.....؟"

"سحر بی بی کی۔"

میں چونکا۔ "تم کون ہو؟"

"سحر کے گھر میں نوکرانی رہی ہوں..... عرصہ دراز پہلے موت ہوگئی تھی میری....." وہ بولی۔

"تو پھر تم زندہ کیسے ہوگئی؟"

اس نے زوردار قہقہہ لگایا۔

"میں روح ہوں..... جو خاص طور پر تمہاری مدد کے لئے آئی ہوں۔"

"اوا چھا..... تو پھر بتاؤ اصل ماجرا کیا ہے؟"

"اصل قاتل کون ہے.....؟ تم صرف اتنا جان لو کے موت سے ایک رات پہلے سحر کھلے بالوں کے ساتھ گھر آئی تھی وہ شام کا وقت تھا جب مونا نے سحر کو دودھ میں نشے کی گولی ملا کے اس کے بال کاٹ لئے تھے پھر اس نے خون کی آدھی بوتل بھی سحر کے جسم سے نکال لی تھی۔

"کیا تم جانتے ہو مونا ایک جادوگرنی ہے..... اس نے مخصوص سحر پھونک کر قبر کے اندر رکھ دیا۔ جس کا رزلٹ موت نکلا۔" روح نے بتایا۔

"لیکن مونا کو اس کا کیا فائدہ ہوگا۔"

"ظفر کی محبت اور دونوں کا شادی کا پلان ہے....."

"مطلب اس گیم میں ظفر بھی شامل ہے۔"

"ہاں..... دونوں نے مل کے مارا ہے اس کو..... اور کھچڑی اس طرح تیار کی کہ نائلہ پھنس جائے۔"

"لیکن مونا نے سحر کی جان اس طرح کیوں لی.....؟ سحر کو مارے بغیر بھی یہ مقصد حاصل ہوسکتا تھا۔"

"ایک روز سحر نے مونا اور ظفر کو نازیبا حالت میں دیکھا تھا، سحر نے اسے اس غلط اور نازیبا ملاقاتوں سے روکا پھر اس نے دھمکی دی تھی کہ وہ سب کچھ ابو امی کو بتا دے گی

......صرف اس دھمکی کے بعد ہی دونوں نے مل کے پلان بنایا......اور زوردار قسم کے جادو کا سہارا لے کر مار ڈالا۔"

☆......☆......☆

نائلہ کا جوتا مونا کے گھر سے کیوں ملا؟

نائلہ نے اپنے جوتے کو ایک منٹ میں پہچان لیا۔

"میں نے عاصمہ کی طرف سے اس ویڈیو کو چلا کے دیکھا تو جوتے واقعی نظر آئے۔

"یہ جوتے تو میرے ہیں لیکن اس عورت نے کیوں پہنے؟" نائلہ نے ویڈیو دیکھ کے کہا۔

"ایک ہی طرح کے کئی جوتے مارکیٹ میں آتے ہیں......لازمی نہیں......یہ تمہارے جوتے ہوں......؟"

"سر......یہ دبئی سے لائے تھے ابو......ان کی ایک خاص نشانی ہوتی ہے کہ چلتے ہوئے چمکتے ہیں اور ابھی ہمارے ملک میں نہیں آئے۔"

"کیا تم نے اپنی چوری کی کمپلین میں جوتے لکھوائے تھے؟"

"نہیں...... میں نے غور نہیں کیا...... میرے جوتے واقعی گم تھے۔"

میں نے اپنی جیب سے چند بال نکالے اور ٹیبل پر رکھ دیئے۔

☆......☆......☆

"مس مونا......یہ بال مجھے سحر کے روم سے ملے تھے۔ جو میں نے تفتیش کے دوران اپنے پاس سنبھال کے رکھے تھے اگر سحر گنجی ہو کے گھر آئی تو یہ بال اس کے روم سے نہ ملتے۔

اس کا مطلب ہے کہ آپ نے ہی سحر کے بال کاٹے تھے۔ اس چیز کی گواہ آپ کی نوکرانی ہے...... بلکہ دونوں نوکرانیاں گواہی دیں گی۔

آپ کی زندہ نوکرانی کہتی ہے کہ آپ شام کے وقت سحر کے روم میں گئی تھیں اور شاپر کے ساتھ باہر آئی تھیں اور پھر اس شام آپ موٹر سائیکل پر کسی کے ساتھ گھر سے بھی باہر گئی تھیں۔"

ظفر سر جھکائے کھڑا تھا۔

"تم نے چوری کی تھی نائلہ کے گھر میں اور ساتھ ہی اس کا جوتا بھی لے آئے...... جو مونا نے استعمال کیا اور پکڑی گئی۔"

وہ بولنے لگا تھا کہ جیسے اس کے سر پر کسی نے ہتھوڑا دے مارا ہو......وہ بھاگنے لگا......دیوار کے قریب جا کر اوپر دیکھنے لگا۔

اسے تھپڑ پڑنے لگے تھے۔

"سر......یہ ساری کہانی مونا کی تھی......ہم دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں......سحر نے ہمیں غلط حالت میں دیکھ لیا تو والدین کو بتانے کی دھمکی دینے لگی......ہم نے اس کے بال اور خون پر جادو ٹونہ پھونک کر قبر میں رکھ دیا اور سارا الزام نائلہ پر لگا دیا۔"

تم محبت تو کیا نفرت کے قابل بھی نہیں ہو......تم نے ایک معصوم کی جان لے لی......شرم کرو......گھن آتی ہے تم سے کہ تم نے کبھی محبت کی ہے۔

اور مونا تم تو ڈوب مرو...... اپنی ہی بہن کو مار ڈالا......ایک جرم کو چھپانے کے لئے اتنا بڑا جرم کر دیا۔

جادوگرنی ہو تم......ظالم عورت......اور جادو کرنے والے لوگ کافر ہیں......افسوس تم نے ایک لمحے کو بھی نہ سوچا کہ تم اتنا غلط اور سنگین جرم کرنے جا رہی ہو۔

"تم دونوں سزا کے مستحق ہو......روح کی گواہی نے تم دونوں کو کیفر کردار تک پہنچا دیا...... اب بھگتو۔" میں نے کہا۔

"تمہاری چوری برآمد ہو گئی نائلہ۔"

"سر...... اسے غریبوں میں تقسیم کر دیں......

آج دوستوں سے اعتماد اٹھ گیا...... اور رشتوں سے بھی۔" وہ بولی۔

"نہیں ...... رشتے آج بھی زندہ ہیں صرف احساس کی کمی ہے......محبت آج بھی ہے صرف بول دینے سے محبت واضح نہیں، ہوتی قربانی دینی پڑتی ہے اور قربانی دینے والے آج بھی زندہ ہیں۔"

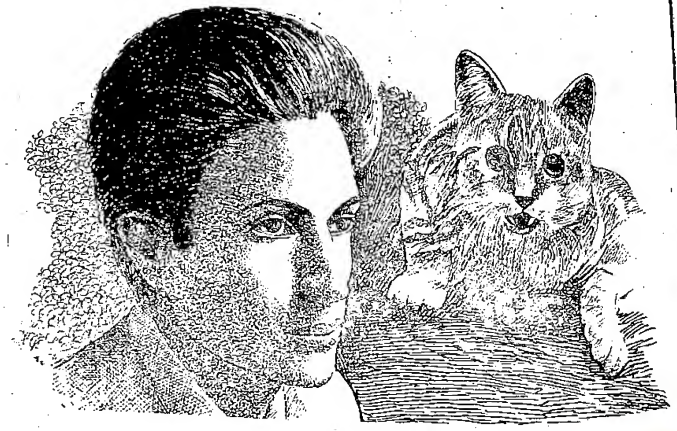

شیطانی چکر

محمد خالد شاہان-صادق آباد

کمرے میں بیٹھا ہوا نوجوان تیزی سے اٹھا اور بھاگتا ہوا دروازے کے پاس پہنچا تو اچانک بوڑھے کا ہاتھ اپنی جگہ سے لمبا ہوتا ہوا نوجوان تک پہنچا اور نوجوان کی گردن جیسے شکنجے میں جکڑ گئی اور پھر تو ایک اچنبھا ہوا جو کہ......

ویران جگہ پر اگر کسی کا واسطہ کسی جن سے پڑ جائے تو وہ کیا کرے گا-کہانی پڑھ کر دیکھیں

رات کا ایک بج رہا تھا کاشف اپنے بستر پر بیٹھا کتاب کا مطالعہ کر رہا تھا اس نے خود کو اچھی طرح لحاف میں لپیٹ رکھا تھا۔ گیس کا ہیٹر اس نے ابھی کچھ دیر پہلے ہی بند کیا تھا۔ کیونکہ اب کچھ ہی دیر بعد وہ سو جانا چاہتا تھا۔ باہر بارش ہو رہی تھی موسم بے حد ٹھنڈا تھا ایسے موسم میں رات دیر تک دلچسپ کتابوں کا مطالعہ کرنے میں اسے بے حد لطف آتا تھا۔ اس کا ایک بھائی بھی ساتھ ہوتا تھا جو اس سے چھوٹا تھا۔ اس کے والدین بہت عرصہ پہلے ایک حادثے میں انتقال کر چکے تھے اور بھائی کو وہ بہت پیار سے پال پوس رہا تھا اور اس کی تعلیم کو جاری رکھا ہوا تھا اور وہ خود نوکری کرتا۔

اس نے کچھ دیر بعد کتاب میز پر رکھی اور سگریٹ سلگانے کے بعد اپنے بھائی کے بارے میں سوچنے لگا، بھائی اپنے دوست کی شادی میں شرکت کے

لئے گیا ہوا تھا۔
اچانک فون کی گھنٹی بجی تو وہ چونک پڑا۔ پھر اس نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگانے کے بعد ''ہیلو'' کہا۔
''ہیلو! کاشف بھائی میں طاہر بول رہا ہوں۔'' طاہر نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔
''طاہر تم اس وقت خیریت سے تو ہو۔'' کاشف نے گھبرا کر پوچھا۔
اس نے کہا۔ ''خیریت نہیں ہے بھائی۔ میں اس وقت انتہائی مشکل میں ہوں۔ آپ جلدی پہنچیں، میں کامران کے گھر میں ہوں اور کامران کے گھر والے بارات لے کر گئے ہوئے ہیں، گھر میں، میں اور کامران اکیلے تھے کہ اچانک کچھ لوگ گھر میں گھس آئے ہیں اور ہم دونوں کو کمرے میں قید کر دیا ہے۔ کہیں یہ ہمیں مار نہ دیں آپ جلدی پہنچیں پلیز! جلدی۔'' اس کے بعد فون کٹ گیا۔
کاشف نے جلدی سے ریسیور کریڈل پر پھینکا پھر وہ بجلی کی تیزی سے اٹھا اس نے گرم کوٹ جوتے اور دستانے پہنے کانوں پر مفلر لپیٹا اس کے بعد الماری سے ریوالور نکال کر جیب میں رکھ لیا۔ گھر کو تالا لگایا اور باہر آ گیا۔
پھر جلدی سے اس نے موٹر بائیک نکالی اور بائیک اسٹارٹ کر کے روانہ ہو گیا۔
اچانک بادل زور سے گرجے بجلی کی چمک بھی دکھائی دی اور اور بارش تیز ہو گئی کاشف نے موٹر بائیک کی رفتار کچھ کم کر دی۔ کیونکہ تیز بارش میں موٹر بائیک چلانا اس کے لئے انتہائی مشکل ہو رہا تھا۔
کامران کی کوٹھی کافی فاصلے پر تھی۔ کاشف کو اس تک پہنچنے کے لئے ایک ایسی ویران سڑک پر سے بھی گزرنا پڑتا۔ جس کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ پراسرار آسیبی سڑک ہے۔ اکثر لوگوں کو وہاں عجیب وغریب مخلوق نظر آتی تھی۔ اور اکثر لوگوں نے مختلف بھیانک آوازیں بھی سنی تھیں۔
کاشف کچھ دیر بعد اس سڑک سے گزرنے لگا۔ اس کے ذہن میں سڑک کے متعلق لوگوں کی مختلف باتیں گردش کرنے لگیں لیکن یہ باتیں زیادہ دیر تک اس کے ذہن میں نہ رہیں کیونکہ اس وقت اسے اپنے بھائی طاہر کی فکر تھی۔
کاشف اپنی سوچوں میں گم احتیاط سے بائیک چلاتا جا رہا تھا کہ اچانک کچھ دور سڑک کے کنارے اسے ایک شخص نظر آیا جو ہاتھ ہلا کر اسے رکنے کا اشارہ کر رہا تھا کاشف نے بریک پر دباؤ بڑھا دیا تو بائیک آہستہ ہو گئی وہ سوچنے لگا۔ ''آخر اسے روکنے والا کون ہو سکتا ہے؟'' پھر اسے خیال آیا۔ ''کوئی شخص ہو گا جسے کسی کی ضرورت ہو گی۔'' یہ بات بھی اس کے ذہن میں آئی کہ وہ کوئی لٹیرا بھی ہو سکتا ہے اور ساتھ ہی یہ خیال بھی آیا کہ ''وہ کوئی پراسرار مخلوق ہو سکتی ہے۔''
کاشف سوچنے لگا کہ اسے رکنا چاہئے یا نہیں وہ بزدل نہیں تھا لیکن اس وقت وہ جلدی میں تھا۔ وہ جلد از جلد کامران کی کوٹھی تک پہنچنا چاہتا تھا اگر وہ اس وقت کسی معاملے میں الجھ جاتا تو اسے اپنی منزل تک پہنچنے میں دیر بھی ہو سکتی تھی۔ پھر اس نے بائیک کی رفتار مزید بڑھا کر تیزی سے نکل جانا چاہا۔ لیکن سڑک پر موجود شخص عین اس کے سامنے آ گیا۔
کاشف کو مجبوراً بائیک روکنی پڑی۔ اس نے غور سے دیکھا۔ اسے روکنے والا ایک بوڑھا شخص تھا۔
جس کی لمبی سفید داڑھی تھی۔ جب کہ اس کے کپڑے سفید تھے۔ اس نے ایک ہاتھ میں ڈنڈا پکڑا ہوا تھا۔ ''کیا بات ہے بابا۔ آپ نے مجھے کیوں روکا؟'' کاشف نے پریشان لہجے میں کہا۔
''کیا تم مجھے یہاں سے کچھ دور کچے راستے پر چھوڑ سکتے ہو۔ وہاں میرا گھر ہے؟'' بوڑھے نے گرجدار آواز میں کہا۔
''بابا اس وقت میں جلدی میں ہوں، اگر آپ کہیں تو واپسی پر آپ کو چھوڑ دوں۔'' کاشف نے کہا۔
''تم دیکھ رہے ہو کہ میں بھیگ رہا ہوں اور کہتے ہو کہ واپسی میں چھوڑ دو گے۔'' بوڑھے نے شکایتی

لہجے میں کاشف سے کہا۔
''مجھے گھر جلدی پہنچنا ہے میری مدد کرو۔''
''مجھے بھی ایک جگہ جلدی پہنچنا ہے بابا معاملہ بہت اہم ہے۔'' کاشف نے کہا۔
''دیکھو میں سردی میں مر سکتا ہوں تم صرف چند منٹ میں مجھے میرے گھر تک پہنچا سکتے ہو سوچ لو، حالانکہ تمہارا معاملہ بھی اہم ہے اگر تم میری مدد نہیں کرو گے ہو سکتا ہے کہ کبھی کوئی تمہاری مدد نہ کرے۔'' بوڑھے نے عجیب انداز میں کہا۔
''کتنی دور جانا ہے بابا؟'' کاشف نے اس کی جانب دیکھ کر کہا۔
''یہاں سے زیادہ دور نہیں جانا۔'' بوڑھے نے جواب دیا۔
کاشف سوچنے لگا کہ کیا کرے ایک طرف طاہر کا مسئلہ تھا وہ خطرناک ترین لوگوں کی قید میں تھا جو نہ صرف ان کو قتل بھی کر سکتے تھے دوسری جانب ایک ضعیف شخص کا مسئلہ تھا جسے اگر وہ اس سرد رات میں اس کے گھر نہ پہنچاتا تو وہ مر سکتا تھا اور اس کے دل میں ساری زندگی بوجھ رہتا کہ وہ اس کی وجہ سے مر گیا ویسے بھی بوڑھے کا انداز ایسا تھا جیسے وہ اس کی جان نہیں چھوڑے گا۔ آخر اس نے فیصلہ کیا کہ وہ جلد از جلد بوڑھے کو اس کے گھر چھوڑنے کے بعد طاہر کی طرف جائے گا اس نے بوڑھے سے کہا۔ ''آپ جلدی سے میرے پیچھے بیٹھ جائیں۔ میں پہلے آپ کو پہنچا دیتا ہوں۔''
''جیتے رہو بیٹا۔'' بوڑھے نے کہا اور بائیک پر بیٹھنے لگا لیکن اس سے صحیح طرح بیٹھا نہیں جا رہا تھا کاشف کو کوفت اور پریشانی ہونے لگی لیکن وہ کچھ نہیں بولا بوڑھا کچھ دیر بعد بائیک پر بیٹھنے میں کامیاب ہو گیا۔
''چلو بیٹا اس طرف کچے راستے پر گاڑی اتار دو۔'' بوڑھے نے کہا تو کاشف نے بائیک آگے بڑھا کر کچے راستے پر ڈال دی، اسے یہاں کچے راستے پر بائیک چلانے میں بہت دشواری پیش آ رہی تھی کیچڑ اور پانی کی وجہ سے بار بار بائیک کا توازن خراب ہو رہا تھا اس کے باوجود کاشف بائیک کو چلاتا رہا۔
تقریباً پندرہ منٹ بعد کاشف نے بوڑھے سے پوچھا۔ ''بابا آپ تو کہہ رہے تھے کہ زیادہ دور نہیں جانا ہے۔ لیکن ہم تو کافی دور آ چکے ہیں۔''
''بس اب زیادہ دور نہیں ہے میرا گھر۔'' بوڑھے نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ پھر کچھ دیر بعد کاشف کو پریشانی اور کوفت ہونے لگی۔
کیونکہ بوڑھے کا گھر آ کے نہیں دے رہا تھا۔
اسے طاہر کا خیال بار بار پریشان کر رہا تھا بوڑھے کو بائیک پر بیٹھانے سے پہلے اس کا خیال تھا کہ پانچ سات منٹ میں ہی وہ بوڑھے کو اس کے گھر پہنچا دے گا۔ اور پھر جلد از جلد طاہر کے پاس پہنچنے کی کوشش کرے گا لیکن اب تو تقریباً بیس منٹ گزر چکے تھے۔
''بابا جی اور کتنی دور جائیں گے آپ؟'' اس نے قدرے بیزاری اور پریشان کن لہجے میں پوچھا۔
''بس اب زیادہ دور نہیں ہے۔'' بوڑھے نے اطمینان کے ساتھ جواب دیا۔
''بابا جی آپ تو شروع سے ہی یہ کہتے چلے آ رہے ہیں کہ زیادہ دور نہیں جانا ہے اور دیکھیں ہم لوگ کتنی دور آ گئے۔'' کاشف نے کہا۔
''فکر نہ کرو اب زیادہ دور نہیں ہے گھر۔'' بوڑھے نے کہا اس کی بات سن کر کاشف بھنا گیا۔ اسے شدید غصہ آنے لگا تھا اس نے سوچا کہ وہ بائیک روک دے اور بوڑھے کو اتار دے پھر اس نے اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے نرم لہجے میں کہا۔ ''میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ مجھے ایک اور جگہ بھی جلدی سے پہنچنا ہے آپ کا گھر تو آ نہیں رہا۔''
''تم پریشان نہ ہو ہم گھر کے قریب پہنچ چکے ہیں۔'' بوڑھے نے مطمئن لہجے میں کہا کچھ دیر بعد کاشف کو کھنڈرات نظر آئے۔ اس پر خوف غالب آ گیا لیکن اس نے خود کو خوف سے آزاد کرا لیا۔ ''بس یہاں روک لو۔'' بوڑھے نے کاشف کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تو اس نے بائیک روک لی اس نے خود کو خوف زدہ محسوس کیا پھر اس نے بوڑھے سے

کہا۔ "اچھا اب مجھے اجازت دیں۔"

"بھئی اتنی بھی کیا جلدی ہے۔ ذرا رکو کچھ کھا پی لو ہمارے ساتھ۔" بوڑھے نے فکر انداز میں اس سے کہا۔

"نہیں بس اب مجھے آپ اجازت دیں مجھے ایک اور جگہ پہنچنا ہے میں پھر کبھی آپ کے پاس آؤں گا۔" کاشف نے کہا۔

"پھر کبھی نہیں ابھی اور اسی وقت آؤ میرے ساتھ۔" بوڑھے نے کرخت لہجے میں کہا اس کا انداز ایک دم ہی بدل گیا تھا۔

"دیکھئے مجھے ایک جگہ پہنچنا ہے۔" کاشف نے قدرے پریشان لہجے میں کہا۔

"بعد میں جانا پہلے ہمارے ساتھ کچھ کھا پی لو۔" بوڑھے نے کہا تو کاشف کو یقین ہوگیا کہ اب اس کی خیر نہیں ہے بوڑھا اسے اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔ پھر اس کے ساتھی اور وہ اس کا خون پی جائیں گے وہ کافی خوف زدہ ہوگیا تھا۔

پھر بھی اس نے اپنے حواس کو قابو میں رکھا اور بولا۔ "دیکھیں جناب جس طرح آپ کی زندگی کا مسئلہ ہے اسی طرح کسی اور کی بھی زندگی کا مسئلہ ہے اگر میں نہ پہنچا تو اسے قتل بھی کیا جاسکتا ہے۔"

"اترو اور چلو میرے ساتھ۔" بوڑھے نے کاشف کا ہاتھ پکڑتے ہوئے خون خوار انداز میں کہا تو کاشف کو یوں محسوس ہوا جیسے کسی لوہے کے شکنجے میں اس کا ہاتھ پھنس گیا ہو۔ پھر بوڑھے نے تقریباً اسے گھسیٹ لیا اس سے پہلے کہ بائیک گر جاتی کاشف چیخا۔ "یہ کیا کر رہے ہیں آپ یہ کون سا طریقہ ہے مہمان نوازی کا۔"

"ہمارا یہی طریقہ ہے چلو میرے ساتھ۔"

بوڑھے نے کہا اور کاشف کو تقریباً گھسیٹنے لگا۔ کاشف سے بائیک چھوٹنے کے بعد گر گئی اور وہ بوڑھے سے خود کو چھڑانے کی کوشش کرنے کے باوجود اس کے ساتھ آگے بڑھنے لگا کیونکہ بوڑھے میں بہت طاقت تھی۔

کچھ دیر بعد بوڑھا کاشف کو کھنڈر کے اندر لے آیا یہاں ہر طرف گہرا اندھیرا تھا۔ بوڑھا کاشف کو گھسیٹے لئے جا رہا تھا اور کاشف خود کو اس کی گرفت سے آزاد کروانے کی بھرپور کوشش کر رہا تھا پھر بوڑھا اسے ایک ایسے کمرے میں لے آیا جہاں کئی دیئے روشن تھے قالین بچھے ہوئے تھے ماحول گرم تھا جب کہ قالین پر ایک بوڑھی عورت اور دو ادھیڑ عمر کے آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔

"تم نے آنے میں دیر کردی۔" بوڑھی عورت نے بوڑھے سے شکایتی انداز میں کہا۔

"ہاں بس ذرا دیر ہوگئی۔" بوڑھے نے سرسری انداز میں کہا پھر اس نے کاشف کا ہاتھ چھوڑنے کے بعد اس سے کہا۔ "بیٹھ جاؤ قالین پر۔"

کاشف نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ "دیکھیں وہ میرا مسئلہ ہے۔"

بوڑھے نے اس کی بات کاٹتے ہوئے سخت لہجے میں کہا۔ "خاموش بیٹھے رہو۔" پھر اس نے بوڑھے اور دونوں آدمیوں کی طرف دیکھ کر کہا۔ "یہ ہمارا مہمان ہے اس کی خوب خاطر تواضع کرو۔" اپنی بات ختم کرنے کے بعد بوڑھا بھی قالین پر بیٹھ گیا کاشف ان تینوں کا بغور جائزہ لے رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس کا اندازہ درست نکلا بوڑھا اسے بالآخر کسی نہ کسی طرح اپنے ٹھکانے پر لے آیا تھا اور اب اسے یقیناً مار دیا جائے گا وہاں سے فرار ہونے کے بارے میں سوچنے لگا اس نے آس پاس کا جائزہ لیا وہ صرف دروازے سے باہر جاسکتا تھا۔ جس سے بوڑھا اسے لے کر آیا تھا۔

بڑھیا اٹھ کر اس کے قریب آ گئی پھر وہ بیٹھ گئی اور اسے غور سے دیکھنے لگی، کاشف بری طرح خوف زدہ ہوگیا۔

"کیا کھانا پسند کرو گے۔" بڑھیا نے پوچھا تو کاشف گھبرا گیا اور بولا۔ "جی نہیں کچھ نہیں، بس میں جانا چاہتا ہوں۔"

"تم نہیں جاسکتے جب تک ہم نہیں چاہیں گے تم نہیں جاسکتے۔" بوڑھے نے کرخت لہجے میں کہا۔

"بتاؤ کیا کھانا پسند کرو گے؟" بڑھیا نے اپنا

بول دہرایا تو کاشف نے سوچا کہ اب وہ بری طرح پھنس گیا ہے اور یہاں سے فرار ہونے کی کوشش بھی ناکام ہوسکتی ہے اس نے طاہر اپنے بھائی کے بارے میں سوچا پھر بڑھیا سے بولا۔

"دیکھئے وہ میرا بھائی سخت مشکل میں ہے میں نے تو باباجی کے ساتھ نیکی کی اور انہیں یہاں تک چھوڑنے آ گیا لیکن آپ لوگ میرے ساتھ بہت برا کر رہے ہیں کیا نیکی کا صلہ یہی ہوتا ہے۔"

بڑھیا کے چہرے پر پراسرار مسکراہٹ بکھر گئی اس نے کہا۔ "تم خوف زدہ کیوں ہو؟"

"جی نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں ہے، میں اپنے بھائی کی وجہ سے پریشان ہوں۔" کاشف نے کہا۔

"بھول جاؤ اسے یہ بتاؤ کہ کیا کھاؤ گے؟" بڑھیا نے پوچھا۔

کاشف نے سوچا کہ اب تو وہ اپنے بھائی طاہر تک نہیں پہنچ پائے گا۔ اس لئے اس کی طرف سے پریشان ہونے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اس نے ایک گہرا سانس لینے کے بعد بڑھیا سے کہا۔ "جو آپ کا دل چاہے کھلا دیں۔"

"اچھا تم بے فکر ہو کر بیٹھو میں آتی ہوں۔" بڑھیا نے کہا اور اٹھ کر کمرے کے باہر چلی گئی۔

بوڑھا اپنی بات آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ "یہ جو ابھی باہر گئی ہے یہ میری بیوی ہے ہم لوگ بہت عرصے سے یہاں رہ رہے ہیں۔" اسی وقت بڑھیا کمرے میں داخل ہوئی اس کے ہاتھ میں ایک بڑی ٹرے تھی اس نے وہ کاشف کے سامنے رکھ دی۔ اس پر موجود کپڑا ہٹا دیا وہاں بہت اچھی اچھی کھانے کی چیزیں رکھی تھیں۔ "لو بھئی کھالو، کچھ اور کھانا چاہو تو بتا دینا۔" بڑھیا نے کہا۔

کاشف سوچنے لگا کہ "اسے کچھ کھانا چاہئے یا نہیں۔" اس پراسرار ماحول میں اسے ڈر تھا کہ وہ پراسرار لوگ کوئی الٹی سیدھی چیز نہ کھلا دیں۔ جو کسی بھی طرح اس کے لئے نقصان دہ ثابت ہو۔ "کھاؤ بھئی کیا سوچنے لگے۔" بوڑھے کی کرخت آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی تو وہ خوف زدہ ہوگیا اور بے اختیار اس کا ہاتھ کھانے کی طرف چلا گیا۔ اس نے تلی ہوئی مرغی کی ایک ران اٹھالی۔

مرغی بڑی لذیذ تھی پریشان اور خوف زدہ ہونے کے باوجود وہ پوری ران ختم کر گیا پھر بوڑھے کے کہنے پر اس نے کچھ اور چیزیں بھی کھائیں، کھانے سے فارغ ہو کر وہ بوڑھے سے بولا۔

"اچھا اب آپ مجھے اجازت دیں۔"

"اس بارش اور طوفان میں کہاں جاؤ گے صبح چلے جانا۔" بوڑھے نے کہا۔

"طوفان، طوفان کہاں ہے؟ باہر تو ہلکی پھلکی بارش ہو رہی ہے۔" کاشف نے کہا۔

"نہیں...... اب ہلکی پھلکی بارش نہیں ہو رہی

محافظ

ایک کمیونسٹ ملک میں جب وہاں کا سربراہ پاگل خانے کا معائنہ کرنے لگا تو پاگلوں کو خوب اچھی طرح سمجھا دیا گیا کہ سب زندہ باد زندہ باد کے نعرے لگائیں۔

چنانچہ جیسے ہی پاگل خانے میں داخل ہوا، پاگلوں نے ہمارا محبوب رہنما زندہ باد کے فلک شگاف نعرے لگانا شروع کردیئے۔ سربراہ پاگلوں کی محبت اور عقیدت سے بہت متاثر ہوا اور دل ہی دل میں اپنی ہر دل عزیزی پر خوش ہو رہا تھا کہ اس کی نظر کونے میں کھڑے ہوئے ایک شخص پر پڑی جو بالکل خاموش کھڑا تھا۔

اس نے اشارے سے اس شخص کو بلایا اور پوچھا۔ "کیا بات ہے۔ کامریڈ تم نعرے نہیں لگا رہے؟"

اس شخص نے ادب سے کہا۔ "میں یہاں کا محافظ ہوں۔ جناب پاگل نہیں۔"

(ثوبیہ شہزادی۔ کھڈیاں خاص)

طوفان آچکا ہے۔" بوڑھے نے کہا۔

کاشف حیرت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "آپ کو کیسے پتہ چلا کہ باہر طوفان آچکا ہے۔"

بوڑھا پراسرار مسکراہٹ بکھیرنے کے بعد بولا۔ "آؤ میرے ساتھ۔" کچھ دیر بعد وہ دونوں کھنڈر سے باہر آئے تو باہر واقعی طوفان آیا ہوا تھا بوڑھا کاشف کو لے کر واپس کمرے میں آ گیا اب تو کاشف کو پکا یقین ہو چکا تھا کہ، بدروحوں کے شکنجے میں پھنس چکا ہے ورنہ بوڑھے کو کیسے پتہ چلا تھا کہ باہر طوفان آیا ہوا ہے۔"

کاشف نے اپنی آخری کوشش کرنے کا ارادہ کیا اب اسے یہاں سے دوڑ جانے کی کوشش کرنی چاہئے پھر چند لمحوں بعد اس نے دوڑ لگادی۔ ابھی وہ کمرے کے دروازے تک ہی پہنچا تھا کہ کسی نے اسے پیچھے سے پکڑ لیا اس نے فوراً مڑ کر دیکھا اور خوف سے لرز اٹھا کیونکہ بوڑھا کافی دور اپنی جگہ ہی بیٹھا تھا اور اس کا ہاتھ لمبا ہو کر کاشف کو پکڑ چکا تھا۔ پھر بوڑھے کے ہاتھ نے کاشف کو کھینچ لیا وہ اسی جگہ پہنچ گیا جہاں سے اٹھ کر بھاگا تھا۔ "بیٹھ جاؤ۔ یہاں سے تم بھاگ نہیں سکتے۔" بوڑھے نے کرخت آواز میں کہا۔

"مجھے جانے دیں میرے بھائی طاہر کی زندگی خطرے میں ہے۔" کاشف نے گویا التجا کی۔

"چپ چاپ بیٹھ جاؤ۔" بوڑھے نے غصے سے کہا۔ تو کاشف بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد بڑھیا اور بوڑھا اور اس کے دونوں بھائی اٹھ کھڑے ہوئے بوڑھا تو کاشف کے قریب ہی کھڑا تھا باقی تینوں بھی اس کے پاس پہنچ گئے کاشف خوف زدہ نگاہوں سے انہیں دیکھنے لگا اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا وہ چاروں جس انداز سے اس کے پاس کھڑے تھے اس سے اسے اندازہ ہو چکا تھا کہ کسی بھی لمحے وہ چاروں خوف ناک روپ بدل کر اسے بھنبھوڑ ڈالیں گے، اس نے بے اختیار ادھر ادھر نظر ڈالی کہ شاید دوڑ جانے کی صورت نظر آ جائے۔ اسی لمحے اس بوڑھے نے اس سے کہا۔ "اب تم آرام کرو۔ صبح چلے جانا۔ اور ہاں یہاں سے فرار ہونے کا سوچنا بھی نہیں۔"

"میں اسی وقت جانا چاہتا ہوں۔" کاشف نے کہا۔

"ابھی تمہارے لئے باہر بہت خطرہ ہے۔ آرام سے سو جاؤ۔" بوڑھے نے کہا تو کاشف حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا پھر بولا۔

"خطرہ میرے لئے۔"

"ہاں تمہارے لئے خطرہ ہے۔ میں ابھی تمہیں کچھ نہیں بتا سکتا کیونکہ تم میری بات کا یقین نہیں کرو گے۔" بوڑھے نے کہا۔

"آپ بتائے میں آپ کی بات پر یقین کر لوں گا۔" کاشف نے جلدی سے کہا۔

"بس تم بے فکر ہو کر سو جاؤ۔" بوڑھے نے قدرے کرخت لہجے میں کہا پھر وہ چاروں کمرے سے باہر چلے گئے۔

کاشف کافی دیر تک بت بنا بیٹھا رہا اور بوڑھے کی باتوں پر غور کرتا رہا کہ آخر وہ کیا چاہتا ہے کیا وہ واقعی سچ کہہ رہا تھا کہ اس کے لئے باہر خطرہ ہے یا صرف اسے تسلی دینے کے لئے ایسی باتیں کر رہا تھا کہ جن کی وجہ سے وہ مطمئن ہو جائے اور وہ لوگ کسی بھی وقت آ کر اس کا خون پی جائیں، وہ بے چینی سے کمرے میں ٹہلنے لگا اس کی ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ کمرے سے باہر کا جائزہ لے وہ بوڑھے کا ہاتھ لمبا ہو جانے کی وجہ سے اب تک خوف زدہ تھا۔ بہت دیر تک ٹہلتے رہنے کے بعد بالآخر وہ تھک کر بیٹھ گیا، طاہر کے بارے میں اس نے سوچا اب تک تو اسے اور اس کے دوست کو قتل کر دیا گیا ہوگا، کچھ دیر بعد وہ لیٹ گیا کافی دیر تک وہ جاگتا رہا۔ پھر رات کے کسی پہر وہ نیند کی آغوش میں سو گیا۔

"اٹھو صبح ہو گئی ہے۔" اس کے کانوں میں آواز آئی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا بوڑھا اس کے قریب ہی بیٹھا تھا اسی نے اس کو جگایا تھا۔ "آؤ میرے ساتھ منہ ہاتھ دھو لو اور ناشتہ کر کے چلے جانا۔" بوڑھے نے اٹھتے ہوئے کہا پھر وہ اسے لے کر ایک ایسی جگہ آ گیا جہاں منہ ہاتھ

...کے لئے پانی موجود تھا، اب کاشف کو پوچھ چھ... آ رہا تھا کہ بوڑھا اور اس کے ساتھی اسے مارنا نہیں ... معاملہ کچھ اور ہے اس نے منہ ہاتھ دھو لیا ... اسے واپس کمرے میں لے آیا کچھ دیر بعد بڑھیا ... لے کر آ گئی پھر وہ اور بڑھیا کمرے سے باہر چلے ... کاشف ناشتہ کرنے لگا کچھ دیر بعد بڑھیا اور بوڑھا ... کاشف نے چند لمحے پہلے ہی ناشتہ ختم کیا تھا۔ بڑھیا برتن اٹھا کر لے گئی۔

بوڑھا کاشف کے قریب بیٹھ گیا اور بولا۔ "تم ... کر جہاں جانا چاہتے تھے وہاں جانے کی ضرورت ... نہیں ہے۔"

"جی کیا مطلب میں کچھ سمجھا نہیں۔" کاشف نے الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

بوڑھا بولا۔ "رات میں جب میں نے تمہیں دیکھا تو مجھے پتہ چل گیا کہ تم کہاں جا رہے ہو اور میں نے تمہیں روک لیا اور پھر تمہیں کسی طرح یہاں لے آیا، ... تمہارے ساتھ ایک بڑا دھوکہ ہونے والا تھا تمہیں ... ایک بدروح نے بلایا تھا۔"

"بدروح۔" کاشف کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"ہاں اگر تم کچھ اور آگے جاتے تو وہ بدروح تمہیں اپنے ساتھیوں سمیت پکڑ لیتی اور اگر تم اس کی ... میں آ جاتے تو یقیناً وہ اب تک تمہیں مار کر تمہارا خون پی جاتی۔" بوڑھے نے کہا۔

"لیکن مجھے تو میرے بھائی نے فون کیا تھا کہ اسے ڈاکوؤں نے قید کر دیا ہے۔" کاشف نے حیرت سے کہا۔

"لیکن وہ فون ایک شیطانی چکر تھا۔ تمہارے بھائی نے نہیں کیا تھا وہ فون۔ اب تم آرام سے گھر جاؤ اور جا کر اپنے بھائی سے پوچھ لینا کہ کیا اس نے فون کیا تھا؟ رات کو میں اس لئے تمہیں نہیں بھیج سکتا تھا کیونکہ وہ بدروح کسی نہ کسی طرح تمہیں گھیر لیتی اور میری مجبوری تھی کہ میں اس کے خلاف کچھ نہیں کر سکتا تھا مجھے معلوم تھا کہ صبح ہونے پر وہ سب چلے جائیں گے اور ایسا ہی ہوا۔ اب

"آپ کون ہیں بابا؟" کاشف نے کہا۔

"یہ جاننے کی ضرورت نہیں ہے۔" بوڑھے نے کہا پھر وہ کاشف کی بائیک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "اسے اٹھا لو اور بے فکر ہو کر جاؤ۔"

"کیا وہ بدروح اور اس کے ساتھی مجھے پھر کبھی نقصان تو نہیں پہنچائیں گے؟" کاشف نے پوچھا۔

"نہیں وہ اب یہاں سے جا چکے ہیں کیونکہ وہ شیطانی چکر ایک بار ہی چلا سکتے ہیں۔" بوڑھے نے کہا۔

کاشف نے اپنی موٹر سائیکل اٹھا کر صاف کی پھر بوڑھے سے بولا۔ "آپ کا بہت شکریہ بابا کہ آپ نے میری مدد کی، کیا میں آپ سے ملنے کسی وقت آ سکتا ہوں؟"

"نہیں اب ہم تمہیں یہاں نہیں ملیں گے۔" بوڑھے نے جواب دیا۔

بائیک اسٹارٹ کرنے کے بعد کاشف نے بوڑھے کی طرف دیکھا تو بوڑھے نے اپنا ہاتھ الوداعی انداز میں اوپر اٹھا کر اپنے چہرے پر مسکراہٹ بکھیر دی تو کاشف بھی دھیرے سے مسکرایا اور پھر روانہ ہو گیا۔ وہ سب سے پہلے کامران کے گھر پہنچا۔

"اتنی صبح بھائی خیریت تو ہے؟" طاہر نے پوچھا۔

"ہاں مسئلہ ہی کچھ ایسا ہو گیا تھا۔" کاشف نے کہا۔ پھر اس نے طاہر سے پوچھا۔ "کیا تم نے رات مجھے فون کیا تھا؟"

"نہیں تو۔ بات کیا ہے بتائیں"۔ طاہر نے کہا۔

"کیا بات ہے بیٹا تم کچھ پریشان لگ رہے ہو۔ بتاؤ کیا بات ہے؟" کامران کی امی کامران کے ساتھ اندر داخل ہوتے ہوئے بولیں۔ تو کاشف نے سارا واقعہ بتا دیا جس پر انہوں نے حیرت کا اظہار کیا بلکہ اس بوڑھے کے لئے تشکر آمیز کلمات بھی کہے۔ "یقیناً وہ بوڑھا کسی اور مخلوق میں سے تھا۔"

وبال

ایس حبیب خان۔ کراچی

نرم و نازک دلکش و دل فریب خوبصورت دوشیزہ کی حالت دن بدن ڈھلنے لگی، ڈاکٹروں نے سر توڑ کوشش کر ڈالی، مگر دوشیزہ کی حالت سنبھلنے کو نہ آرہی تھی اور جب حقیقت کھل کر سامنے آئی تو لوگ دھل کر رہ گئے۔

اصل اور نقل میں فرق نہ رکھنے والے اذیت کا شکار ہوجاتے ہیں، کہانی پڑھ کر دیکھیں

اگروال ہاؤس میں خوب گہما گہمی ہورہی تھی، ہر طرف لوگ آجارہے تھے کوئی مٹھائی کے ٹوکرے لے جارہا تھا تو کوئی پھولوں سے لدا سیڑھیاں چڑھ رہا تھا یہ وہ سب لوگ تھے جو سجاوٹ اور دیگر انتظامات کررہے تھے اور یہ تمام انتظامات تھے شیکھر اگروال کے اکلوتے بیٹے ہرش اگروال کی شادی کے لئے، جس کی شادی شیکھر اگروال کے بچپن کے دوست سنیل گپتا کی اکلوتی بیٹی سندیہا سے ہورہی تھی شیکھر اگروال اور سنیل گپتا اسکول کے زمانے سے ساتھ تھے شیکھر اگروال نے بزنس میں ڈگری لے کر اپنا فیملی بزنس سنبھال لیا جبکہ سنیل گپتا سوفٹ ویئر انجینئر تھے۔ جو کہ سولہ سال پہلے بنگلور سے یوکے چلے گئے تھے وہاں ان کی رہائش کوینٹری میں تھی۔ سنیل گپتا جب اپنی پتنی سادھنا اور بیٹی سندیہا کو لے کر یوکے گئے تھے اس وقت سندیہا کی عمر دو برس تھی۔

دوسری طرف شیکھر اگروال کے پریوار میں اس کی دھرم پتنی آشا دیوی، بیٹا ہرش اور بیٹی شروتی تھے ہرش بڑا تھا مگر اس نے شیکھر اگروال اور آشا دیوی سے صاف کہہ دیا تھا کہ وہ جب تک شادی نہیں کرے گا جب تک اس کی بہن اپنے گھر کی نہ ہوجائے اور یوں اس کی خواہش پر شیکھر اگروال نے پہلے شروتی کا وواہ کردیا۔

ان کی مشکل کچھ یوں بھی جلد آسان ہوگئی تھی کہ شروتی کی سہیلی نے شروتی کا ہاتھ اپنے بھائی کے لئے مانگا تھا۔ شروتی کا سسرال شہر کے بڑے گھرانوں میں سے ایک تھا اور اس کا پتی بہت اچھا انسان تھا اور یوں شروتی کا گھر سورگ جیسا تھا۔

سندیہا اور ہرش بھی ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے۔ دونوں نے تصویروں میں بھی ایک دوسرے کو دیکھا ہوا تھا ساتھ لائیو چیٹ پر بھی ان کا رابطہ رہتا تھا شیکھر اگروال نے سنیل گپتا اور ان کے پریوار کے ٹھہرنے کا بندوبست اپنے دوسرے بنگلے میں کروایا تھا ویسے تو سنیل گپتا کے رشتہ دار بھی تھے مگر انہوں نے الگ ٹھہرنے کو ترجیح دی۔ سنیل گپتا شادی سے پانچ روز پہلے آنے والے تھے کیونکہ باقی کام کی ذمہ داری شیکھر اگروال نے لے لی تھی۔

"ماں جی! آپ یہ تمام ڈریسز دیکھ لیجیے۔" شروتی نے آشا دیوی کے کمرے میں آکر کہا جس کے پیچھے ملازم ہاتھوں میں بڑے بڑے فینسی باکس اٹھائے اندر داخل ہورہے تھے۔ انہوں نے شروتی کی ہدایت

کے مطابق وہ باکس ترتیب سے ٹیبل پر رکھ دیئے ان باکسز میں ڈیزائنر سوٹس تھے۔ آشا دیوی اپنے برابر میں رکھی ڈرائی فروٹس کی ٹرے سے کاجو اٹھا کر کھارہی تھیں پھر انہوں نے ٹرے سائیڈ باکس پر رکھی اور بولیں۔ "لاؤ بھئی دیکھتے ہیں تم نے کیا شاپنگ کی سب سے پہلے مجھے بارات کا جوڑا دکھاؤ سب سے خاص جوڑا تو دلہن کا وہی ہوتا ہے۔" آشا دیوی نے ساڑھی سنبھال کر بیٹھتے ہوئے کہا تو شروتی مسکرائی۔

اور سارے باکسز میں سے ایک میرون ویلوٹ کا شاندار باکس اٹھایا اور بیڈ پر لاکر کھولا۔ اس میں سے ہلکا میرون کلر کا لہنگا نکالا، جس کا گھیرا اتنا تھا کہ پورے بیڈ پر پھیل گیا ہلکے سنہری رنگ کا بھاری کام اسے مزید حسین بنارہا تھا۔ "ماں یہ اس کی چولی ہے ویلوٹ کی بیک پر بھی کام ہے اور یہ دوپٹہ دیکھیں۔"

شروتی نے جب دوپٹہ پھیلایا تو آشا دیوی ایک دم بولیں۔ "بیٹا دوپٹہ تو بہت ہی حسین ہے۔" ان کے انداز سے خوشی اور پسندیدگی صاف عیاں تھی۔

شروتی نے جوڑے کو ایک طرف کیا پھر ایک اور باکس کھولا۔ "ماں یہ ریسپشن کے لئے ہے۔" اس نے بے حد حسین سی گرین کلر کی ساڑھی نکال کر آشا دیوی کو دکھائی جس پر کمیش کا باریک کام بنا ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر آشا دیوی نے مسکراتے ہوئے بھنوئیں چڑھائیں۔

پھر شروتی نے ایک اور باکس کھولا۔ "ماں یہ سنگیت کے فنکشن کے لئے ہے۔" اس نے گوٹے کے کام والی فراک نکالی اس کے ساتھ چوڑے بارڈر والا دوپٹہ تھا۔

"شروتی! تو نے تو میری خوشی کو دگنا کردیا، میری امید سے بڑھ کر تو نے شاپنگ کی ہے۔" آشا دیوی اس کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکیں۔ واقعی شروتی نے شاندار تیاری کی تھی۔

"ماں آپ بھی ناں! شاندار تیاری کیوں نہ کرتی، آخر میرے اکلوتے بھیا کی شادی ہے! دل کھول کر ارمان نکالوں گی، کوئی کسر نہیں چھوڑوں گی۔" شروتی نے جذباتی انداز میں کہا اس کی آنکھوں میں خوشی کی نمی تیر گئی تھی۔

"شروتی!"

"جی ماں۔" اس نے جواب دیا۔

"بیٹا میں یہ سوچ رہی تھی کہ باقی وقت تو ٹھیک ہے مگر شادی میں دلہن کا پہناوا اور اس کا انداز روایتی

ہونا چاہیے۔" آشا دیوی نے کہا۔

"ماں میں سمجھی نہیں!" تہمہ بناتی شروتی رک کر بولی۔

"بیٹا تم تو جانتی ہو کہ سندیہا کا ماؤرن ہیئر کٹ ہوا ہے۔ مگر وہ مشرقی پہناوے پر جچتا نہیں ہے، میری تو اچھا ہے کہ ان سب پہناؤں کے ساتھ سندیہا کے لمبے بال ہوتے۔" آشا دیوی نے سوچتے ہوئے کہا۔

تو ان کی بات پر شروتی کی ہنسی چھوٹ گئی۔ "ارے ماں یہ بھی کوئی ٹینشن والی بات ہے! آج کے دور میں کچھ بھی ناممکن نہیں ہے آپ چنتا نہ کریں، آپ کی بہو کے گھٹنوں تک لمبے بال ہوں گے بس۔" شروتی نے کہا تو آشا دیوی نے پوچھا۔

"سچ!" وہ سیدھی سادھی گھریلو خاتون تھیں۔

"اور نہیں تو کیا؟ آج کل ایک سے ایک ہیئر ایکسٹینشن ملتی ہے، جو آپ کے چھوٹے بالوں کو گھٹنوں تک اور لمبے بالوں کو چھپا کر بوائے کٹ سب کچھ کر دیتی ہیں۔" شروتی نے کہا تو آشا دیوی ہنسنے لگیں۔ پھر شروتی نے انہیں باقی جوڑے دکھانے شروع کر دیئے۔

☆.....☆.....☆

سنیل گپتا کی فلائٹ لینڈ کر چکی تھی انہوں نے جہاز سے اتر کر گہری سانس لی وہ اپنے دیش کی ہوا میں رچی بسی جانی پہچانی، اپنائیت کی مہک کو اپنے روم روم میں محسوس کر رہے تھے۔ سولہ سال کا عرصہ بہت ہوتا ہے اپنی زمین اور اپنے لوگوں سے دور رہ کر گزارنے کے لئے سے نے انہیں کبھی موقع ہی نہیں دیا واپس آنے کا۔ مگر سندیہا کے جوان ہونے کے بعد سے انہیں واپس آنے کی اچھا ہونے لگی اور انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ پردیس میں نہیں اپنے ملک میں بیٹی بیاہیں گے تاکہ ان کا ناطہ اپنے دیش سے نہ ٹوٹے، ورنہ اگر سندیہا کی شادی یوکے میں ہو جاتی تو پھر ان کے واپس آنے کا کوئی جواز نہ ہوتا اور ان کی نسلیں وہیں کی ہو کر رہ جاتیں اور ان کا یہ مسئلہ ان کے بچپن کے دوست شیکھر اگروال نے حل کر دیا۔

شیکھر اگروال نے دو ایک چکر لگائے تھے یوکے کے، وہیں انہوں نے سندیہا کو دیکھ کر اسے اپنی بہو بنانے کا فیصلہ کر لیا تھا جب انہوں نے سنیل سے سندیہا کا ہاتھ اپنے بیٹے ہرش کے لئے مانگا تو سنیل گپتا خوشی سے اچھل پڑے اور دونوں دوست جلد از جلد اس دوستی کو رشتے داری میں بدلنے کے لئے بے تاب تھے۔

☆.....☆.....☆

گاڑی مارکیٹ کے سامنے رکی، شروتی اپنا بیگ کندھے پر لٹکا کر گاڑی سے باہر نکل آئی اور ڈرائیور سے ویٹ کرنے کا کہہ کر مارکیٹ کی طرف چل دی مارکیٹ میں داخل ہو کر اس کی نگاہیں مختلف شاپس کے ناموں پر مرکوز تھیں وہ گراؤنڈ فلور پر گھومتی رہی مگر اسے اس کی مطلوبہ شاپ نہ ملی پھر وہ اوپری منزل پر گئی وہ چلتی ہوئی شاپ کے نام پڑھ رہی تھی چار پانچ دکانوں کے بعد ہی اسے اپنا مطلوبہ نام نظر آ گیا وہ یہاں اپنی دوست شانتی کے بتانے پر آئی تھی شانتی نے شاپ کا نام بتا کر صرف اتنا کہا تھا۔ "ڈھونڈ تم خود لینا، ایگزیکٹ جگہ مجھے نہیں معلوم میری کزن گئی تھی وہاں۔"

لیکن آخر کار شروتی نے شاپ ڈھونڈ ہی لی۔ شاپ کافی بڑی تھی شروتی اندر گئی تو اس کا استقبال زمین سے چھت تک سجی مختلف انداز کی "وگز" نے کیا جن میں جوڑے، اسٹپ، کرلز، ہر طرح کی وگز تھیں، ہر شیڈ میں، شروتی ان سب پر نظریں گھما رہی تھی اور اس کی نظریں گھومتی ہوئی ایک جگہ ٹھہر گئیں جہاں ایک آدمی نظر آیا وہ سر جھکائے کچھ کر رہا تھا اور اس کی پیٹھ شروتی کی طرف تھی۔

"ایکسکیوزمی!"

شروتی نے اسے مخاطب کیا تو وہ آدمی پیچھے مڑا اس کے ہاتھوں میں ایک جوڑا تھا جسے وہ کومب کر رہا تھا اس نے وہ گلاس کاؤنٹر پر رکھا اور بولا۔ "یس میم! واٹ کین آئی ڈو فار یو؟" اس کا انداز کافی خوش اخلاقی والا تھا۔

"جی مجھے لمبے بالوں کی وگ چاہیے۔" شروتی نے اپنی منشاء بیان کی۔

"نو پرابلم میم! مل جائے گی۔" اس آدمی نے کہا اور نیچے بیٹھ کر گلاس کاؤنٹر کے نیچے بنے پورشن میں سے ایک ڈبہ نکالا اور اسے کاؤنٹر پر رکھ کر کھولا اور اندر سے تھیلی سے گولڈن بالوں کی وگ نکالی اور شروتی کے آگے کر دی۔

"نہیں مجھے بڑی لینتھ کی چاہیے۔ کم از کم گھٹنو ں تک آتی اور اس شیڈ میں نہیں، مجھے بلیک براؤن شیڈ میں چاہیے۔" شروتی نے بالوں کا معائنہ کرتے ہوئے کہا جس کی لمبائی بمشکل کمر تک تھی۔

"لیٹ می چیک!" اس آدمی نے کہا اور نیچے جھک کر دوبارہ دیکھنے لگا۔ "سوری میم! میرے پاس فی الحال یہ ہی ہے ہاں اور کسی اسٹائل کے ہیئر ایکسٹینشن چاہئے یا کسی بھی ایرا کے جوڑے وہ مل جائیں گے۔" اس آدمی نے کہا۔

"اوہ تو یہ تو بہت غلط ہوا یہاں اور کوئی شاپ ہے اس طرح کی؟" شروتی نے پوچھا۔

"میم! آپ کو آج ہی چاہئے بال؟" اس آدمی نے سوال کیا۔

"نہیں! آج تو نہیں مگر دو تین دن میں لازمی چاہئے ایکچلی فنکشن ہے ہمارے گھر۔" شروتی نے بتایا۔

"تین دن! نو پرابلم میم! ہم دو دن میں آپ کا ہیئر پیس آپ کے گھر پہنچا دیں گے۔" دکاندار نے کہا۔

"رئیلی؟" شروتی نے تصفیہ کیا۔

"یس میم! مگر ایک بات کلیئر کر دوں ہم اصلی بالوں کے ایکسٹینشن بناتے ہیں، تو وہ آپ کو کافی مہنگے پڑیں گے، رئیل بالوں کی کوسٹ لینتھ کے حساب سے بڑھتی جاتی ہے، ہاں اگر آپ کو سستی چاہئے تو نائلون مٹیریل بنوا لیں۔" دکاندار نے تفصیل سے بتایا۔

"نہیں! مجھے رئیل بال ہی چاہئیں۔" شروتی نے کہا اور دس ہزار ایڈوانس کے دے کر اپنا ایڈریس لکھوا دیا۔

دکاندار نے رسید اس کے ہاتھ میں دی تو شروتی نے اسے ریمائنڈ کروایا۔ "آرڈر لیٹ نہیں ہونا چاہیے۔"

"ڈونٹ وری میم! آپ کا آرڈر کوشش کر کے وقت سے پہلے ہی پہنچا دیں گے۔" دکاندار نے کہا تو شروتی بیگ کندھے پر ڈال کر دکان سے نکل گئی۔ اس کے نکلتے ہی دکاندار نے اپنا موبائل نکالا اور کال ملانے لگا۔

☆.....☆.....☆

چندو کھولی میں داخل ہوا تو رگھو اسے سامنے زمین پر اوندھے منہ پڑا ہوا ملا ایک طرف خالی بوتل پڑی تھی اور گلاس رگھو کے ہاتھ کے قریب پڑا ہوا تھا۔ "رگھو، اٹھو، رگھو، اٹھ ناں!" چندو نے رگھو کو آوازیں دیں مگر رگھو گھوڑے گدھے بیچ کر مدہوش پڑا تھا۔ پھر چندو نے ایک زوردار لات رگھو کے رسید کی۔ رگھو نے تھوڑی سی حرکت کی پھر گردن ادھر ادھر کر کے دوبارہ ہوش سے بیگانہ ہو گیا۔ چندو گیا اور ایک ڈونگے میں پانی بھر کر لایا اور رگھو کے منہ پر اچھال دیا۔

رگھو ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا "کون ہے؟" وہ چیخا۔

"ابے سالے میں ہوں چندو!" چندو بولا۔

رگھو نے گردن ہلائی اور بولا۔ "کیا چندو! سارا مزہ کرکرا کر دیا۔" وہ آنکھیں مچتا ہوا ہاتھ سے منہ صاف کرنے لگا۔

"ابے اٹھ! روکڑا کمانے کا ٹیم ہے، تجھے اپنے مزے کی پڑی ہے، سالے روکڑا نہیں ہوگا تو مزے کہاں سے کرے گا؟" چندو نے کہا تو رگھو لڑکھڑاتا ہوا اٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔

چندو نے رگھو کا بازو پکڑا تو رگھو لڑکھڑاتے قدموں سے اٹھ کر آگے بڑھا رگھو کی ٹھوکر نیچے پڑی بوتل پر پڑی تو وہ لڑھکتی ہوئی دور جا گری، رگھو ڈولتا ہوا کھولی میں بنے ٹین کی چادر کے پیچھے اشنان گھر میں گیا جہاں پانی سے بھرا ڈرم رکھا ہوا تھا اس نے دونوں ہتھیلیوں کو ملا کر اس میں پانی لے کر منہ پر چھپکا مارا۔

"ہو ہو ہو! مر گیا رے ارے اوہ رام کتنا ٹھنڈا پانی ہے۔" اس نے جھرجھری لیتے ہوئے کہا۔

"ہاں تیرے باپ نے گیز رفٹ کیا ہوا ہے ناں جو تجھے گرم پانی ملے گا۔" چندو نے طنز کیا۔ رگھو نے ایک طرف لٹکے میلے کچیلے پردے سے منہ صاف کیا اور دیوار پر لگی کھونٹی سے ایک بوسیدہ شرٹ اتار کر پہن لی۔ "یار ایک بیڑی تو دے!" اس نے چندو سے کہا تو چندو نے گھورتے ہوئے جیب سے بیڑی کا پیکٹ نکالا اور اسے ایک بیڑی دے دی۔

رگھو نے اپنی جیبیں ٹٹولیں مگر وہ خالی تھیں۔ چندو نے اپنی جیب سے ماچس نکال کر رگھو کے ہونٹوں میں دبی بیڑی کو جلایا۔ "یار چندو پیٹ میں چوہے دوڑ رہے ہیں۔" رگھو نے کہا۔ "چل پہلے کچھ پیٹ پوجا کرتے ہیں پھر دھندے کی بات کریں گے۔" چندو نے کہا اور رگھو کے گلے میں ہاتھ ڈال کر کھولی سے باہر نکل آیا۔ دونوں بستی میں بنے ایک ڈھابے پر جا کر بیٹھ گئے۔ "چندو یار! یہاں تو کڑکی ہے۔" رگھو نے بینچ پر پیر اوپر کرتے ہوئے کہا۔

"ابے مجھے پتہ ہے۔" پھر چندو نے دال چاول منگوائے تو رگھو اپنی تھالی پر ٹوٹ پڑا چند ہی منٹ میں خالی تھالی منہ چڑا رہی تھی، رگھو اپنی انگلیاں چاٹ رہا تھا چندو نے دو چائے منگوائیں اور بولا۔ "آج دو آرڈر ہیں۔" رگھو نے اس کی بات سن کر ہاں میں سر ہلایا۔ ایک دم چندو کی جیب میں رکھا موبائل بجا چندو نے جیب سے موبائل نکالا اسکرین پر "موہن سر" لکھا ہوا آ رہا تھا۔

چندو نے کال ریسیو کی۔ "نمستے سر! اپن کو کیسے یاد کیا؟" موہن شاذ و نادر ہی چندو کو کال کرتا تھا وہ بھی اس صورت میں جب اسے ضرورت ہوتی تھی ورنہ اس کا کام بہت بڑے پیمانے پر تھا۔ "چندو! فوراً میرے پاس آ۔" موہن نے صرف اتنا کہا اور فون بند کر دیا۔

"چل اٹھ رگھو! ایک اور کام ہاتھ لگا ہے۔" چندو نے چپل پیر میں ڈالتے ہوئے کہا تو رگھو بھی اٹھ گیا۔

☆.....☆.....☆

"سر جی! آج ڈیلیوری کیسے ہو سکتی ہے؟" چندو نے موہن سے کہا۔

"چندو ڈیلیوری میں دیر نہیں کر سکتا میں نے ایڈوانس لیا ہوا ہے آرڈر کا۔" موہن نے چندو سے کہا۔

"مگر سر جی آپ خود سوچو! ابھی تو مال ڈھونڈھنا پڑے گا اس میں کتنا سے لگ جائے تو آج ڈیلیوری تو ناممکن ہے۔" چندو نے کہا۔

"مجھے نہیں پتہ چندو مگر تجھے آج ہی کام کرنا ہے! منہ مانگی رقم دوں گا۔" موہن بولا۔

"پانچ ہزار۔" چندو نے کہا۔

"ٹھیک ہے!" موہن بولا۔

"سر آج کی میں کوشش کروں گا ورنہ کل پکا مال پہنچ جائے گا۔" چندو نے کہا تو موہن سوچنے لگا پھر بولا۔ "ٹھیک ہے اور جیب سے دو ہزار نکال کر چندو کو دے دیئے۔ "یہ ایڈوانس ہے۔ باقی کے تین ہزار مال ملنے کے بعد۔"

چندو پیسے لے کر کھڑا ہو گیا۔ باہر رگھو اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے ایک ہزار رگھو کو دیئے اور ایک خود رکھ لیئے۔ "یار چندو! پہلے کے بھی تو دو آرڈر پہنچانے ہیں جو تو ڈھابے پر بتا رہا تھا۔" رگھو بولا۔

"ابے ان کی جلدی نہیں ہے وہ تو گھر پر پڑا ہے صرف پہنچانا ہے۔" چندو نے کہا اور سوچنے لگا۔

"ابے تو سوچ کیا رہا ہے؟" رگھو نے پوچھا۔

"یہی کہ موہن سر کے مال کی ڈیلیوری آج ہی کرنی ہے اور ابھی تک مال کا کچھ پتہ نہیں ہے۔ اسے ڈھونڈھنا پڑے گا۔" اور رگھو کو چندو نے تفصیل بتانی شروع کر دی۔ ابھی وہ دونوں باتیں ہی کر رہے تھے کہ ان کے کانوں میں شور کی آواز سنائی دی۔ دونوں آواز کی اور مڑ کر دیکھنے لگے۔ وہاں کافی سارے لوگ سڑک سے نیچے کچے کی طرف بھاگ رہے تھے اور ساتھ چیخ بھی رہے تھے۔ "پکڑو! پکڑو! پکڑ جانے نہ پائے بچ کے!"

وہ دونوں دوڑ کر اس طرف گئے، رگھو نے ایک لڑکے سے پوچھا۔ "کیا ہوا؟ کیا کوئی چور ہے؟"

"نہیں بھیا! لوگوں نے ایک ڈائن کو رنگے

ہاتھوں پکڑا ہے بچہ چراتے ہوئے، علاقے کے دس بچے لے ہیں بغیر کلیجے کے! آج تو اسے جلا کر بھسم کر دیں گے۔" اس نے کہا اور آگے بڑھ گیا۔

چندو نے رگھو کو اشارہ کیا اور دونوں وہیں رک گئے۔ "چل ناں چندو دیکھتے ہیں چل کے۔" رگھو بولا۔

"چھوڑ اپن کیوں اپنا منج خراب کریں؟ ہو گی کوئی بے چاری غریب، بڑے لوگ اپنا کام نکال کر، ان سے اپنی جان چھڑانے کے لئے ڈائن بنا کر قصہ تمام کرواتے ہیں۔" چندو نے کہا۔

اس کا کہنا ایک حد تک صحیح تھا کیونکہ وہ بڑے بڑے ٹھاکروں اور ان کے سپوتوں کے کارناموں سے آگاہ تھا۔ "چل رام کا نام لے کر دھندے کے لئے مال ڈھونڈتے ہیں۔" رگھو بولا تو چندو اس کے گلے میں ہاتھ ڈال کر چل پڑا۔

☆.....☆.....☆

شروتی نے اگلے دن کال کر کے اپنے آرڈر کے بارے میں پوچھا تو دکاندار نے بتایا کہ "ابھی آرڈر تیار نہیں ہے۔ جیسے ہی تیار ہو گا فوراً ڈیلیوری ہو جائے گی آپ چنتا نہ کریں۔"

"مجھے آرڈر وقت پر چاہئے یاد رکھیئے گا۔" شروتی نے کہا اور فون رکھ دیا پھر وہ جیولر کو کال ملانے لگی۔ آشا دیوی نے اپنا سٹ لڑ ہار پالش کرنے کو دیا تھا اور آج شروتی نے اسے لینا تھا اس لئے وہ جانے سے پہلے کنفرم کر رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

ٹین کی چادر سے بنے کوارٹر کو رگھو نے بجایا اندر سے عورت کی کرخت آواز آئی۔ "آ جا کھلا ہوا ہے۔" دونوں اندر چلے گئے۔

عورت نے کہا۔ "آ جا چندو تو بڑے دن بعد آیا ہے!"

"ہاں تجھے تو پتہ ہے کہ دھندے کے لئے کتنے ہاتھ پیر مارنے پڑتے ہیں۔" چندو بولا۔

"کیا کریں سارا کھیل ہی دھن کا ہے۔" عورت بولی۔ پھر اس نے پلنگ کے نیچے سے ایک بڑا سا تھیلا نکالا اور چندو، رگھو کے آگے کر دیا "کتنا مال ہے؟" رگھو نے پوچھا۔

"دس ہیں پورے۔" عورت بولی۔

"بڑے ہیں؟" چندو بولا۔

"نہیں چھوٹے ہیں۔" عورت بولی تو چندو مایوس ہو گیا۔ "کیا مجھے آج ایک خاص مال مل سکتا ہے۔ بڑا بہت بڑا" چندو نے ہاتھ سے بتایا تو عورت نے صفائی سے ناں میں گردن ہلا دی۔ "آج تو کیا اگلے دو، تین ہفتوں تک بھول جا۔"

"وہ کیوں؟" مسلوں نے سرکار سے شکایت کر دی ہے۔ آج کل بہت سختی ہے قبرستان میں سپاہی کھڑے رہتے ہیں۔" عورت نے بتا دیا۔

"تو یہ کہاں سے آئے؟" رگھو نے تھیلے کی جانب اشارہ کر کے پوچھا۔

"یہ تو غریب گھرانوں کی لوٹریوں نے دے دیئے ہیں۔ جنہیں روٹی کے لالے پڑے تھے۔" عورت نے سفاکی سے ہتھیلی پر تمباکو مسلتے ہوئے کہا۔

"وہاں سے نہیں مل سکتے؟" چندو نے امید سے کہا۔

"میں پہلے ہی وہاں سے سب سمیٹ لائی ہوں۔ کھیتی اگنے میں سے لگتا ہے، جادو نہیں کہ چھومنتر کرو اور مل جائے!" عورت کو غصہ آ گیا۔

چندو نے روپے گن کر اس عورت کے ہاتھ پر رکھے اور وہاں سے اٹھ گیا۔ اب اسے چنتا ہو رہی تھی۔

رگھو اور چندو بالوں کا گھناؤنا دھندا کرتے تھے ان کو بال یہی عورت سپلائی کرتی تھی یا تو وہ غریب مجبور لڑکیوں کو اپنے بال دینے پر مجبور کرتی یا پھر اس سے بھی خوف ناک طریقے سے قبرستان میں دفنائی جانے والی عورتوں کے بال قبرستان مسلمانوں کا تھا اور وہاں جا کر یہ خاصہ مشکل کام تھا رگھو اور چندو اس عورت سے بال لے کر انہیں آگے مہنگا بیچتے تھے اور دکان والوں سے اپنا کمیشن الگ لیتے تھے۔ مگر آج کا آرڈر چندو کے گلے میں اٹک گیا تھا ہر طرف سے ناکامی ہوئی تھی کیونکہ اس

نے اورلوگوں سے بھی معلوم کیا تھا جو اس دھندے میں تھے۔ سے بیتا جا رہا تھا اور چندو کی چنتا بڑھتی جا رہی تھی۔

"یار چندو! دو تین ہفتے تک رکنا ہوگا تو ہمارا کیا ہوگا؟ ایسا کرتے ہیں کہ بنگلور چلتے ہیں کہیں اور قسمت آزماتے ہیں۔" رگھو نے کہا۔

"ہاں تو کہتا تو ٹھیک ہے، پہلے موہن سر کے آرڈر کو پہنچا دوں پھر دیکھتے ہیں آگے کیا کرنا ہے۔" چندو نے سوچتے ہوئے کہا۔

دونوں باتیں کرتے ہوئے جا رہے تھے کہ ایک دم رگھو کو ٹھوکر لگی اور وہ نیچے جا پڑا وہاں ہلکا اندھیرا تھا چندو رگھو کو اٹھانے جھکا تو اس کے ہاتھ میں چنری آ گئی ساتھ ایک عورت زمین پر پڑی نظر آئی۔ "کون ہو تم؟" چندو نے اس سے پوچھا۔

"تو عورت نے اپنے خون میں لتھڑے ،لرزتے ہاتھ جوڑے اور چندو سے بولی۔ "سائتا کرو میری! وہ لوگ مجھے مار دیں گے۔" چندو اکڑوں اس کے پاس زمین پر بیٹھ گیا۔

"تم وہی ہو جسے لوگ ڈائن کہہ کر ڈھونڈ رہے ہیں؟" چندو نے پوچھا۔

"نہیں بابو! میں ڈائن نہیں ہوں، سب جھوٹ ہے یہ۔" اس عورت نے کہا اور چندو کی قمیض پکڑ کر اٹھنے کی کوشش کی، چندو نے اسے بازوؤں سے پکڑ کر اٹھایا تو وہ پوری خون میں لت پت ہو رہی تھی چندو کے ہاتھ بھی خون میں لت پت ہو گئے۔

عورت جھکی ہوئی تھی جب وہ سیدھی ہونے لگی تو اس کے ٹخنوں کو چھوتی چٹیا آگے آ پڑی۔ اس کی چٹیا چندو کی نظروں کے سامنے لہرائی تو چندو کے دماغ میں بجلی سی کوندی۔ "چنتا مت کرو میں تمہیں بچالوں گا۔" اس نے گھائل عورت سے کہا اور اس کو بازوؤں سے تھام کر سہارا دے کر ایک پتھر پر بیٹھایا ساتھ اس نے رگھو کو پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔

جیسے ہی رگھو پیچھے آیا چندو نے جھٹ سے اس عورت کے بالوں کو گدی سے پکڑ لیا۔

"لے یار چندو!" رگھو نے اسے پیچھے سے قینچی دی جو وہ اکثر اپنے ساتھ بیگ میں رکھتے تھے۔ دور سے لوگوں کا شور پھر سنائی دینے لگا۔ عورت خوف اور درد سے چیخی۔ "دیا کرو! مجھے جانے دو۔" مگر چندو نے عورت کے بال گدی سے کاٹ لئے اور اسے زور سے دھکا دے دیا۔ عورت چیختی ہوئی زمین پر اوندھی جا پڑی۔

اتنے میں بہت سارے لوگ وہاں آ گئے۔ "یہ رہی ڈائن!" ایک آدمی نے عورت کی طرف انگلی کرتے ہوئے کہا تو سارے لوگوں نے اسے گھیر لیا۔ مجمعے میں سے ایک آدمی آگے آیا اس کے ہاتھ میں کین تھا جس میں کچھ بھرا ہوا تھا اس نے ڈھکنا کھول کر محلول اس عورت پر چھڑکا تو فضا میں مٹی کے تیل کی بو پھیل گئی۔ عورت نیچے پڑی کانپ رہی تھی چندو کی نظر اس کی انگلیوں پر گئی تو وہ لمحہ بھر کے لئے چونک گیا پھر ان لوگوں نے اس عورت کو آگ لگا دی۔ وہ رسی میں جکڑی زمین پر جلتی ہوئی ادھر ادھر چیختی ہوئی لڑھک رہی تھی پھر آہستہ آہستہ اس کی حرکت اور چیخوں میں کمی آتی گئی اور کچھ دیر بعد وہاں راکھ کا ڈھیر بن گیا۔

"آپ کا بہت بہت دھنے واد! آج آپ کے کارن اس ڈائن سے چھٹکارا ملا ہے۔" ایک آدمی نے چندو کے پاس آ کر کہا۔

"ارے یہ تو میرا سو بھاگیہ ہے کہ میں کسی کے کام آ سکا۔" چندو نے مکاری سے کہا۔ اس عورت کے بال اس نے خاموشی سے رگھو کو دے دیئے تھے جو رگھو نے بیگ میں ڈال دیئے تھے۔

☆......☆......☆

"ہیلو میم! آپ شروتی بات کر رہی ہیں؟" شروتی کے موبائل پر کال آئی تھی۔

"جی ہاں میں ہی شروتی ہوں۔" شروتی نے کہا۔

"میم! آپ نے جو ہیئر پیس آرڈر کیا تھا وہ ریڈی ہے۔ آپ اب بتایئے کہ کس طرح اپنا آرڈر لیں گی۔ یہاں آ کر یا گھر بھیج دیں؟" دوسری طرف سے آدمی نے کہا۔

"میں خود آ کر لے لیتی ہوں ایک گھنٹے میں۔" شروتی نے کہا اور موبائل رکھ کر اپنا کام سمیٹ کر جانے کے لئے تیار ہو گئی۔ اس نے سمیت کو کال کر کے بتا دیا اور اپنی ساس سے اجازت لے کر چلی گئی اسے آج آشا دیوی کے ساتھ سندیہا سے ملنے جانا تھا اس نے سوچا پہلے ہیئر پیس لے لے پھر وہیں سے آشا دیوی کے پاس چلی جائے گی۔

شروتی نے دکان میں جا کر ہیئر پیس مانگا۔ دکاندار نے اسے نکال کر بال دکھائے جو گھٹنوں تک آ رہے تھے۔ شروتی انہیں دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔

"میم! ٹھیک ہے؟ آپ سیٹسفائی ہیں؟" دکاندار نے پوچھا۔

"بالکل آپ نے میری چنتا دور کر دی۔ تھینکس!" شروتی نے کہا اور پرس سے نوٹ نکال کر اس کے باقی کے پیسے دے دیئے۔

☆......☆......☆

"بیٹا سندیہا!" سادھنا نے روم میں آ کر کہا۔

"جی مام!" سندیہا نے بالوں میں برش کرتے ہوئے کہا۔

"بیٹا! کے پاس۔" سادھنا نے پیار سے کہا۔

"تھینکس آنٹی! اسے یہاں بلا لیں سب ساتھ میں باتیں کریں گے۔" شروتی نے مسکرا کر کہا تو سادھنا نے ملازمہ کو بھیج دیا۔

ملازمہ نے دروازہ ناک کیا تو سندیہا نے اسے اندر آنے کا کہا۔ "سندیہا بی بی آشا دیوی اور شروتی جی آئی ہیں اور آپ کو بلا رہی ہیں۔" ملازمہ نے بتایا۔

"تم چلو میں آتی ہوں۔" سندیہا بولی اور پھر آئینے میں اپنے سراپے پر نظر ڈالنے لگی۔ آسمانی کلر کے نیٹ کے سوٹ میں وہ کافی دلکش لگ رہی تھی۔ سندیہا کمرے سے نکل کر لاؤنج میں آ گئی وہاں سے ہنسنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

شروتی نے اٹھ کر سندیہا کو گلے لگایا سندیہا نے آشا دیوی کے چرنوں کو چھو کر آشیرباد دیا۔

سندیہا آ کر صوفے پر بیٹھ گئی۔ "سندیہا! ہمیں تم سے ایک بات ڈسکس کرنا تھی۔" شروتی بولی تو سندیہا ان دونوں کی طرف متوجہ ہو گئی۔

شروتی بولی۔ "سندیہا! ماں کی اچھا ہے کہ تم شادی میں ٹری ڈشنل وے میں تیار ہو۔" اور پھر اس نے لمبے بال باکس میں سے نکال کر اسے دکھائے اور آشا دیوی کی اچھا کے بارے میں بتایا۔

سندیہا کچھ دیر خاموش رہی تو شروتی اور آشا دیوی ایک دوسرے کی اور دیکھنے لگیں۔ "بیٹا! یہ صرف میری اچھا ہے اگر تمہیں نہیں پسند تو کوئی بات نہیں؟" آشا دیوی بولیں۔

"ہاں سندیہا اگر تم کمفرٹ ایبل فیل نہ کرو تو زبردستی نہیں ہے۔" شروتی بھی جلدی سے بولی۔

"سندیہا نے شروتی کی طرف دیکھا اور بولی۔ "یو نو! شروتی آنٹی لوولانگ ہیئرز ،مگر کیا کروں کوینٹری جیسی جگہ پر بڑے بال کیری کرنا ،اٹس ناٹ ایزی وہاں کا لائف اسٹائل، وہاں کے فرینڈز سب الگ طرح کا ہے۔"

"مگر تم نے تو میری یہ اچھا پوری کر کے مجھے خوش کر دیا تھینکس!" شروتی اور آشا دیوی نے سندیہا کی بات سن کر سکھ کا سانس لیا۔

"خوش تو تم نے مجھے کر دیا ہے بیٹا، میری اچھا کا احترام کر کے!" آشا دیوی بولیں۔

"آنٹی آپ کی اچھا میرے لئے بہت معنی رکھتی ہے! اگر مجھے یہ پسند نہ بھی ہوتے تب بھی میں یہ آپ کے لئے ضرور لگاتی!" سندیہا کی بات سن کر آشا دیوی خوشی سے پھولی نہ سما رہی تھیں۔ اتنے سنسکاروں والی بہو تو بھاگ سے ہی ملتی ہے وہ بھی باہر سے آئی ہوئی۔

"آپ باتیں بعد میں کیجیے گا پہلے یہ لیجیے۔" ملازمہ سادھنا بیگم کے ساتھ چائے کی ٹرالی لے آئی جو چائے کے ساتھ دیگر لوازمات سے سجی ہوئی تھی سندیہا جلدی سے اٹھی اور سب کے لئے چائے بنانے لگی۔

"سندیہا! ماں کی چائے میں نو شوگر۔" شروتی

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

نے بتایا تو سندیہا گردن ہلانے لگی۔

''سندیہا کتنا سے اور لگے گا؟'' سادھنا نے سندیہا کے موبائل پر کال کی جو کہ سیلون میں بیٹھی تیار ہو رہی تھی۔

''مام! بس آدھا گھنٹہ اور لگے گا۔'' سندیہا نے کہا اور فون کٹ کر دیا۔

''میم آپ کے میئر پیس کو آپ کے بالوں کے ساتھ اٹیچڈ کر کے فکس کر دوں؟'' بیوٹیشن نے پوچھا۔

''ایسے فکسڈ کیجیے کہ مجھے بار بار لگانے نہ پڑیں آپ کو تو پتہ ہے شادی میں کتنے سارے فنکشنز ہوتے ہیں۔'' سندیہا نے کہا۔

''او کے میم! میں انہیں فکسڈ کر رہی ہوں جب آپ کو نکالنے ہوں آپ سیلون آجایئے گا اس انجیکٹ کا ڈیوریشن تھری ویک ہے۔'' بیوٹیشن نے بتایا اور پھر بالوں کو سندیہا کے سر کے بالوں سے اٹیچڈ کر دیا سندیہا نے تیار ہو کر اپنا جائزہ لیا بال بالکل رئیل لگ رہے تھے۔ ''گڈ!'' سندیہا نے بیوٹیشن کی تعریف کی اور گھر جانے کے لئے گاڑی میں بیٹھ گئی۔

نکسیت شروع ہو گیا تھا سب لوگ انجوائے کر رہے تھے فضا میں قہقہوں اور گفتگو کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں لڑکے اور لڑکیاں خوب انجوائے کر رہے تھے سندیہا کو اسٹیج پر لا کر بیٹھا دیا گیا اور رسمیں شروع ہو گئیں۔

سندیہا کو اپنے سر کے پچھلے حصے میں سنسناہٹ سی محسوس ہوئی مگر اس نے زیادہ دھیان نہ دیا پھر گانے کا دور چل پڑا دونوں طرف لڑکوں کی ٹیم اور لڑکیوں کی ٹیم میں کانٹے دار مقابلہ ہو رہا تھا کوئی بار ماننے کو تیار نہ تھا پھر بڑوں نے آ کر کھانے کا کہہ کر مقابلہ ختم کروایا ورنہ اسی میں پوری رات بیت جاتی مہمان کھانے میں مصروف تھے۔

اسٹیج پر بیٹھی سندیہا کے سر میں ہلکا ہلکا درد ہونے لگا اس نے شروتی کو اشارے سے بلایا پھر اس نے شروتی کے کان میں کہا تو وہ فکر مند ہو گئی اور بولی۔ ''پہلے میں تمہارے لئے کھانا لاتی ہوں پھر پین کلرز دیتی ہوں۔''

سندیہا نے اقرار میں گردن ہلائی شروتی پلیٹ میں کھانا لے آئی اور اسے کھلانے لگی۔ سندیہا نے تھوڑا سا ہی کھایا پھر شروتی نے اسے پین کلرز دے دیں۔ برابر میں بیٹھے ہرش نے موقع دیکھ کر سندیہا کی تعریف کرنے میں دیر نہ لگائی سندیہا چوڑی دار فراک میں بہت سندر لگ رہی تھی سب نے اسے اس طرح کے پہناوے میں آج ہی دیکھا تھا اس کے لگائے لمبے بال چٹیا کی شکل میں آگے ایک طرف پڑے تھے جن میں موتیا کی کلیاں لگی ہوئی تھیں درد تو وقتی طور پر کم ہو گیا تھا مگر سندیہا اپنے آپ کو لیزی فیل کر رہی تھی۔

تقریباً آدھی رات کو ختم ہوئی ہرش اور اس کے گھر والے چلے گئے۔ سندیہا اپنے کمرے میں آ کر دھم سے بیڈ پر گر گئی اس میں کپڑے چینج کرنے کی بھی ہمت نہیں ہو رہی تھی سادھنا جی اس کو دیکھنے آئیں تو سندیہا ایسے ہی لیٹی ہوئی تھی۔ ''بیٹا! چینج نہیں کیا؟'' انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''مام! ہمت نہیں ہو رہی، تھک گئی ہوں بہت۔'' اس نے کہا تو سادھنا جی اس کے گہنے اتارنے لگیں پھر اس کے کپڑے الماری سے نکال کر بیڈ پر ہی رکھ دیئے اور چینج کرنے کا کہہ کر چلی گئیں۔ سندیہا نے بڑی مشکل سے ہمت جمع کر کے کپڑے چینج کئے اگر وہ بھاری کامدار کپڑے نہ ہوتے تو وہ انہی میں سو جاتی کپڑے چینج کر کے وہ بستر پر گر گئی اس کا سر بے انتہا بھاری ہو رہا تھا۔

ناشتے کی میز پر سادھنا جی اور سنیل گپتا باتیں کر رہے تھے سندیہا بوجھل انداز میں چلتی ہوئی آئی اور کرسی پر بیٹھ کر ٹیک لگا لیا۔

''تھکن اتری نہیں بیٹا؟'' سادھنا جی نے اس سے پوچھا۔

''نو مام!'' سندیہا نے آنکھیں بند کئے ہوئے جواب دیا۔

''بیٹا یہ کونیٹری نہیں کہ ایک سائن کرنے سے شادی ہو جائے یہ انڈیا ہے یہاں قدم قدم پر رسمیں ہوں گی جن سے تم دامن بچا نہ سکو گی اب یو کے کی فاسٹ اور شارٹ انداز کو بھول کر یہاں کی عادت ڈالو۔'' سنیل گپتا نے ہنستے ہوئے کہا تو سندیہا بھی مسکرا دی۔

''لو بیٹا! یہ آلو کا پراٹھا کھاؤ۔ اچھی طرح ناشتہ کرو۔'' سادھنا نے سندیہا کی طرف پلیٹ بڑھاتے ہوئے کہا سندیہا نے صحیح بیٹھتے ہوئے اپنی پلیٹ لی اور پراٹھا توڑ کر نوالہ منہ میں رکھ کر چبانے لگی ناشتہ ختم کر کے وہ اپنے روم میں آئی اور ملازمہ سے کہہ کر اپنی چیزیں اٹھوانے لگی جو رات اس نے ایسے ہی چھوڑ دیں تھیں۔

سندیہا الماری کے پاس کھڑی تھی ایک دم اسے بہت زوردار چکر آئے اور وہ الماری کا دروازہ پکڑے پکڑے نیچے جا پڑی۔ ملازمہ نے دوڑ کر سندیہا کو اٹھایا مگر اسے برابر چکر آ رہے تھے ملازمہ نے شور مچا کر سادھنا جی کو بلایا تو ان کے ساتھ سنیل گپتا بھی آ گئے سندیہا کو دیکھ کر دونوں پریشان ہو گئے۔ سنیل گپتا نے فوراً ٹیکسی کر اگروال کو کال کی تو انہوں نے ڈاکٹر گھر بھجوانے کا رات کو سندیہا کی بار بار تھی تھوڑی دیر میں ڈاکٹر صاحب آ گئے انہوں نے سندیہا کا بلڈ پریشر چیک کیا اور بولے۔ ''ان کا بلڈ پریشر بہت لو ہے۔'' پھر انہوں نے سندیہا کو انجکشن لگایا اور کھانے پینے کا کہا۔

انجکشن لگا کر سندیہا کو تھوڑا بہتر محسوس ہونے لگا سادھنا جی نے اسے آرام کرنے کا کہا اور ہر دو گھنٹے کے بعد وہ سندیہا کے لئے فروٹس، جوس اور ٹنس بھیجتی رہیں شام تک سندیہا بالکل ٹھیک ہو گئی اور سادھنا جی کے ساتھ پارلر چلی گئی۔

شادی کا منڈپ سج چکا تھا، سندیہا بھی پارلر سے آ چکی تھی دلہن کے جوڑے میں بہت سندر لگ رہی تھی اس کا جوڑا تھا بھی بہت اچھا وہ بھی کچھ کم نہیں لگ رہا تھا۔ سب دونوں کی جوڑی کی تعریفیں کر رہے تھے پھیرے ہو گئے سندیہا کی مانگ میں ہرش نے سیندور لگایا اور دونوں پتی پتنی کے اٹوٹ بندھن میں بندھ گئے سب لوگ دونوں کو آشیر باد دے رہے تھے۔

سندیہا کے سر میں پھر ہلکا ہلکا درد شروع ہو گیا تھا وہ آشا دیوی سے کہہ کر سجے ہوئے اسٹیج پر بیٹھ گئی ہرش اس کے برابر میں بیٹھا ہوا تھا موقع دیکھ کر وہ سندیہا کے قریب ہوا اور اس کے کان میں سرگوشی کر دی کہ ''سندیہا تم لمبے بالوں میں اور بھی زیادہ سندر لگ رہی ہو!'' تو سندیہا نے شرما کر کہا۔

''آپ کو لمبے بال پسند ہیں تو میں اپنے بال بڑھا لوں گی۔''

جب رسمیں ختم ہو گئیں تو بدھائی کا سے آ گیا سندیہا روتے ہوئے اپنے ماتا پتا کے گلے لگ گئی سنیل گپتا نے اس کو روتے ہوئے گاڑی میں بیٹھا دیا۔ گاڑی تک آتے آتے بھی سندیہا کو چکر آ رہے تھے مگر وہ گاڑی کا گیٹ تھامے اندر بیٹھ گئی، اس وقت اسے صرف ماتا پتا سے دور ہونے کا غم تھا ہرش اس کے برابر آ کر بیٹھ گیا گاڑی چلی تو سندیہا نے سیٹ سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔

''مت روسندیہا!'' ہرش نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھامتے ہوئے کہا۔ گاڑی سفر مکمل کر کے اگروال ہاؤس کے سامنے رک گئی۔

''سندیہا! گھر آ گیا۔'' ہرش نے کہا تو اس نے آنکھیں کھول دیں۔ آشا دیوی اور شروتی ان دونوں سے پہلے ہی گھر کے لئے نکل گئی تھیں تاکہ دلہن کا سواگت کر سکیں جب سندیہا گاڑی سے نیچے اتری تو ایک دم لہرا گئی، آشا دیوی اور شروتی اور باقی لوگ اس کے سواگت کے لئے کھڑے تھے۔

سندیہا نے ایک قدم بڑھایا تو دوبارہ لہرا گئی ہرش نے جلدی سے آگے بڑھ کر اسے تھام لیا۔

''لو بھئی! ہرش بھیا تو گئے کام سے، ان کی ڈیوٹی تو بھابھی نے ابھی سے لگا دی۔'' شروتی کی بات پر بے اختیار سندیہا کی ہنسی چھوٹ گئی۔

''ہرے بھئی شروتی! ہماری سندیہا بھابھی اتنی نازک سی ہیں اور لہنگا تم نے دس کلو وزن کے کام والا لے لیا بھئی یہ تو ظلم ہے۔'' شروتی کے پتی سمیت نے انہیں چھیڑا۔

''سمیت چڈا کی کوئی بات نہیں ہے بھابھی نے ڈیوٹی تو لگا دی ہے بھیا کی، وہ اٹھا کر لے جائیں گے۔''

شروتی بولی سب زور سے ہنسنے لگے۔

"تم دونوں سے تو میں بعد میں نمٹوں گا۔" ہرش نے مسکراتے ہوئے کہا سندیہا دھیرے دھیرے چلتی ہوئی گھر کی دہلیز تک آئی وہ بہت مشکل سے اپنے آپ کو سنبھال رہی تھی اس نے سوچا اتنے سارے لوگوں کے سامنے تماشہ نہ بن جائے مگر اس کا ضبط ٹوٹ گیا گھر پر دیش کی رسم کے لئے آشا دیوی دلہا دلہن کی آرتی اتار رہی تھیں۔

سندیہا ایک دم لہرائی اور اپنا توازن برقرار نہ رکھ پائی، وہ تو گری ساتھ اس کا ہاتھ آشا دیوی کے ہاتھوں میں تھامی ہوئی تھالی پر پڑا تو تھالی بھی نیچے جا پڑی سب زمین پر بکھر گیا اس پل سب ساکت رہ گئے ہرش نے سندیہا کا سر اپنی گود میں رکھا، شروتی ساڑھی سنبھالتی پانی لینے دوڑی جبکہ آشا دیوی کی نگاہیں گری ہوئی تھال پر تھیں جو کہ بہت بڑا "اپشگن" تھا۔

شروتی نے سندیہا کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے تو اس نے اپنی آنکھیں کھول دیں، ہرش سندیہا کو اٹھا کر کمرے میں لے آیا اور اسے بیڈ پر لٹا دیا، سب اس کے کمرے میں جمع تھے سندیہا کو شرمندگی محسوس ہو رہی تھی جس کا اسے ڈر تھا وہی ہو گیا تھا۔

شیکھر اگروال کے کہنے پر ہرش نے ڈاکٹر منجے کوکال کی جنہوں نے صبح ہی سندیہا کو چیک کیا تھا وہ فوراً یہاں آ گئے انہوں نے سندیہا کو چیک کیا تو اس کا "بلڈ پریشر بہت زیادہ لو تھا۔" انہوں نے سندیہا کو دوبارہ انجکشن لگا دیا۔ "سندیہا بیٹا! یہ سب آپ کے ساتھ پہلے ہوا ہے؟ کیا آپ کوئی میڈیسن لیتی تھیں اور اب وہ چھوڑ دی ہو؟" ڈاکٹر منجے نے سوال کئے۔

"نو! ڈاکٹر، مجھے ایسا کبھی نہیں ہوا، بس دو روز سے یہ سب ہو رہا ہے اور نہ ہی میں نے کبھی کسی چیز کی کوئی میڈیسن لی ہے۔" سندیہا نے بتایا۔

ڈاکٹر نے کچھ ٹیسٹ لکھ کر ہرش کو دیئے اور کہا۔ "یہ کروائیں تو پتہ چلے گا کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے۔"

سندیہا نے سنیل گپتا اور سادھنا جی کو بتانے سے منع کر دیا کیونکہ وہ پہلے ہی بیٹی کی جدائی میں غم زدہ ہوں گے۔

سادھنا بیگم اور سنیل گپتا ناشتے کے ساتھ سندیہا سے ملنے اگروال ہاؤس پہنچ چکے تھے سندیہا کی طبیعت بوجھل ہو رہی تھی اس کے سر میں کچھ ہو رہا تھا جو وہ اپنے لفظوں میں بیان نہیں کر پا رہی تھی مگر اس نے اپنے ماتا پتا کے سامنے خود کو نارمل رکھا۔ وہ دونوں اسے دیکھ کر خوش ہو رہے تھے۔ "سندیہا بیٹا! لو یہ شیک پی لو۔" آشا دیوی نے گلاس اس کی اور بڑھاتے ہوئے کہا تو اس نے شکریہ کے ساتھ لے لیا۔

ہرش اس کے برابر بیٹھا ناشتہ کر رہا تھا۔ "بیٹا آپ چلیں گے ہمارے ساتھ؟" سنیل گپتا نے ہرش اور سندیہا کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ "تو ہرش رک کر بولا۔ "انکل! اف یو ڈونٹ مائنڈ؟ میں سندیہا کو دوپہر میں چھوڑ دوں گا ابھی میرے کچھ فرینڈز آئیں گے ملنے۔"

"کوئی بات نہیں بیٹا! جیسے آپ دونوں کو ایزی لگے۔" انہوں نے کہا اور پھر کچھ دیر میں وہ لوگ چلے گئے۔

دراصل ہرش سندیہا کو ٹیسٹ کروانے لے جا رہا تھا سندیہا نے ٹیسٹ کروائے اور سیمپل دے دیئے رپورٹس شام تک ملنی تھی ہرش نے سندیہا کو اس کے ماتا پتا کے گھر چھوڑ دیا شام کو اس نے سندیہا کی رپورٹس لیب سے کلیکٹ کی اور سیدھا منجے شرما کے پاس لے گیا منجے شرما نے تمام رپورٹس دیکھ کر ہرش سے کہا۔ "ہرش چنتا کی کوئی بھی بات نہیں ہے، تمام رپورٹس کلیئر ہیں بس سندیہا میں خون کی کمی ہے، میں دوا لکھ رہا ہوں تم یہ شروع کروا دو سندیہا ٹھیک ہو جائے گی۔" منجے شرما کی بات سن کر ہرش کی چنتا ختم ہو گئی، ہرش وہاں سے سندیہا کے گھر گیا اور ڈنر کر کے دونوں گھر آ گئے، سب سندیہا کی رپورٹس دیکھ کر مطمئن ہو گئے۔

سندیہا نے اپنا ریسپشن ڈنر کی تاریخ تھوڑی آگے کروا دی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ دوا کھا کر تھوڑا فٹ ہو جائے تو پھر وہ بھی انجوائے کر سکے گی، شادی کے پانچ روز بعد ان کا ڈنر تھا جو کہ اب آگے بڑھا دیا گیا تھا۔

تین روز گزرے سندیہا نے صبح بستر سے اٹھنے کی کوشش کی تو اس سے اٹھا ہی نہیں گیا، ہرش نے سندیہا کو اٹھا کر بیڈ سے ٹیک لگا کر بیٹھا دیا وہ سندیہا کو دیکھ کر چونک گیا اس کا رنگ ہلدی کی مانند پیلا ہو رہا تھا آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے بھی ہو رہے تھے سندیہا برابر اپنی میڈیسن لے رہی تھی مگر پھر بھی اس کی یہ حالت ہونا سب کو چنتا میں ڈال رہا تھا۔

ڈاکٹر کی ہدایت پر سندیہا کو بلڈ چڑھایا گیا جس سے سندیہا نارمل ہونے لگی وہ اب دیکھنے میں بھی صحیح لگ رہی تھی چہرے پر سرخی بھی آ گئی تھی دو دن بعد ریسپشن ڈنر تھا جو پہلے آگے بڑھا دیا گیا تھا ہر کوئی اس کی تیاری کر رہا تھا سندیہا خود بھی بہت ایکسائیٹڈ تھی کیونکہ وہ پہلی بار ساڑھی پہننے والی تھی۔

اس روز سندیہا بہت سندر لگ رہی تھی سی گرین کلر کی ساڑھی جس پر مکیش کا باریک کام بنا ہوا تھا اس نے لمبے بالوں کو کھول رکھا تھا اس نے تیار ہو کر آئینے میں اپنا جائزہ لیا آئینہ دیکھتے دیکھتے وہ رک گئی۔

جب بیوٹیشن نے اس کے بال لگائے تھے وہ گھٹنوں کو چھو رہے تھے مگر اب بال گھٹنوں سے بھی تقریباً دو انچ نیچے تھے پھر اس نے سوچا شاید اتنے دن گزرنے پر وہ لوز ہو کر نیچے ہو گئے ہیں پھر وہ تیار ہو کر سب کے ساتھ آ گئی، ڈنر بہت شاندار اور بڑے پیمانے پر تھا سب لوگ سندیہا کو فریش دیکھ کر خوش ہو رہے تھے نکھرتی ہوئی رنگت، دمکتا چہرہ اور سندیہا کی مسکراہٹ سادھنا اور سنیل گپتا بھگوان کا شکر ادا کر رہے تھے بعد میں ہرش نے انہیں سندیہا میں خون کی کمی کا بتا دیا تھا، سندیہا نے اپنی طبیعت کی وجہ سے اپنے جیون کے سب سے اہم دنوں میں خوشیوں سے دور رہ کر سب بتایا تھا مگر اب سب صحیح تھا۔

☆.....☆.....☆

سندیہا سو رہی تھی ایک دم اس کے دل کی دھڑکن بے ترتیب ہونے لگی وہ نیند میں سر ادھر ادھر کرنے لگی اس کے سر میں اچانک تکلیف ہونے لگی جس سے اس کی آنکھ کھل گئی۔

"ہر ہرش!" وہ بمشکل بول پائی۔

ہرش کی آنکھ اس کی آواز پر کھل گئی سندیہا نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام رکھا تھا ہرش نے گلاس میں پانی ڈالا اور سندیہا کے ہونٹوں سے لگایا پانی پی کر سندیہا بیڈ سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی اس کے سر میں دھماکے ہو رہے تھے۔ "سندیہا! تم میڈیسن تو لے رہی ہو نا؟" ہرش نے سوال کیا۔

"جی ہرش! میں برابر دوا لے رہی ہوں۔" سندیہا نے سر پکڑے ہوئے کہا۔

"تم یہ پین کلر لے لو! شاید سر میں درد کم ہو جائے۔" ہرش نے اسے گولی دیتے ہوئے کہا اس وقت رات کے ساڑھے تین بج رہے تھے۔ "یو نو سندیہا! میں سوچ رہا ہوں کہ تمہیں تھوڑے سے کے لئے یو کے لے چلوں جب سے تم یہاں آئی ہو بیمار پڑ گئی ہو۔" ہرش بولا تو سندیہا سر ہلا کر رہ گئی اسے چین نہیں آ رہا تھا۔

سندیہا کے ہاتھ چھلنی ہو گئے تھے کون سا ایسا ٹیسٹ تھا جو اس کا نہ ہوا ہو، بڑے سے بڑے ڈاکٹرز نے اسے دیکھا مگر سوائے "خون کی کمی" کے کچھ نہ تھا مگر اس عرصے میں سندیہا کو کافی خون چڑھ چکا تھا مگر خون کی کمی تھی کہ پوری نہ ہو پا رہی تھی، سندیہا کا باڈی فنکشن بالکل ٹھیک کام کر رہا تھا اس کے جسم میں نیا خون بھی بن رہا تھا تو پھر آخر ایسا کیوں ہو رہا تھا؟ اس کا جواب کسی بھی ڈاکٹر کے پاس نہ تھا۔

چند روز بعد اچانک سندیہا کی طبیعت بہت بگڑ گئی اس کو اسپتال میں ایڈمٹ کر لیا گیا اس کے بلڈ کی پریشر مرنے کی حد تک نیچے آ گئی تھی اسے فوراً بلڈ چڑھا دیا گیا سادھنا اور سنیل گپتا سکتے کی حالت میں تھے پھر ان سب چاروں بھی جا رہے تھے ان کے ٹیسٹس کنفرم ہو گئے تھے۔

سندیہا لیٹی ہوئی تھی اسے دیکھ کر ہرش کو خوف آ رہا تھا وہ بالکل ڈھانچہ بن گئی تھی سفید ہونٹ، آنکھوں کے گرد گڑھے اور پیلی رنگت اس کا ایک ہاتھ ہر وقت سر کے پچھلے حصے میں رکھا ہوتا، سندیہا کو سر میں ہر لمحہ زلزلہ سا محسوس ہوتا تھا اس کے سر سے پیر تک ٹیسٹ

ہو چکے تھے مگر رپورٹس میں کچھ نہیں آتا تھا، ہرش سندیہا کے پاس آیا اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر بولا۔ ''چپ کیوں ہو جان! دیکھنا کونیٹری کی آب وہوا سے تم اچھی ہو جاؤ گی وہاں تمہارے فرینڈز بھی ہیں جن سے تم ملوگی تو اچھا لگے گا تمہیں۔''

''ہرش! میں ٹھیک تو ہو جاؤں گی ؟'' سندیہا نے بے چارگی سے کہا اس کے انداز میں جانے کیا تھا کہ ہرش کا دل رو پڑا اسے سندیہا پر ترس آ رہا تھا۔

''آف کورس ڈارلنگ !تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ گی، وہاں ایک سے ایک ڈاکٹرز ہیں یہاں کسی کی سمجھ نہیں آ رہا، تم دیکھنا وہاں جا کر تم پہلے کی طرح ہو جاؤ گی۔'' ہرش نے اس کا ہاتھ تھامے ہوئے کہا اس کی نگاہیں نیچی تھیں کیونکہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ سندیہا اس کی آنکھوں کی نمی دیکھ کر ہمت ہار جائے اس وقت اسے ہرش کی ضرورت تھی۔

''بھگوان کرے جو تم کہہ رہے ہو ویسا ہی ہو مگر ہرش جانے میرے سر میں کچھ ہو رہا ہے جو کہ ان ڈاکٹرز کو نظر نہیں آ رہا ہے، میری بات کا یقین ہے ناں تمہیں؟'' سندیہا بولی۔

''سندیہا! مائی سوئیٹ ہارٹ مجھے تمہارے ہر لفظ پر یقین ہے اب ہم باہر جا رہے ہیں ناں، وہاں جا کر ڈاکٹرز سے ڈسکس کر لیں گے اوکے؟'' ہرش نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''ہرش !میرے کارن تمہارے جیون سے خوشیاں چلی گئیں اس سے تو بہتر تھا تم کسی اور سے شادی کر لیتے۔'' سندیہا نے روتے ہوئے کہا۔

''سندیہا اسٹاپ اٹ میں نے تم سے شادی خود کی ہے۔ تم سے بہتر میری جیون ساتھی اور کوئی ہو ہی نہیں سکتی سمجھیں تم۔'' ہرش نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے جذباتی انداز سے کہا۔

''ہرش! اگر میری مرتیو ہو جائے تو تم پلیز! مام ڈیڈ کا خیال رکھنا۔'' سندیہا کے اس جملے سے ہرش کو غصہ آ گیا۔

''شٹ اپ !سندیہا بند کرو اپنی یہ فضول باتیں اور میرا دماغ خراب مت کرو، میں پہلے ہی بہت پریشان ہوں تمہاری طبیعت کو لے کر۔''

''اوکے بابا! آئی ایم سوری، اب نہیں کروں گی ایسی باتیں اور نہ تمہیں کبھی تنگ کروں گی۔'' سندیہا نے کہا اور لمبی سانس لے کر آنکھیں موندھ لیں۔

''سندیہا اٹھ جاؤ! تم بھی کیا یاد کرو گی کہ تمہارے پتی دیو تمہارے لئے اپنے ہاتھوں سے ناشتہ بنا کر لائے ہیں۔'' ہرش ٹرالی لے کر کمرے میں داخل ہو کر بولا۔

مگر سندیہا نے آنکھیں نہیں کھولیں۔ ''اٹھ جاؤ سندیہا! دس بج رہے ہیں بھول گئیں کیا؟ آج کے ٹکٹس ہیں جانے کے، دو تین چیزیں اب بھی ہیں پیک کرنے کی تم جلدی سے ناشتہ کر لو تو میں وہ نمٹا دوں۔'' ہرش نے بیڈ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

مگر سندیہا سوتی رہی۔ ''یار! تمہاری دواؤں میں نیند بھی تو ہوتی ہے مگر آج تو تمہیں جانا ہے اس لئے اٹھو اب۔'' ہرش نے ہاتھ بڑھا کر سندیہا کا ہاتھ تھاما...... سندیہا کا ہاتھ برف کی مانند یخ ہو رہا تھا ہرش چونک گیا سندیہا اس نے آواز دی مگر سندیہا بے سدھ پڑی رہی۔

ہرش نے اپنا سر سندیہا کے سینے پر رکھ کر اس کی دھڑکن سنی مگر، وہاں بالکل سناٹا تھا ''سندیہا!'' وہ اتنی زور سے چیخا کہ آواز آکاش تک پہنچ جائے اس کی آواز سن کر شیکھر اور آشا دوڑتے ہوئے آ گئے۔

''کیا ہوا ہرش؟'' شیکھر اگروال بولے۔

''س س سندیہا!'' اس نے صرف اتنا کہا۔ آشا دیوی نے آگے بڑھ کر سندیہا کو آواز دی پھر اسے جھنجھوڑا اگر وہ ہوتی تو رسپانس دیتی! شیکھر اگروال نے فوراً ڈاکٹر سنجے کو کال کی وہ بھی پہنچ گئے انہوں نے سندیہا کی نبض چیک کی آنکھوں کو دیکھا اور افسوس سے سر جھکا لیا۔ ''شیکھر! سندیہا بیٹا اب ہم میں نہیں رہی۔''

''مگر کیسے ڈاکٹر؟ رات ہی تو ہماری تفصیل سے بات ہوئی ہے، سندیہا بالکل ٹھیک بات کر رہی تھی۔'' ہرش روتے ہوئے بولا۔

''بیٹا! سندیہا کو گزرے کئی گھنٹے گزر چکے ہیں بلکہ میرا خیال ہے تمہاری بات چیت کے کچھ سمے بعد ہی......'' ڈاکٹر سنجے نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

شیکھر اگروال نے شروتی اور سمیت کو کال کی وہ دونوں دوڑے چلے آئے۔ ان لوگوں کی ہمت نہیں ہو رہی تھی سادھنا اور سنیل کو یہ خبر سنانے کی پھر سمیت نے ہمت کر کے ان دونوں کو کال کی ان کے تو قدموں تلے سے زمین ہی کھینچ لی تھی سمیت کی بات سن کر سادھنا بیگم ننگے پیر چلی آئیں دوڑتی ہوئی وہ پاگلوں کی طرح چیخ رہی تھیں۔ ''سندیہا! سندیہا!'' ان کی حالت دیکھ کر سب رو پڑے وہ سندیہا! کو جھنجھوڑ رہی تھیں۔ ''سندیہا اٹھو! میری جان دیکھو مام آئیں ہیں۔'' آشا دیوی نے انہیں شانوں سے پکڑ کر اٹھایا تو وہ بولیں۔

''دیکھئے ناں بھابھی سندیہا اٹھ نہیں رہی ہے آپ کہیں آپ کی بات ضرور مانے گی۔'' آشا دیوی نے کھینچ کر انہیں گلے لگا لیا اور دھاڑیں مار کر رونے لگیں شیکھر اور سمیت، سنیل اور ہرش کو سنبھال رہے تھے۔ ''یہ سب کیا ہوا؟ کیسے ہوا؟'' کسی کو سمجھ نہیں آ رہا تھا سب لوگ شاکڈ تھے۔

سندیہا کی ارتھی تیار کی جا رہی تھی، سندیہا کو ابھی سہاگن کی طرح سجا تھا مگر اپنے انتم سفر پر جانے کے لئے شروتی کمرے میں آئی اسے سندیہا کو اشنان کروانا تھا اس نے سندیہا کا سر اپنے ہاتھوں میں تھاما ہوا تھا اس نے سندیہا کو اٹھانا چاہا تو اس کے لمبے بال آگے جھول گئے۔ ''اوہ! یہ تو نکالے ہی نہیں۔'' شروتی کو انہیں دیکھ کر خیال آیا ورنہ تو خود سندیہا کا دھیان اس طرف نہیں گیا تھا۔ اس کی طبیعت سنبھل ہی نہ پا رہی تھی جو وہ اس طرف دھیان دیتی۔ شروتی کے ساتھ آشا دیوی بھی تھیں انہوں نے سندیہا کو پکڑا اور شروتی نے سندیہا کے بالوں کو پکڑا تا کہ ان سے نقلی بال الگ کر سکے اس نے بالوں کی تہہ کھول کر دیکھی تو دھک سے رہ گئی اس کی لمحہ بھر میں جیسے جان نکل گئی اس کے جسم میں سنسناہٹ ہونے لگی۔ ''سندیہا کے اپنے بالوں میں جڑے مصنوعی بالوں میں سے کچھ پیچھے سر کی طرف جا رہے تھے اور ان کے سرے خون کی رگوں کی مانند سرخ ہو رہے تھے اور پھول کر کافی موٹے ہو رہے تھے کہ سندیہا کی کھوپڑی میں پیوست تھے۔ اس جگہ سے سندیہا کی کھوپڑی اس کے اپنے بالوں سے عاری ہو چکی تھی۔

خون بھرے بال یا رگیں کھوپڑی میں پیوست ہونے کی وجہ سے سندیہا کی کھوپڑی جگہ جگہ سے چٹخی ہوئی تھی دراڑیں اتنی کھلی ہوئی تھیں کہ سندیہا کا داغ نظر آ رہا تھا۔'' شروتی نے جھٹ بال واپس چھوڑ دیئے اور سندیہا کا سر واپس نیچے رکھ دیا۔

''کیا ہوا شروتی؟'' آشا دیوی بولیں مگر شروتی اپنی جگہ سن ہو رہی تھی۔ ''یہ کیا ہے؟'' اس کی سمجھ نہیں آ رہا تھا آشا دیوی نے اسے ہلایا تو وہ چونکی۔ ''ماں! پاپا! ہرش، سمیت سنیل انکل اور آنٹی سب کو بلائیں ترنت!''

شروتی نے خوف زدہ انداز میں کہا تو آشا دیوی حیران نظروں سے اسے دیکھتی باہر کی اور دوڑ پڑیں۔ پھر ان کے ساتھ سب کمرے میں داخل ہوئے۔ ''کیا ہوا شروتی؟'' ہرش بولا۔

شروتی نے سب کو سندیہا کا سر دکھایا تو سب اپنی اپنی جگہ جیسے جم سے گئے۔

''کہا تھا مجھ سے سندیہا نے کہ ہرش میرے سر میں کچھ ہو رہا ہے اور ہم ٹیسٹوں کے چکر میں پڑے رہے، ایک مرتبہ بھی اس کے سر میں نہیں دیکھا۔'' ہرش دوبارہ رونے لگا۔

''انکل مجھے تو یہ کوئی اور ہی چکر لگ رہا ہے۔'' سمیت بولا۔

''کیا مطلب بیٹا؟'' سنیل گپتا بولے۔

''ٹھہریئے میں ایک آدمی کو جانتا ہوں اسے بلاتے ہیں تو پتہ چل جائے گا کہ آخر معاملہ کیا ہے؟''

سمیت بولا اور وہاں سے چلا گیا۔

وہ شخص کمرے میں آیا ننگے پیر اس کا انداز عام آدمیوں سے ذرا مختلف تھا گلے میں مالا، ماتھے پر تلک اور لمبی چوٹی، اس نے سندیہا کے بالوں کو صرف چھوا اور چونک کر پیچھے ہٹ گیا اور بولا۔ ''جتنی جلدی ممکن ہو اس بچی کا انتم سنسکار کردو!''

''مگر بات کیا ہے؟ کیا ہوا میری پتنی کے ساتھ ؟'' ہرش بولا۔

وہ اس کی بات سن کر بولا۔ ''ڈائن کے بالوں نے مارا ہے تیری پتنی کو!'' اس آدمی کی بات سن کر سب ہکا بکا رہ گئے۔

شروتی کی نگاہ سندیہا کے مصنوعی بالوں پر گئی تو وہ چونک گئی، جب اس نے وہ بال لئے تھے تو وہ گھٹنوں تک آرہے تھے مگر وہ اب بستر پر پھیلے سندیہا کے گھٹنوں سے نیچے جارہے تھے۔

''ڈائن کے بال؟'' شیکھر اگروال بولے۔

''ہاں! اس بچی کے سر میں ڈائن کے بال ہیں، ڈائن کی ساری شکتی اس کے بالوں میں ہوتی ہے یہ بال زندہ ڈائن کے جسم سے الگ کئے گئے ہیں تو یہ اس سمے سے زندہ ہیں اور اس بچی کے خون سے اپنی پیاس بجھا کر ابھی تک جیوت ہیں اسی کارن اس بچی کی مرتیو ہوئی ہے۔'' اس آدمی نے کہا تو سب کو سانپ سونگھ گیا جب ہی تو سندیہا میں مسلسل خون کی کمی ہو رہی تھی اس کا سارا خون ڈائن کے بال چوس رہے تھے۔

وہ آدمی رک کر پھر بولا۔ ''ان بالوں کو ترنت نشٹ کرنا ہوگا ورنہ یہ کسی اور کو اپنا شکار بنالیں گے، آپ کی بچی کے جسم سے آخری خون کا قطرہ چوس کر یہ خود بخود اس کے سر سے الگ ہوجائیں گے۔''

''ان بالوں کو تو نشٹ کرنا ہی ہوگا ساتھ ان ہیر پیس والوں کو بھی قانون کی گرفت میں لانا ہوگا تاکہ ہماری طرح کسی اور کی بچی اپنی جان نہ دے دے۔'' شیکھر اگروال نے کہا۔ ''جو آپ کو اوچت لگے آپ کیجیے۔'' سنیل گپتا بولے۔

اس آدمی نے اپنے کاندھے پر لٹکے تھیلے سے ایک دھاگہ نکالا اور پھر شروتی سے بولا۔ ''اس دھاگے کو بچی کے اپنے بال اور ڈائن کے بالوں کو ملا کر گانٹھ باندھ دو!'' شروتی نے اس کی ہدایت کے مطابق ایسا ہی کیا۔

''یہ دھاگہ کس لئے ہے؟'' آشا دیوی نے پوچھا۔

''یہ پوتر اور شکتی شالی دھاگہ ہے اس دھاگے کی شکتی ان بالوں کو بچی کے شریر سے الگ نہ ہونے دے گی۔'' اس آدمی نے بتایا۔

پھر سندیہا کی ارتھی تیار کرکے اسے شمشان گھاٹ لے جایا گیا اور پھر سسکیوں اور آہوں کے ساتھ اس کی چتا کو اگنی دے دی گئی چتا کو اگنی ملتے ہی سندیہا کے بالوں نے لہرانا شروع کردیا وہ بار بار اوپر اٹھتے اور پھر سندیہا کے شریر پر جا گرتے ایسا لگتا کہ کوئی ان دیکھی طاقت نے انہیں کھینچا ہو، چتا جلنا شروع ہوئی سب نے اپنی ناکوں کو ہاتھ سے پکڑ لیا، فضا میں سڑے ہوئے خون کی بساند پھیل گئی تھی، چتا جلتی رہی اور پھر راکھ کا ڈھیر بن گئی۔

شیکھر اگروال نے اپنے دوست ٹی ایس پی مشرا جی سے بات کی انہوں نے اس دکان پر چھاپہ مارا اور چھان بین میں رگھو اور چندو سمیت ان کے پورے گروہ کو پکڑ لیا جن کی تلاش پہلے سے پولیس کو تھی۔

سنیل اور سادھنا واپس کو نیٹری چلے گئے، آئے تو وہ یہاں دوبارہ بسنے تھے مگر یہاں رہ کر وہ سندیہا کو یاد کرکے تکلیف میں رہتے، ہرش بھی کچھ دنوں کے لئے ان کے ساتھ چلا گیا تھا جبکہ شیکھر، آشا دیوی اور شروتی گزرے دنوں کی اچھی یادوں کے سہارے سندیہا کے بچھڑنے کے غم کو دور کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

ضمیر کی عدالت

شائستہ سحر - راولپنڈی

نوجوان نے لاکھ کوشش کی کہ اسے سکون ملے مگر سکون اب اس کی زندگی سے ختم ہوچکا تھا اور اسے جو سزا ضمیر کی عدالت میں ملی تھی وہ اس دنیا کی عدالت میں ملنے والی ہر سزا سے زیادہ بھیانک تھی کیونکہ......

کیا مرے ہوئے انسان سے باتیں کرنے والا پاگل ہوسکتا ہے، یہ تو پردہ اٹھنے کے بعد پتہ چلے گا

''آج پھر آگئے تم مجھ سے ملنے۔'' وہ خفگی بھری آواز میں بولی۔

''کیا کروں لاکھ کوشش کرتا ہوں تم سے دور رہنے کی مگر پھر پلٹ کر تمہارا ہی خیال آتا ہے، مجبور ہوجاتا ہوں تمہارے پاس آنے پر۔'' وہ اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے بولا۔ وہ کھلکھلا کر ہنسی۔

''میں نے کہا تھا ناں امتیاز! تم مجھ سے کبھی پیچھا نہیں چھڑا سکتے۔'' تو وہ بے بسی سے بولا۔

''اڑا لو میرا مذاق جتنا دل چاہتا ہے، ہنس لو مجھ پر۔'' وہ تمسخرانہ لہجے میں بولی۔

''مجھے افسوس ہوتا ہے تم پر، سب کچھ حاصل کرکے بھی تم تنہا ہو، تمہیں آج بھی میری ضرورت ہے، کاش! یہ بات تم پہلے سمجھ جاتے۔''

''مجھے معلوم تھا تمہاری بکواس شروع ہوجائے گی، کرنے لگو گی پھر گلے شکوے۔'' وہ غصے سے بولا تو وہ چپ ہوگئی۔

''چپ کیوں ہوگئی؟'' وہ اس کی خاموشی پر بے چینی سے بولا۔

''پلیز! مجھ سے ناراض مت ہوا کرو، میں پہلے ہی بہت پریشان ہوں۔''

"کوئی نئی بات نہیں، تم روز ہی پریشان ہوتے ہو۔" وہ لاپرواہی سے بولی۔

"پلیز! طنز مت کرو مجھ پر، میں تم سے اپنا دکھ شیئر کرنے آیا ہوں۔" وہ بجھے ہوئے لہجے میں بولا۔

"اچھا تو پھر بتاؤ آج کیا ہوا امتیاز احمد؟" وہ اسے مخاطب کرتے ہوئے سنجیدگی سے بولی۔

"میری بیوی مجھے بہت تنگ کرتی ہے، سمجھ نہیں آتا کہ میں کیا کروں۔" امتیاز اپنا سر پکڑ کر بولا۔

"کیوں..... تم تو بڑے چاؤ سے بیاہ کر لائے تھے اسے۔" وہ تلخی سے بولی۔

وہ اعتراف کرتے ہوئے بولا۔ "ہاں میں اس کو واقعی بہت پسند کرتا ہوں مگر مجھے کیا معلوم تھا وہ میرے ساتھ ایسا سلوک کرے گی۔"

"ایسا کیا کردی اس نے۔" وہ یکلخت بولی۔

وہ تاسف بھرے لہجے میں بولا۔ "تم کو تو بتایا ہے میں نے! اس کو میرا وجود کھٹنے لگا ہے جیسے جیسے دن گزرتے جارہے ہیں بات بے بات لڑتی ہے، کل تو اس نے حد کردی۔

کل رات جب میں آفس سے آیا تو وہ کسی آدمی کے ساتھ ڈرائنگ روم میں بیٹھی گپیں لگا رہی تھی اس بدشکل آدمی سے میں پہلے بھی مل چکا تھا، میری بیوی نے اسے اپنا کزن بتایا ہے مگر مجھے شک ہے کہ وہ اس کا کوئی پرانا دوست ہے۔

بہرحال میں نے اس شخص کی موجودگی پر اعتراض کیا تو اس نے اس شخص کے سامنے میری خوب بے عزتی کی۔"

"تم تو بڑے حاکم بنے پھرتے تھے۔ اپنی پسندیدہ عورت کے سامنے تم کیوں گیدڑ بن گئے ہو بلکہ صاف لفظوں میں یہ کیوں نہیں کہتے کہ تم اس کے غلام بن چکے ہو۔" آخر الفاظ کہتے ہوئے اس کے لہجے میں حقارت اتر آئی۔

"تم جل رہی ہو اس سے؟" وہ اس کے لہجے کی جلن محسوس کر کے بے اختیار مسکرایا۔

"تم خوش مت ہو ایسا کچھ نہیں ہے۔" وہ یوں بولی جیسے اسے برا لگا ہو۔ "ہوسکتا ہے تم صحیح کہتی ہو۔"

بہرحال اس نے اپنے کندھے اچکائے اور پھر اس کی طرف دیکھ کر بولا۔ "مجھے اس بات کا اندازہ ہو چکا ہے، اس نے مجھ سے شادی میری دولت کی وجہ سے کی ہے۔ دولت جیسے ہی اس کے ہاتھ میں آئی وہ مجھ سے بے پرواہ ہوگئی۔"

وہ چبھتے ہوئے لہجے میں بولی۔ "جو اپنے سچے چاہنے والوں کی پرواہ نہیں کرتا اس کے ساتھ وہی ہوتا ہے جو تم جھیل رہے ہو۔"

"تم مجھے طعنے دے دے کر تھکتی نہیں؟" وہ غصے سے بولا۔

"تم بھی تو نہیں تھکتے روز اپنا دکھ سنانے آجاتے ہو۔" وہ جواباً بولی۔

"وہ مجھے پاگل سمجھتی ہے۔" وہ سر جھکا کر بولا مگر اس کا لہجہ درد سے چور تھا۔ "کیوں؟" وہ فوراً بولی۔

"کیونکہ میں باتیں کرتا رہتا ہوں۔"

"کس سے؟" وہ حیرت سے بولی۔

"مردوں سے باتیں۔ وہ یہ کہتی ہے کہ میں پاگل ہوں میں مردوں سے باتیں کرتا رہتا ہوں اور وہ مجھے ماہر نفسیات کے پاس کل لے کر جانے والی ہے۔" امتیاز بھرے دکھ سے تفصیل بتاتے ہوئے بولا۔

"ٹھیک ہی تو کہتی ہے۔" وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"پتہ نہیں مجھے کس چیز کی سزا مل رہی ہے۔ میں کیسے ان حالات سے نکل پاؤں گا۔" وہ اس کی ہنسی کو نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔

"بہت آسان حل ہے اگر تم مان جاؤ تو؟"

"کیسا حل؟" وہ فوراً بولا۔ وہ دھیمے لہجے میں بولی۔

"تھانے میں جاؤ اور اعتراف کرو کہ تم نے کیسے اپنی محبت کرنے والی بیوی کو زبردستی کر مارا اور اتنی صفائی سے یہ قتل کیا کہ آج تک کسی کو تم پر شک نہیں ہوا۔"

اس نے چور نگاہوں سے آس پاس دیکھا اور پھر اس پر گویا برس پڑا۔

"تم اپنی بکواس بند کرو تم چاہتی ہو میں جیل چلا

جاؤں اور قتل کے الزام میں پھانسی چڑھ جاؤں۔"

وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔ "بار بار مرنے سے بہتر ہے تم ایک ہی بار مر جاؤ یہ سزا ہی تو ہے کہ تم آج بھی اپنی مری ہوئی بیوی کی روح سے باتیں کرتے ہو۔"

"کیا..... تم بھی وہی بکواس کررہی ہو جو میری بیوی روز کرتی ہے میرے متعلق۔" وہ اسے کھا جانے والی نظروں سے گھورتے ہوئے بولا۔

"ہاں تو وہ کچھ غلط نہیں کہتی مرے ہوئے انسان سے باتیں کرنے والا پاگل ہی تو ہوتا ہے اس لئے کہتی ہوں میری بات مان لو ورنہ یونہی اپنی مری ہوئی بیوی کی روح سے باتیں کرتے رہو گے اور ایک دن پاگل خانے پہنچ جاؤ گے۔" وہ بات ختم کرتے ہوئے بڑے زور سے ہنسی تو وہ غصے سے چیخ پڑا۔

"بکواس کرتی ہو تم میں مردوں سے باتیں نہیں کرتا اب اگر تم کچھ مزید اور کہا تو میں تمہارا گلا دبا دوں گا۔"

وہ جیسے ہی چیخا اس کی آواز اس ویران قبرستان میں گونج کر رہ گئی اس نے مشتعل نگاہوں سے اپنے سامنے موجود قبر کو دیکھا جس پر نصرت بیگم زوجہ امتیاز احمد کے نام کی تختی آویزاں تھی وہ جھٹکے سے اٹھ کر واپس پلٹ گیا جب سے نصرت بیگم مری تھی نصرت بیگم کی روح اسے جیتے جاگتے وجود میں اپنے آس پاس منڈلاتی ہوئی اور باتیں کرتی ہوئی نظر آتی تھی یہ ایسی تکلیف دہ اور اذیت ناک صورت حال تھی جس نے اس کو تقریباً حواس باختہ ہی کر دیا تھا وہ پاگلوں کی طرح کبھی گھر میں کبھی باہر تو کبھی نصرت بیگم کی قبر کے پاس بیٹھ کر باتیں کرتا رہتا تھا۔

نصرت بیگم کا قتل کر کے وہ اپنی ہوشیاری اور پیسوں سے دنیا کی عدالت سے تو بچ گیا تھا اور نصرت بیگم کی دولت پر قابض ہو کر اپنی پسند کی عورت سے شادی کر چکا تھا مگر سکون اب اس کی زندگی سے ختم ہو چکا تھا اور یہ سزا اس کی ضمیر کی عدالت میں اس کو ملی تھی جو اس دنیا کی عدالت میں ملنے والی ہر سزا سے زیادہ بھیانک اور اذیت ناک تھی۔

موت کا ذائقہ

جب وقت اجل آجاتا ہے تو نہ ایک لمحہ آگے ہوتا ہے اور نہ ایک لمحہ پیچھے چاہے دولت میں قارون، تکبر میں فرعون، ظلم میں قماک، تمرد میں نمرود، شہ زوری میں رستم، یا خوب صورتی میں یوسفؑ، صبر میں ایوبؑ، درازی عمر میں نوحؑ، بصارت میں موسیٰؑ، حکمت میں لقمان، خاموشی میں ذکریاؑ، خوش الحانی میں داؤدؑ، مصوری میں مانی، عشق میں مجنوں، ملک گیر میں سکندر، دبدبہ میں جمشید، اقبال میں اکبر، فصاحت میں سحبان، انصاف میں نوشیرواں، دانش میں ارسطو، سخاوت میں حاتم طائی، شاعری میں فردوسی، انوری اور شیخ سعدی، غذا میں محمود، جہالت میں ابوجہل، نازک دماغی میں تاناشاہ، خون ریزی میں چنگیز خاں، ہلاکو خان، دفاع عام میں شیر شاہ، اسلام میں امام غزالی، موت سے کوئی بھی چھٹکارا حاصل نہیں کرسکتا کیونکہ! "کل نفس ذائقۃ الموت"

(ایس امتیاز احمد)

دشمن روحیں

ایم اے راحت

قسط نمبر:3

ظلم و جبر کی داستان حیرت جو کہ خراماں خراماں اپنے پڑھنے والوں کے رؤیں رؤیں میں خوف کی لہر سرایت کرتی رات کے گھٹا ٹوپ پرہیبت اندھیرے میں روحوں کی دنیا میں لے جائے گی، جہاں کہ اذیت سے دو چار روحیں سبک رفتاری سے پڑھنے والوں پر سکتہ طاری کردیں گی۔

ڈر کے لبادے میں پوشیدہ ذہن سے محو نہ ہونے والی رائٹر کے زور قلم سے لکھی شاہکار کہانی

بعض اوقات بڑے انوکھے واقعات ہوتے ہیں۔ میں نے آج رات پرانی حویلی میں داخل ہونے کا فیصلہ کیا تھا اور اس کی تیاری کرتا رہا تھا۔ تیاری کیا تھی بس خود کو ہمت دلا رہا تھا کیونکہ پرانی حویلی میں گھر کے باہمت بڑے بھی کبھی داخل ہونے کی جرأت نہیں کرتے تھے۔

رات کے نو بجے تھے کہ تایا ابو کے ایک بہت گہرے دوست برقی صاحب پشاور سے آگئے۔ ان کے اہل خاندان ساتھ تھے۔ برقی صاحب لاہور جارہے تھے کہ راستے میں ان کی کار خراب ہوگئی۔ کار کو ٹھیک کراتے دن گزر گیا پھر کار ٹھیک ہوئی تو ہر طرف اندھیرا چھا گیا چنانچہ انہوں نے رات یہاں گزارنے کا فیصلہ کرلیا۔

''بن بلائے مہمان بیشک ناگوار گزرتے ہیں لیکن یہ تمہاری بھابھی تمہارے بارے میں کچھ زیادہ ہی اچھے خیالات رکھتی ہیں۔ کہنے لگیں رحمت بھائی کے بارے میں ایسی بات خواب میں بھی نہیں سوچی جاسکتی کہ وہ ہمارے آنے سے پریشان ہوجائیں گے۔''

''بھابھی ایک اعلیٰ نسب کی خاتون ہیں۔ بندوں کو سمجھتی ہیں۔'' تایا ابو نے ہنستے ہوئے کہا۔

ان کے درمیان چوٹیں چلتی رہیں لیکن میں پریشان تھا۔ برقی صاحب کے آجانے سے رت جگا ہوسکتا تھا اور حویلی میں چہل پہل ہوتی۔ اس سے میرے کام میں دشواری ہوتی۔

برقی صاحب پشاور میں رہتے تھے لیکن ان کے باقی اہل خاندان لاہور میں تھے۔ ان کی اولادیں لاہور میں پڑھتی تھیں اور وہاں ان کی شاندار کوٹھی تھی۔

انہوں نے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔'' اشرف میاں کو آگے تعلیم دلانے کے بارے میں تم نے کیا سوچا ہے، رحمت خان؟''

''انشاءاللہ یہ آگے پڑھیں گے۔'' تایا ابو نے کہا۔

''یہاں گجر گھاٹ میں۔'' برقی صاحب نے طنزیہ بولے۔

''یار میرے گھر کو اتنی حقارت سے تو نہ دیکھو۔'' تایا ابو بولے۔

''حقارت کی بات نہیں۔ معاف کرنا تم لوگ ارب پتی ہو۔ صدیوں سے یہاں رہتے ہو، تم اگر چاہتے تو یہاں تعلیم کے انتظامات بھی کرسکتے تھے اسکول، کالج بلکہ یونیورسٹی بھی قائم کرسکتے تھے، تمہارا فرض تھا لیکن افسوس تم لوگوں نے کچھ نہیں کیا۔''

''شکر ہے تم نے لوگوں کہہ دیا۔ بس ہر شخص کچھ نہ کچھ کہہ دیتا ہے ایک انسان اگر کچھ سوچ بھی لیتا تنہا کچھ نہیں کرسکتا۔'' تایا ابو نے کہا۔

''برا مت مانو۔ میں تم سے یہ بات کہہ

دیتا ہوں۔ ”ایسے ہی میرے دل میں خیال آیا تھا۔“

”تمہیں یہاں کے حالات بھی معلوم ہیں۔“

”ہاں جی۔ تم لوگوں کی سلامتی کی دعائیں کرتے رہتے ہیں۔ ویسے اشرف خان کی تعلیم لاہور میں مکمل ہوگی وہاں گھر موجود ہے، بچے موجود ہیں سب مل جل کر رہیں گے۔ یہ وہاں آرام سے پڑھیں گے۔ کیوں بھابھی جی۔“ اس بار برقی صاحب نے امی سے کہا تھا۔

”جی۔ ہاں..... میں یہی چاہتی ہوں کہ اشرف لاہور میں تعلیم حاصل کرے۔ بس، جو بھائی صاحب طے کریں گے میں کیا کہہ سکتی ہوں۔“ امی نے کہا۔

”بھابھی۔ آپ میری بھابھی ہی نہیں لگتی بہنوں جیسی ہیں۔ اگر آپ بھی لاہور آجائیں تو میری بڑی مشکل حل ہوجائے۔ وہاں آپ کے دوسرے بچے بھی پڑھتے ہیں انہیں ایک ذمہ دار بزرگ خاتون مل جائیں گی اور میں مطمئن ہوجاؤں گا۔“

”اس سے پہلے کہ زیب النساء کچھ جواب دیں، میرا بولنا ضروری ہے۔“ زیب النساء کے بڑے گھر میں موجود ہیں لیکن جو مقام ان کا ہے وہ کوئی نہیں لے سکتا۔ مرحوم عظمت خان کے بعد انہوں نے جس طرح حویلی کے ریت رواج سنبھالے ہیں ان کے علاوہ کوئی نہیں سنبھال سکتا۔ ہاں اشرف کی بات اور ہے۔ ہم نے کئی بار انہیں لاہور روانہ کرنے کے بارے میں سوچا ہے۔ ذہن میں ہاسٹل ہی آیا تھا لیکن واقعی تمہارا گھر ہے وہاں بچوں کے ساتھ رہیں گے تو ان کا بھی دل لگا رہے گا۔“

بات خاصی طویل ہوگئی تھی اس لئے میں وہاں سے اٹھ گیا۔ مجھے اپنا کام کرنا تھا کسی نے میرے اٹھنے پر اعتراض نہیں کیا تھا اور میں وقت گزرنے کا انتظار کرتا رہا۔ مجھے اندازہ تھا کہ آج حویلی میں کافی رات تک رونق رہے گی لیکن میں جو ارادہ کرچکا تھا اس میں ترمیم نہیں کرنا چاہتا تھا۔

موسم بھی آج کمال کا تھا ہلکی ہلکی رم جھم ہونے لگی تھی بادل تو سرِشام ہی سے چھائے ہوئے تھے بوندا باندی تھوڑی دیر پہلے ہی شروع ہوئی تھی۔

اس وقت رات کے گیارہ بجے تھے۔ میں کیل کانٹے سے لیس ہوکر باہر نکل آیا۔ حیرت ناک طور پر برقی صاحب بھی آرام گاہ میں سونے چلے گئے تھے اور حویلی میں گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ پرانی حویلی اپنے اندر بھیانک داستانیں سمیٹے خاموش کھڑی تھی، ہاں دور شمشان گھاٹ میں ایک چتا سے دھواں اٹھ رہا تھا غالباً کوئی تازہ مردہ جلایا گیا تھا اور اسے بھسم کرنے والے واپس جاچکے تھے۔

میں نے ایک نگاہ پرانی حویلی پر ڈالی اور مردانہ وار اس کی طرف بڑھنے لگا۔ اس حویلی سے بڑی ہولناک داستانیں جڑی ہوئی تھیں، میرے دل میں اشتیاق تھا اور میں ان داستانوں سے واقف ہونا چاہتا تھا۔

ابھی میں حویلی سے کوئی بیس گز کے فاصلے پر تھا کہ اچانک املی کے ایک درخت سے ایک پرندہ اڑا اور اس کے پروں کی تیز آواز پر میری نظریں اس کی طرف اٹھ گئیں۔ پرندہ مجھ سے کوئی پانچ گز کے فاصلے پر زمین پر اتر گیا۔ تب میں نے ایک ناقابل یقین منظر دیکھا پرندے کا حجم بڑھا اور پھر وہ ایک خوب صورت لڑکی کا روپ دھار گیا۔ سلک کے خوبصورت لبادے میں ملبوس حسین لڑکی مینکا تھی۔

”ارے۔ مینکا تم۔؟“ میرے منہ سے حیران کن آواز نکلی۔

”ہاں چھوٹے راج کمار۔ میں ہی ہوں۔“

”تم یہاں کیسے آگئیں؟“

”میں جاتی ہی کہاں ہوں چھوٹے راج کمار۔“

”کیا مطلب.....؟“

”آپ کے بنا من لگتا ہی نہیں ہے۔ تھوڑے سے دور رہوں تو جی لوٹنے لگتا ہے۔ بس دیکھ لیتی ہوں تو شانت ہوجاتی ہوں۔“

میں خاموش ہوگیا۔ اس کی باتوں کا کیا جواب دیتا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ ابھی میں حسن و عشق کے رموز سے واقف بھی نہیں ہوا تھا۔

”میری چنتامت کرنا چھوٹے مہاراج۔ میں اپنے من کی بات کھلے من سے کہہ دیتی ہوں۔ اس کا مطلب یہ

نہیں ہوتا کہ میں آپ سے آپ کا پریم مانگوں۔ ہمارے دھرم الگ ہیں، میں اگر چاہوں بھی تو آپ کا دھرم نہیں اپنا سکتی کیونکہ میں نے سات پربھو گتائیں پرگھٹ کی ہیں۔“

”سات پربھو گتائیں۔“ میں نے الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

”ہاں۔ بھوانی دیوی کا گیان استھان۔ میرے پتا جنا داس بھی بھوانی کے داس ہیں۔ بھوانی دیوی اچھے کاموں کی دیوی ہے اور صرف وہ ہے جو کالے جادو کی تمام مدھراؤں کا توڑ ہے۔ لیکن وہ جو کالی دیوی کلکتے والی سے بھینٹ لے سکتی ہے اور اس کے کرموں کا توڑ کرسکتی ہے لیکن اس کے پیروکاروں کو سات پربھو گتائیں بھوگنی ہوتی ہیں تب وہ بھوانی کا داس بن سکتا ہے اور اس کا گیان لے سکتا ہے۔“

”ان پربھو گتاؤں میں کیا کرنا ہوتا ہے؟“ میں نے دلچسپی سے پوچھا۔

”ایک بات کہوں چھوٹے مہاراج۔“

”ہاں..... بولو۔“

”آپ کو یاد ہے پتا جی نے آپ سے کیا کہا تھا۔“

”کس بارے میں مجھے یاد نہیں۔“

”جب آپ نے ان سے کہا تھا کہ آپ جادو دریا لینا چاہتے ہیں۔“

”اوہ ہاں..... انہوں نے منع کیا تھا۔“

”صرف منع نہیں کیا تھا بلکہ انہوں نے کہا تھا کہ سنسار کا سب سے بڑا گیان آپ کی بڑی کتاب میں موجود ہے۔ اس سے بڑا گیان کسی پرگھٹا میں نہیں ہے۔ کیونکہ وہ پرماتما کی کتاب ہے۔“

”اب مجھے بھی ایک بات بتاؤ مینکا۔“

”جی مہاراج۔“

”اگر تم ہماری بڑی کتاب کو اتنا مانتے ہو تو ہمارے دھرم میں کیوں نہیں آجاتے۔ مسلمان کیوں نہیں ہوجاتے۔“

”اس کا کارن ہے مہاراج۔“

”بتاؤ۔ کیا؟“

”آپ کے ہاں سنتان پیدا ہوتی ہے تو اس کے کان میں پوتر شبد کہے جاتے ہیں اور آپ کا دھرم پکا ہوجاتا ہے اس طرح ہمارے ہاں دوسرے کام کئے جاتے ہیں پنڈت اشلوک پڑھتے ہیں اور..... اور..... اور بھی کچھ ہوتا ہے اور ہمیں ہمارے دھرم کا پتہ چل جاتا ہے۔ ہمارے اور آپ کے دھرموں میں فرق رکھا جاتا ہے پنڈتوں کا یہی کام ہوتا ہے میں میرے پتا جی اور بہت سے ایسے جو دھرموں کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں گیان حاصل کرکے جانکاری حاصل کرتے ہیں دوسرے دھرموں کا پریوگ کرتے ہیں اور ہر دھرم کی برائیوں سے واقف ہوتے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم اپنا دھرم چھوڑ دیں ہمارا دھرم ہمارے لئے بہت کچھ ہے۔“

”ٹھیک..... اچھی بات ہے۔“

”پتا جی نے آپ کو جادو سکھانے سے اس لئے منع کیا تھا کہ وہ آپ کے دھرم سے الگ ہے۔“

”اس کے لئے ہندو بننا پڑتا ہے۔“

”نہیں۔ اس کے لئے بے دھرم ہونا پڑتا ہے۔ اگر کوئی مسلمان کالا جادو سیکھتا ہے تو اس کا دھرم نہ مسلمان کا رہتا ہے نہ ہندو کا وہ بے دھرم ہوجاتا ہے اسے کالے دھرم والا کہا جاتا ہے جس سے ہندو بھی نفرت کرتے ہیں۔“

”اوہ۔“

”اور کچھ پوچھیں گے چھوٹے راج کمار۔“

”نہیں! تم بہت اچھی ہو مینکا تمہارے پتا جی بھی بہت اچھے ہیں۔“

مینکا نے مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھا۔ پھر بولی۔ ”بھگوان آپ کو سنسار کی بری نظروں سے ہمیشہ بچائے۔“

”میں تم پر بہت رشک کرتا ہوں مینکا، کاش مجھے بھی تم جیسا علم آجائے تم سب کچھ بن سکتی ہو، خوب صورت پرندہ بن کر فضاؤں میں اڑ سکتی ہو، خونخوار درندہ بن کر اپنے دشمنوں کو چیر پھاڑ سکتی ہو۔“

”پتا جی مجھے سنسار کی ساری باتیں بتاتے رہتے ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ تمہارے دھرم میں بھی ہے اسے

رشی منی ہوتے ہیں کہ سنسار ان کے سامنے کچھ نہیں ہوتا۔ مگر وہ سب کچھ بھگوان، نہیں میرا مطلب ہے خدا سے مانگتے ہیں دیوی دیوتاؤں سے نہیں اور پھر جو کرتے ہیں خدا کی خوشی کے لئے کرتے ہیں بڑے سے بڑا وردان بھی ان کے سامنے چیونٹی سے بھی زیادہ حقیر ہوتا ہے وہ کبھی کسی کے برے کے لئے کام نہیں کرتے، ہاں برائی کے خاتمے کے لئے ضرور کام کرتے ہیں۔"

"کاش مجھے بھی کوئی ایسا صاحب علم مل جائے؟ ایک بزرگ ملے تھے لیکن میں ان کے دیئے ہوئے تعویز کی حفاظت نہیں کرسکا۔" میں نے محبوب الٰہی کو یاد کرتے ہوئے کہا۔

"پتاجی کہتے ہیں۔ تمہارے ہاں گیان کی بہت سی منزلیں ہوتی ہیں۔ پیر، فقیر، درویش، مجذوب، قطب ابدال یہ بڑے شکتی مان ہوتے ہیں اور کوئی ان کے سامنے نہیں ٹکتا۔"

"مجھے کہیں سے ان کا پتہ مل سکتا ہے۔"

"پتاجی سے پوچھ کر بتاؤں گی۔" اس نے کہا۔

دفعتاً میں چونک پڑا۔ میں میکا کی میت میں اپنا اصل کام بھول گیا تھا۔ میرا یہ مشن بالکل خفیہ تھا میں کسی کو اس بارے میں نہیں بتانا چاہتا تھا لیکن میکا۔ اب میکا ہی میری سب سے اچھی دوست اور ہمدرد تھی۔ میں اس کی اس بات سے بہت متاثر ہوا تھا کہ وہ میری حفاظت کے لئے میرے آس پاس ہی رہتی ہے۔ اسے اپنے راز میں شریک کرلینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ میں نے کہا۔

"میکا۔ میں تمہیں کچھ بتانا چاہتا ہوں۔"

"جی چھوٹے راجکمار۔"

"تم مجھے راجکمار کیوں کہتی ہو۔"

"مجھے یہ اچھا لگتا ہے۔" وہ پیار سے بولی۔

"خیر، میکا میں اس وقت ایک ضروری کام سے نکلا تھا۔"

"جی چھوٹے راجکمار۔"

"میں پرانی حویلی کی سیر کرنے جارہا ہوں۔"

"ارے..... کیوں.....؟" وہ حیرت سے بولی۔

"اس حویلی سے میرے دادا جان کی زندگی کی داستانیں وابستہ ہیں۔ وہاں کوئی نہیں جاتا۔ سب کہتے ہیں کہ وہاں صرف بدروحوں کا راج ہے۔ میں ان بدروحوں کو قریب سے دیکھنا چاہتا ہوں۔ اصل میں میکا میرے خاندان کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے میں اسے معاف نہیں کرسکتا۔ میں دیکھوں گا یہ کیسے میری جان لیتی ہیں۔ میں ان دشمن روحوں سے اپنے خاندان کا بدلہ لینا چاہتا ہوں۔"

"چھوٹے راجکمار۔" میکا پریشانی سے بولی۔

"میں نے کسی کو نہیں بتایا کہ میں آج پرانی حویلی کا جائزہ لینے جارہا ہوں۔ لیکن میں نے دل سے تمہیں اپنی دوست مان لیا ہے۔ اس لئے میں تم سے کچھ نہیں چھپا رہا۔"

"یہ بہت مشکل کام ہے راجکمار جی۔"

"میں اسے کرکے رہوں گا۔" میں نے جوش سے کہا۔

"بھگوان آپ کی سائتا کرے، لیکن جب آپ مجھے اپنی داسی مانتے ہیں تو میری کچھ باتیں بھی مان لیجیے۔"

"بولو....."

"آپ کی رشی منی سے، میرا مطلب ہے اپنے دھرم کے کسی عالم سے گیان لیجیے۔ یہ ضروری ہے پھر آتمائیں آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گی اس کے بنا آپ ان کے مقابلے پر نہ آئیں۔"

"میں بھی تو یہی چاہتا ہوں۔ کاش مجھے ایسا کوئی عالم مل جائے۔" میں نے اداسی سے کہا۔ پھر چونک کر بولا۔ "لیکن میکا میں اس وقت حویلی ضرور دیکھوں گا۔"

میکا سوچ میں ڈوب گئی۔ پھر اس نے کہا۔ "ٹھیک ہے میں آپ کے ساتھ حویلی میں چلوں گی۔"

"تم.....؟" میں نے ہچکچا کر کہا۔

"بھگوان کے لئے مجھے اس کے لئے منع نہ کرنا۔ آپ اندر جاؤ گے اور میں یہاں پاگلوں کی طرح تڑپتی رہوں گی۔"

"ٹھیک ہے۔" میں تیار ہوگیا۔

"اور میں آپ کو ایسے اندر نہیں جانے دوں گی۔"

"کیا مطلب؟"

"آپ کا شریر یہاں رہے گا اور آتما اندر جائے گی۔"

"آتما، یعنی روح۔"

"ہاں۔"

"یہ کیسے ہوسکتا ہے۔"

"ہوسکتا ہے، میں کرسکتی ہوں میں آپ کی آتما کو تھوڑی دیر کے لئے شریر سے دور کردوں گی اور آپ کو حویلی میں لے چلوں گی پھر وہاں اگر کوئی بری روح ہوئی تو آپ کو نقصان نہیں پہنچا سکے گی۔"

"ارے واہ۔ میرا بدن کہاں رہے گا۔"

"یہیں کسی پیڑ پر چھپا دوں گی۔"

"یہ میری زندگی کا سب سے انوکھا تجربہ ہوگا، بے حد دلچسپ، بہت عجیب۔ ٹھیک ہے میں تیار ہوں۔" میں نے کہا اور میکا مسکرادی۔ پھر اس نے چاروں طرف دیکھا اور بولی۔

"ادھر آجاؤ چھوٹے راجکمار۔" اس نے ایک درخت کی طرف اشارہ کیا۔ یہ پیپل کا ایک بہت قدیم درخت تھا ایک بار والد صاحب نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا۔ "اشرف اس درخت کو دیکھو یہ صدیوں پرانا ہے ہمارے ملکھان خاندان کی طرح۔"

"صدیوں پرانا؟"

"ہاں۔ دادا صاحب بتاتے تھے کہ یہ ان کے دادا سے پہلے کا درخت ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ انہیں اس سے پہلے کی تاریخ معلوم نہیں ہے یہ درخت اس سے بھی پرانا ہے۔"

تو یہ درخت اتنا ہی پرانا تھا بے حد گھنا اور بہت بڑے رقبے میں پھیلا ہوا۔" میکا مجھے اس درخت کے پیچھے لے گئی اور پھر اس نے مجھے درخت کے تنے سے لگا کر کھڑا کردیا۔

"دونوں ہاتھ اوپر اٹھا دو چھوٹے راجکمار۔" اس نے کہا اور میں نے دونوں ہاتھ اوپر کرکے درخت کے تنے سے لگا دیئے۔ میکا مجھے دیکھنے لگی تھی۔ میں نے اس کی آنکھوں کے رنگ بدلتے دیکھے آہستہ آہستہ اس کی آنکھوں کی پتلیاں غائب ہوتی جارہی تھیں یہاں تک کہ اس کی پتلیاں بالکل گم ہوگئیں پھر اس کی آنکھوں کے ڈھیلے ہلکا نیلا رنگ اختیار کرگئے اور مجھے اپنا بدن ہلکا محسوس ہونے لگا پھر ایک انوکھی بات ہوئی۔ میں آہستہ سے اپنی جگہ سے ہٹا اور درخت سے ایک گز پیچھے ہٹ گیا۔

"لیکن۔"

میں بدستور درخت سے لگا کھڑا تھا۔ یہ کیا، میں دو حصوں میں تقسیم ہوگیا تھا میرا بدن درخت سے لگا کھڑا تھا اور میں۔ اس سے ایک گز پیچھے کھڑا اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔

"یہ..... یہ کیا میکا۔" بمشکل میرے منہ سے نکلا۔

"آپ کا شریر آتما سے دور ہوگیا ہے۔ اب وہ مٹی کے سوا کچھ نہیں ہے۔"

"لیکن۔ میں تو یہاں ہوں۔"

"ہاں یہ آپ کی آتما ہے۔ آپ اس دوسرے درخت کے پاس جاؤ۔"

"دوسرے درخت کے پاس؟" بات میری سمجھ میں نہیں آئی تھی۔

"ہاں۔ آتما صرف ایک لطیف احساس ہوتا ہے۔ اس کا کوئی بدن نہیں ہوتا۔ جاؤ اس درخت کے پاس جاؤ۔" اس نے دوبارہ کہا اور میں نے اس درخت کی طرف قدم بڑھا دیئے۔ پھر میں درخت کے پاس پہنچ گیا اور میں نے کہا۔

"اب کیا کروں۔"

"اس درخت کے تنے سے دوسری طرف نکل جاؤ۔ جاؤ جو کچھ میں کہہ رہی ہوں اسے کرکے دیکھو۔ چلو تجربہ کرو اور میں نے اپنی زندگی کا انوکھا تجربہ کیا۔ میں ہوا کے کسی جھونکے کی طرح اس درخت سے گزر گیا تھا۔ اوہ کیسا عجیب لمحہ تھا یہ..... میں کچھ بھی نہیں تھا۔ میرے سارے وجود میں گدگدیاں ہورہی تھیں۔ میں نے بڑی دلچسپی سے پوچھا۔

آرزوئیں اس طرح بھی پوری ہوجایا کرتی ہیں

اسماء الحسنٰی۔۔۔۔کامیابی کا راستہ

ہر مشکل کا حل بذریعہ موکلات جس پریشانی کی وجہ سے آپ کی زندگی موت سے بھی بدتر ہوگئی ہو اور ہر عامل ناکام ہوگیا ہو ہم سے مشورہ ایک بار ضرور لیں عامل وہ جس علم سات سمندر پار چلے کالے و سفلی جادو ختم پتھر سے پتھر دل محبوب تابع ہوگا اولاد فرمان بردار خاوند سے بے رخی بچوں کے اچھے رشتے اور کاروبار میں کامیابی وہ لوگ مایوس نہ ہوں بلکہ اپنی آخری امید سمجھ کر سید فرمان شاہ سے رابطہ کریں انشاء آپ محسوس کریں گے ایک فون کال نے ہماری زندگی بدل دی

پریشانیوں سے چھٹکارہ

ہمارا ہر عمل دنیا کے ہر کونے میں اثر کرتا ہے

جادو چلانا ہو یا ختم کرنا ہو

اولاد کا نہ ہو یا ہو کر مرجانا

کاروباری بندش

دیگر مسائل

سید فرمان شاہ کا پیغام جو لوگ سوچتے رہتے ہیں۔ وہ ہمیشہ دکھی رہتے ہیں پلک جھپکنے سے پہلے کام علم جو بگڑے کام بنائے

سسرال میں بہو سب کی آنکھ کا تارا بن سکتی ہے ہر کام 100% رازداری کے ساتھ

کلام الٰہی سے ہر پریشانی کا حل پہلے تعویز سے آپکی اجڑی ہوئی زندگی میں بہار ایک فون کال پر آپ کے مسائل کا حل ایک فون کال پر

خواہش

زندگی کی کوئی بھی خواہش ہے کسی کو پانے کی تمنا اپنوں کی بے رخی سے دکھی ہیں یا میاں بیوی کی رنجش کو ختم کرنا ہے

آپ کی کوئی بھی جائز خواہش ہے تو پوری ہوگی انشاء اللہ

میں آپ سے ایک فون کال کی دوری پر موجود ہوں فون ملایئے اور آزمالیجئے

ایک بار ہمیں خدمت کا موقع دیں کامرانیاں آپ کے قدم چومیں گی اور آپ یقیناً بہترین اور خوشگوار زندگی کا لطف اٹھائیں گے۔

نوٹ: جو خواتین و حضرات خود نہیں آسکتے وہ گھر بیٹھے فون کریں اور ہم سے کام لیں انشاء اللہ کامیابی ہوگی۔

وہ علم ہی کیا جس میں عمل نہ ہو۔ وہ زبان ہی کیا جس میں اثر نہ ہو۔

سید فرمان شاہ

اچھرہ شاپ مین بازار اچھرہ لاہور پاکستان

0300-6484398

"کیا اس طرح میں ٹھوس دیواروں سے بھی گزر سکتا ہوں مینکا۔"

"ہر چیز سے مہاراج۔" وہ بولی۔

"کتنا اچھا ہے یہ سب مینکا اگر میں اسی طرح رہنا چاہوں تو کتنا عجیب ہے یہ سب میں کہیں بھی، کسی بھی جگہ جاسکتا ہوں ہواؤں میں اڑ سکتا ہوں۔"

"بھگوان نہ کرے چھوٹے راجکمار۔" مینکا تڑپ کر بولی۔

"کیوں۔ ایسے کیوں کہہ رہی ہو۔"

"وہ جیون نہیں ہوگا۔"

"پھر کیا ہوگا؟"

"ایک بھٹکتی آتما۔ جس کا کوئی شریر نہیں ہوگا۔"

اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔

"پڑتا ہے مہاراج۔"

"بتاؤ کیا......؟" میں نے بچوں کی طرح ضد کرکے کہا کا۔

"شریر اور آتما کا ملاپ ہی جیون کہلاتا ہے چھوٹے راجکمار۔ بھگوان نہ کرے آپ کا شریر آپ کے پاس نہیں ہوگا تو آپ جیتے کہاں کہلائیں گے آپ کا شریر تو چار دن کے بعد ہی مائی بن کر ختم ہوجائے گا۔ آتما کہاں بھٹکتی رہے گی کون جانے۔"

میں حیران رہ گیا۔ واقعی ایک ہوا کی شکل اختیار کرکے زندگی کیا رہ جائے گی، نہ کسی کو چھو سکو، نہ کسی سے بات کرسکو میں ہنس کر رہ گیا تب وہ بولی۔

"میں آپ کے شریر کو اس درخت پر چھپادوں۔"

اور پھر وہ پیپل کے درخت کے پاس پہنچ گئی اس نے میرے تنے سے لگے ہوئے بدن کو درخت پر چڑھا کر اوپر کھینچ لیا اور پھر پتوں میں چھپا کر نیچے اتر آئی۔

"آؤ چلیں۔" اس نے کہا اور میں اس کے ساتھ حویلی کی طرف چل پڑا۔ مجھے لگ ہی نہیں رہا تھا کہ میں زمین پر چل رہا ہوں۔ میرے پاؤں زمین سے اٹھے ہوئے تھے اور میں جیسے ہوا میں تیر رہا تھا۔ یہ بھی میری زندگی کا انوکھا تجربہ تھا۔ اس طرح ہم پرانی حویلی میں داخل ہوگئے۔

حویلی صحیح معنوں میں آسیب زدہ لگ رہی تھی۔ پورا ماحول بے حد بھیانک لگ رہا تھا محسوس ہو رہا تھا کہ بہت سی آنکھیں ہماری طرف نگراں ہیں۔ بہت سی دبی دبی سرگوشیاں کی جارہی تھیں۔ ان میں سے کچھ آوازیں نمایاں ہوجاتی تھیں۔

"مامون خان۔"

"درندہ۔"

"ظالم۔"

"ماردو۔"

"ختم کردو۔"

"نہیں۔ یہ وہ نہیں ہے۔ وہ نہیں ہے۔ وہ نہیں ہے۔"

میرے کان سرگوشیاں سن رہے تھے۔ لیکن میرے دل میں خوف کا کوئی گزر نہیں تھا۔ میرے کان سن رہے تھے لیکن مجھے اس کا کوئی خاص احساس نہیں تھا۔

دفعتاً مجھے کوئی خیال آیا۔ اور میں نے کہا۔

"مینکا۔"

"جی میرے چھوٹے راجکمار۔"

"کیا ہم گنگا سری کے محبوب رام سروپ کی لاش تلاش کرسکتے ہیں گنگا سری رات کی تاریکیوں میں اپنے محبوب کی لاش حویلی میں تلاش کرتی پھرتی ہے۔"

"دیوانی ہے وہ۔" مینکا نے کہا۔

"وہ کیوں۔"

"اگر اس کا شریر حویلی میں ہوتا تو اسے ضرور مل جاتا۔ بڑے مہارج نے ضرور اسے دریا میں بہادیا۔ یہاں سے کچھ دور سے راوی گزرتا ہے۔ لاش اس میں بہادی گئی ہوگی۔ آتمائیں سب کچھ تلاش کرلیتی ہیں لیکن بہتے پانی میں ہر طرح کا جادو ختم ہوجاتا ہے۔ نہ وہاں آتماؤں کا گزر ہوسکتا ہے نہ کوئی جادو بھگوان کی

کرنے کے خلاف کام کرتا ہے۔ رام سروپ کی لاش دھرتی کے کسی کونے میں دبی ہوتی تو گنگا سری اسے حاصل کرلیتی بہتا پانی اسے کہیں سے کہیں لے گیا ہوگا۔ آپ کو پتہ ہے چھوٹے راجکمار۔ سارے بڑے دریا سمندر میں گرتے ہیں۔ اور سمندر اتنا بڑا ہے کہ ساری دھرتی اس کا ایک کونہ بھی نہیں ہے۔"

"اوہ..... واقعی۔" میں نے کہا۔ پھر میں نے کہا۔" اور گنگا سری کی بازیب کا تم نے کیا کیا۔ جو میں نے تمہیں دے دی تھی۔"

"وہ میرے پاس ہے۔"

"تم اس کا کیا کروگی؟"

"کیوں پوچھ رہے ہو چھوٹے راجکمار۔" مدیکا عجیب سے لہجے میں بولی۔

"کوئی خاص وجہ نہیں۔"

"چھوٹے راجکمار۔ وہ اس کی دکھتی رگ ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"محبوب کا تحفہ۔"

"اوہ۔ کیا وہ اسے رام سروپ نے دی تھی۔"

"ہاں اسی نے دی تھی۔ اور اس نے کہا تھا کہ" وہ اس سنسار سے جانے کے بعد بھی اسے ساتھ رکھے گی۔ وہ اسے اپنی چتا میں اپنے ساتھ مجسم کرالے گی تاکہ جب وہ دوسرا جنم لے تو رام سروپ اسے پہچان سکے۔ اور انہیں دوسرے جنم کا ساتھ بھی مل جائے۔"

"اتنا چاہتی تھی وہ رام سروپ کو۔"

"اس سے بھی زیادہ۔"

"اور مامون خان نے نہ صرف انہیں جدا کردیا بلکہ اس کے پریمی کو بھی قتل کرادیا اور اسے بھی۔"

"یہ تو واقعی افسوس کی بات ہے۔" میں نے تاسف سے کہا۔

"ہاں۔ انیائے تو ہوا ہے اس کے ساتھ۔ پر اس میں آپ کا تو دوش نہیں ہے۔ پریوار میں ایک دوسرے کے ہم شکل تو پیدا ہوجاتے ہیں۔ ان سے تو بدلہ نہیں لیا جاتا۔ نہ ہی پورے پریوار سے بیر باندھی جاتی ہے۔ انہوں نے تو تمہارے پریوار کے بہت سے لوگوں کی جان لی ہے۔"

"زیور سے کیا ہوگا۔"

"اس کا پریمی اسے تلاش نہ کرسکے گا۔"

"اوہ۔" میں نے کہا۔

"تمہارا دھرم یہ سب نہیں مانتا۔ لیکن یہ ہمارے دھرم کی بات ہے۔"

کاش میں تمہاری طرح یہ ساحرانہ قوتیں حاصل کرسکتا۔ کاش جمنا داس جی مجھے یہ سب سکھادیتے جو انہوں نے تمہیں سکھایا ہے۔"

"وہ ایسا کر بھی سکتے ہیں لیکن اصل وجہ میں تمہیں بتا چکی ہوں اس کے لئے دھرم نشٹ کرنا پڑتا ہے پھر اپنا دھرم چھوڑ کر سب سے پہلے کائر بننا پڑتا ہے۔ وہ وہ برے کام کرنے پڑتے ہیں جو نہیں کرنے چاہئیں ایسے منش کا کسی دھرم سے کوئی سمبندھ نہیں رہ سکتا۔"

"پھر تم۔ تم نے تو وہ برے کام نہیں کیے۔"

"نہیں۔ کیونکہ میرا تو دھرم ہی الگ ہے۔ دوسرے دھرم والے کو کالے پریوار میں آنے سے پہلے یہ سب کرنا ہوتا ہے۔"

"گویا کوئی مسلمان اگر کالا جادو سیکھنا چاہے تو پہلے اسے اپنے دین کے خلاف کام کرنا پڑتا ہے۔"

"کوئی معمولی کام نہیں۔ اسے سولہ شیطانوں کو خوش کرنا ہوتا ہے۔ یہ سولہ شیطان کالے دھرم کے پیروکار ہیں۔ سات کنواری کنیاؤں کی عزت لوٹنی ہوتی ہے ان کی جان کی بلی دینی ہوتی ہے تب کہیں جاکر انہیں کالے پریوار میں شامل کیا جاتا ہے۔"

میں نے لاہول پڑھی تو وہ مسکرانے لگی۔

"بھگوان تمہارے دھرم کو اور تمہیں قائم رکھے۔ اگر اس نے تمہیں کوئی نقصان پہنچانے کی کوشش کی تو میں اس کا جو کچھ کروں گی، کروں گی ہی، لیکن اس کا اگلا جنم نشٹ کردوں گی۔"

"تم ایسا کیوں کروگی مدیکا۔" میں نے پوچھا

اور وہ خاموش ہوگئی۔ "بتاؤ۔" میں نے پھر کہا۔

"کیونکہ..... کیونکہ میں تم سے پریم کرتی ہوں۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

"لیکن مدیکا۔" میں تو مسلمان ہوں۔ ہم کیسے یکجا ہوسکتے ہیں۔"

"یکجا ہونے کا کام ہی پریم نہیں ہے چھوٹے راجکمار۔ پریم کا کوئی دھرم نہیں ہوتا۔ میں تو یہ بھی کبھی نہیں کہوں گی کہ مجھے میرے پریم کا جواب دو، میں تمہیں چاہتی ہوں، بس سچائی ہے۔"

میں خاموش ہوگیا۔ میری عراب اس قابل ہوگئی تھی کہ میں حسن و عشق کے واقعات کو سمجھ سکوں، ان کی حقیقتوں اور ضرورتوں کو بھی میں سمجھنے لگا تھا۔ لیکن ذاتی طور پر مجھے اس کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ میں خود کسی سے متاثر نہیں ہوا تھا۔

لیکن مدیکا کی باتوں نے مجھے بہت متاثر کیا تھا۔

"ایک بات کہوں۔" وہ بولی۔

"میں نے تمہیں کھل کر بتادیا چھوٹے سرکار کہ میں آپ کے پریم میں گرفتار ہوگئی ہوں۔ لیکن بھگوان کی سوگند میں نے ایک بات سوچی ہے۔"

"کیا.....؟" میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

"میں نے منت مانگی ہے کہ بھگوان اگر میرا پریم سچا ہے تو اگلے جنم میں میرے پریمی کو کسی ہندو گھرانے میں پیدا کرنا تاکہ میں اسے پاسکوں اور اگر اسے ہندو گھرانے میں پیدا نہ کریں تو مجھے کسی مسلمان گھرانے میں پیدا کردینا اور اسے مجھ سے ملادینا۔"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ دل میں یہ بات ضرور تھی کہ پاگل لڑکی ہم دوسرے جنم کو نہیں مانتے اس لئے میرے دل میں ایسی کوئی جگہ نہیں ہے لیکن یہ بات کہہ کر میں اس کا دل نہیں دکھانا چاہتا تھا۔ اس بات چیت کے دوران ہم حویلی کی سیر بھی کررہے تھے۔

حویلی بے حد خوب صورت بنی ہوئی تھی لیکن پوری کی پوری اجاڑ اور ویران پڑی ہوئی تھی۔ اس کی اوپری منزل کے بعض کمروں میں لاکھوں روپے کا قیمتی فرنیچر، اطلس قیمتیں کم خواب کے پردے پڑے ہوئے تھے اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ وہ سب صاف وشفاف تھے جیسے کوئی ان کی صفائی کرتا رہا ہو۔ جبکہ مجھے یہ اچھی طرح معلوم تھا کہ ملازم پرانی حویلی کی طرف رخ کرتے ہوئے بھی کان کو ہاتھ لگاتے ہیں پھر ظاہر ہے یہاں روحوں کا راج ہی تھا۔

یہ باتیں کرتے ہوئے ہم پوری حویلی کا چکر لگاتے رہے کہ صاف اندازہ ہورہا تھا کہ ہم اکیلے نہیں بلکہ بہت سی آنکھیں ہمارے ساتھ چل رہی ہیں انوکھی سرگوشیاں ابھر رہی ہیں لیکن کسی کے الفاظ سمجھ میں نہیں آرہے تھے ایک اور خیال میرے دل میں تھا۔ اگر میں جیتا ہوتا تو شاید مجھے کوئی جانی نقصان بھی پہنچ جاتا لیکن میرے ساتھ طاقتور وجود تھا جو ہر طرح کی ناپاک روحوں کو نقصان پہنچا سکتا تھا۔

کوئی ایک گھنٹے سے زیادہ دیر تک ہم دونوں حویلی میں گھومتے رہے۔ اس وقت ہم اوپری منزل کی ایک راہداری سے گزر رہے تھے کہ کھلی جگہ سے دور نظر آنے والے شمشان گھاٹ پر نظر پڑی میں نے پہلے بھی وہاں دھواں دیکھا تھا لیکن میں نے یہ سوچا تھا کہ کوئی چتا جل رہی ہوگی لیکن..... دھواں اب بھی اٹھ رہا تھا اور رہ رہ کر مرغولے بلند ہورہے تھے۔ ساتھ ہی کچھ تحریک بھی نظر آرہی تھی۔

"یہ کیا ہے؟" میرے منہ سے آہستہ سے نکلا۔

"کہاں؟"

"وہ دھواں۔" میں نے اتنا کہا تو مدیکا بھی ادھر دیکھنے لگی پھر آہستہ سے بولی۔

"کوئی خاص ہی بات ہے۔"

"چتا نہیں جل رہی؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔ چتا ایسے نہیں جلتی۔"

"آؤ دیکھیں....." میں دلچسپی سے بولا۔

"چلو۔" اس نے کہا اور میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ پھر وہ

کہا۔

"ادھر؟"

"ہاں آؤ۔"

اوہو۔ یہ تو بہت دلچسپ ہوگا۔ یہاں سے نیچے کودو گی۔"

"ہاں ناں۔" وہ ہنس کر بولی۔

"چوٹ نہیں لگے گی۔"

"چوٹ شریر کو لگتی ہے چھوٹے راجکمار، آتما کو نہیں۔" وہ بولی مجھے اس کے یہ جملے عجیب لگے تھے۔ روح کو بدن سے جدا کرنے کا یہ عمل بھی مجھے بے حد انوکھا لگا تھا ایک بار پھر میرے دل میں یہ حسرت پیدا ہوئی کہ کاش اس طرح کا کوئی عمل میں بھی سیکھ سکوں۔

منیکا میرا ہاتھ پکڑ کر راہداری کی منڈیر پر چڑھی اور پھر نیچے کود گئی۔ احساس بھی نہیں ہوا کہ اتنی بلندی سے نیچے آئے ہیں منیکا شمشان گھاٹ کی طرف چل پڑے۔ وہ جگہ نمایاں ہوتی جارہی تھی جہاں سے دھواں اٹھ رہا تھا یہ دھواں چتا سے نہیں اٹھ رہا تھا بلکہ دو انسانی ہاتھ لوبان قسم کی کوئی چیز کوئلوں کے ڈھیر پر ڈال رہے تھے اور ایک بھنبھناہٹ سی سنائی دے رہی تھی۔

ماحول اور نمایاں ہوتا جارہا تھا۔ میں نے شدید حیرت کے عالم میں دیکھا۔ وہاں گنگا سری بھی موجود تھی اور ساتھ کچھ بدشکل منڈے۔ اپنے چہروں اور بدن پر بھبھوت ملے ہوئے۔ پالتی مارے آنکھیں بند کئے ہاتھ جوڑے بیٹھے ہوئے تھے۔ کوئلوں کے ڈھیر کے ایک سرے پر ایک لمبے اور گندے بالوں والا ننگ دھڑنگ سادھو بیٹھا ہوا تھا اس نے بدن پر صرف ایک لنگوٹی باندھی ہوئی تھی۔ اور..... اور اس کے سامنے جو ہاتھ لوبان قسم کی چیز کوئلوں پر ڈال رہے تھے وہ..... چاچا فرید کے ہاتھ تھے..... ہاں ملکھان خاندان کے فرد چاچا فرید کے۔

میری آنکھیں شدت حیرت سے پھٹی ہوئی تھیں سادھو کچھ نامعلوم الفاظ کسی نامانوس زبان میں کہہ رہا تھا اور چاچا وہ الفاظ کو دہرا رہے تھے بالکل اس طرح جیسے کوئی سبق پڑھتا ہے۔

میں دم بخود تھا۔ چاچا۔ چاچا فرید..... اور مکروہ لوگ..... اور گنگا سری..... ہمارے خاندان کی دشمن، میرے ابو کی چاچا فرید کے بھائی کی قاتل، میں خاموشی سے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ سادھو..... چاچا کو پڑھاتا رہا۔ پھر اس نے ہاتھ اٹھایا اور بولا۔

"بس۔ آج کا کام ختم۔ لے یہ امرت جل پی لے۔" سادھو نے ایک پیلے رنگ کا پانی جیسا سیال ایک مٹی کے برتن میں انڈیلا اور چاچا کی طرف بڑھا دیا۔ چاچا نے وہ برتن لیا اور اسے ہونٹوں سے لگا لیا۔

میں عالم سحر میں یہ سب منظر دیکھ رہا تھا۔ یہ کیا ہو رہا ہے یہ فرید چاچا ہیں نا۔ میری آنکھوں کو دھوکا تو نہیں ہو رہا۔

"آؤ چلیں۔" منیکا نے کہا۔

"ایں۔ ہاں چلو۔"

ہم وہاں سے واپس چلے پڑے۔ اور پھر کافی دور نکل آئے۔ "منیکا بولی۔" اپنے شریر میں چلیں۔"

"ہاں، میں حویلی دیکھنا چاہتا تھا، دیکھ لی ،اور..... اور۔"

"اور کیا۔"

"یہ جو کچھ دیکھا میری سمجھ میں نہیں آیا۔"

"میں بتاؤں۔" وہ بولی۔

"ہاں بتاؤ۔"

"تمہیں دکھ ہوگا۔"

"مجھے بہت سے دکھ ہیں منیکا۔ کوئی اور دکھ بڑھ جائے تو کیا فرق پڑتا ہے۔"

"وہ تمہارے چاچا جی تھے نا؟"

"ہاں۔ وہی تھے۔"

"انہوں نے اپنا دھرم تیاگ دیا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"اب نہ وہ مسلمان رہے ہیں نا کوئی اور دھرم رہا ہے ان کا، وہ شنکھا ئیتھی بن گئے ہیں گندے دھرم کے

پیروکار، مہا کالی کے دوسرے روپ والے۔ وہ سادھو بھان شنکھا تھا جو انہیں گندا خون پلا کر بے دھرم کر رہا تھا وہ جادو سیکھ رہے ہیں۔"

میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ ملکھان خاندان ویسے ہی مامون خان کی وجہ سے بدنام اور نحوستوں کا شکار تھا مامون خان ایک عیاش زمیندار تھے جنہوں نے بہت سے انسانوں کی جان لی تھی بہت سی کنواریوں کی عزت لوٹ کر انہیں قتل کیا تھا لیکن فرید چاچا۔ انہوں نے تو اپنا دین کھو دیا تھا۔

میرا بدن درخت پر پوشیدہ تھا۔ میں نے اسے حاصل کیا اور منیکا کی طرف دیکھنے لگا۔

"جاؤں؟" وہ بولی۔

"تمہارا شکر یہ منیکا..... ایک بات کہوں۔"

"ہاں....." اس نے اشتیاق سے کہا۔ وہ میری زبان سے جو سننا چاہتی تھی میری سمجھ میں آ گیا تھا لیکن میں ابھی اس میں ماہر نہیں ہوا تھا تاہم میں نے کہا۔

"گجر گھاٹ میں رہتے ہوئے میں اس حویلی تک ہی محدود رہا ہوں۔ میرے خاندان میں میری عمر کے لڑکے بھی ہیں اور لڑکیاں بھی لیکن میری ان سے واجبی سی ہی دوستی رہی ہے۔ لیکن منیکا میری خواہش ہے کہ میں تم سے زندگی بھر کی دوستی رکھوں۔"

"سچ چھوٹے راجکمار۔" اس کے لہجے میں بے پناہ خوشی جھلک رہی تھی۔

"ہاں منیکا۔"

"یہ شبد مجھے زندہ رکھیں گے۔" اس نے کہا۔ کچھ دیر کے بعد وہ بولی۔ "چلو، میں تمہیں پہنچا دوں۔"

"ارے نہیں تم جاؤ۔ میں چلا جاؤں گا۔" میں نے ہنس کر کہا۔

"نہیں چھوٹے راجکمار۔ چلو میں کھڑکی کے نیچے کھڑی ہو جاؤں گی تم کھڑکی سے جھانک کر مجھے الوداع کر دینا۔ تب میں چلی جاؤں گی۔"

میں نے گردن ہلا دی یہ اس کی چھوٹی سی خوشی تھی اپنے کمرے میں داخل ہوا تو امی کروٹ بدلے گہری نیند سو رہی تھیں میں نے اطمینان کی سانس لی کہ میری اتنی زبردست مہم کا پتہ نہیں چلا تھا۔ میں کھڑکی کے پاس پہنچا منیکا نیچے کھڑی تھی میں نے اسے ہاتھ ہلا کر الوداع کیا اور اس نے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے میں نے اسے جانے کے لئے اشارہ کیا تو وہ واپس مڑ گئی پھر میں اسے دور تک دیکھتا رہا تھا۔

جب وہ نگاہوں سے اوجھل ہوگئی تو میں گہری سانس لے کر پلٹا اسی وقت میرے دل میں ایک خیال آیا۔ چاچا فرید اس وقت شمشان گھاٹ بیٹھے اپنا ایمان کھو رہے ہیں ان کا کمرہ خالی ہوگا۔ کیوں نہ ان کے کمرے کی تلاشی لوں۔ ممکن ہے محبوب الٰہی صاحب کا تعویز مجھے مل جائے ویسے چاچا فرید کو جس حال میں دیکھا تھا اور اس کے بارے میں منیکا نے جو کچھ بتایا اس نے میرا دل ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تھا مجھے سو بار بھی قربان کر دیا جائے۔ میرے بدن کے ہزار ٹکڑے کر دیئے جائیں مجھے دنیا بھر کی دولت پیش کی جائے اس کے عوض بھی میں اپنے ایمان پر حرف نہ آنے دوں۔

ایک بار پھر میں نے امی کے خراٹوں کا جائزہ لیا۔ وہ گھوڑے بیچ کر سو رہی تھیں چنانچہ میں باہر نکل آیا۔

سب لوگ گہری نیند سو رہے تھے۔ میں دبے پاؤں چلتا ہوا چاچا فرید کے کمرے میں پہنچ گیا۔ میں نے ان کے کمرے کے دروازے کا پٹ آہستہ سے دھکیل کر دیکھا۔ دروازہ اندر سے بند نہیں تھا میں نے اسے دبایا تو وہ کھل گیا۔ لیکن..... چاچا فرید اپنی مسہری پر گہری نیند سو رہے تھے۔

میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ یہ کیا طلسم ہے۔ وہاں شمشان گھاٹ میں چاچا جس عالم میں بیٹھے ہوئے تھے اس سے یہ گمان بھی نہیں کیا جاسکتا تھا کہ وہ اتنی برق رفتاری سے واپس اپنے کمرے میں آ جائیں گے پھر شمشان گھاٹ سے جو راستہ آتا تھا وہ بھی اسی طرف آتا تھا جہاں میں موجود تھا۔

کوئی پراسرار دھوکہ۔ چاچا کی طرف سے یا پھر

ان دشمن روحوں کی طرف سے۔ جو ہمیں اپنے طلسم میں گرفتار کئے ہوئے تھیں اگر ایسی بات ہے تو پھر چچا فرید کی طرف سے بدظن ہوتا، ناانصافی تھی۔

میں وہاں سے واپس پلٹ پڑا۔ اور اپنے کمرے میں آ گیا۔ اتنا بڑا معرکہ سر کرلیا تھا لیکن کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوئی تھی۔

پھر صبح تک نیند کیسے آئی، بدن ٹوٹ رہا تھا، شاید بخار بھی آ گیا تھا۔ ناشتے کی میز پر تایا صاحب نے میرا چہرہ دیکھ کر کہا۔

"کیا بات ہے چہرہ کیسے سرخ ہو رہا ہے۔"

"بس یونہی۔" میں نے جواب دیا اور بس اتفاق سے ہی میری نظر چچا صاحب کے چہرے کی طرف اٹھ گئی میں نے ان کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ دیکھی تھی۔ میری نظر ان سے ملی تو انہوں نے رخ بدل لیا تھا.....

وقت آگے بڑھتا رہا۔ حالات میں کوئی نمایاں فرق نہیں تھا۔ خدا کے فضل سے کوئی حادثہ بھی نہیں ہوا تھا۔ اس دوران منیکا سے کئی بار ملاقات ہوئی اس دن کے بارے میں بھی میں نے اسے بتایا تھا کہ میں نے فرید چچا کو ان کے بیڈ روم میں دیکھا تھا منیکا خاموش ہو گئی تھی اس نے کوئی جواب نہیں دیا تھا ایک دن میں نے کہا۔

"منیکا۔" میں اس بات کی تصدیق کرنا چاہتا ہوں کہ اس دن میں نے فرید چچا کو ہی دیکھا تھا یا پھر یہ ان بری روحوں کا کام تھا جنہوں نے میرا ذہن ان کی طرف سے خراب کیا تھا۔

"ابھی ایسا نہ کرو۔ چھوٹے راجکمار۔" منیکا نے کہا۔

"کیوں.....؟"

"ٹھیک نہیں ہوگا۔ گندی آتما ؤں کو معلوم ہو چکا ہے کہ اس رات ہم نے شمشان گھاٹ میں وہ سب کچھ دیکھ لیا تھا۔"

"دیکھ لیا تھا۔ یہ معلوم ہو چکا ہے انہیں۔"

"ہاں.....اس لئے تم سے پہلے فرید جی مہاراج اپنے کمرے میں پہنچ کر سوتے بن گئے تھے تاکہ تم کچھ اور سوچنے لگو۔"

مجھے منیکا کی بات پر یقین تھا۔ وہ میری بہت اچھی دوست بن گئی تھی بلکہ یہ کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا کہ اب اس کے علاوہ میرا کوئی دوست نہیں تھا فرید چچا اب بالکل قابل اعتبار نہیں رہے تھے کھانے کی میز پر ان کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتے ہوئے بھی مجھے بہت کراہیت ہوتی تھی البتہ اس کے بعد وہ مجھے کبھی شمشان گھاٹ جاتے نظر نہیں آئے تھے۔

پھر ایک دن میں نے ایک اور منظر دیکھا۔ تایا ابو کے کمرے کے سامنے سے گزر رہا تھا کہ اندر سے تایا ابو اور فرید چچا کے باتیں کرنے کی آوازیں سنائی دیں۔

"جی بڑے بھائی۔" دو کروڑ دس لاکھ ہیں۔" یہ فرید چچا کی آواز تھی۔

"لیکن یہ تم نے کیا کئے.....؟" تایا ابو نے کہا۔

"بس بڑے بھائی جی۔ کبھی کبھی تقدیر ایسے ہی کھیل کھیلتی ہے۔" فرید چچا کی افسردہ آواز سنائی دی۔

"بتاؤ۔ کیا ہوا؟"

"میں نہیں جانتا بھائی جی کہ لوگوں کے دل میری طرف سے برے کیوں ہوئے۔"

"اس کی وجہ تو ہے فرید۔" بڑے بھائی نے صاف گوئی سے کہا۔

"یعنی میرے شوق۔"

"ہاں۔ وہ اچھے تو نہیں تھے۔"

"بھائی جی، میری باتیں آپ کو بری تو ضرور لگیں گی۔ ابا جی نے جو کچھ کیا تھا ہماری زندگی میں ہی کیا تھا کیا ان کے عمل ہمیں معلوم نہیں تھے۔"

"مطلب.....؟"

"انہیں کسی نے روکا۔"

"وہ ہمارے باپ تھے۔"

"باپ بھی تھے اور زمیندار بھی تھے۔ ایک سخت گیر زمیندار، کسی کی مجال تھی کہ انہیں روکتا۔ بڑے بھائی

ہم سب جانتے تھے کہ ہم میں سے کسی نے ان کا راستہ روکا تو ہم اس دنیا میں نہیں رہیں گے۔"

"اب وہ اس دنیا میں نہیں رہیں۔ اس لئے گڑے مردے نہ اکھاڑو۔" تایا ابو نے کہا۔

"میں گڑے مردے نہیں اکھاڑ رہا، بتا رہا ہوں کہ میری رگوں میں بھی انہیں کا خون تھا۔ رنگین مزاجی مجھے خون کے ورثے میں ملی تھی۔"

"ہم بھی تو انہیں کی اولاد ہیں۔"

"مانتا ہوں۔ لیکن جب مجھے احساس ہوا کہ یہ سب برا ہے تو میں نے سب چھوڑ دیا۔ آپ اس بات سے انکار کریں گے۔"

"ہرگز نہیں۔ مرحوم اماں بھی کہا کرتی تھیں کہ میرا فرید واپس آ گیا ہے۔ وہ اس بات سے بہت خوش تھیں۔" تایا ابو نے گلوگیر لہجے میں کہا۔

"پھر بھی بھائی جی۔ گھر میں مجھے اچھی نظروں سے نہیں دیکھا جاتا۔"

"مجھے معاف کرنا اس میں کچھ وقت لگے گا۔ اور پھر تم نے یہ جو کچھ کیا ہے وہ تو بہت برا کام ہے اس سے تمہاری صاف نیت اور اچھے کردار کا پتہ چلتا ہے۔"

"عظمت بھائی میرا خون تھے۔ اور اشرف، وہ بھی میرا اپنا ہے میں تو یہ سب آپ لوگوں کے حوالے کرنے کو تیار ہوں، تاکہ آپ کو میرے خلوص کا یقین آ جائے میرا خیال ہے بھابھی صاحبہ اور اشرف کو اس بارے میں اطلاع دے دی جائے۔"

"وہیں اپنے کمرے میں ہے، چلیں۔"

"جی چلئے۔" دونوں اپنی جگہ سے اٹھ گئے۔

مجھے حال کا ٹھیک سے اندازہ تو نہیں تھا لیکن جو کچھ میں سن چکا تھا اس سے ضرور پتہ چل گیا تھا کہ فرید چچا نے کوئی نئی چال چلی ہے جہاں تک ان کے خلوص کا تعلق تھا اس کے بارے میں تو میں اچھی طرح جانتا تھا کہ اب وہ کیا ہیں۔

چنانچہ میں نے اپنے کمرے کی طرف چھلانگ لگاڑی اور چھلاوے کی طرح غڑاپ سے اپنے کمرے میں داخل ہو گیا شکر ہے امی اس وقت واش روم میں تھیں ورنہ میرے اس طرح دوڑ کر آنے کی وجہ ضرور پوچھتیں۔ میں اپنی رائٹنگ ٹیبل پر پہنچا اور کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔ میں نے ایک کتاب کھول کر سامنے رکھ لی۔ اسی وقت دروازہ نوک ہوا تھا۔ پھر تایا ابو کی آواز سنائی دی۔

"دلہن ہم آ سکتے ہیں۔"

میں نے کتاب درمیان سے کھول کر الٹ کر رکھ دی اور دروازے کے قریب پہنچ کر اسے کھولا۔ "امی واش روم میں ہیں تایا ابو۔ آ جائیے۔"

تایا ابو فرید چچا کے ساتھ اندر داخل ہو گئے۔ انہوں نے میز پر نگاہ ڈالی اور مسکرا کر بولے۔ "ہوں، تو اسٹڈی ہو رہی ہے۔"

"جی.....تایا ابو۔" میں نے کہا۔

دونوں کرسیاں گھسیٹ کر بیٹھ گئے۔ اسی وقت امی سر پر دوپٹہ درست کرتی ہوئی واش روم سے باہر آ گئیں انہوں نے سلام کیا تو صرف تایا ابو نے جواب دیا تھا فرید چچا بالکل خاموش بیٹھے ہوئے تھے۔ "ایک ضروری کام سے تمہارے پاس آئے ہیں ہم لوگ۔" تایا ابو نے کہا۔

"مجھے طلب کرلیا ہوتا بھائی جی۔" امی نے کہا۔

"ایک ہی بات ہے۔ خیر، ایک خوشخبری بھی ہے اور ایک درخواست بھی۔"

"آپ حکم دیجیے بھائی جی۔"

"دلہن، ہم جن حالات کا شکار ہیں تم بھی اچھی طرح جانتی ہو۔ ارواح خبیثہ ہمیں ہر طرح آزار پہنچا رہی ہیں۔ بار بار ابا میاں کا نام لے کر ان کی روح کو شرمندہ کرنا بہت افسوس امر ہے۔ اس لئے اب ان کا نام لئے بغیر یہ کہنا بہت ضروری ہے کہ یہ روحیں ہمیں نقصان پہنچانے کے درپے ہیں اور ہر رخ سے حملے کر رہی ہیں۔"

"بیشک بھائی جی۔"

"ہمارے پیارے ہم سے دور کر دیئے گئے۔ ہمیں ہر طرح کا نقصان پہنچایا جا رہا ہے۔"

"جی....." امی نے دکھ بھری سانس لی۔

"ہمارے درمیان پھوٹ بھی ڈالوائی جارہی ہے خاص طور سے فرید کے خلاف کافی بڑی مہم چلائی جارہی ہے۔ میں چاہتا ہوں دلبن، پہلے ہم لوگ اپنے دل صاف کرلیں۔"

"فرید کو میں نے اپنا دیور نہیں بیٹا سمجھا ہے بھائی جی اور اب بھی سمجھتی ہوں، مجھ سے کوئی غلطی ہوگئی ہو تو براہ کرم اس کی نشاندہی کردیں۔ آئندہ نہیں ہوگی۔"

"میں جانتا ہوں آپ اعلیٰ نسب خاتون ہیں۔ میں فرید کی سفارش کرتا ہوں کہ اس کی طرف سے دل صاف کرلیں۔"

"وہ میرا بیٹا ہے۔" امی نے کہا۔

"شکریہ..... ہاں اس نے ایک ایسا کارنامہ سرانجام دیا ہے جس کا کوئی جواب نہیں۔"

"جی.....!"

"چوہدری بشیر اینڈ سنز طویل عرصہ سے عظمت خان کی بہت بڑی رقم دبائے بیٹھا تھا۔ یہ رقم دو کروڑ سے زیادہ تھی فرید نے کوشش کرکے یہ رقم وصول کرلی یوں سمجھ لو دلبن یہ رقم ڈوبی ہوئی تصور کرلی گئی تھی اسے ان لوگوں سے نکلوالینا ایک تاریخی قدم ہے۔ جس پر میں خود حیران ہوں۔"

"اوہ..... یہ تو بڑی خوش خبری ہے۔" امی نے کہا۔

"یہ اس کے کاغذات ہیں بھابھی۔ آپ یہ چیک بینک میں جمع کرادیں۔"

"میں کیوں کرادوں..... یہ تو تمہارا کام ہے۔"

"جیسا آپ حکم دیں۔ لیکن۔"

"میں نے آج تک اس بارے میں کچھ نہیں کہا ہے فرید، اگر میرے منہ سے کوئی بات نکلی ہے تو بتادو۔"

"بالکل نہیں بھابھی۔ خراب دوسری باتیں کرنے سے کیا فائدہ۔ مجھ سے جب آپ کا دل چاہے حسابات کے بارے میں پوچھ سکتی ہیں۔"

"کبھی نہیں پوچھوں گی۔ ختم کردان باتوں کو۔" امی نے کہا۔

میں اس دوران بالکل خاموش رہا تھا۔ کافی دیر تک وہ بیٹھے رہے پھر چلے گئے۔ فرید چچا کو میں جس عالم میں دیکھ چکا تھا اس کے بعد ان پر کسی طرح کا بھروسہ کرنا خود کو دھوکہ دینا تھا۔ اس کی تصدیق رات کو منیکا نے کردی۔ مجھ سے تفصیل سن کر اس نے تشویش سے کہا تھا۔

"اس کا مطلب ہے کہ....." وہ رک گئی..... پھر بولی۔ "چھوٹے راجکمار..... ایک بات بتاؤ۔"

"ہاں بولو۔"

"تم یہ تو نہیں سمجھتے کہ میں تمہیں تمہارے پریوار کے خلاف بھڑکا رہی ہوں۔"

"نہیں....." میں نے سرد لہجے میں کہا۔

"میری بات کا برا مان گئے۔"

"نہیں، تم میری تنہا دوست ہو دوبارہ ایسا مت کہنا۔" میں نے سنجیدگی سے کہا اور وہ مسکرانے لگی پھر بولی۔

"فرید خان مہاراج، کالی ودیا سیکھ رہے ہیں۔ ان کا دھرم نشٹ کرنے والے ان پر دن رات محنت کررہے ہیں جن لوگوں سے انہوں نے ڈوبی رقم نکلوائی ہے انہوں نے کالی ودیا کے زور پر وہ رقم دی ہے۔ چاہو تو معلوم کرلو۔"

"ضرور ایسا ہی ہوا ہوگا۔" اس کا مطلب ہے کہ فرید خان اور خطرناک ہوگئے۔ میں نے تشویش سے کہا۔

"بھگوان تمہاری سہائتا کرے۔"

واقعی تشویش ہوگئی تھی۔ کوشش کے باوجود میں نے فرید خان کو دوبارہ شمشان گھاٹ جاتے ہوئے نہیں دیکھا۔ بلکہ اب ان کا رویہ میرے ساتھ بہت ہی اچھا ہوگیا تھا۔ وہ بڑے پیار سے مجھے اپنے پاس بلاتے۔ اور سارے حسابات کے کھاتے کھول کر میرے سامنے رکھ دیتے۔

"میں جانتا ہوں ابھی تم ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ لیکن بیٹے تمہاری عمر دراز ہو آگے چل کر تمہیں یہ سب دیکھنا ہوگا انہیں دیکھو مجھ سے اس

بارے میں پوچھو۔ یہ الفاظ انہوں نے ایک دن اس وقت کیے تھے جب امی اور تایا ابو ایک ساتھ دروازے سے اندر داخل ہورہے تھے اور انہوں نے یہ الفاظ سنے تھے۔ وہ ان سے بہت متاثر ہوئے تھے اور مجھے ان کی اس کاوش کا بھی پتہ چل گیا۔ تایا ابو نے اس دن خاص طور سے مجھے بلایا تھا امی بھی ان کے ساتھ تھیں اور کچھ فکرمند نظر آرہی تھیں۔

"اشرف، تیاری کرو، تمہیں لاہور جانا ہے۔" تایا ابو نے کہا۔

"لاہور..... کیوں خیریت؟" میں نے کہا۔

"تم وہیں تعلیم حاصل کروگے۔"

"اکیلا جاؤں گا میں۔"

"ہاں۔ تمہاری رہائش برقی صاحب کے ہاں رہے گی۔ وہاں ان کی شاندار کوٹھی ہے، ان کے سارے خاندان والے وہیں رہتے ہیں تمہیں وہاں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔"

"امی بھی وہاں جائیں گی؟"

"نہیں بیٹے، پڑھنا تمہیں ہے، امی کو نہیں۔"

"میں امی کے بغیر نہیں جاؤں گا۔"

"نہیں اشرف۔ میں نہیں جاسکتی۔ تم وہاں اکیلے نہیں ہوگے۔ بہت سے لوگ ہیں وہاں تایا ابو فون پر بات کرچکے ہیں۔"

"ارے واہ۔ مجھ سے پوچھا بھی نہیں گیا اور آپ لوگوں نے سارے معاملات طے کرلئے۔" میں نے کسی قدر غصے سے کہا۔

"ہمیں یہ بتانے کی کوشش مت کرو کہ تم بڑے ہوگئے ہو اور ہم تمہارے بارے میں کوئی فیصلہ تم سے پوچھے بغیر نہیں کرسکتے۔" تایا ابو نے شدید غصے سے کہا اور میں ہکا بکا رہ گیا۔ تایا ابو نے اس لہجے میں کبھی مجھ سے بات نہیں کی تھی۔ میں حیرت سے ان کی صورت دیکھنے لگا۔ پھر میں نے امی کی طرف دیکھا ان کے چہرے کے تاثرات بتارہے تھے کہ وہ بھی میرے ساتھ کوئی رعایت نہیں کرنا چاہتیں۔ البتہ رات کو انہوں نے کہا۔

"لاہور جانے سے انکار مت کرو اشرف۔ اتنی بڑی جائیداد اور دولت کو سنبھالنے کے لئے تمہاری تعلیم ضروری ہے میں تمہارے لاہور جانے کے حق میں ہوں۔"

"ٹھیک ہے امی۔ بعد میں آپ کو خصوصاً میں آپ کے بارے میں کہہ رہا ہوں آپ کو اپنے اس فیصلے پر افسوس ہوگا۔"

پھر میں نے منیکا کو اس بارے میں بتایا تو وہ دم بخود رہ گئی۔

"تم نے ان کی بات مان لی۔"

"امی نے اس فیصلے کی توثیق کردی ہے۔" میں نے کہا تو وہ رونے لگی۔ "مجھے جانا ہوگا منیکا تم سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں۔"

"کیا.....؟"

"تمہیں اتنی پراسرار قوتیں حاصل ہیں عام لوگوں کے لئے تو گجر گھاٹ سے لاہور تک کا سفر کافی زیادہ ہے تم تو پرندہ بن کر بھی پرواز کرسکتی ہو۔"

"نہیں کرسکتی۔" اس نے بدستور روتے ہوئے کہا۔

"کیوں.....؟"

"سینکڑوں بدروحیں ہماری دشمن ہوتی ہیں۔ کالی ماتا کے پجاری، بھوانی دیوی کے داسوں سے نفرت کرتے ہیں اور جب بھی موقع ملتا ہے انہیں ہلاک کردیتے ہیں ہمارے لئے ایک حلقہ محفوظ کردیا جاتا ہے اور ہمیں ان سیماؤں میں رہنا ہوتا ہے چاہے ہم کچھ بھی بن جائیں۔"

"تو تم لاہور نہیں آسکو گی۔"

"نہیں۔"

"اوہ..... یہ تو بڑی پریشانی کی بات ہے۔" میں نے کہا۔ اور وہ روتی رہی، پھر میں نے کہا۔ "مجھے بتاؤ منیکا پھر میں کیا کروں۔"

"جاؤ چھوٹے راجکمار۔ وچھوڑا تو جیون کا سب سے بڑا دکھ ہوتا ہے۔ بھگوان کرے تم اپنے دشمنوں سے محفوظ رہو اگر کبھی منیکا یاد آئے تو....." پھر اس کی آواز بھرا گئی۔

"میں گجر گھاٹ جلدی جلدی آیا کروں گا۔"

"ٹھیک ہے۔" وہ بے چارگی سے بولی۔

میں بھی بہت افسردہ ہوگیا تھا۔ بڑی اچھی دوست تھی میری، میری محافظ بھی یہ اسی کا دم تھا کہ میرے دشمن مجھے نقصان پہنچانے میں ہمیشہ ناکام رہے تھے۔ اب مجھے خود محتاط رہنا ہوگا۔ امی اور تایا ابو نے سب کچھ نظر انداز کردیا تھا۔ وہ بھول گئے تھے کہ دشمن روحیں مجھے ہر قیمت پر ختم کردینا چاہتی ہیں کیونکہ میں اپنے دادا کا ہمشکل تھا۔

لاہور جاکر تعلیم حاصل کرنا ایک سنہرا خواب تھا پوری زندگی گجر گھاٹ میں گزارنی تھی یہاں کے ایک ایک گوشے سے پیار تھا لیکن زندگی میں اور بھی کچھ دیکھنے کی آرزو ہوتی وہ وہ بھی اس عمر میں جو دیکھنے کی عمر ہوتی ہے دو تین بار لاہور گیا تھا صاف شفاف سڑکوں کا، ہرے بھرے پارکوں کا، خوبصورت اور قابل دید عمارتوں کا اور جدید ترین بازاروں کا یہ جگمگاتا شہر مجھے بہت پسند تھا۔ لیکن میں نے کبھی وہاں جاکر رہنے کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔ اور اب تو صورت حال ہی بدلی ہوئی تھی دادا ابو کی موت کے بعد حویلی میں جو کچھ ہوا تھا اور ہو رہا تھا وہ ہم لوگوں کے لئے عجیب ہوگیا تھا کبھی کبھی تو یوں لگتا تھا جیسے ہم سب کو سزائے موت سنادی گئی ہو اور ایک ایک کرکے اس خاندان کے افراد کو سولی پر لٹکایا جارہا ہے گھر سے دور جاکر بھی زندگی گزارنا ایک مشکل کام تھا۔

دل ہر وقت حویلی میں بھی بھٹکتا رہے گا مزید یہ کہ مینکا زندگی کا بہت بڑا حصہ بن چکی تھی میں نہیں جانتا تھا کہ عشق کیا ہوتا ہے کیسے ہوتا ہے لیکن اب مینکا مجھے بے حد عزیز تھی اور میں اس سے دور نہیں جانا چاہتا تھا البتہ اپنے گرد موجود لوگوں پر مجھے حیرت ہوتی تھی میں ان سب کی آنکھوں کا تارا تھا۔ پہلے کبھی غور نہیں کیا تھا لیکن اب غور کیا تو احساس ہوا کہ وہ سب مجھ سے بہت پیار کرتے تھے۔

لیکن اب.....؟ تایا ابو، کلثوم پھوپھی، فرید چچا، سب کی آنکھیں بدل گئی تھیں آخر ایسی کون سی تعلیم تھی کس کس نے گجر گھاٹ سے باہر جاکر تعلیم حاصل کی تھی۔ خاص طور سے امی۔

آنکھوں میں آنسو آگئے۔ امی بھی مجھے خود سے دور کرنے پر تیار تھیں۔ یہ کمال کی بات تھی دل میں یہ خیال جڑ پکڑ چکا تھا کہ ان تمام باتوں کے پیچھے فرید چچا کا ہاتھ ہے۔ پھر ایک اور خیال دل میں آیا اور میں بری طرح چونک پڑا۔

کئی تاریخیں گزر گئی تھیں حویلی میں کوئی نیا حادثہ نہیں ہوا تھا۔ سب ٹھیک تھا کیوں؟ کیا فرید چچا کی وجہ سے۔ کیا انہوں نے ان دشمن روحوں سے سمجھوتہ کرلیا تھا ایک طرح تو یہ بات حویلی والوں کے حق میں جاتی تھی پھر میں نے ایک فیصلہ کیا آخری بار ایک کوشش اور کرلیتا ہوں۔ باقی لوگوں کے بدلے ہوئے رویے کو تو میں دیکھ چکا تھا۔ لیکن۔ امی۔

"امی۔" میں نے آدھی رات کو امی کو آواز دی اور وہ چونک کر جاگ گئیں۔ ان کی آواز ابھری۔

"اشرف۔"

"جی امی۔"

"تم نے مجھے آواز دی تھی۔"

"ہاں۔" میں نے کہا۔

"ابھی تک جاگ رہے ہو؟"

"کئی راتوں سے جاگ رہا ہوں۔ آپ نے اب مجھ پر توجہ دینا چھوڑ دی ہے۔"

"کیوں جاگ رہے ہو؟"

"مجھے آپ پر حیرت ہے امی۔"

"کیسی حیرت۔"

"آپ مجھے خود سے دور کررہی ہیں۔"

"ایسا تو نہیں ہے اشرف۔ تم کون سا ملک سے باہر جارہے ہو۔ لاہور سے گجر گھاٹ کا فاصلہ ہی کتنا ہے۔ جب چاہو یہاں آسکتے ہو۔ تعلیم حاصل کرنے کے لئے تو لوگ دوسرے ملکوں کو چلے جاتے ہیں۔

"ہمارے گھر میں کس نے دوسرے ملک جاکر

تعلیم حاصل کی ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے۔ مگر وقت بدل گیا ہے۔ تم نئی نسل کے نمائندے ہو۔ روایتی زمینداری سے ہٹ کر جدید دور کا ساتھ دینا ضروری ہے اور اس کے لئے تم ملکھاؤں کے خاندان کے واحد لڑکے ہو۔"

"پتہ نہیں آپ کس کی زبان بول رہی ہیں۔"

"خود کو سنبھالو اشرف، تمہیں لاہور جانا ہی ہوگا۔"

"ہاں۔ میں چلا جاؤں گا۔ لیکن شاید میں آپ کی توقعات پر پورا نہ اتروں۔" میں نے کہا۔ اندازہ ہوگیا تھا کہ امی پوری طرح ٹریپ ہوچکی ہیں۔

میرے لاہور جانے کی تیاریاں ہونے لگیں برقی صاحب کو بھی اطلاع دے دی گئی تھی فرید چچا مکمل شیطان بن چکے تھے وہ ہر ایک کے سامنے سر جھکائے رہتے تھے۔ ہر ایک کے تابعدار بن گئے تھے لیکن جب بھی ان کی نظریں مجھ سے ملتیں ان کی آنکھوں میں ان کے ہونٹوں پر ایک طنزیہ مسکراہٹ پھیلی نظر آتی تھی۔

اس رات میں نے مینکا سے آخری ملاقات کی۔ اس کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔

"کل جارہا ہوں۔"

"بھگوان تمہیں سکھی رکھے۔"

"میں تمہارے پاس آیا کروں گا۔"

"اچھا۔"

"تم نے جمنا داس جی سے بات کی۔"

"کس بارے میں۔"

"یہی کہ جب وہ تمہیں اتنے سارے علم سکھا سکتے ہیں تو کیا کوئی ایسا علم نہیں سکھا سکتے کہ تم میرے پاس لاہور بھی اس طرح آسکو جس طرح یہاں آجاتی ہو۔"

"میں ان بات کی تھی۔" وہ اداسی سے بولی۔

"تو پھر.....؟"

"جادو دویا میں حد یا، پانی بڑی حیثیت رکھتے ہیں۔"

"مطلب۔"

"سارے جادو پانی پار کرنے سے ختم ہوجاتے ہیں۔ گجر گھاٹ سے لاہو رجاتے ہوئے دریا کے اوپر سے گزرنا ضروری ہے۔ اگر میں نے ایسا کیا تو میرے سارے گیان نشٹ ہوجائیں گے۔"

"اوہ۔" میں نے گہری سانس لی۔ اب تو یہ احساس ہونے لگا تھا کہ مجھے سب سے زیادہ دکھ مینکا سے جدا ہونے کا ہے۔ لیکن یہ بھی لگ رہا تھا کہ اب جیسے مینکا مجھ سے دور ہورہی ہے ہمیشہ کے لئے۔

میری لاہور روانگی میں کوئی اہتمام نہیں تھا۔ ابرار بھائی مجھے چھوڑنے جارہے تھے مینکا سے گزری رات مل چکا تھا۔ سب مجھے الوداع کہہ رہے تھے نصیحت کررہے تھے لیکن فرید چچا کی فاتحانہ نظروں کو میں کبھی نہیں بھول سکتا تھا یوں لگتا تھا جیسے انہوں نے مجھے شکست دی ہو، مجھ سے میری آبائی حویلی چھین لی ہو۔

لاہور میں البتہ برقی صاحب اور ان کے اہل خاندان نے جس طرح میرا استقبال کیا وہ مجھے بہت اچھا لگا تھا وہ خود پشاور میں رہتے تھے لیکن ان کے خاندان کے بیشتر افراد لاہور میں تھے۔ نوجوان لڑکے، لڑکیاں ہماری حویلی کی نسبت یہ لوگ کافی آزاد خیال تھے۔ اس کے ساتھ ہی کچھ دلچسپ معاملات بھی تھے۔ جن کا اندازہ مجھے بعد میں ہوا۔

تقریباً چار کنال کی یہ کوٹھی بہت خوب صورت بنی ہوئی تھی۔ بے شمار کمرے تھے جو بہت عمدگی سے آراستہ تھے افراد کی ایک پوری فوج نے میرا استقبال کیا تھا۔

برقی صاحب نے کہا۔ "اشرف بیٹے۔ میں نے بڑے پیار سے تمہیں یہاں بلایا ہے۔ ہمارے خاندانوں میں جو تعلق ہے وہ اتنا مضبوط ہے کہ اس کے بارے میں مجھ کہنا فضول ہے۔ میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ تم بھی اس خاندان کے ایک فرد ہو جو تمہارے سامنے ہے۔ تم یہاں خود کو اجنبی مت سمجھنا۔"

"جی تایا جی۔" میں نے کہا۔

"ہمارے گھر کی سب سے بزرگ خاتون سے ملو پوری کوٹھی کی ساری ذمہ داری انہیں پر ہے کسی کو کوئی ضرورت ہوتی ہے کسی کو کسی سے کوئی شکایت ہوتی ہے تو انہیں کے پاس فریاد لے کر جاتا ہے اور یہ اس کی مشکل

حل کر دیتی ہیں کہنے کا مطلب یہ ہے کہ تمہیں کبھی کوئی ضرورت ہو کوئی مشکل ہو تو تم بھی گھر کے دوسرے لوگوں کی طرح ان سے کہہ سکتے ہو۔" برقی صاحب نے کہا۔

میں ان خاتون کی تلاش میں نگاہیں دوڑانے لگا۔ کئی عمر رسیدہ خواتین یہاں موجود تھیں، لیکن میں فیصلہ نہیں کر سکا کہ برقی صاحب کس کے بارے میں کہہ رہے ہیں۔ برقی صاحب بولے۔

"آیئے محترمہ۔ اشرف سے ملئے۔

تقریباً پانچ سال کی ایک نیلی آنکھوں اور حد جیسے سفید رنگ والی انتہائی حسین نقوش کی مالک ایک بچی آگے بڑھ آئی اس کے چہرے پر پوری سنجیدگی طاری تھی۔ پہلے اس نے میرے گرد چکر لگایا۔ اور میں حیرت سے دیکھنے لگا۔ پھر وہ میرے سامنے رک گئی پھر اس کی آواز کا نغمہ ابھرا۔

"معقول نوجوان نظر آتے ہیں۔ لیکن ایک نگاہ میں کسی کے بارے میں فیصلہ مشکل ہوتا ہے۔" تاہم عزیزم آپ کا نام تو ہمیں معلوم ہو چکا ہے اشرف ہے۔ ہمیں عریشہ کہتے ہیں ویسے ہم مکمل فریشہ ہیں۔ عریشہ ہونا تو بہت بڑا منصب ہوتا ہے۔" میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں یہ کس عمر کی بچی بول رہی ہے عرش اور فرش کو اس طرح سمجھتی ہے مجھے وہ بہت اچھی لگی تھی۔

"اب میں آپ سے ان سب کا تعارف کرا دوں۔ یہ ہمارے گھر کی بزرگ خواتین ہیں وہ ان خواتین کے بارے میں بتانے لگی جو عمر رسیدہ تھیں اور یہ نیک پروین نوجوان لڑکیاں ہیں یہ ثانیہ ہیں یہ ظافرہ ہیں یہ عباد صاحب ہیں یہ عاکف فی الحال آپ ان کے نام جان لیجیے کس کا کس سے کیا رشتہ ہے یہ بعد میں خود پتہ چلتا رہے گا۔

کمال کی لڑکی تھی اس نے میرے بارے میں ملازموں کو ہدایات دیں۔ اور مجھے پیچھے کی منزل میں ہی ایک کمرہ دے دیا گیا جو ہر طرح آراستہ تھا۔ رات کی ڈنر ٹیبل پر پورا خاندان جمع تھا کھانے کے بعد برقی صاحب نے کہا۔

"تم بہت جلد اس ماحول میں ایڈجسٹ ہو جاؤ گے عاکف تمہارے سارے تعلیمی معاملات دیکھیں گے اور تمہارا ایڈمشن کرا دیں گے میں صبح پشاور چلا جاؤں گا ویسے میں آتا رہتا ہوں تم آرام سے رہو۔"

"جی تایا جان۔" میں نے کہا۔

اپنے بیڈ روم میں، میں اکیلا تھا تنہائی کاٹے کھا رہی تھی۔ زندگی میں شاید ہی کبھی رویا ہوں گا لیکن آج رونا آ رہا تھا۔ ماں سے شکایت تھی کہ انہوں نے کس طرح میری جدائی قبول کر لی تھی اور مدیکا تھی جس کی بے بسی یاد آ رہی تھی۔

رات سوتے جاگتے گزری۔ یہاں کے ماحول کے بارے میں اندازہ لگایا کہ نارمل سا ہے سیدھے سادھے لوگ ہیں سادہ لباس پہنتے ہیں کوٹھی کے ماحول میں بھی رکھ رکھاؤ تھا۔ ناشتے کی میز پر برقی صاحب موجود تھے پھر اس کے بعد وہ چلے گئے۔ میں اپنے کمرے میں آ گیا۔

کمرے میں بیٹھ کر میں سوچ رہا تھا کہ اب کیا کروں کہ کہیں سے انگریزی موسیقی کی آواز ابھری جو کافی اونچی تھی۔ اس کے بعد شور شرابہ ہونے لگا۔ میں حیران ہو رہا تھا کہ اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی اور عریشہ کی پیاری آواز ابھری۔

"ہم حاضر ہو سکتے ہیں۔"

میں نے آواز پہچان لی۔ یہ بچی مجھے بہت پیاری لگی تھی۔ میں نے خوش دلی سے کہا۔ "تشریف لایئے۔" اور وہ اندر داخل ہو گئی۔

"آیئے۔ نیرنگیٔ ثقافت دوران دیکھیے۔" اس نے کہا۔

"جی کیا فرمایا۔" میں نے مسکرا کر کہا۔

"دنیا کی دورنگی کے بارے میں کہہ رہے ہیں۔ انسانیت کس طرح چولا بدلتی ہے۔ اپنی آنکھوں سے دیکھیے۔"

"تھوڑی سی وضاحت فرما دیں تو عنایت ہو گی۔" میں نے بھی فصاحت و بلاحت کا مظاہرہ کیا۔ اور وہ بڑے عالمانہ انداز میں چلتی ہوئی ایک صوفے

پر بیٹھ گئی۔

"زمانہ بہت بدل گیا ہے۔ نئی نسل جدیدیت کے نام پر بے لگام ہو گئی ہے بزرگوں کو تماشہ بنا کر رکھ دیا ہے مگر قصور بزرگوں کا بھی ہے۔ انسان اپنے بچوں کے مزاج کو بھی نہ سمجھ سکے تو پھر تو اس کی غلطی ہوئی۔ اب ان برقی صاحب کو یعنی ہمارے دادا حضور کو دیکھ لیجیے۔ انہیں نہیں معلوم کہ ان کے بچے کیا مزاج رکھتے ہیں۔ بس یہ اس وقت تک ان کے انداز اختیار کر لو، جب تک وہ سامنے ہیں۔ اس کے بعد..... او مائی گاڈ۔"

میں پاگلوں کی طرح اس کی صورت دیکھ رہا تھا۔ یہ ایک پانچ چھ سال کی بچی بول رہی ہے۔ کون یقین کر سکتا تھا۔ دفعتاً وہ چونک کر بولی۔

"ارے جناب۔ میں آپ کو بلانے آئی تھی یہاں بیٹھ گئی۔ آیئے۔ اٹھیے پلیز۔" وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر میرے قریب آئی، میرا ہاتھ پکڑا اور دروازے کی طرف چل پڑی۔ میرا ذہن یہاں بھی مختلف انداز میں سوچ رہا تھا۔ کیا یہ واقعی اتنی چھوٹی سی بچی ہے یا اس کے روپ میں کچھ اور۔

دراصل اتنے پراسرار حالات میں اب تک کی زندگی گزری تھی کہ اب ہر چیز مشکوک ہو گئی تھی۔ وہ مجھے لئے ہوئے کوٹھی کے بالکل اندرونی حصے میں پہنچ گئی۔ ایک دروازے کی دوسری طرف سے انگریزی موسیقی کی آوازیں ابھر رہی تھیں اس نے دروازہ کھولا اور تیز موسیقی کا طوفان ابل پڑا۔ اندر کا منظر ناقابل یقین تھا۔ میرا اس کوٹھی میں جن لوگوں نے استقبال کیا تھا وہ سیدھے سادھے مشرقی لباس شلوار قمیض میں ملبوس تھے۔ لڑکیوں کے سروں پر دوپٹے اوڑھ رکھے تھے۔

لیکن اس وقت ہال میں نوجوان لڑکے لڑکیاں، جدید ترین لباسوں میں ملبوس رقص کر رہے تھے۔ لڑکیاں پتلونیں پہنے ہوئے تھیں خوب شور شرابا ہو رہا تھا عاکف میرے پاس آ گیا۔

"آؤ اشرف تمہیں رقص آتا ہے۔"

"نہیں۔" میں نے کہا۔

"تو پھر سیکھو۔" رقص زندگی ہے۔

"میں زندگی دیکھوں گا۔" میں نے کہا۔ اسی وقت پیچھے سے عریشہ کی آواز سنائی دی۔

"گو پھر آؤ۔ میں آپ کو زندگی دکھاؤں۔"

جایئے آپ جایئے۔ میں ان کے ساتھ بیٹھتی ہوں۔" اس نے کہا اور میرا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف بڑھ گئی۔ لیکن ساتھ ہی ظافرہ بھی آ گئی تھی۔ یہ خوب صورت نقوش کی مالک دراز قامت لڑکی تھی۔

"آپ انہیں زندگی نہ دکھایئے۔ بلکہ انہیں میرے پاس چھوڑ دیجیے۔" اس نے عریشہ سے کہا۔

"چلیے یہ کام آپ کر لیجیے۔" عریشہ نے کہا اور وہاں سے آگے بڑھ گئی۔

"آپ کو یہ عجیب لگ رہا ہو گا اشرف صاحب۔" ظافرہ نے کہا۔

"ہاں۔ میں نے یہ سب پہلے نہیں دیکھا، آپ کو علم ہے کہ میں دیہاتی ہوں۔"

"نہیں خیر، گجر گھاٹ گاؤں تو نہیں ہے۔" وہ بولی۔

"پھر بھی۔ یہ سب وہاں نہیں ہے۔"

"برا لگ رہا ہے یہ ماحول آپ کو؟"

"بالکل نہیں۔ اجنبی لگ رہا ہے۔ ویسے ایک بات بتایئے؟"

"جی۔"

"معافی چاہتا ہوں۔ آپ برا تو نہیں مانیں گی۔"

"نہیں۔ بتایئے۔"

"برقی صاحب کی موجودگی میں آپ کے حلئے اور لباس بہت مختلف تھے۔"

"یہ جنریشن گیپ ہے۔"

"مطلب؟"

"بزرگوں نے وقت سے سمجھوتہ نہیں کیا ہے۔ وہ مٹی کے تیل کے لیمپ اور سرسوں کے تیل کے چراغوں کے دور سے تو نکل آئے ہیں بجلی کا استعمال اور گھوڑے کی سواری کے بجائے کاروں اور جہازوں میں تو سفر کرتے ہیں لیکن نئی نسل کی ضرورتوں کو تسلیم نہیں

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY

کرتے۔"

"نئی نسل کی ضرورتیں، یعنی، فحاشی، بے حجابی، آوارگی، نئی نسل کی ضرورت ہے۔"

"آپ کے تینوں لفظ غلط ہیں۔ نئی نسل وہ ہیں جس نے آپ کی صحت کو تحفظ دیا ہے۔ جس نے آپ کو زندگی کی وہ سہولتیں دی ہیں جنہیں آپ نے بخوشی اپنا حق سمجھ لیا ہے۔ نئی نسل نہ فحش ہے نہ بے حجاب ہے اور نہ آوارہ۔ ان سب کو دیکھ لیجیے یہ سب تو جوان ہیں۔ خوب صورت اور تندرست ہیں لیکن ان میں سے کوئی ایک دوسرے کو بری نگاہ سے نہیں دیکھ رہا۔ آپ چور نگاہوں سے ان کا جائزہ لیں ان کا تجزیہ کریں جبکہ ماضی کی داستانوں میں صرف جنس مخالف کے المیے ہیں۔ ماضی میں چھتوں کے رومانس ہیں۔ مثنوی زیر عشق ہے نئے دور میں یہ سب کچھ نہ ہونے کے برابر ہے۔ ہم سب برقی صاحب کا احترام کرتے ہیں وہ گھر کا تبرک ہیں ہم اس تبرک کا احترام کرتے ہیں۔"

"ارے باپ رے۔ آپ تو اچھی خاصی مقررہ ہیں۔"

"کیسی تھی میری تقریر۔" وہ مسکرا کر بولی۔

"اس سے پہلے بھی میرا واسطہ اس سے پڑ چکا ہے۔" میں نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔

"نہیں سمجھی۔" وہ بولی۔

"محترمہ عرش اعظم۔۔۔"

"عرش اعظم۔" وہ اب بھی نہیں سمجھی تھی۔

"جی۔ عریشہ بیگم۔" وہ بھی اسی پائے کی تقریر کر چکی ہیں۔

"اوہ۔" وہ ہنس پڑی۔

"وہ بھی آپ ہی کی بگاڑی ہوئی ہیں۔" میں نے بے تکلفی سے پوچھا۔ میرا خیال تھا وہ میرے الفاظ کا برا مان جائے گی لیکن وہ میرے سوال پر خوب ہنسی۔ پھر بولی۔

"نہیں۔ اس کی اتالیق ثانیہ ہے۔ فلسفے میں ماسٹرز کر رہی ہے۔ اور اس نے عریشہ کو ماڈل بنایا ہوا ہے۔" مجھے ظافرہ پسند آئی تھی۔ بہت کشادہ زمین اور صاف ستھری طبیعت کی مالک تھی۔ تھوڑے ہی دنوں میں مجھ سے خوب بے تکلف ہو گئی تھی۔ لڑکے بھی بہت اچھے مزاج کے حامل تھے۔ عاکف تو خیر رندادل سے مددگار تھا لیکن عباد بھی اچھا دوست ٹائپ کا آدمی تھا۔ اس نے اپنے دوسرے دوستوں سے بھی میرا تعارف کرایا تھا اور مجھے بہترین کمپنی دی تھی نتیجے میں لاہور میں میرا دل لگ گیا۔

بس ایک منیکا یاد آتی تھی اور دل چاہتا تھا کہ اس کے لئے گجر گھاٹ جاؤں۔ دوسری شخصیت میری امی کی تھی جن سے مجھے پیار تھا لیکن میں نے ایک دکھ بھری بات محسوس کی تھی۔ ابتداء میں فون پر امی سے بات ہوتی تھی وہ روتی تھیں میری جدائی کا احساس کرتی تھیں لیکن رفتہ رفتہ وہ نارمل ہوتی گئیں۔

"نہیں بیٹے۔ اب میں بھی اس بات کی قائل ہو گئی ہوں کہ تعلیم حاصل کرنا ضروری ہے۔ تم ملکھان خاندان میں ایک نئی تاریخ لکھو گے۔ ہمارے خاندان میں کوئی اعلیٰ تعلیم یافتہ نہیں تھا۔ تم سے بہت سی امیدیں وابستہ ہیں۔"

"آپ کو دیکھے ہوئے بہت دن ہو گئے۔"

"جب تک تمہاری تعلیم نہ پوری ہو جائے تم گجر گھاٹ نہیں آؤ گے۔"

"ارے، کیوں۔ چھٹیوں میں بھی نہیں۔"

"اس کے بارے میں بعد میں بات کریں گے۔"

"عید بقر عید کو بھی نہیں۔"

"بھئی کہا نا اس کا فیصلہ ہو جائے گا۔" امی کا لہجہ جذبات سے عاری تھا۔ افسوس ہوا تھا لیکن پھر سوچا تھا کہ وہ لوگ مجھے پڑھنے کا موقع دینا چاہتے ہیں یہی بات ایک دن تایا ابو نے بھی کہہ دی۔

"یہاں سب خیریت ہے۔ بلکہ یہ کہا جا رہا ہے کہ تمہارے جانے کے بعد انتقام کی پیاسی بدروحوں کو بھی قرار آ گیا ہے ان کی سرگرمیاں یکلخت ختم ہو گئی ہیں۔ اب اس منحوس تاریخ سے بھی نجات مل گئی ہے۔"

"میرے جانے کے بعد۔" میں نے افسوس سے کہا۔

"ہاں۔ اس کی وجہ ہے۔"

"کیا تایا ابو۔"

"تم جانتے ہو تم ابا میاں کے ہمشکل ہو۔ اور دشمن روحیں ان کی وجہ سے ہماری دشمن ہوئی ہیں۔ افسوس صرف اس وجہ سے کئی قیمتی جانیں چلی گئیں۔"

"دادا ابو کا ہمشکل ہونا میرا قصور ہے تایا ابو۔" میں نے شکایتی لہجے میں کہا۔

"بحث کیوں کر رہے ہو۔ جو بہتر سمجھا جا رہا ہے کیا جا رہا ہے۔" تایا ابو کا لہجہ خشک ہو گیا اور میں خاموش ہو گیا لیکن دل بری طرح دکھا تھا۔ شدید غصہ بھی آیا تھا کتنے بے درد ہو گئے ہیں یہ لوگ۔ ایک طرح سے مجھے دیس نکالا دے دیا گیا ہے سب وہاں آرام سے رہ رہے ہیں۔

اور خاص طور سے امی؟

ویسے برقی صاحب اور ان کے اہل خاندان بے حد نفیس لوگ تھے کسی نے مجھے غیریت کا احساس نہ ہونے دیا تھا۔ ہم پھر سے لاہور کی سیر کرتے تھے لاہور بے حد خوب صورت تھا میرا دل یہاں اچھی طرح لگ گیا تھا لیکن حویلی یاد آ گئی تھی وہاں گزرے دن رات یاد آتے تھے اور امی..... وہ بہت یاد آتی تھیں منیکا تھی اس کے لئے دل بہت تڑپتا تھا وہ بھی مجھے بہت یاد کرتی ہو گی لیکن وہ صاحب اختیار تھی۔ پراسرار علوم کی ماہر تھی مجھ تک پہنچنے کا کوئی حل نکال سکتی تھی، بھول گئی ہو گی دوسروں کی طرح۔

پھر دو واقعات ایک ساتھ ہوئے۔

برقی صاحب پشاور سے آئے تھے، آتے رہتے تھے۔ مجھ سے ہمیشہ پیار سے پیش آتے تھے۔ ضروری امور کے بعد انہوں نے مجھے اپنے کمرے میں بلایا اور بیٹھنے کا اشارہ کیا پھر بولے۔ "مجھے ایک بات بتاؤ اشرف بیٹے۔"

"جی تایا ابو۔"

"نیاز علی کو جانتے ہو؟"

زمین کس کی ہے

کھیتوں کے درمیان کھڑے ہوئے دو شخص آپس میں جھگڑا کر رہے تھے کہ یہ زمین میری ہے جبکہ دوسرے نے یہ دعویٰ کر رکھی تھی کہ نہیں یہ زمین میری ہے۔

ایسے میں وہاں سے ایک بزرگ کا گزر ہوا تو دونوں آدمی ان سے کہنے لگے۔ آپ بھلے آدمی لگتے ہیں۔

"آپ ہمارا فیصلہ کر دیں تو ہم اسے تسلیم کر لیں گے۔"

بزرگ نے فرمایا۔ "اگر یہ فیصلہ زمین کر دے تو۔" دونوں یہ جواب سن کر حیران ہوئے کہ یہ تو اور اچھی بات ہے۔

بزرگ نے اسی جگہ دو رکعت نماز حاجت پڑھی اور رب العزت سے گزارش کی کہ یا الٰہی تو اپنی زمین کو حکم دے کہ ان کا فیصلہ کر دے۔ زمین کے اندر سے آواز آئی۔

"آج یہ دونوں شخص پانچ فٹ میرے اوپر کھڑے ہو کر باتیں کر رہے ہیں جب یہ پانچ فٹ میرے اندر آئیں گے تو ان کو خود معلوم ہو جائے گا کہ زمین کس کی ہے۔"

(شرف الدین جیلانی۔ ٹنڈو الہ یار)

"نیاز علی۔ جی ہاں۔ ابو کے گہرے دوست تھے۔ کاروباری بھی تھے۔ بہت اچھے انسان بھی۔"

"میرا بھی ان سے کاروباری ہی رابطہ ہے۔ اور یہ رابطہ تمہارے ابو کے ذریعے ہی ہوا تھا۔ بہت ہی اچھا انسان ہے نیاز علی صاف ستھری طبیعت کا مالک ہے خیر وہ خاص طور سے پشاور آ کر مجھ سے ملے تھے۔"

"جی....."

"اور وہ بھی تمہارے سلسلے میں۔ انہیں معلوم ہے کہ اب تم لاہور میں تعلیم حاصل کر رہے ہو اور میرے پاس رہتے ہو۔"

"اوہو۔انہوں نے آپ کو محبوب الٰہی کے بارے میں تو نہیں بتایا۔"

"نہیں۔ انہوں نے مجھے فرید چچا کے بارے میں بتایا ہے۔" برقی صاحب معنی خیز لہجے میں بولے۔

"چھوٹے چچا کے بارے میں؟"

"ہاں۔ یہ تو میں جانتا ہوں کہ حویلی کے تمام لوگوں نے مل کر فرید خان کو خصوصاً تمہاری تمام زمینوں، باغات اور جائیداد کا متولی بنا دیا ہے۔ جبکہ فرید خان کے ماضی کے بارے میں سب کو معلوم ہے۔ چلو دوسروں کی میں کوئی بات نہیں کرتا لیکن رحمت خان صاحب تو سمجھ دار ہیں ان کی نیت پر شبہ کرنا دل کو نہیں لگتا لیکن....." برقی صاحب خاموش ہو گئے۔

"آپ بتائیے کیا بتایا ہے نیاز چچا نے۔"

"فرید خان ان سے ملے تھے۔ اور انہوں نے پچھلے کئی سالوں کا حساب ان سے مانگا تھا۔ لیکن اور جو کچھ انہوں نے کیا وہ بہت تشویش ناک تھا۔"

"کیا؟"

"انہوں نے کہا کہ اب وہ ان تمام زمینوں اور باغات وغیرہ کے مالک ہیں۔ اس لئے ان کی خواہش کے مطابق حساب کتاب اور آئندہ اگر انہیں یہ کاروبار جاری رکھنا ہے تو نئے سرے سے نئی شرائط کے ساتھ ان سے ایگریمنٹ کریں۔ اس بات پر نیاز علی اور فرید خان کے درمیان تلخی ہو گئی اور فرید خان انہیں دھمکی دے کر آ گئے کہ وہ جانتا نتائج کے لئے تیار رہیں۔"

"فرید چچا میری جائیداد کے مالک ہیں۔" میں نے حیرت سے کہا۔

"ہاں۔ نیاز علی خاص طور سے مجھ سے ملے ہیں ان کا کہنا ہے کہ تم ابھی بچے ہو۔ کوئی فیصلہ نہیں کر سکو گے اس لئے میں تمہاری مدد کروں۔"

میں کچھ دیر خاموش رہا۔ پھر میں نے کہا۔ "مجھے تعلیم کے حصول کے لئے لاہور بھجوایا گیا اور اس کے بعد فرید چچا نے اپنا کام شروع کر دیا تایا ابو، میں یہ بات جانتا تھا۔"

"جانتے تھے۔" برقی صاحب چونک کر بولے۔

"جی تایا ابو۔ فرید چچا سے سب ناواقف ہیں سوائے میرے۔ میں انہیں اندر سے جانتا ہوں۔ آپ میرے لئے جو کر سکتے ہیں ضرور کریں۔ لیکن میں آپ سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔"

"کیا؟"

"آپ یہ مشکل مول نہ لیں۔ میں خود ان حالات سے نمٹوں گا۔ ہمیں ایک کام کرنا ہے۔"

"بتاؤ کیا؟ ویسے تمہاری اس ہمت سے مجھے خوشی ہوئی ہے۔" برقی صاحب نے کہا۔

"عظمت علی صاحب کی جائیداد کے قانونی وکیل طارق چغتائی صاحب ہیں۔"

"ویری گڈ۔ ہاں ہیں، نیاز علی نے مجھے اس بارے میں بتایا ہے۔ تم یہ بات پہلے سے جانتے تھے؟ خیر، مجھے فرید خان کے بارے میں اور بتاؤ۔"

"آپ خود بتا چکے ہیں کہ ان کا ماضی کیا رہا ہے۔" میں نے گول مول بات کی۔ پھر کہا۔ "تایا جان، میں طارق چغتائی صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"ایک بار پھر ویری گڈ۔ میں خود بھی یہی کہنا چاہتا تھا۔ آخر فرید خان کس بنیاد پر خود کو عظمت خان کی ساری جائیداد اور دولت کا مالک قرار دے رہے ہیں۔"

"آپ وقت نکال سکیں گے تایا جان۔"

"بالکل نکالوں گا۔ یہ میری ذمہ داری ہے۔ ویسے مجھے حیرت ہے کہ فرید خان کے ان ارادوں کے بارے میں رحمت خان صاحب اور دوسرے ذمہ دار لوگوں کو کچھ نہ کچھ ضرور معلوم ہو گا۔ لیکن کسی نے کوئی ری ایکشن نہیں دیا۔ خیر، ہم آج ہی طارق چغتائی سے ملتے ہیں۔"

برقی صاحب نے عاکف کی ڈیوٹی لگائی کہ وہ طارق صاحب سے ملاقات کا وقت لے۔ اس نے بتایا کہ پانچ بجے شام طارق صاحب اپنے آفس میں ان کا انتظار کریں گے۔ برقی صاحب میرے ساتھ طارق صاحب کے آفس گئے۔ ٹھیک پانچ بجے ہم نے ان کے آفس میں قدم رکھا تھا اتنے ہی ذمہ دار طارق صاحب بھی تھے۔ وہ ہمارے فائل سامنے رکھے بیٹھے تھے۔

"میں نے اردلی سے کہہ دیا ہے کہ پانچ کے بعد کسی کو اندر نہ آنے دے۔ میرا مطلب ہے آپ کے سوا۔"

"شکریہ....." برقی صاحب نے کہا۔

"ان واقعات کی تفصیل نے مجھے الجھا دیا ہے۔"

"جی۔ آپ ہمیں بتانا پسند کریں گے۔"

"عظمت خان صاحب نے ایک وصیت نامہ میرے ذریعہ تیار کرایا تھا جو قانونی طور پر بالکل مکمل تھا۔ ان کے انتقال کے بعد اس وصیت نامے کی رو سے سارے کام ہو رہے تھے۔ فرید خان صاحب کو حویلی کے دوسرے ارکان نے اس جائیداد کا نگراں بنایا تھا اس کی کوئی قانونی حیثیت نہیں تھی لیکن کوئی دن قبل مجھے ایک بہت بڑے بیرسٹر نورالدین صدیقی صاحب کا اطلاع نامہ ملا کہ ان کے ایک کلائنٹ نے درخواست دی ہے کہ اس کے بھائی کے تیار کئے ہوئے وصیت نامے کی رو سے عظمت خان کی تمام جائیداد زمینیں باغات وغیرہ اس کی تحویل میں دے دیئے جائیں۔" میں حیران رہ گیا اور میں نے صدیقی صاحب سے رابطہ کیا انہوں نے وصیت نامہ کی کاپی میرے پاس بھیج دی۔ یہ وہ فائل ہے آپ لوگ بھی نگاہ ڈال لیں۔"

کیا وصیت نامہ پہلے وصیت نامے کی تاریخ سے کئی سال پہلے کا تھا اور اس میں عظمت خان صاحب نے کہا تھا کہ انہوں نے یہ سب کچھ اپنے اکلوتے بیٹے اشرف خان کے نام کیا تھا لیکن اشرف خان ایک نافرمان اور اوباش فطرت لڑکا ہے۔ اسے راہ راست پر لانے کی ہر کوشش ناکام ہو گئی ہے اس لئے وہ پرانا وصیت نامہ کالعدم کر کے یہ نیا وصیت نامہ تیار کرا رہے ہیں جس کی رو سے یہ سب کچھ فرید خان ولد مامون خان کے نام کیا جاتا ہے کیونکہ اسے ایک سازش کے ذریعے بدنام کیا گیا ہے جبکہ وہ ایک معاملہ فہم اور نیک فطرت نوجوان ہے۔"

برقی صاحب نے یہ آواز بلند وصیت نامہ پڑھا تھا۔ وصیت نامہ پڑھ کر انہوں نے گہری سانس لی تھی۔ پھر انہوں نے سرد لہجے میں کہا۔

"یہ جعلی ہے۔"

"اسے عدالت میں ثابت کرنا ہوگا۔ آپ اس میں گواہوں کے دستخط دیکھ رہے ہیں۔"

"ہاں۔ گواہ نمبر ایک بیگم مامون خان مرحومہ، گواہ نمبر دو، بہن کلثوم، گواہ نمبر تین رحمت خان صاحب۔" برقی صاحب نے گواہوں کے نام پڑھے۔

"بالکل۔ آپ کیا کہتے ہیں آپ۔" چغتائی صاحب بولے۔

"جعلی دستخط بھی ہو سکتے ہیں۔"

"یقیناً۔ اگر یہ ثابت ہو جائے تو فرید خان سزا سے نہیں بچ سکیں گے۔"

"تو پھر طارق صاحب.....؟"

"آپ سے، میرا مطلب ہے، آپ لوگوں سے ملاقات کے بعد ہی آگے کے بارے میں فیصلہ کرنا تھا۔ میں کچھ ضروری کاموں میں مصروف تھا۔ ان کے بعد اسی سلسلے میں کام شروع کرنا تھا۔ یہ اچھا ہوا کہ آپ خود آ گئے۔ اب کچھ ذمہ داریاں میں آپ کے سپرد کرنا چاہتا ہوں۔"

"جی فرمایئے۔"

"پہلے خود فرید خان صاحب سے اس وصیت نامے کی تصدیق کیجئے۔ ان سے بات کیجئے پھر ہم قانونی کارروائی کرتے ہیں۔" برقی صاحب نے تیکھی نگاہوں سے مجھے دیکھا میں سمجھ گیا کہ وہ الجھ رہے ہیں چنانچہ میں نے کہا۔

"نہیں۔ حالانکہ تایا جان میرے سگے تایا سے بڑھ کر ہیں لیکن میں جانتا ہوں وہ اس حد تک جانا پسند نہیں کریں گے۔"

"بیٹے بات میری پسند کی نہیں ہے۔ لوگ فوراً نیت پر شک کرنے لگتے ہیں۔ یہ سوچا جا سکتا ہے کہ میں کسی خاص ارادے کے تحت اس بارے میں زیادہ سرگرمی دکھا رہا ہوں۔"

"میں سمجھتا ہوں، میں سمجھتا ہوں۔" طارق صاحب نے کہا۔

"آپ فکر نہ کریں۔ میں خود فرید چچا سے بات

کروں گا۔"

برقی صاحب نے البتہ میرے گجر گھاٹ جانے کے لئے گاڑی دی تھی اور ڈرائیور کو ہدایت دی تھی کہ مجھے حویلی چھوڑ کر واپس آجائے لاہور آکر دل لگ گیا تھا۔ بہت اچھے لوگ تھے ایک ایک فرد نے میری دل جوئی کی تھی خاص طور سے ظافرہ تو پل پل میرا خیال رکھتی تھی کبھی کبھی اس کے اندر بڑی محجوبیت پیدا ہو جاتی تھی لیکن میں بہت محتاط تھا اور شرافت نبھانا چاہتا تھا۔

ہاں البتہ عریشہ سے میں نے ایک وعدہ کیا تھا۔

"اشرف بھائی۔ مستقبل میں آپ کیا بننا چاہتے ہیں۔"

"میں..... انجینئر....." میں نے کہا۔

"اوہو.....؟"

"بس انجینئر۔"

"اب مجھ سے پوچھیں۔"

"بتاؤ۔"

"دلہن..... مجھے دلہنیں بہت اچھی لگتی ہیں۔"

"ارے واہ..... لیکن اس کے لئے تو شادی کرنی پڑتی ہے۔"

"کرلوں گی لوگ مجبور کریں گے تو۔ لیکن میں ایک شرط لگا دوں گی۔"

"کیسی شرط؟"

"دولہا میں پسند کروں گی۔"

"اوہو۔ یہ تو بڑی خطرناک بات ہے۔ کیسا دولہا پسند کریں گی آپ مس عریشہ؟"

"وہ تو میں کر بھی لیا ہے۔"

"گڈ۔ واہ بھئی۔ ہم تو آپ کے دوست بلکہ سہیلی ہیں ہمیں بتایئے کہاں ہیں، آپ کے دولہا صاحب۔"

"یہ ہیں۔" اس نے میرے سینے پر انگلی رکھ دی۔

"ہیں؟"

"ہاں۔" میں نے ثانیہ باجی کو اپنی مرضی بتادی ہے۔ اور کہہ دیا ہے کہ میں شادی کروں گی تو صرف اشرف بھائی سے۔ اس نے کہا اور میں خوب ہنسا۔

گجر گھاٹ جاتے ہوئے راستے میں نہ جانے میرے ذہن میں کیا کیا خیالات آتے رہے تھے۔ میرے اچانک پہنچنے پر کیا ری ایکشن ہوگا کون مجھ سے کس انداز میں ملے گا۔ برقی صاحب نے کہہ دیا تھا میں کچھ دن وہاں رہوں۔ پھر جب اپنا کام مکمل کرلوں اور آنا چاہوں تو عاکف کو فون کردوں۔ وہ گاڑی بھیج دے گا۔ یہ ان کا خلوص تھا ورنہ حویلی میں گاڑیوں کی کیا کمی تھی گجر گھاٹ کی سرحد سے داخل ہوتے ہی اور بہت سی یادیں دل میں ابھر آئیں نہ جانے کیا کیا یاد آنے لگا۔ مدیحا بھی دل میں ہوک بن کر ابھری تھی۔

غرض یہ کہ گاڑی حویلی کے بڑے گیٹ سے گزر کر پورچ میں جا رکی۔ ملازموں نے مجھے گاڑی سے اترتے دیکھا اور میری طرف دوڑ پڑے۔ معصوم لوگوں نے اپنے طور پر میری آمد پر خوشی کا اظہار کیا میں نے بھی سب کی خیریت پوچھی۔ اور پھر اندر چل پڑا سب سے پہلی ملاقات کلثوم پھوپھی سے ہوئی تھی انہوں نے مجھے دیکھا لیکن نہ تو ان کے چہرے پر کوئی حیرت پیدا ہوئی نہ وہ مسکرائیں میں نے سلام کیا تو وہ بولیں۔

"اچانک آئے۔ یا کسی کو خبر دی تھی۔"

میں دنگ رہ گیا تھا کلثوم پھوپھی تو مجھ پر جان چھڑکتی تھیں لیکن اس وقت کس قدر سپاٹ تھیں وہ پھر بھی میں نے خود کو سنبھال کر کہا۔

"کیسی ہیں بڑی پھوپھی۔ سب لوگ کیسے ہیں۔"

"ٹھیک ہیں، جاؤ اندر جاؤ۔ میں آتی ہوں۔" انہوں نے کہا اور آگے بڑھ گئیں۔

دل کو دھکا سا لگا تھا یہ کیسا رویہ ہے کیوں ہے کیا یہ لوگ مجھ سے ناراض ہیں؟ لیکن کیوں؟ میں اندر چل پڑا۔ پرتایا ابو ملے ان کا انداز بھی پھوپھی سے مختلف نہیں تھا۔ یا خدا کیا ہو گیا ان سب کو۔

امی اپنے کمرے میں موجود نہیں تھیں میں نے انہیں کئی آوازیں دیں ان کے کمرے میں تھا کہ باہر سے کئی آوازیں سنائی دیں اور پھر سب سے پہلے فرید چچا

اندر داخل ہوئے۔ وہ مجھے دیکھ کر خوش ہوئے تھے۔ دونوں ہاتھ پھیلا کر آگے بڑھے اور مجھے گلے لگا لیا۔

"ارے میرا بیٹا۔ کیسے اچانک آ گیا۔ تم تو ایک دم جوان ہو گئے۔ لاہور کی آب و ہوا راس آ گئی۔ خوش ہو نا۔"

"جی چچا، لیکن ان سب کو کیا ہو گیا۔"

"کیوں..... کیا بات ہے۔"

"سب روٹھے روٹھے سے، جیسے مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی ہو۔"

"ارے نہیں، تمہیں لگ رہا ہے۔ آؤ بڑے کمرے میں آؤ۔ اچانک آ گئے ویسے بڑا اچھا ہوا، میں خود تمہیں فون کرنے والا تھا کہ گاڑی بھیج رہا ہوں۔ تھوڑا سا وقت نکال کر آ جاؤ۔

"امی کہاں ہیں؟" میں نے گردن اونچی کر کے دیکھا کلثوم پھوپھی اور دوسرے لوگ نظر آ رہے تھے۔ امی ابھی تک نہیں آئی تھیں۔

"آؤ..... آؤ بتاتا ہوں۔" آؤ فرید چچا نے کہا۔ اور میرا دل کسی خدشے سے دھڑک اٹھا۔

"فرید چچا۔ امی کہاں ہیں؟"

"وہ۔ وہ عمرے پر گئی ہیں بس ایک دم ان کے ذہن پر یہ بات سوار ہو گئی کہ انہیں عمرے پر جانا ہے۔ سب نے کہا کہ ضرور جائیں لیکن تھوڑے دن رک جائیں۔ نہیں مانیں ارجنٹ انتظام کرنا پڑا۔" چچا کا لہجہ مصنوعی تھا باقی لوگ اس طرح بے نیاز تھے جیسے ان باتوں سے کسی کو سروکار نہ ہو۔

"مجھ سے مل کر بھی نہیں گئیں۔" میں نے کہا۔

"میں نے تمہیں تفصیل بتا دی۔" فرید چچا کا لہجہ خشک ہو گیا۔ پھر وہ بولے۔ "لیکن تمہاری اچانک آمد، تم نے فون پر بھی نہیں بتایا کہ تم آ رہے ہو۔ خیر اچھا ہوا تم آ گئے چلو آرام کرو، کھاؤ پیو، بھابھی صاحبہ عمرہ کر کے واپس آ ہی جائیں گی اتنی پریشانی کی بات نہیں۔"

میں امی کے کمرے میں آ گیا۔ مگر میرے دل کی حالت عجیب تھی۔ میرا ذہن چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا کہ امی عمرے پر نہیں گئی ہیں کچھ ہوا ہے لیکن کیا؟ اندازہ ہو رہا تھا کہ جو کچھ بھی ہوا ہے اس میں کسی اور کا نہیں فرید چچا کا ہاتھ ہے لیکن کیا ہوا ہے۔

مجھے کچھ خیال آیا کمرے کا دروازے بند کر کے میں نے امی کے کپڑوں کی الماری کا جائزہ لیا۔ بے شمار ہینگر تھے ان میں کوئی کمی نہیں ہوئی تھی دیگر چیزیں بھی جوں کی توں تھیں امی کسی قیمت پر اپنی مرضی سے نہیں گئی تھیں پھر کیا ہوا ہے۔ عقل نے سمجھایا جلد بازی سے کوئی فائدہ نہیں ہے جو کچھ ہو رہا ہے بے حد خطرناک ہے فرید چچا اس گھر کے لئے سب سے بڑا آسیب ہیں۔ پتہ نہیں انہوں نے باقی لوگوں کے ساتھ کیا کیا ہے۔

میں سوچتا رہا۔ فرید چچا نے تھوڑی دیر کے بعد دروازہ بجایا۔ تو میں نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا وہ اندر داخل ہو گئے۔ پھر بولے۔ "اشرف ..... یہ کیا طریقہ اپنایا ہوا ہے تم نے۔ کیوں ایسے ہو رہے ہو۔ کھاؤ کھیلو اتنے دن کے بعد گجر گھاٹ آئے ہو۔"

"فرید چچا۔ مجھے صرف امی کے بارے میں بتا دیں۔"

"بالکل خیریت سے ہیں۔ تمہیں پوری خیریت سے ان سے ملاقات میری ذمہ داری ہے۔"

"وہ عمرے پر گئی ہیں۔" میں نے پوچھا۔

"ہاں گئی ہیں۔" وہ عجیب سے لہجے میں بولے۔

"آپ جھوٹ بول رہے ہیں۔" میں نے غصے سے کہا۔ میرا خیال تھا کہ فرید چچا میرے اس انداز گفتگو سے چراغ پا ہو جائیں گے۔ لیکن وہ مسکرا دیئے۔

"ممکن ہے۔" انہوں نے کہا۔

"چھوٹے چچا۔ آخر آپ نے یہ کیا رویہ اختیار کیا ہے۔" میں نے کہا۔

"بات کریں گے پیارے بھتیجے۔ بات کریں گے تم اپنا رویہ بدلو۔ بتا دیا ہے۔ سب خیریت ہے تمہیں کوئی شکایت نہیں ہوگی۔ بلکہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ تو وہ دوبارہ بولے۔ "مجھ سے تعاون کرو، میں تمہیں اطمینان

دلاتا ہوں، سب کچھ تمہاری مرضی کے مطابق ہوگا چلتا ہوں۔" کھاؤ پیو، عیش کرو، میں نے کوئی جواب نہیں دیا لیکن اب میں واقعی ٹھنڈے دل سے سوچ رہا تھا پہلے دشمن روحوں کے نشانے پر تھا اور اب..... اب ایک دشمن شیطان میرا دشمن تھا جوان روحوں سے بھی زیادہ خطرناک تھا۔

میں نے آخری فیصلہ ہی کیا کہ رویہ بدل لوں۔

میں باہر نکل آیا رافعہ خالدہ سے ناشتے کے بارے میں کہا اور وہ گردن جھکا کر چلی گئیں پھر میرے سامنے عمدہ ناشتہ لگا دیا گیا کافی وقت میں نے اسی انداز میں گزارا ،،بہت سی باتوں کا تجزیہ کر رہا تھا ایک بار شمشان گھاٹ میں فرید چچا کو جس عالم میں دیکھا تھا وہ یاد تھا فرید چچا نے ان ناپاک روحوں کا ساتھ اپنا لیا تھا کیا فرید چچا بے دین ہو گئے ہیں میرے رگ وپے میں سرد لہریں دوڑ گئیں اگر ایسا ہوا تو ملکھان خاندان کی تباہی مکمل ہو گئی اس دن شمشان گھاٹ میں، میں نے گنگا سری کو بھی دیکھا تھا گنگا سری ہر طرح اس خاندان کے ایک ایک فرد کو ختم کر دینا چاہتی تھی اس نے کئی افراد کو اس طرح ختم کر دیا اور اب اس نے صبح ہستی سے مٹانے کے لئے اس خاندان کے ایک فرد کو منتخب کر لیا تھا۔

"اوہ..... میرے خدا، یہ سب سے خطرناک بات تھی۔"

سوچتے سوچتے کھڑکی کے پاس آ کھڑا ہوا۔ تب میں نے ایک کھلی جیپ کو باہر نکلتے دیکھا۔ فرید چچا ڈرائیور کے ساتھ جا رہے تھے۔ میں پرخیال نظروں سے دیکھتا رہا پھر وہاں سے ہٹ کر باہر نکل آیا میں نے کلثوم پھوپھی کے کمرے کا رخ کیا۔ وہاں تایا صاحب بھی موجود تھے۔

دونوں باتیں کر رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر خاموش ہو گئے۔ میں ان کے پاس پہنچ گیا۔ "آپ لوگ مجھ سے ناراض ہیں؟" میں نے کہا۔

"نہیں۔ نہیں تو....." دونوں بیک وقت بولے لیکن ان کا انداز مشینی تھا جیسے وہ کسی اور خوف کے تحت بول رہے ہوں۔" میں نے اچھی طرح محسوس کیا تھا۔

"پھر آپ کا رویہ میرے ساتھ ایسا کیوں ہے؟"

"نہیں..... نہیں تو....." وہ پھر اسی طرح بولے۔

"امی کہاں ہیں۔ آپ مجھے بتائیں گے؟"

"عمرے، عمرے پر گئی ہیں۔"

"آپ کیوں جھوٹ بول رہے ہیں۔ مجھے بتایئے ورنہ میں سارے رشتے بھول کر آپ کے خلاف جو کارروائی کروں گا وہ آپ سے برداشت نہیں ہوگی۔ اسے ذہن میں رکھیں۔"

دونوں کے چہرے سپاٹ تھے۔ اچانک وہ دونوں بیک وقت اپنی جگہ سے اٹھے اور میرے قریب سے گزر کر باہر نکل گئے۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ ان دونوں ہی کا ذہنی توازن ٹھیک نہیں ہے اب مجھے اندازہ ہوا تھا کہ مجھے لاہور کیوں بھیجا گیا تھا۔ یہ فرید چچا کی چال تھی لیکن امی، کہاں ہیں انہوں نے امی کے ساتھ فرید چچا نے یہ بھی کہا تھا کہ وہ مجھے خود بلانا چاہتے تھے اس کی کوئی وجہ ضرور ہوگی۔

بہت سے سوالات، غرض یہ کہ میں اپنے بارے میں بہت سے فیصلے کرتا رہا۔ رات کو میں باہر نکل آیا باہر نکل کر مجھے خیال آیا کہ امی کو پرانی حویلی میں قید نہ کر دیا گیا ہو۔ آہ..... کیا میرے پیچھے میری ماں پر یہ مظالم ہوئے ہیں۔

میں پرانی حویلی کی طرف چل پڑا۔ میری نظریں چاروں طرف بھٹک رہی تھیں۔ میں ہر خوف کو بھول گیا تھا۔ میں نے بارہا دل میں کئی بار منیکا کو پکارا۔ منیکا کیا تمہیں میری گنگا گھاٹ آمد کے بارے میں نہیں معلوم ہو سکا، کہاں ہو تم..... منیکا، منیکا....." لیکن کہیں سے کوئی جواب نہیں ملا۔ منیکا بھی شاید مجھے بھول گئی تھی۔ حویلی میں داخل ہو کر میں نے چیخ چیخ کر امی کو آوازیں دیں۔

پھر اچانک مجھے ایک آہٹ سنائی دی۔ پھر ایک تیز آواز۔

(جاری ہے)

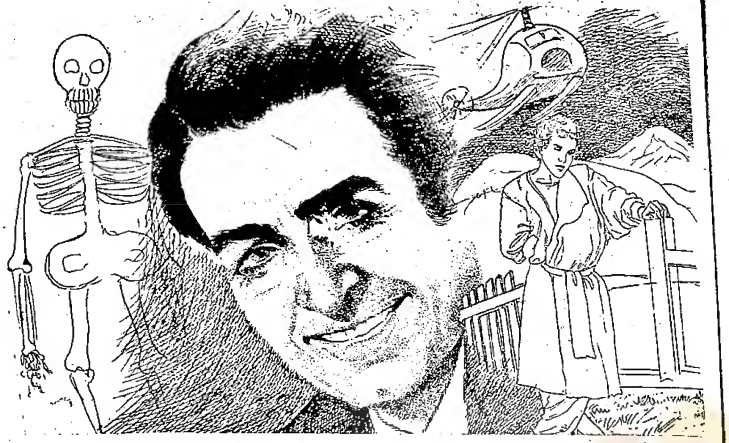

آزاد روح

عروہ ہادی۔ جنڈانوالہ

مردہ بے جان اور بے خوف اڑدھا میں حرکت ہوئی، اس کی آنکھیں پھیلتے پھیلتے انگارہ برسانے لگیں، اس کی پھنکار نے قرب و جوار کو دھلا کر رکھ دیا پھر اس کا حجم بڑھنے لگا اور پھر وہ اوپر کو اٹھتے ہوئے قیامت برپا کر دیا۔

احکام خداوندی سے انحراف لوگوں کا انجام بہت عبرتناک ہوتا ہے۔ حقیقت کہانی میں ہے

سمندر کی پرشور لہروں کو دیکھتے ہوئے وہ اپنی زندگی کے نشیب و فراز کے متعلق سوچ رہا تھا اس کی زندگی بھی کبھی سمندر کی مانند پرشور تھی، سمندر میں ہمیشہ سکون کہاں رہتا ہے۔ کبھی کبھی اس میں ایسے طوفان اٹھتے ہیں جو سب کچھ بہا کر لے جاتے ہیں، لوایڈ کی زندگی میں بھی جیروم نامی طوفان آیا تھا جو اپنے ساتھ سب کچھ بہا کر لے گیا وہ بے بسی سے اپنے ہاتھ کی لکیروں کو دیکھتا اور اپنی قسمت سے ملال ہو جاتا، اس کے بچپن کا ایک خواب تھا جو کہ اب جوانی میں آ کر جنون بن گیا تھا، اسے بہرحال ہالی ووڈ کا سپر اسٹار بننا تھا اس لئے اس نے ایک اکیڈمی سے اداکاری کی باقاعدہ ٹریننگ حاصل کی اپنے خواب کی تکمیل کے لئے کئی مشکلات کا سامنا کیا۔ بالآخر اسے ریمپ پر "میل ونڈرڈریس" کے لئے واک کی پیشکش ہوئی اور اس نے

اس طرح سے اپنے کو پیش کیا کہ تجربہ کار ماڈلز عش عش کراٹھے یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ اسے چند اشتہارات کے لئے منتخب کرلیا گیا۔

لوائیڈ نے کیمروں کی چکا چوند کے سامنے بڑی خوب صورتی سے اداکاری کی اس کے چہرے کے تاثرات جملوں کی ادائیگی نے اسے سب کی نظروں میں عروج بخشا۔ وہ اخبارات کے صفحات کی زینت بننے لگا اداکاروں کے لئے شائع ہونے والے ہفتہ وار میگزین میں اس کی بھی تعریفیں ہونے لگیں اب تو لوائیڈ خود کو ہواؤں میں اڑتا ہوا محسوس کررہا تھا جب اس نے بین الاقوامی معیار کی ایک کاسمیکس کمپنی سے تین سالہ معاہدہ کیا۔ وہ پرفیوم کے اشتہارات کے لئے منتخب ہوچکا تھا۔

لیکن اس کی منزل ابھی بہت دور تھی مگر منزل تک پہنچنے کے لئے اسے مضبوط سیڑھی فراہم ہوگئی تھی۔

انہی دنوں ایک میوزک البم ریلیز ہوا جس میں ایک نوجوان جیروم نے پہلی بار اداکاری کی تھی اس پر چند گانے پکچرائز ہوئے تھے اور اس نے ہر گانے پر الگ انداز اپنایا تھا۔ ٹریجڈ سونگ پر اس کی افسردگی کمال کی تھی اور رومانٹک گانوں پر اس کا رومانس...... غرض کہ ہر جگہ وہ چھا گیا۔

لوائیڈ کا جس کمپنی سے معاہدہ ہوا تھا اس کے سرمایہ داروں کے درمیان کھٹ پٹ ہوگئی جس کے نتیجے میں سانجھے کی ہنڈیا چوراہے پر پھوٹی اور لوائیڈ کے سارے خواب چکنا چور ہوگئے۔

جیروم تیزی سے شہرت پانے لگا اور اس سے کہیں زیادہ تیزی سے لوائیڈ پس منظر میں چلا گیا۔

الیکٹرونک و پرنٹ میڈیا پر جیروم کی دھوم مچی تھی اسے معروف ڈائریکٹر نے اپنی نئی مووی میں تھوڑی سی جگہ دی تھی بدقسمتی سے وہ فلم زیادہ بزنس نہ کرسکی مگر خوش قسمتی سے جیروم کی جاندار اداکاری نے سب کو متاثر کردیا اسے ایک معروف اور ہردلعزیز ڈائریکٹر نے اپنی فلم میں مرکزی کردار کی آفر کردی جسے جیروم نے فوراً قبول کرلیا، بلاشبہ یہ خوش بختی کی انتہا تھی جیروم کے ساتھ سپر اسٹار ہیروئن بلینڈا کو منتخب کیا گیا دونوں کی جوڑی کو مستقبل کی انجیلینا اور بریڈ لے تک کہا گیا۔ جیروم اس فلم کے لئے بے حد پرجوش تھا۔

ابتدائیہ مناظر کی عکس بندی شروع ہوگئی تھی......

میڈیا کے ذریعے ہر تبصرہ نگار جیروم کی حوصلہ افزائی کررہا تھا۔ ایک نجی چینل نے مقامی لوگوں سے سروے کیا اور تقریباً ہر ایک نے جیروم کی تعریف کی اور کامیابی کو اس کی ذات سے منسوب کردیا۔

لوائیڈ اب کسی کی نظروں میں بھی نہیں رہا تھا۔ مشہور تو وہ پہلے بھی اتنا نہیں تھا۔ اب مکمل طور پر گمنام ہوگیا، وہ سر جھکائے ساحل سمندر پر چل رہا تھا، پانی کی لہریں آتیں اور اس کی پنڈلی سے سر پٹخ کر چلی جاتیں۔

دفعتاً ایک لہر تیزی سے آئی لوائیڈ کی پنڈلی سے کوئی سخت چیز ٹکرائی پھر لہر اسی تیزی سے ہٹ گئی، اس نے نیچے دیکھا پھر جھک کر اس چیز کو اٹھایا وہ گولڈن کلر کا ایک لاکٹ تھا نفیس سنہری چین میں سرخ دل پرویا گیا تھا وہ اپنی آنکھوں کے سامنے کئے اسے دیکھتا رہا۔ ''گولڈن ہارٹ شپ لاکٹ'' اس نے نجانے کیا سوچ کر اسے اپنی گردن میں ڈال دیا اور بے مقصد ٹہلتا رہا۔

شام کے بعد وہ اپنے فلیٹ میں لوٹا تھا نوڈلز کا آخری پیکٹ کھاتے ہوئے وہ سنجیدگی سے اپنے مستقبل کے بارے میں سوچتا رہا پھر اپنے بیڈ روم میں آگیا لباس تبدیل کرنے کے بعد وہ بیڈ پر اوندھا گرا تو کوئی چیز اس کے سینے پر چبھی تو اس نے ہاتھ سے ٹٹول کر دیکھا، وہی دل تھا وہ کچھ دیر اسے دیکھتے رہنے کے بعد نیند کی وادی میں اترتا گیا۔

''لوائیڈ......'' نیند کی حالت میں بھی وہ سرگوشی سن رہا تھا

''لوائیڈ......'' آواز اس کے کان کے بے حد قریب سے ابھری تھی، آواز سن کر اس کی آنکھیں کھولیں حواس بیدار ہونے میں چند لمحے لگے ''لوائیڈ

پھر آواز سنائی دی۔

''وہ جھٹکے سے اٹھ بیٹھا اور حیران سا ارد گرد دیکھنے لگا۔ سارے کمرے میں سنہری روشنی پھیلی ہوئی تھی جو اس کی گردن میں جھولتی چین سے پھوٹ رہی تھی اس نے ہراساں ہوکر لاکٹ کو دیکھا اس میں جڑے دل سے ہلکی سرخی روشنی پھوٹ رہی تھی۔

''میرے دوست میرے محسن لوائیڈ۔'' اب سرخ روشنی سنہری روشنی میں تبدیل ہوگئی تھی۔

لوائیڈ کا سارا وجود کپکپانے لگا ''کون ہو تم؟''

''تمہارا دوست ہوں، میرے محسن تم نے مجھے پانی کی قید سے نجات دی ہے۔'' سرخ روشنی پھر سے پھوٹی جس میں سے آواز ابھری تھی۔ سرخ و سنہری رنگوں کا پھر امتزاج بنا تھا۔ لواڈ کا سر بری طرح چکرا گیا۔ ''میں نے؟''

''ہاں میرے دوست...... میں پچھلے کئی سالوں سے اس اذیت میں تھا۔ تم نے مجھے رہا کیا...... اگر تم یہ لاکٹ اسی وقت نہ پہن لیتے تو شاید میں آزاد نہ ہوتا۔''

سرخ روشنی پھر نکلی اور آواز سنائی دی۔

لوائیڈ کا خوف قدرے کم ہوا اس نے دلچسپی سے پوچھا۔ ''مگر تم ہو کون اور اس لاکٹ میں کیسے آئے؟''

''میں ڈریم ہوں......'' سرخ روشنی سے آواز ابھری۔ فادر جیمس کو پراسراریت سے والہانہ لگاؤ تھا ان کا اکثر وقت پراسرار جنتر منتر کے مطالعے میں گزرتا۔ ایک دن ان کی نظر میں ایک قدیم جادوئی کتاب آگئی، جس میں کسی انسان کے مرنے کے فوراً بعد روح کو اپنے قابو میں کرنے کا عمل درج تھا۔ فادر کو اس عمل نے بہت متاثر کیا تو وہ ہر وقت اس تجربے کو آزمانے کا سوچتے رہتے۔ ان کا کھانا پینا سب ترک ہوگیا۔ ہر وقت سوچوں کا محور وہی پراسرار عمل رہتا۔

ایک رات وہ بار بار اس عمل کے منتر کو دیکھ رہے تھے، جب عجیب سے کھٹکے نے انہیں چونکا دیا انہوں نے اپنی مکمل توجہ باہر لگادی ایک بار پھر ہلکی سی آواز آئی تو وہ خاموشی سے اٹھے اور دبے پاؤں کمرے سے باہر نکل

عملیات کی کتابیں

عملیات شادی	ڈاکٹر حشمت جاہ	75/-
عملیات محبت	ڈاکٹر حشمت جاہ	75/-
عملیات استخارہ	ڈاکٹر حشمت جاہ	75/-
عملیات روزگار	ڈاکٹر حشمت جاہ	75/-
عملیات جسمانی امراض	ڈاکٹر حشمت جاہ	75/-
عملیات روحانی امراض	ڈاکٹر حشمت جاہ	75/-
عملیات مشکل کشائی	ڈاکٹر حشمت جاہ	75/-
عملیات حاجت روائی	ڈاکٹر حشمت جاہ	75/-
عملیات حفاظت وعداوت	ڈاکٹر حشمت جاہ	75/-
عملیات تسخیرات	ڈاکٹر حشمت جاہ	75/-
جادو کا توڑ خود کیجئے	ڈاکٹر حشمت جاہ	75/-
سورۂ فاتحہ سے روحانی علاج	ڈاکٹر حشمت جاہ	60/-
سورۂ بقرہ سے روحانی علاج	ڈاکٹر حشمت جاہ	60/-
اسم اعظم سے مشکلات کا حل	اقبال احمد مدنی	40/-
اسمائے نبوی سے مشکلات کا حل	اقبال احمد مدنی	40/-
سورۂ فاتحہ سے مشکلات کا حل	اقبال احمد مدنی	40/-
سورۂ بقرہ سے مشکلات کا حل	اقبال احمد مدنی	40/-
سورۂ یٰسین سے مشکلات کا حل	اقبال احمد مدنی	40/-
سورۂ مزمل سے مشکلات کا حل	اقبال احمد مدنی	40/-
بسم اللہ سے مشکلات کا حل	اقبال احمد مدنی	40/-
اعوذ باللہ سے مشکلات کا حل	اقبال احمد مدنی	40/-
ناد علیؑ سے مشکلات کا حل	اقبال احمد مدنی	40/-
سورۂ فلق سے مشکلات کا حل	اقبال احمد مدنی	40/-
سورۂ ناس سے مشکلات کا حل	اقبال احمد مدنی	40/-
سورۂ اخلاص سے مشکلات کا حل	اقبال احمد مدنی	40/-

دعا بک کارنر منشی محلہ امین پور بازار گلی نمبر 5 فیصل آباد

فون نمبر: 041-2640013

آئے وہ محتاط انداز میں چلتے ہوئے کچن کے پاس آگئے، ان کے اندازے کے مطابق ہلکی ہلکی آوازیں اندر سے برآمد ہورہی تھیں۔

ایک زوردار جھٹکے سے انہوں نے دروازہ کھول دیا۔ کچن میں ایک شخص موجود تھا۔ اس کے چہرے پر گھبراہٹ طاری تھی، سامنے موجود شخص گھبرا کر پیچھے دیکھا، فادر جیمس نے فوراً اسے پہچان لیا تھا وہ گھر گھر جا کر ردی لینے والا ڈریم تھا۔ جو بھوک کی شدت سے بے حال ہوکر آیا تھا، روٹی کے ٹکڑوں پر جیم لگا کر وہ ہراساں سا فادر جیمس کو دیکھ رہا تھا فادر نے ایک گہری سانس خارج کی۔

وہ پریشان اور گھبرائے ہوئے ڈریم کو دیکھ رہے تھے معاً ان کی آنکھیں کسی خیال کے تحت چمک اٹھیں۔ ذہن میں فوراً شیطانی منصوبہ ترتیب پانے لگا وہ تیزی آگے بڑھے اور ڈریم کو کالر سے پکڑا تو ڈریم کے ے کا رنگ اڑ گیا کچھ بولنے کی خواہش فادر کے سخت ات سے دب گئی، فادر جیمس نے اسے گھسیٹا اور اپنے ے کے نیچے تہہ خانے میں اترتے چلے گئے۔

اس کے بعد فادر جیمس نے اپنا عمل ڈریم پر آزمایا۔ ان کی بے جا اور فضول خواہش کی تکمیل ہوگئی اب ان کا ضمیر انہیں کچوکے لگا رہا تھا۔ ایک معمولی تجربے کے بھینٹ نے ڈریم کی زندگی چھین لی تھی۔

اس کے بعد فادر نے ڈریم کی روح کو ایک چینن میں قید کر کے سپرد سمندر کردی جسم گلنے سڑنے کے لئے تہہ خانے میں چھوڑ دیا۔

اب وہ حد سے زیادہ پشیمان اور افسردہ تھے انہوں نے جادو منتر اور عمل کی ساری کتابیں کھنگال ڈالیں مگر کوئی فائدہ نہ ہوا۔ پھر اس جگہ کو چھوڑ کر وہ دوسری جگہ آگئے اور خود کو ہر وقت مصروف کر کے دیکھا مگر ہر پل خود کو ہر جگہ ڈریم کے چہرے کی بے بسی ،افسردگی اور تکلیف دہ خیالات سے اپنا پیچھا نہ چھڑا سکے تو انہوں نے شادی کرلی مصروفیات بڑھنے لگیں ان کا ایک بیٹا بھی ہوا جس کا نام ان کی بیوی نے جیروم رکھا اور جیمس سے کہا۔ ”ایک دن میرا جیروم بہت بڑا ہیرو بنے گا۔“

جیمس کو اس سے کوئی غرض نہیں تھی جب جیروم اٹھارہ برس کا ہوا تو جیمس اس دنیا سے رخصت ہوگئے، اپنے اعمال اپنے ساتھ لے کر البتہ ان کی غلطیوں کا خمیازہ جیروم نے بھگتنا تھا۔“

لوائیڈ اپنی جگہ پر ساکت سا بیٹھا تھا۔

”لوائیڈ تم اس تکلیف کو نہیں جانتے جو جیمس نے مجھے دی۔ میں بیس سالوں سے ناقابل برداشت تکلیف میں تھا۔ اب میری رہائی بالآخر ہوگئی اب مجھے جانا ہے۔ مگر اس سے پہلے میں اپنا انتقام لوں گا۔ مجھے معلوم ہے میرا اور تمہارا دشمن ایک ہی شخص ہے اب اس کے دن پورے ہوچکے ہیں۔“ لاکٹ میں سے پھوٹتی سرخ روشنی سے نفرت آمیز آواز سنائی دی تھی۔

یہ سن کر لوائیڈ کا دل بری طرح دھڑکا کہ جیروم اس کی ترقی کی تکمیل میں رکاوٹ ضرور تھا مگر وہ اس کی قیمت اس کی جان لے کر نہیں وصول کرسکتا تھا۔

☆......☆......☆

سیٹ پر تمام تیاریاں مکمل ہوچکی تھیں۔ جیروم اور بلینڈا کا میک اپ بھی فائنل ہوچکا تھا ان دونوں نے جنگل میں اپنے ریسرچ ٹیم کے ہمراہ جانا تھا اور حادثے میں وہ دونوں اپنی ٹیم سے بچھڑ جانے تھے، اصل جنگل میں جانے کی بجائے اسٹوڈیو کو ہی جنگل کا بہروپ بنایا گیا تھا چاروں طرف پینٹ شدہ تختے، دور دور تک پھیلی جھاڑیوں پودوں اور درختوں کا منظر پیش کررہے تھے، اسٹوڈیو کے مخصوص حصے جس میں جیروم اور بلینڈا کے سین عکس بند ہونے تھے اس حصے کی چھت پر نیچے جالی دار ترپال رکھا گیا تھا جس کے اوپر چھوٹے چھوٹے واٹر پمپ رکھے گئے تھے جن کے ذریعے پانی جالیوں پر گرتا اور مصنوعی بارش معلوم ہوتی۔

ساؤنڈ کنٹرولر ان کے سامنے کیمروں کے ساتھ تھے ہدایت کار ایک ایک چیز کو چیک کرنے کے بعد مطمئن تھا۔ فائنل پرنٹ میں ہر شے حقیقی لگنا تھی۔

جیروم کی شرٹ کے نیچے کیچپ کی ننھی سی تھیلی اٹیچ کی جارہی تھی بلینڈا کے بال ہیئر لوشن سے نم کردیئے گئے تھے، اس کی آنکھ کے نیچے میرون بلش لگایا جارہا تھا، چہرے کے اس حصے کو بالوں سے ڈھانپ دیتا تھا، پھر سین میں اسے زخم کے طور پر دیکھایا جانا تھا۔

جیروم کے لبوں کے نیچے ریڈ بلش لگ چکا تھا اس کے منہ کے اندر سرخ رنگ کی ایک گولی ٹشو پیپر میں لپیٹ کر رکھی گئی تھی۔ سین میں وہ اسے چبا کر منہ سے لہو بہا دیکھاتا۔

پھر سیٹ پر جا کر چند ایک سین مکمل کروائے سین میں بلینڈا کا زخمی ہونا اور جیروم کا گرنا بھی شامل تھا۔ پروڈیوسر دونوں کی اداکاری سے بے حد مطمئن تھا۔

سین رکنے کے بعد وہ جیروم کو مزید سمجھانے لگا۔

اب سیٹ پر ایک اور اضافہ ہوچکا تھا، بیس فٹ کا ایک لمبا سیاہ ربڑ کا مصنوعی اژدھا۔ جسے تاروں کے ذریعے باندھا گیا تھا تا کہ اسے آسانی سے اٹھایا جاسکے تاریں بہت مضبوط مگر پتلی تھیں اسے کنٹرول رکھنے والے تختوں کے پیچھے بیٹھے تھے اگلا سین ”ایکشن“ کی زوردار آواز کے ساتھ شروع ہوگیا جیروم سیٹ پر دیوانہ وار چلاتے ہوئے بھاگتا دیکھائی دے رہا تھا ہلکی ہلکی بارش ہورہی تھی۔ ساؤنڈ سسٹم سے بادلوں کی گڑگڑاہٹ اور بجلی کڑکنے کی آوازیں پیدا ہونے لگیں جیسے ہی بجلی کڑکتی لائٹ مین فوراً آنکھوں کو چندھیاتی روشنی سیٹ پر پھینکتا۔

جیروم ٹھوکر کھا کر گرا اور اچانک ساؤنڈ سسٹم سے سانپ کی پھنکار ابھری جیروم کے سامنے سیاہ خوف ناک سانپ موجود تھا جسے تاروں سے الگ کر کے اور ہلا کر نفرت واشتعال کا اظہار کروایا جارہا تھا جیروم ہراساں نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

ٹھیک اسی لمحے جیروم کے بالکل اوپر تختے پر ایک سنہرا لاکٹ نمودار ہوا تھا۔ جس میں سے پلک جھپکتے ہی سنہری روشنی پھوٹی اور آناً فاناً مصنوعی سانپ میں سما گئی۔

جیروم آہستگی سے پیچھے ہوتا جارہا تھا کہ خوف ناک سانپ جھپٹا اور جیروم کے گرد گھیرا کسنے لگا پھر وہ جیروم کو زمین سے اٹھا کر اوپر ہوا۔

سانپ کنٹرولر کے اختیار سے باہر نکلنے لگا تھا، وہ پریشان ہوگئے پھر سانپ نے جیروم کو کافی بلندی پر لے کر اٹھا اور پھر دھپ سے نیچے پٹخ دیا۔

جیروم کے حلق سے دلخراش چیخ ابھری پھر سانپ تیزی سے اس کے قریب آیا اور قہر آلود نظر سے پھنکارتے ہوئے دوبارہ جیروم کو جکڑ کر بلند ہونے لگا۔

کنٹرولرز کے ہاتھوں سے تاریں چھوٹ گئیں۔

وہ چیختے ہوئے تختوں کے پیچھے سے نکلے، پروڈیوسر سمیت سب ہراساں ہوکر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

سانپ جیروم کو بلندی پر لے جا کر گھوما اور اسے اسٹوڈیو کی دیوار پر دے مارا تو وہاں موجود حواس باختہ لوگوں کی دلخراش چیخیں نکل گئیں کیونکہ جیروم دم گھٹنے اور ہڈیاں ٹوٹنے کی وجہ سے دم توڑ گیا اس کے منہ سے اور جسم سے کیچپ کے بجائے، سرخ سرخ گاڑھا خون تیزی سے جاری تھا سب کے چہروں پر خوف اور آنکھوں میں بے یقینی تھی۔

مصنوعی سانپ لہرا کر فرش پر گرا تو اس کے اندر سے سرخ روشنی باہر کو نکلی اور ہوا میں تحلیل ہوگئی۔

ایک دن لوگوں کے پیچھے ہجوم کو چیرتا باہر کو تیزی سے جارہا تھا کہ اچانک ایک نیوز رپورٹر اس کے سامنے آئی۔ ”سر پلیز! ایک سوال۔“

یہ سنتے ہی لوائیڈ نے اپنی کلائی پر بندھی قیمتی گھڑی پر نظر ڈال کر سر اثبات میں ہلایا۔

”سپر اسٹار لکی مین۔ آپ کس کو اپنی کامیابی کا زینہ ٹھہراتے ہیں؟“ اس نے تیزی سے پوچھا۔

”برانڈ ڈگلاسز کے پیچھے لوائیڈ کی آنکھوں کے سامنے گولڈن لاکٹ اور جیروم کا چہرہ جھلملایا اس کے بعد اس نے نیوز رپورٹر کو بغور دیکھا اور جلدی سے آگے بڑھ گیا۔

سنہری آنکھیں

عامر زمان عامر-بورے والا

رات کی تاریکی پورے گائوں پر مسلط تھی اور ایک سایہ آگے ہی آگے بڑھ رہا تھا کہ اچانک چاند بادلوں کی اوٹ سے کلا تو سایہ کے ہاتھ میں موجود خنجر بجلی کا کوندا بن کر چمکا اور پھر اچانک دلدوز چیخ سنائی دی۔

اچھی کہانیوں کے متلاشی لوگوں کے لئے دلگداز، دلفریب اچھوتی، انوکھی اور انہونی کہانی

نمل وادی دو مختلف اضلاع کے پہاڑی سلسلے کے سنگم پر واقع تھی، محل وقوع کے اعتبار سے وادی کا شمالی حصہ ایک ضلع کی سرحد پر جبکہ دوسرا تین چوتھائی حصہ دوسرے ضلع کی سرحد پر مشتمل تھا۔ شروع میں وادی پر ایک ہی راجہ کی حکومت تھی بعد میں راجہ کے چھوٹے بھائی سے جھگڑے کی صورت میں اسے دو حصوں میں تقسیم کیا گیا، بالائی حصے پر بڑے بھائی نے اپنا راج پاٹ چلایا تو نشیبی حصے پر چھوٹا راجہ تخت نشین ہوگیا دونوں راجاؤں کی وفات کے بعد دونوں آبادیوں میں صلح ہوگئی نشیبی حصے کے ساتھ گزرنے والی جھیل کا رخ موڑ کر نشیبی اور بالائی حصوں کو باہم جوڑ دیا گیا محل کی ارتقائی حیثیت بحال ہوگئی دونوں حصوں کے باشندے قدیم دشمنی بھول کر یکجا ہوگئے۔ ایک دوسرے کے دکھ درد اور خوشی میں بڑھ چڑھ کر شریک ہونے سے انفرادی مسائل اجتماعی رنگ میں ڈھل گئے۔

"حماد تمہارے احمقانہ فیصلے کی میں تائید نہیں کرتا، مجھے سمجھ نہیں آرہی تمہاری زندگی کا بڑا حصہ شہر کی رونقوں میں گزرا ہے، پھر تم اپنے لئے جنگل کا ہی انتخاب کیوں کررہے ہو حیرت ہے تمہارے پڑھے لکھے ذہن میں جنگلی آئیڈیا آیا کیسے میرے تو سن کر رونگٹے کھڑے ہوگئے میری مانو تو ابھی بھی وقت ہے اس فیصلے پر نظر ثانی کرو تمہیں اپنی جان کی ذرا بھی پروا نہیں ہے؟ چلو اپنی فکر نہ سہی کم از کم اپنے گھر والوں کے بارے میں ہی سوچ لو، خود پر نہ سہی اپنے گھر والوں پر ہی کچھ رحم کرو۔ تمہارے گھر والوں نے تمہیں اس لئے ڈاکٹر بنایا تھا کہ تم ڈاکٹر بن کر سب کچھ بھلا کے جنگل میں ڈیرے ڈال دو۔"

"ذکی تم نہیں سمجھو گے یار وہ علاقہ جنگل نہیں آسمان سے باتیں کرتے پہاڑوں کے درمیان ایک خوب صورت وادی ہے۔ وہاں بھی لوگ بستے ہیں انہیں میری ضرورت ہے میں نے اچھی طرح سوچ سمجھ کے فیصلہ کیا ہے۔ بچپن سے میرا خواب تھا، میں ایسے خوب صورت علاقے میں جاؤں ان کی ثقافت، انداز زندگی اور پہاڑوں کا فطرتی حسن آنکھوں میں بھر کے وہاں کے لوگوں میں گھل مل جاؤں راستوں کے پیچ وخم پتھریلی گزرگاہوں کے نشیب وفراز پر ڈگمگاتے قدموں کا نظارہ دیکھوں، جس آنکھ میں کوئی خواب اور ارادے میں ایڈونچر نہ ہو وہ زندگی بھی کوئی زندگی ہے خطروں سے کھیلنا، موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر منزل کی اور بھرپور ولولے سے آگے بڑھنا ہی زندگی کا حسن ہے۔ میں نے مکمل تیاری کرلی ہے اسی ہفتے نکلنا ہے۔" ڈاکٹر حماد نے حتمی لہجے میں جواب دیا۔

"حماد تمہیں کیا ہوگیا ہے بچگانہ سوچ کے خول سے

باہر نکلو کیوں اپنے دشمن بنے ہو تم بچی عمر کے میڈیکل کے طالب علم نہیں رہے اب تم ڈاکٹر بن چکے ہو تصورات میں کسی پہاڑی علاقے کا اجمالی خاکہ بسالینا تصویر کا ایک رخ ہے پہاڑی علاقے اور وہاں بسنے والے لوگوں کے بارے میں جانتے ہی کیا ہو پہاڑی لوگ سنگدل اور پہاڑوں کی طرح پتھر مزاج رکھتے ہیں اگر تم نے نمل میں ہاؤس جب کی ٹھان لی ہے تو میرا مشورہ ہے پہلے وادی کا ایک وزٹ کرلو اس ماحول کو اچھی طرح دیکھ لو، لوگوں کو پرکھ لو پھر حتمی فیصلہ کرکے وہاں مستقل ڈیرے ڈالنا، آگے تمہاری مرضی ہے۔" ذکی نے آخری بار سمجھاتے ہوئے ہتھیار ڈال دیئے۔

"ارے بھئی اچھے برے لوگ کہاں نہیں ہوتے، تجھے کس بے وقوف نے کہا ہے کہ پہاڑی لوگ سخت دل اور بے وفا ہوتے ہیں سنگلاخ چٹانوں کی پتھریلی آغوش میں ہونے والے ضروری نہیں کہ ان کے دل بھی پتھر ہوں، ان کے مزاج کی مومیت محسوس کرنے سے تعلق رکھتی ہے میرا دل کہتا ہے پہاڑوں کی گود میں بسنے والے اندر سے گلابوں کی طرح نرم ونازک ہوتے ہیں ان کے ملائم احساس کو چھونے کی ضرورت ہے۔ ان کے صندل جذبے گدگدانے کی ضرورت ہے پربت کی وادی میں اترنے کی ضرورت ہے۔"

بہت سارے پھول بھی تو نوکدار کرخت کانٹوں سے لیس ہوتے ہیں پھر لوگ انہیں چھونے کی حسرت کیوں کرتے ہیں اگر پھول کو چھوتے وقت ایک آدھ کانٹا نازک پوروں میں پیوست بھی ہوجائے تو اس کی نرماہٹ کا احساس درد پر غالب آجاتا ہے۔ بھئی پہ تو میرا برسوں کا خواب تھا خواہش تھی قدرت نے مجھے موقع دیا ہے میں کسی صورت اسے مس نہیں کرسکتا۔

"جو شخص جانتے بوجھتے ہوئے اپنے راستے میں خود اپنے ہاتھ سے گڑھا کھود رہا ہو اس کا کچھ نہیں ہوسکتا، تیرا بے تکا فلسفہ میری سمجھ سے باہر ہے، لوگ دیہی زندگی پر شہر کی پرآسائش زندگی کو ترجیح دیتے ہیں پہلا عقل کا اندھا دیکھا ہے جو شہر کی رونقیں چھوڑ کر پہاڑوں سے سر پھوڑنے چلا ہے مجھے تو لگتا ہے ڈاکٹر بنتے بنتے تو پڑھ پڑھ کے پاگل ہوگیا ہے ایسا کرو دو سروں لوگوں کا علاج کرنے سے پہلے اپنا علاج کسی اچھے سے ڈاکٹر سے کراؤ، جانے سے پہلے کسی ماہر نفسیات سے اپنا مائنڈ ٹیسٹ کرالو ہوسکتا ہے تمہیں عقل آجائے اگر کوئی رومانوی ویژن کا کیڑا اتنا ہی تمہارے دماغ میں کلبلا رہا ہے تو تم کسی نزدیکی دیہی مرکز سے بھی تو اسٹارٹ لے سکتے ہو، ایک تمہاری بات نہیں کتنی زندگیاں

تمہارے مستقبل سے جڑی ہیں تمہارے سامنے پوری زندگی پڑی ہے تم ضد کے پہاڑ گرا کر اپنے کیریئر کی دیوار ہی پاش پاش کرنے پر کیوں تلے ہو۔" ذکی کی نصیحتوں کا آخری پتھر بھی اس کی سوچوں کی جھیل میں کوئی ارتعاش نہ پیدا کرسکا، وہ مایوس ہوکر اٹھنے لگا تو حماد نے مسکراتے ہوئے پیار سے اس کا ہاتھ پکڑلیا۔

بیٹھو نا کچھ دیر تو بیٹھو صائم بھی آنے والا ہے۔ پھر تمہیں اچھی سی تمہاری فیورٹ ہاٹ کافی پلاتا ہوں ویسے بھی سب دوستوں کے پاس یہی ہفتہ ہے اس کے بعد تو سب اپنے اپنے مدار میں تیرتے ہوئے مصروف ہوجائیں گے۔

"چھوڑو میرا ہاتھ مجھے نہیں سننی تمہاری فالتو کی بکواس، کافی کے لئے میرا موڈ نہیں ہے ویسے بھی بہت دیر ہوگئی ہے میں چلتا ہوں۔"

☆......☆......☆

پتھریلے راستوں پر بس ہچکولے کھاتی لرزتی جھولتی آگے بڑھ رہی تھی، پہاڑوں کی قد آور قطار شیشے سے دیکھنے سے ایسی لگ رہی تھی۔ جیسے بس کے ساتھ پوری رفتار کے ساتھ دوڑ رہی ہو سینکڑوں فٹ کی بلندی پر چار سو پھیلے چیڑ اور پڑتل کے درخت بھی ساتھ چل رہے تھے پہاڑوں پر اترتی سرمئی شام کتنی حسین ہوتی ہے، پرسوز گیت فضا میں سر بکھیرتا ہے تو پوری وادی ساز سے گونج اٹھتی ہے، سڑک کے دونوں جانب گہری کھائی نے سفر کو اور بھی خطرناک بنادیا تھا۔ ذرا سے ہچکولے پر سطح زمین سے گہری کھائی تک پڑتی نظر دل ہلا دینے کے لئے کافی تھی زور کے جھٹکے سے بریک لگی ڈر سے سب کا کلیجہ ایک دم منہ کو آنے لگا۔ "چلو بھئی چلو اترو...... اترو...... آؤ جی آؤ...... اروما آ گیا۔" کنڈیکٹر "اروما اروما" کا راگ الاپتے پھرتی سے چھت پر چڑھ گیا وہ اروما وادی کا آخری اسٹاپ تھا۔ جہاں پر بڑی سڑک اروما کے گردونواح میں گھوم کر ختم ہوتی تھی۔ اروما وادی سب سے اونچی پہاڑی پر واقع تھی بس کے آخری اسٹاپ سے آگے کا راستہ پیدل یا پھر خچروں پر سوار ہوکر طے کیا جاتا۔ اروما دلکش تفریحی مقام، خوب صورت منظر کے پیش نظر اپنی مثال آپ تھا۔ ہر سال موسم سرما کے آغاز میں برف باری اور وادی کے دل موہ لینے والے نظاروں کو دیکھنے سیاحوں کا جم غفیر زرمبادلہ میں اضافے کے ساتھ اروما کی شہرت کا دائرہ کئی گنا اور بھی وسیع کردیتا۔

کنڈیکٹر تیزی سے حرام کے مال کی طرح چھت سے بھاری بھرکم بیگ پھینکنے لگا مسافر سیڑھیوں کے قریب کھڑے ہوکے اپنے اپنے بیگ پکڑنے کے لئے ہاتھ بلند کئے دہائیاں دینے لگے۔ "آنے دو...... چھوڑنا مت...... پھینکنا نہیں...... پھٹ جائے گا۔ ارے کیا کررہے ہو...... نیچے گرجائے گا۔" کسی کا بیگ آناً فاناً دھڑم سے زمین پر آن گرتا تو کوئی سیڑھیوں کے ساتھ رگڑیں کھاتے سرکتے بیگ کو تھام لینے میں کامیاب ہوجاتا۔

حماد نے سیڑھیوں کے ساتھ لگ کر ایک بیگ پکڑ کر احتیاط سے زمین پر رکھا کنڈیکٹر کی ہانک پھر بلند ہوئی۔ "یہ بڑا بیگ کس کا ہے۔" "میرا ہے یہ بھی میرا ہے۔" اس کے مڑنے سے پہلے ہی اس نے لاپروائی سے نیچے پھینک دیا جو سیدھا حماد کے کندھوں پر آن گرا، وہ منہ کے بل زمین پر گر پڑا۔ "او بیڑہ غرق۔" حماد کے منہ سے کرخت آواز نکلی کے بعد دیگر کتنے سارے بیگ گرنے سے وہ دب کر رہ گیا۔ کنڈیکٹر نے جلدی سے سیڑھیوں سے چھلانگ لگادی۔

"او بھائی صاحب معاف کرنا، چوٹ تو نہیں لگی۔"

"بھائی صاحب کے بچے اندھے تھے نظر نہیں آرہا تھا، میں ایک بیگ نیچے رکھنے کے لئے جونہی نیچے جھکا تم نے سارے بیگ میرے اوپر پھینک کر بھرکس نکال دیا میرا۔" وہ اٹھتے ہوئے غصے سے چلایا۔ سانس اندر ہی گھٹ کے رہ گیا، اس کا دل چاہ رہا تھا کہ کنڈیکٹر کو کچا چبا جائے۔ "ایک منٹ صبر نہیں کرسکتے تھے، تم انسان ہو کہ کوئی چھلاوا۔" اس سے پہلے کہ بحث و تکرار ہاتھا پائی تک پہنچتی دوسرے مسافروں نے معاملہ رفع دفع کردیا۔ حماد کی توانائی بحال ہوئی تو وہ بیگ اٹھائے سامنے ریسٹورنٹ کی طرف بڑھ گیا۔

"جی صاحب کمرہ چاہئے، ڈبل بیڈ؟ سنگل بیڈ بالائی منزل پر، وی آئی پی روم بھی اویل ہے۔ چارجز بھی مناسب، بالائی منزل سے پوری وادی کا نظارہ صاف دکھائی دیتا ہے۔"

"ارے بھائی فرفر بولے جارہے ہو، پہلے میری تو سن لو بہت زور کی بھوک لگی ہے کوئی پیٹ پوجا کا بندوبست کرو۔" وہ بوجھل قدموں سے بیگ استقبالیہ پر رکھ کر خالی میز پر بیٹھ کر کھانے کا انتظار کرنے لگا۔ ہال نما بڑے کمرے میں اس کے چاروں اطراف کھانے کی میزوں پر بیٹھے ہوئے زیادہ تر سیاح تھے مقامی لوگ آٹے میں نمک کے برابر تھے وہ کھانا کھا کر پھر استقبالیہ پر آ گیا۔

"یار نمل وادی کتنی دور ہے؟ کس راستے جانا زیادہ بہتر ہے؟" حماد نے کھانے کا بل کاؤنٹر پر رکھتے ہوئے پوچھا۔

"بھائی صاحب نمل یہاں سے تیرہ کلو میٹر دور ہے وہاں تک پہنچنے کی واحد سواری خچر ہیں اب تو شام ہونے والی ہے کل صبح سویرے ہوٹل کے سامنے سواری مل جائے گی وہ بائیں طرف ڈھلوان نظر آرہی ہے ناں وہاں سے اتر کے نمل کا راستہ شروع ہوتا ہے ایک اور راستہ بھی ہے پیدل اگر تم ہمت کرسکو تو مگر اس وقت تو ممکن نہیں ہوگا بہتر ہے رات ہمارے ہوٹل میں ہی رک جاؤ۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔" اس نے وقت کی نزاکت دیکھتے ہوئے رات ہوٹل میں ہی گزارنے کا فیصلہ کرلیا۔

"جی صاحب کو کس کمرے میں چھوڑنا ہے۔" کاؤنٹر پر کھڑے شخص نے گھنٹی کا بٹن دبایا تو ایک ادھیڑ عمر باریش بیرہ جن کی طرح جھٹ سے برآمد ہوگیا انہیں اوپر والے وی آئی پی روم میں لے جاؤ اور خاطر داری کے لئے بھی پوچھ لو میٹھا یا نمکین۔" اس نے ہوشیاری سے بیرے کو ہدایت دی۔

"بھائی صاحب مجھے وی آئی پی روم نہیں چاہئے بس سادے سے سنگل بیڈ کمرے کا انتظام کردو، میں نے پہلے بھی بتایا ہے میں سیر کرنے نہیں آیا ہوں، ایک رات ہی تو گزارنی ہے کوئی بھی عام سا کمرہ بھی چلے گا۔"

"گل خان ٹھیک ہے انہیں نیچے سیڑھیوں کے ساتھ والے تیسرے کمرے میں چھوڑ آؤ اور میٹھا نمکین۔" اس نے پشتو میں دوبارہ سمجھایا لفظ گل خان کے علاوہ حماد کے پلے کچھ نہ پڑا۔ "لو صاحب یہ رہا کمرہ" وہ سامان رکھ کے سامنے بیٹھ گیا۔

"ہونہہ کمرہ تو ٹھیک ہے زیادہ ٹھنڈ تو نہیں ہوگی ناں۔" حماد نے بیڈ کی چادر بچھاتے ہوئے پوچھا۔

"ٹھنڈ تو بہت ہوتی ہے کمبل سے کام نہ چلے تو الماری سے رضائی نکال لینا اور ہیٹر بھی آن کرلو اور کچھ چاہئے، چائے پانی، میٹھی یا نمکین ڈش؟" گل خان نے معنی خیز نظروں سے سوال کیا۔

"نہیں نہیں شکریہ اور کچھ نہیں چاہئے۔"

"دیکھ لو صاحب ٹھنڈ بہت ہے میٹھی یا نمکین۔" گل خان نے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ پھیلا کر میٹھی یا نمکین ڈش پر زور دیا۔

"اچھا تم اتنے اصرار سے کہہ رہے ہو تو ذرا بتاؤ میٹھی ڈش کون سی ہے اور نمکین میں کیا ہے؟" اس نے تفصیل پوچھی۔

"میٹھی ڈش میں پچیس سال سے چالیس سال تک کا مال ہے اور نمکین میں سولہ سال سے پچیس سال کی ورائٹی ہے۔" گل خان نے راز داری سے اس کے آگے جھک کر آہستگی سے کہا تو چار سو چالیس وولٹ کرنٹ کی ایک لہر اس کے وجود سے گزر گئی۔

"کیا بکواس کررہے ہو تم میٹھی اور نمکین ڈش پر جو بار بار زور دے رہے تھے اس کا مطلب ہے تم اپنے ہوٹل میں سیاحوں کو غلط کام کے لئے عورتیں سپلائی کرتے ہو۔"

"ہاوے کاناں ماڑا۔" (جی ہاں جناب) اس نے ڈھیٹ پن سے اثبات میں سر ہلایا۔

"لعنت ہے تم لوگوں پر ہوٹل کی آڑ میں گناہ کا کاروبار چلا رہے ہو۔" حماد کا چہرہ غصے سے لال سرخ ہوگیا۔

"لگتا ہے تم یہاں پہلی بار آئے ہو۔" گل خان

کھلکھلا کر ہنس دیا۔

"شکر ہے پہلی بار آیا ہوں اور شاید آخری بار، تمہیں خدا کا ذرا خوف نہیں تمہیں یہاں کی حکومت یا قانون کوئی پوچھنے والا نہیں ہے۔" حماد لاچارگی سے سر پکڑ کے بیٹھ گیا، اس کا وجود ٹھنڈ کے باوجود غصے کی آگ میں جل رہا تھا۔ "اف کہاں آ گیا ہوں کیسے ظالم انسان ہیں چند پیسوں کے لالچ میں لوگوں کی عزتوں سے کھیل رہے ہیں۔" اس نے خونخوار نظروں سے گل خان کو دیکھا اس کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا پہاڑوں کے دامن میں اتنے صاف ستھرے اجلے ماحول میں اتنی گندی ذہنیت کے لوگ بھی پناہ گزین ہوسکتے ہیں اس کا جی چاہا کہ پلک جھپکنے میں گناہ کی دلدل سے دور نکل جائے مگر اروما کی ٹھٹھراتی رات میں رات گزارنے کا واحد سہارہ وہی ریسٹورنٹ تھا اتنی رات کو وہ کہاں جائے گا یہ سوچ کر اس کا غصہ قدرے ٹھنڈا پڑنے لگا۔

"ارے صاحب میرا کیا قصور ہے میں تو خادم ہوں اپنے کام سے کام رکھتا ہوں یہاں کوئی قانون نہیں، قانون تو مراد خان کی جیب میں ہے علاقے کے بڑے لوگ دسمبر کی ٹھنڈی راتیں رنگین بنانے اور جھک مارنے کے لئے دن رات پالتو کتے کی طرح مراد خان کے تلوے چاٹتے رہتے ہیں کچھ جسم فروش عورتوں کی بھی مجبوری ہے محنت مزدوری کے لئے کوئی خاص کام دھندا تو ہے نہیں کچھ مجبوراپنی غربت سے تنگ آ کر عزت نیلام کرنے پر مجبور ہیں ان میں اکثریت علاقہ غیر کے افراد کی ہے، ان کی دیکھا دیکھی اب تو علاقے کی بہت ساری لڑکیاں اس روش پر چل نکلے ہیں، خوشی ہوئی کہ عرصے بعد اس ہوٹل میں کوئی غیرت مند مسافر آیا ہے، مرد کے بچے لگتے ہو، ہمیشہ خوش رہو چلتا ہوں، بیٹا آرام کرو۔

"حماد دروازہ بند کر کے اپنے بستر پر آ کر لیٹ گیا، اسے دسمبر میں گزاری کیمپس کی راتیں یاد آنے لگیں، ثانیہ اس کی بہترین دوست ہی نہیں بلکہ وہ ایک دوسرے سے ٹوٹ کر پیار کرتے تھے وہ بھی میڈیکل کی اسٹوڈنٹ تھی، ثانیہ والدین کے فیصلے سے مجبور ہو کر پڑھنے کے لئے جرمنی جا چکی تھی، طویل سرد رات میں ثانیہ کے ساتھ گزرے محبت بھرے لمحے اسے شدت سے یاد آنے لگے۔

وہ رات بھر ڈائری کھولے پرانی یادوں کے حصار میں لپٹا رہا، صبح ہوتے ہی نمل کے سفر پر روانہ ہو گیا، وہ سامنے پہاڑ میں گھری آبادی نظر آ رہی ہے ناں وہاں سے نمل کی حدود کا آغاز ہوتا ہے۔ اب تم آسانی سے پیدل جاسکتے ہو، آسمان تک پھیلے ہوئے سیاہ پہاڑوں نے برف کی سفید شال اوڑھ رکھی تھی وادی میں ہر طرف سفید دھوئیں کی طرح کہر اٹھ رہی تھی۔ نشیبی حصہ غیر متوازن مولٹ کی طرح غیر متوازی تھا۔ دو گھر ادھر تو چار گھر دوسرے سرے پر موجود تھے آبادی کا بڑا حصہ جنگلی بھیڑ بکریاں پال کے گزر بسر کرتا تھا کچھ لوگوں کا ذریعہ معاش جنگل کی قیمتی لکڑیاں کاٹ کر فروخت کرنا تھا اکا دکا گھروں کے افراد شہر میں ہوٹل چلاتے تھے موسم سرما میں بیشتر کاروباری سرگرمیاں مفلوج ہو کر رہ جاتیں۔ جاڑے کی لہر چھٹتے ہی لوگ پھر سے روزمرہ امور کے لئے گھروں سے نکلتے تو کاروباری زندگی کی رونق بھی بحال ہو جاتی۔

کتنی دور رہ گیا ہے پہاڑ، چلتے ہوئے تو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے چند قدموں کے فاصلے پر ہو مگر دوری ہے کہ کم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی اس نے ایک پختہ ڈھلوان کے کونے پر بیگ رکھ کے ٹھنڈ سے نڈھال ہوتے ہوئے دونوں ہاتھ آپس میں ملا کر رگڑے، گرمائش سے ایک دم ہاتھوں میں جان آ گئی وہ بیگ اٹھا کر آگے بڑھنے لگا ایک دم بڑھتے ہوئے قدم ٹھٹھک کے رہ گئے۔

ایک پہاڑی لڑکی ڈیلے پھاڑے اسے حیرت سے گھورے جا رہی تھی کشادہ پیشانی، کاجل سے بھری موٹی آنکھیں چکلا چوڑا سینہ سرخ چہرہ وہ اس کا حسن دیکھ کر دنگ رہ گیا وہ اس قدر حسین مخلوق کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا، وجود کے ساتھ اس کے ہونٹ بھی ساکت ہو گئے۔

"نمل کتنی دور رہ گیا ہے؟" اس نے ہمت کر کے اسے مخاطب کیا۔

"تم نمل میں ہی کھڑے ہو، یہ بتاؤ تم کون ہو اور نمل میں کیا کر رہے ہو،" پھر خود ہی مفروضہ قائم کر کے

بولی۔ "سیاح ہو؟"

"نہیں میں سیاح نہیں ہوں میرا نام ڈاکٹر حماد ہے میں نمل اسپتال جو مدت سے بند پڑا ہے اسے دوبارہ کھولنے آیا ہوں تم مجھے بتا سکتی ہو اسپتال کدھر ہے؟"

"اسپتال ہونہہ ڈاکٹر یہاں کوئی اسپتال نہیں اسپتال تو کب کا بھوت بنگلے میں تبدیل ہو گیا، واپس لوٹ جاؤ خواہ مخواہ وقت برباد کرنے آئے ہو، نمل کے لوگ تندرست ہیں انہیں ڈاکٹر کی ضرورت نہیں۔

"اسے اجنبی لڑکی سے اس رویے کی ہرگز توقع نہیں تھی اس نے مزید الجھ کے وقت برباد کرنے سے جان چھڑانے میں ہی عافیت جانی۔ اسپتال بالائی آبادی والے حصے پر مشتمل تھا وہ لوگوں سے مل کر اوپر والے حصے میں پہنچ گیا۔ جہاں اس کی ملاقات زرداد خان سے ہوئی وہ اسے اپنے ساتھ گھر لے گیا، زرداد خان نے رات میں خوب خدمت مدارت کی صبح اسپتال جانے سے پہلے اس نے ساری آبادی کے لوگوں کو اکٹھا کیا اور اسپتال کھولنے کی خوش خبری سنائی۔

"بھائیو! یہ ڈاکٹر حماد ہے جو نمل کے لوگوں کے لئے مسیحا بن کے آیا ہے تمام بھائیوں سے تعاون کی درخواست ہے۔"

"زرداد یہ تو بہت اچھی خبر ہے اس نوجوان کی مدد کے لئے کچھ لڑکے ساتھ بھیج کر اسپتال صاف کرا دو، دیکھنا حماد کی خاطرداری میں کوئی کسر مت چھوڑنا کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے بتانا اور ہاں شام کو حماد کے ساتھ مجھے لازمی ملنا، کل صبح میں شہر چلا جاؤں گا،" گلاب خان نے حوصلہ بڑھاتے ہوئے ملاقات کی بھی تاکید کی۔

زرداد ڈاکٹر حماد کا ہم عمر تھا بڑا ہی دار اور اپنے اندر انسانیت کا جذبہ رکھنے والا لڑکا تھا۔ "کتنے عرصے سے بند پڑا ہے اسپتال؟" حماد نے زنگ آلودہ آہنی گیٹ کھول کے اندر جھانکتے ہوئے سوال کیا۔

"حماد بھائی پچھلے پانچ برسوں سے بند پڑا ہے۔"

"ارے عجیب لوگ ہو بنیادی سہولیات کے ساتھ اچھی صحت بھی آپ کا بنیادی حق ہے۔ آپ نے ڈاکٹر کے

سزا

کلاسیکی موسیقی کے ایک پروگرام میں جیل سے آئے ہوئے کچھ قیدیوں کو سامعین میں شامل دیکھ کر ایک صاحب کو بہت تعجب ہوا۔ انہوں نے اپنے قریب بیٹھے ہوئے شخص سے کہا۔

"اب تو ہمارے قیدیوں کو بڑی سہولت ملنے لگی ہے۔"

وہ شخص بولا۔ "سہولت؟ آپ نے ان قیدیوں سے بھی پوچھا ہے۔ یہ پروگرام ان کی سزا میں شامل ہے۔ (افق وقاص احمد-کراچی)

لئے کوشش کیوں نہیں کی حیرت ہے۔"

"کوشش تو بہت کی ہر مہینے ڈاک بنگلے میں شکایت بھی درج کرواتے رہے ایک دوبار تو شہر بھی حکومت کے پاس فریاد لے کر گئے مگر کوئی ڈاکٹر شہر سے دور دراز سے اس وادی میں آنے کے لئے تیار ہی نہ تھا وادی کے لوگ بڑی مشکل میں تھے اگر کوئی بیمار ہوتا تو ندی عبور کر کے وادی چھوڑ کر چوتھی وادی میں ایک پرائیویٹ ڈاکٹر کے پاس جانا پڑتا بعض اوقات تو ڈاکٹر تک پہنچنے سے پہلے ہی مریض دم توڑ جاتا، اتنے عرصے بعد آپ کو خدا نے ہمارے لئے فرشتہ بنا کر بھیجا ہے۔" زرداد نے چمکتی آنکھوں سے کہا۔

"آؤ آؤ...... زرداد خان...... ہاں نوجوان کیسا رہا پہلا دن ہو گئی صفائی۔"

گلاب خان پہلے ہی منتظر تھا۔ "جی خان صاحب ہو گیا ہے سب کچھ صرف صاف ستھرائی ہی نہیں بلکہ افتتاح بھی ہو چکا ہے تین چار مریض بھی دیکھے ہیں ایک بچے کو تو ایک سو تین بخار تھا پتہ نہیں پانچ سال سے آپ لوگ کیسے جھیل رہے تھے ہمت ہے آپ لوگوں کی۔"

"ویری گڈ ڈاکٹر صاحب شروعات تو بہت ہی اچھی رہی۔ کیسی لگی وادی اور اس میں بسنے والے لوگ میرا مطلب ہے سب کا رجحان اور تعاون۔"

''جی سب کچھ ٹھیک ہے وادی تو بہت خوب صورت ہے اور لوگ تو وادی سے بھی زیادہ خوب صورت دل رکھتے ہیں بس ایک تھوڑی سی پریشانی ہے کچھ میڈیسن اور فرنیچر کی اشد ضرورت ہے۔ اس کے لئے مجھے شہر جانا پڑے گا جو فی الحال ممکن نہیں ابھی تو کل ہی میں آیا ہوں میں کچھ دن یہاں رکنا چاہتا تھا۔ یہاں رہوں گا تو اس ماحول کو ان لوگوں کو سمجھوں گا لوگوں کے دکھ درد میں شریک ہوں گا تب ہی ان کے دل جیت سکوں گا مگر میڈیسن کے بغیر بھی گزارا نہیں میں کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہا کیا کروں کچھ دن اور ٹھہر جاؤں یا پہلے شہر سے میڈیسن۔'' گلاب خان کا ردعمل جاننے کے لئے اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''ڈاکٹر صاحب آپ کو فکر مند کی ضرورت نہیں ہے آپ سے ملاقات کا مقصد ہی یہی تھا آپ ڈیمانڈ لکھ کر مجھے دے دو، دو تین دن تک میڈیسن پہنچ جائے گی۔ آپ دونوں دو تین دن بعد ڈاک بنگلے سے میڈیسن اور فرنیچر اٹھا لینا میرا چکر تو مہینے بعد لگے اس دوران بھی کسی چیز کی ضرورت ہو تو کاغذ پہ لکھ کے زرداد خان کے ہاتھ وہ کاغذ ڈاک بنگلے بھیج دینا مجھ تک پہنچ جائے گا۔''

گلاب خان سرکاری محکمے میں گریڈ دن کا افسر تھا حکومت کے ایوانوں تک اس کی خاصی جان پہچان تھی وادی میں جو بھی فلاحی کام ہوتا اس میں گلاب خان کی خدمات پیش ہوتیں، اسی کی کوشش سے نمل کے لوگوں کو ڈاکٹر حماد کی صورت میں نیا مسیحا ملا تھا۔

''حماد بیٹا وادی کے بارے میں تو زرداد خان تمہیں آگاہ کر چکا ہے یہ بھی تمہارے علم میں ہے کہ گزشتہ پانچ برسوں سے کوئی ڈاکٹر نمل میں آنے کے لئے راضی نہیں تھا مگر شاید زرداد نے تمہیں اس کی وجہ نہیں بتائی ہوگی۔ بیٹا تمہارے عزم اور حوصلے کی قدر کرتا ہوں تم نے ہمیں جو اپنائیت دی ہے اس لئے کوئی بات تم سے پوشیدہ رکھنا تمہارے ساتھ دھوکا ہوگا۔''

''حماد کو یوں لگا جیسے کئی من وزنی پتھر گلاب خان نے اس کے سینے پر رکھ دیا ہو وہ اس کے بوجھ تلے دھنستا جا رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ گلاب خان بات کو آگے بڑھاتا دوپٹے کے پلو سے آدھا چہرہ چھپائے گلاب خان کی بیٹی لکڑی کے مگوں میں قہوہ رکھے پردے کی اوٹ سے نکلی اور حماد کو دیکھتے ہی اس کے قدم ساکت ہو گئے۔

''آؤ بیٹا حماد سے شرمانے کی ضرورت نہیں ہے اب حماد نمل کا حصہ ہے آ جاؤ لے آؤ قہوہ۔'' وہ قہوہ رکھ کے جونہی پلٹی اس کے چہرے سے آدھا پلو بھی ہٹ گیا تو حماد دیکھ کر حیرت میں ڈوب گیا۔ ''باپ رے باپ یہ تو وہی سنہری آنکھوں والی لڑکی ہے۔ جو پہلے دن وادی کے باہر ملی تھی کمال ہے یہ گلاب خان کی بیٹی ہے۔'' اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا اس نے پیچھے مڑ کے منہ بناتے ہوئے حماد کو گھورا، پردہ اٹھا کر اندر داخل ہو گئی اس کے ردعمل سے لگ رہا تھا اسے حماد کی آمد ناگوار گزری تھی حماد کو سمجھ میں نہیں آ رہی تھی ماجرہ کیا ہے۔ سنہری آنکھوں والی لڑکی کی نفرت اس کی ذات سے تھی یا اس کے پیشے سے جبکہ دوسری طرف وادی میں اسپتال چلانے کے لئے جس کی سب سے زیادہ سپورٹ تھی وہ اس کا باپ تھا۔

''جی تو گلاب خان آپ کچھ کہہ رہے تھے کچھ بتانا چاہ رہے تھے۔''

حماد نے خالی مگ رکھتے ہوئے اسے یاد دلایا۔

''ہونہہ...... اسپتال کی منظوری کے بعد حکومت نے نمل میں جو پہلا ڈاکٹر تعینات کیا تھا در اصل وہ مسیحا کے روپ میں درندہ تھا اسے تو اپنے کئے کی سزا مل گئی مگر افسوس ناک بات یہ ہے کہ اسے وادی میں سے کسی نے بھی نہیں مارا تھا حیرت انگیز طور پر صبح اسپتال میں اس کی لاش پڑی تھی اس کے بعد جو بھی ڈاکٹر آیا وہ بھی پراسرار طور پر نامعلوم قاتل کی سفاکیت کا نشانہ بنا، اب تک تین ڈاکٹر بے گناہ ہونے کے باوجود اس وحشی کے کرتوں کا خمیازہ بھگت چکے ہیں، سمجھ نہیں آتا کہ ان بے چاروں کا کیا قصور تھا، اتنا عرصہ گزر جانے کے باوجود یہ معمہ آج تک حل طلب ہے، حیرت انگیز طور پر یہ تینوں کو قتل کرنے کا طریقہ واردات ایک ہی ہے، نمل میں وہ کون سی وحشی بلا ہے جو انہیں نگل گئی یہ آج تک راز نہیں کھلا، کون وحشی جانور ہے پہلے بڑی بے دردی سے آنکھیں نکالتا ہے پھر وحشیانہ انداز میں قتل کر کے

ادھ کاٹتا ہے، آخر میں سر تن سے کاٹ کے پھینک دیتا ہے، ہیں کئی بار انوسٹی گیشن کے لئے شہر سے آئی ہے مگر کوئی سراغ نہیں ملا نہ ہی ہم میں سے کوئی کھوج لگا سکا ہے، ایک بات تو طے ہے درندے کے روپ میں ہے تو وہ بھی کوئی انسان کوئی جنگلی جانور یا بلا اتنی مہارت اور صفائی سے آنکھیں نکال سکتی ہے نہ ہی گلا اور ہاتھ کاٹ سکتی ہے زندہ انسانوں کو نوچ کر موت کے گھاٹ اتارنے والا ہے ز گوشت پوشت کا انسان مگر......'' کرب سے موٹے موٹے پانی کے قطرے گلاب خان کی آنکھوں سے پھسل کر گھنی داڑھی میں جذب ہو گئے۔

''اب تو ہم بالکل ناامید ہو چکے تھے کہ نمل کا کھنڈر نما اسپتال کبھی آباد نہیں ہوگا اب یہاں کوئی نہیں آئے گا۔ بیٹا تم وادی کے لوگوں کے لئے امید کی آخری کرن ہو، میں جانتا ہوں تم بہادر ہو سمجھ دار ہو مگر تمہیں ہوشیار رہنا ہوگا۔ اسپتال یا سرکاری ڈاک بنگلے میں رہنے کی غلطی کبھی بھول کر بھی مت کرنا۔ ہم نہیں چاہتے نمل کی تاریخ پھر کوئی ہولناک حادثہ دہرائے، زرداد خان نمل کا سب سے بہادر لڑکا ہے یہ دن رات سائے کی طرح تمہارے ساتھ رہے گا وادی کے چپے چپے سے اچھی طرح واقف ہے، رات کے وقت ڈیرے پر بھی تمہارے ساتھ رہا کرے گا، میں کل شہر اپنی ڈیوٹی پر چلا جاؤں گا اپنا خیال رکھنا۔'' گلاب خان کا حیرت انگیز انکشاف سن کے حماد پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے ٹھنڈ کے باوجود اس پر خوف دہشت طاری ہونے سے اس کا ماتھا پسینے سے بھیگ چکا تھا۔

انجانے خوف سے اس کا جسم تھر تھر کانپ رہا تھا اس کی حالت غیر ہونے لگی ایک لمحے کے لئے اسے اپنے جذباتی فیصلے پر پچھتاوا ہونے لگا۔ ''ذکی ٹھیک کہتا تھا مجھے اتنی جلدی اپنے کیریئر کا فیصلہ نہیں کرنا چاہئے تھا میں نمل نہیں کسی آدم خور قبیلے میں آ گیا ہوں۔'' وہ سب کچھ بھول گیا تھوڑی دیر پہلے سنہری آنکھوں والی لڑکی کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی تھی وہ ایک دم ماند پڑ گئی ڈر سے اس کا رنگ پیلا پڑنے لگا اس نے سہمے ہوئے انداز میں خالی نظروں سے ایک نظر زرداد کے چہرے پر ڈالی وہ کچھ کہنا چاہتا تھا مگر حلق اور ہونٹ خشک ہو گئے زرداد خان اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اس کے پیچھے حماد بھی مرے ہوئے قدموں سے چلنے لگا۔

''حماد بھائی کچھ لڑکے تم سے ملنے آئے ہیں۔'' زرداد نے مریضوں میں گھرے ڈاکٹر حماد کو اطلاع دی۔

حماد اسٹیتھو اسکوپ گلے سے اتار کے میز پر رکھ کے باہر آ گیا۔

''کون آیا ہے کوئی سریس مریض ہے یا پھر کوئی حیرت انگیز انکشاف منتظر ہے؟''

واہم کو جھٹکتے ہوئے اس نے زرداد سے پوچھا، وہ گزشتہ شام سے لپٹے ہوئے ڈر کے سحر سے ابھی تک نہیں نکلا تھا۔

''وادی کے ہی چھوکرے ہیں تم سے ملنے آئے ہیں خود ہی پوچھ لو کیا کام ہے؟''

''اچھا ٹھیک ہے بلاؤ اندر۔'' حماد ساتھ والے کمرے کی طرف مڑ گیا۔

''السلام وعلیکم ڈاکٹر صاحب!'' اونچے قد کاٹھ والے پھرتیلے ایک لڑکے نے آگے بڑھ کے سلام کیا۔

''وعلیکم السلام۔ جی کہئے کوئی ضروری کام تھا؟'' حماد نے لہجے میں اترے خوف کو قدرے چھپانے کی کوشش کی۔

''ڈاکٹر صاحب ڈاک بنگلے سے اطلاع آئی ہے کہ وہاں شہر سے کچھ دوائیاں اور سامان آیا ہے۔''

''تم کون ہو۔'' حماد نے میڈیسن کا سن کر اطمینان سے سانس لیا۔

''یہ دولت خان ہے۔'' گلاب خان کا لڑکا۔

اس کے جواب سے پہلے ہی زرداد نے تعارف کرا دیا۔

''اچھا یہ تو اچھی خبر ہے مگر ابھی بتانا اتنا ضروری بھی نہیں تھا اس وقت مریض دیکھنا ضروری ہے۔''

''ہاں جی بالکل ٹھیک کہا مگر ہم نے سمجھا شاید دوائیاں ختم ہوں اور ڈاک بنگلے سے تاکید تھی فوراً ڈاکٹر

صاحب کو اطلاع کردو۔"

"ارے بہت بہت شکریہ ابھی کچھ دوائیاں پڑی ہیں آج کا کام چل جائے گا کل جمعہ ہے کل اسپتال سے ناغہ ہوگا کل جائیں گے ڈاک بنگلے۔"

حماد نے خوش دلی سے سب کا شکریہ ادا کرکے وضاحت کی۔

"ٹھیک ہے لالہ کل جب ہماری ضرورت ہو بلالینا۔"

دولت نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہاں ہاں کیوں نہیں زرداد آپ کو بلالے گا۔"

☆......☆......☆

ایک ماہ کا طویل عرصہ پلک جھپکتے گزر گیا وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہوا۔ نمل کے لوگوں کے چہروں پر پھیلی ہوئی مایوسی خوشی میں تبدیل ہوگئی، میں وادی کے لوگوں میں گھل مل گیا میرے ذہن سے خوف کا بھوت بھی اتر گیا میں نے مہینے کے آخر میں شہر چکر لگانے کا منصوبہ بنایا۔" زرداد اب تو مریضوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے اکا دکا مریض آتے ہیں ہفتے میں کیا خیال ہے۔ گھر کا چکر نہ لگا آؤں۔"

زرداد چمکتے ہوئے چہرے کے ساتھ آرام سے چارپائی پر پھیلتے ہوئے مجھے تکنے لگا۔

"ہاں خیال تو اچھا ہے بلکہ میرا تو مشورہ ہے اسی ہفتے کے آخر میں نکل جاؤ۔ ماما گلاب خان بھی اس ہفتے آجائے گا اس سے ملاقات بھی ہوجائے گی پھر چلے جانا۔"

"اب چلیں ڈیرے پر یا کچھ دیر پڑھائی کروگے۔"

زرداد نے اس کی حتمی رائے جاننے کے لئے زور دے کر کہا۔

"کیوں تمہیں نیند آرہی ہے یا بھوک ستارہی ہے؟"

"بھوک سے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے ہیں، نیند کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

اچھا اٹھو چلو پہلے کھانا کھا کے آتے ہیں پھر واپس آکر تم ڈسپنسری میں کچھ میڈیسن ترتیب دینے میں مدد کرنا میں تھوڑا سا مطالعہ کرلوں گا۔"

"ٹھیک ہے چلو۔"

زرداد خوشی سے اچھلتے ہوئے فوراً اٹھ کھڑا ہو جیسے پہلے سے تیار بیٹھا ہو، کھانے سے واپس آکر وہ سیدھے ڈسپنسری میں گھس گیا، زرداد بڑے کاٹن سے دوائیاں نکال کر مجھے دیئے جاتا اور میں ترتیب سے الگ الگ خانے میں رکھتے ہوئے زرداد کو مخاطب کرکے اس میں دلچسپی پیدا کرنے کی کوشش بھی کررہا تھا۔

"زرداد پتہ ہے یہ میڈیسن کس چیز کی ہے۔"

"بابا اتنا پتہ ہوتا تو تمہاری جگہ ہم نمل کا ڈاکٹر ہوتا۔"

"یہ تو ہے، زرداد خوشخبری تو تجھے بتانا ہی بھول گیا۔"

اچانک جیسے کچھ یاد آ گیا۔

"کیسا خوشخبری۔"

"بہت جلد نمل اسپتال میں میری مدد کے لئے کمپاؤنڈر کا بھی بندوبست ہوجائے گا۔"

"کمپاؤنڈر۔ یہ کیا ہوتا ہے۔"

"یہ آدھا ڈاکٹر ہوتا ہے آدھا انسان ہوتا ہے۔"

میں نے خوش گوار موڈ میں جواب دیا تو زرداد کی ہنسی کے فوارے چھوٹ گئے۔

"یہ اس وقت کون آ گیا؟"

آہٹ پر چونک کر ہم دونوں حیرت سے ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔

"میں دیکھتا ہوں حماد بھائی تم نیچے نہ اترو۔"

"ڈاکٹر صاحب...... جلدی سے میرے ساتھ چلئے میری بیٹی کو زہریلے سانپ نے ڈس لیا ہے گھر میں میرا شوہر بھی نہیں شوہر مزدوری پر گیا ہوا ہے ورنہ اپنی بیٹی کو آپ کے پاس لے آتی خدا کے لئے جلدی سے میرے ساتھ چلئے۔"

زرداد کے باہر نکلنے سے پہلے دوڑتی ہوئی خاتون اندر داخل ہوگئی۔

"میں جلدی سے میڈیسن والا بیگ

بہترین کہانیوں کا انتخاب

ماہنامہ صائمہ کراچی کا

قیمت -/50 روپے

نیا شمارہ شائع ہوگیا ہے

جس میں دل کو چھو لینے والی اور ذہن سے محو نہ ہونے والی نئی سلسلے وار کہانی۔

"شمع" اے آر خاتون، اور دوسری "شکست شب" فریدہ اشفاق۔

اس کے علاوہ مستقل سلسلوں میں، تھوڑی سی ملاقات، خواتین کے مسائل، بزم غزل، باتوں کے موتی، صائمہ کا دسترخوان، بزم حسن، صائمہ کے ٹوٹکے، اور نامور رائٹروں کی کہانیاں، افسانے ناول اور سچ پر مبنی بہت سی کہانیاں اور بہت کچھ جو آپ پڑھنا چاہتی ہیں۔ ابھی اپنے کسی بھی قریبی بک اسٹال یا ہاکر سے نام لے کر طلب فرمائیں۔

معزز خواتین! آپ سب کے لئے سنہری موقع ہے کہ آپ دیگر رسالوں میں اپنی تحریریں بھیج کر انتظار کی گھڑیاں گن رہی ہیں۔ لہٰذا اپنی تحریر صائمہ میں ارسال کریں۔ پہلی فرصت میں آپ کی تحریریں شامل اشاعت ہوں گی۔

رابطے کے لئے:۔

آرڈر دینے کے لئے ایجنٹ حضرات فوری رابطہ کریں۔

نورانی آرکیڈ۔ میزانائن فلور رتن تلاؤ نمبر ۳، کراچی

021-32711915 021-32744391

اٹھا کر تیار ہوگیا۔ زرداد خان بھی ساتھ چلنے کے لئے آگے بڑھا تو میں نے اسے منع کیا۔

"تم ٹھہرو ساری میڈیسن بکھری پڑی ہیں تم آرام سے میڈیسن نکال کے ترتیب سے رکھو جیسے میں رکھ رہا تھا میں ابھی آیا ورنہ پھر بہت دیر ہوجائے گی۔"

وہ جلدی سے ہدایت دے کر خاتون کے ساتھ نکل گیا۔

☆......☆......☆

"خالہ کا گھر تو اتنی دور نہیں تھا حماد بابو کہاں رہ گیا۔" زرداد کھڑکی سے دیکھ کر پھر بے چینی سے بیٹھ گیا۔

دور سے کوئی سیاہ ہیولا دھیرے دھیرے سے کھڑکی کی اور بڑھ رہا تھا زرداد دیکھ کے پہلے ششدہ ہوا پھر کچھ سوچ کر کھڑکی کے پاس بیٹھ گیا۔

"اچھا تو حماد بابا، زرداد کی بہادری کا امتحان لینا چاہتا ہے، اس طرح چادر میں چھپ کر مجھے ڈرانے آیا ہے۔ زرداد پہاڑوں کا بیٹا ہے، آ ذرا تیری تو میں خبر لیتا ہوں۔" زرداد بولا۔

ہیولا چلتے چلتے انسانی وجود میں تبدیل ہوگیا زرداد کا تجسس دھیرے دھیرے بڑھتا جارہا تھا۔ اس کالی چادر کی بکل میں لپٹے انسانی وجود اور کھڑکی کے درمیان بہت کم فاصلہ رہ گیا تھا، زرداد بڑے اطمینان سے کھڑکی کی طرف پشت کر کے آرام سے بیٹھ گیا، وہ ہیولا کے آگے بڑھنے کا انتظار کررہا تھا، دروازے سے لے کر آخری کونے تک گھپ اندھیرا تھا، کمرے میں موم بتی کی ہلکی روشنی پھیلی تھی اور زرداد آنکھ مچولی کا منتظر تھا۔

زرداد آگے بڑھتے ہوئے قدموں کی آہٹ واضح سن رہا تھا۔ جب اسے یقین ہوگیا کہ نقاب پوش کھڑکی کے بالکل قریب پہنچ گیا ہے زرداد اسے گرفت میں لے کر پکڑنا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے تو وہ پھرتی سے کھڑکی سے کود کے اسے دبوچنے کے لئے اس سے چمٹ گیا۔

تیز دھار خنجر لہرایا اور سیدھا بائیں آنکھ پر لگا، زرداد کراہتے ہوئے کھڑکی کے پاس ڈھیر ہوگیا۔

میرے آنے تک زرداد کا کام تمام کر کے نقاب پوش ہوا ہو چکا تھا۔

خوف سے میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے، میں نے ادھر ادھر دیکھا مگر حملہ آور رات کی تاریکی میں آسانی سے فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا تھا۔

میرے شور مچانے سے آس پاس کے گھروں سے لوگ نکل کر اسپتال میں جمع ہوچکے تھے۔ خوش قسمتی سے زرداد کی جان تو بچ گئی مگر آنکھ پر زخم بہت گہرا لگا تھا۔ زرداد خان خون میں لت پت مردہ لاش کی طرح خاموش پڑا تھا۔

زرداد کو اس حالت میں دیکھ کر سب کے ہوش اڑ گئے مگر میں نے انہیں تسلی دی، زرداد کی سانسیں چل رہی ہیں آنکھ کے علاوہ جسم پر کوئی اور زخم نہیں ہے گھبرائیں نہیں یہ زندہ ہے درد اور خوف کی وجہ سے بے ہوش ہے۔ اسے اندر ڈسپنسری تک لانے میں مدد کریں کچھ نہیں ہوگا اسے۔"

رات خوف و دہشت کی نذر ہوگئی پوری وادی نے رات جاگ کر آنکھوں میں گزار دی صبح ہوتے ہی سب نے اسپتال کو ہمیشہ کے لئے تالا لگا کر مجھ کو شہر واپس لوٹ جانے کا مشورہ دیا۔

"حماد بابو آپ نے ہمارے لئے جو کچھ کیا وہ سب کو معلوم ہے دیکھو آپ کے اس احسان کا مول تو ہم نہیں چکا سکتے مگر سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے تمہیں خطرے کی آگ میں نہیں جھونک سکتے، اس لئے بہتر ہے آپ واپس چلے، جاؤ نمل اسپتال میں، ہم کسی اور کو درندگی کا نشانہ نہیں بننے دیں گے۔

"مگر میں نے واپس جانے سے انکار کردیا، وادی کے لوگ فیصلہ کرچکے تھے کہ کسی صورت بھی مجھ کو نمل میں رہنے کی اجازت نہیں دیں گے، سب کو گلاب خان کا شدت سے انتظار تھا۔

"حماد بیٹا سب ٹھیک کہہ رہے ہیں تمہارا واپس چلے جانا ہی بہتر ہے پہلے ہی تین بے قصور ڈاکٹر نا کردہ جرم کی پاداش میں اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں زرداد اپنی آنکھ گنوا چکا ہے میں اس ضد کی تائید نہیں کرسکتا۔" گلاب خان نے صورت حال کو مدنظر رکھتے ہوئے دوٹوک جواب دیا۔

"گلاب خان میں آپ کی بات اور سب لوگوں کے جذبات سمجھ سکتا ہوں میں یہ بھی جانتا ہوں کہ جان لیوا حملہ زرداد پر نہیں مجھ پر ہوا تھا، غلط فہمی میں میری جگہ زرداد بے چارہ درندگی کی بھینٹ چڑھ گیا مگر آپ پڑھے لکھے ہیں جو جن بھوت، چڑیل بلا یا جنگلی جانور والا معاملہ یہ سب سمجھ رہے ہیں ایسی کوئی بات نہیں، میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ جو بھی درندہ ہے اس کے انتقام کی کہانی نمل اسپتال سے جڑی ہے، مطلب وار کرنے والے کا نشانہ زرداد نہیں میں تھا کیونکہ حملہ آور اس کی آنکھ پھوڑ کے گرا سکتا تھا تو وہ مزید وار کر کے جان سے بھی مار سکتا تھا مگر اس نے آنکھ پر وار محض پہچانے جانے کے ڈر سے کیا تھا تاکہ زرداد اسے پہچان نہ پائے اور میں یہ بھی پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ کوئی جن بھوت یا چڑیل نہیں بلکہ وہ جنونی شخص اسی نمل وادی سے ہے، آپ لوگ مجھے ایک موقع دیں وہ جو بھی ہے نمل کا خیر خواہ نہیں، میں اسے بے نقاب ضرور کروں گا میں اسے پکڑ کر دکھاؤں گا۔"

"ارے ڈاکٹر لگتا ہے تو پاگل ہوگیا ہے، تو خود بھی مرے گا ساتھ کوئی اور بھی زرداد جیسا قربانی کا بکرہ بنے گا۔" سب لوگ یکدم یک آواز ہو کر بولے۔

مگر گلاب خان کو میری بات سمجھ آچکی تھی اس کی گرج دار آواز گونجی۔ "دیکھو بھائی لوگ حماد بابو ٹھیک کہہ رہا ہے کوئی گھر کا بھیدی ہے جو لنکا ڈھا رہا ہے، بیٹا میں تمہارے ساتھ ہوں تمہارے پاس ایک موقع ہے خدا تمہیں اس مقصد میں کامیاب کرے، لیکن ایک بات تم اچھی طرح سن لو اگر دوبارہ کوئی ناخوش گوار واقعہ رونما ہوا تو یاد رکھنا تمہارا خاموشی سے چلے جانا بہتر ہوگا۔"

☆......☆......☆

میں اپنے گھر والوں سے ملنے شہر جانے لگا تو زردار کے گھر والوں سے اجازت لے کر اسے بھی ساتھ لے گیا، شہر کے اچھے اسپتال میں زرداد کا علاج ہوا، اس نے شہر میں اس کی دل جان سے خدمت کی شہر گھمایا۔ مگر آپریشن کے باوجود آنکھ کی بینائی نہ بحال ہوسکی وہ آنکھ سے محروم ہوگیا مگر اس نے میرا ساتھ نہ چھوڑا وہ پہلے کی طرح پرچھائی بن کر میرے ساتھ رہنے لگا۔ میں جب بھی شہر اپنے گھر جاتا تو زرداد میرے ساتھ ہی ہوتا۔

"زرداد ایک بات میری سمجھ نہیں آرہی جب سے نمل آیا ہوں گلاب خان سے پہلی ملاقات سے لے کر وہ بات میرے ذہن میں مسلسل کھٹک رہی ہے سوچا تھا جب اتنا کچھ تمہارے اور گلاب خان کی زبانی پتہ چل گیا تو اس بات کا جواب بھی نمل میں رہتے مل جائے گا۔"

"حماد بھائی کون سی بات تمہارے من میں کھٹک رہی ہے۔" زرداد نے پوچھا۔

"یہ تو معلوم ہوگیا کہ انتقام کی آگ نمل اسپتال کی دیواروں سے بھڑکی تھی مگر وہ بدنصیب لڑکی کون تھی جسے اس وحشی ڈاکٹر نے بربریت کا نشانہ بنا کر برباد کر ڈالا تھا۔"

"حماد بھائی...... پوری وادی کا حسن ایک طرف اور زرتاشا ایک طرف پرستان کی شہزادی تھی۔

شہزادی اس جیسی خوب صورت لڑکی نمل وادی میں کسی ماں نے جنی ہے نہ جنے گی مگر اس حرام زادے ڈاکٹر نے کلی کو کھلنے سے پہلے ہی مسل ڈالا، زرتاشہ ماما گلاب خان کی بیٹی تھی۔

ایڑیاں رگڑ رگڑ کے اس بے چاری نے گلاب خان کے سامنے دم توڑا تھا، پہاڑ کا جگر ہے گلاب خان کا حوصلہ ہے کہ جوان بیٹی کی موت کا غم سینے سے لگا کر جی رہا ہے، مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ شام کے سپاٹ سکوت میں اب بھی پہاڑوں کے دامن میں زرتاشہ کی چیخوں کا شور گونجتا ہے وہ منظر کوئی نہیں بھول پایا آج تک...... ایک قیامت تھی جو آ کر تو گزر گئی مگر اپنے پیچھے بھیانک نشان چھوڑ گئی۔ سچ پوچھو تو وادی کے لوگوں کا ماننا ہے کہ زرتاشہ کی روح آج تک بھٹکتی پھرتی ہے وہی انتقام کا روپ دھارے سب کو اپنے شکار کا لقمہ بناتی ہے۔" زرداد نے بتایا۔

"مگر اتنے عرصے بعد یہ خیال آپ کے ذہن میں کیسے آیا میرا مطلب ہے آپ یہ سب کچھ کیوں پوچھ رہے ہے؟"

"زرداد نے چونکتے ہوئے سوال کے جواب میں حیرت سے پوچھا۔

"زرداد تم پہاڑی لوگ بہت سادہ ہو، یہ روحوں کا انتقام، آتما پریت ایسا کچھ بھی نہیں ہوتا ایسی باتیں کہانیوں افسانوں میں لکھی پڑھی اور فلموں ڈراموں میں دیکھی جاتی ہیں حقیقت میں اس کا کوئی وجود نہیں ہے زرداد تمہاری باتیں سن کر میرا شک پکے یقین میں بدلتا جارہا ہے۔"

"میں نے اپنے خدشے کی خود ہی تصدیق کرتے ہوئے جواب دیا۔"

"شک، یقین حماد بھائی آپ کیا کہہ رہے ہو میرے تو کچھ پلے نہیں پڑ رہا۔"

"تمہیں کسی پر شک ہے؟"

وہ خوف سے ایسے کانپنے لگا جیسے وہ کردار اسے مارنے کے لئے سامنے کھڑا ہو۔

"اچھا تمہیں یاد ہے جس رات تم پر حملہ ہوا تھا اگلی صبح باہر والے دروازے سے قریب گرم اونی کھال دار ٹوپی ملی تھی۔

میں نے جواب دینے کی بجائے الجھ کر نئے سوال کی گرہ ڈالی۔

"ہاں ہاں یاد آیا ملی تھی وہ تھی بھی زنانہ۔"

زرداد نے اپنے ماتھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے یاد کرکے جواب دیا۔

"تو اس بات کو ڈیڑھ سال گزر گیا اتنے عرصے بعد آپ کو ٹوپی سے ایسا کون سا سراغ مل گیا آپ کو کس پر شک ہوگیا۔"

زرداد کا تجسس لحہ بہ لحہ بڑھتا جارہا تھا اس کے سوال کا کیا مطلب تھا وہ سن کر حیرتوں میں ڈوبتا جارہا تھا۔

"فیض ادھر آؤ بات سنو۔" میں نے کمپاؤنڈر کو آواز دی۔

"فیض کل رات تم زرداد کے گھر سے کھانا لا رہے تھے تو تم نے کیا دیکھا؟" میں نے فیض سے پوچھا۔

"میں نے دیکھا اسپتال کی دیوار کے ساتھ کوئی لڑکی تھی سنہری آنکھوں والی اس کی آنکھیں اندھیرے میں چمک رہی تھیں، میں نے آواز دی پھر اس کے پیچھے بھاگا مگر وہ بجلی کی تیزی سے غائب ہوگئی۔"

"زرداد دھیان سے سنو، ہم دونوں پر آج کل میں کسی پر پھر جان لیوا حملہ ہوسکتا ہے زیادہ چانس میرا اور فیض کا ہے، زرداد تم ایک کام کرو کل سے وادی میں مشہور کردو کہ تم اور فیض ڈیرے پر ہوتے ہو اور ڈاکٹر حماد یعنی میں رات اسپتال میں تنہا ہوتا ہوں، ہمیں ضرورت سے زیادہ ہوشیار رہنے کی ضرورت ہوگی پھر دیکھنا راز سے پردہ کیسے اٹھتا ہے۔" میں نے کہا۔

منصوبے کے مطابق رات کو اسپتال میں ساری ساری رات جاگ کر ہم پہرہ دیتے، وادی کے کچھ دوسرے لڑکے بھی ان کے ساتھ جاگتے رہے مگر کوئی کامیابی نہ ملی، مہینے سے زیادہ عرصہ گزر گیا نتیجہ صفر، دھیرے دھیرے جوشیلے لڑکے تتر بتر ہوگئے۔

آخر میں ہم وہی تین کے تین بنیادی کردار رہ گئے فیض اور زرداد بھی بالکل مایوس ہوچکے تھے مگر میں پکے ارادے سے مسلسل تاڑ میں رہا۔

ایک رات میں مطالعے میں غرق تھا کہ اچانک آہٹ پر چونک گیا، نقاب پوش کیل کانٹے سے لیس ہوکر میری زندگی کا چراغ گل کرنے اسپتال کی چاردیواری کے اندر اتر چکا تھا میں اندھیرے میں سنہری آنکھوں کی چمک سے چونک کر ہوشیار ہوگیا۔

خوش قسمتی سے فیض اور زرداد کی مدد سے میں پراسرار قاتل کو پکڑنے میں کامیاب ہوچکا تھا۔

رات کا آخری پہر دامن کوہ میں دم توڑ رہا تھا میں اپنے کمرے سے نکل کر دیوار کے عقب میں حملہ آور کی گھات میں بیٹھا تھا، اس سے پہلے کہ وہ فیض پر حملہ کرکے انتقام کا نشانہ بناتا میں پلک جھپکتے میں پیچھے سے اسے اپنے مضبوط بازوؤں میں جکڑ کے اپنے قابو میں کرلیا۔

صبح ہوتے ہی وحشی درندے کا سفاک روپ دیکھنے پوری مکمل وادی اسپتال میں امڈ آئی، دروازہ کھول کے سارے لوگ اشتیاق سے اندر داخل ہوئے اور نظر پڑتے ہی سب کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ کمرے کے میں سنہری آنکھوں والی گلاب خان کی بیٹی پلوشہ موجود تھی۔

زندہ مردہ

احسان الحق۔ اسلام آباد

بستر پر موجود شخص چیختا رہا چلاتا رہا مگر افسوس کہ جتنے لوگ وہاں موجود تھے کسی نے اس کی ایک نہ سنی، ایسا لگتا تھا کہ اس کی آواز بند ہوچکی تھی، مگر ایسا نہ تھا کیونکہ اس کے ساتھ بہت ہی عجیب ہورہا تھا۔

کہتے ہیں کہ زیادہ چالاکی اور عقلمندی اکثر گلے پڑ جاتی ہے، اپنی نوعیت کی شاہکار کہانی

میر زمان خان شہر کے ان رئیسوں اور دولت مندوں میں سے تھا جس کے پاس دنیا کی کسی آسائش کی کمی نہ تھی۔ وہ جب چاہتا اپنے دل کی کوئی بھی خواہش پوری کرسکتا تھا۔ دولت جب انسان کے پاس ہو تو مزاج میں لاابالی پن آ ہی جاتا ہے لیکن وہ ایک سمجھدار انسان تھا دولت کو نہ صرف کمانا ہی نہ جانتا تھا بلکہ اسے سنبھالا کس طرح جاتا ہے؟ یہ بھی اسے بخوبی معلوم تھا! دنیا میں اکثر لوگ دولت کما لیتے ہیں لیکن یہ ایسی "ظالم" ہوتی ہے کہ سنبھلے نہیں سنبھلتی۔ لیکن میر زمان ایسا آدمی تھا ہی نہیں۔ اس کی زندگی میں کسی شے کی کمی نہ تھی۔ اگر کمی تھی تو وہ تھا "دل کا سکون" اسے ڈپریشن کا مرض تھا۔ وہ ایک مقامی ماہر نفسیات سے اپنے اس مرض کا علاج باقاعدگی سے کروا رہا تھا آج بھی وہ اپنے علاج کے سلسلے میں اپنے معالج کے سامنے اس کے کلینک میں موجود تھا۔

"میرا خیال ہے کہ آپ کے لئے اب ضروری ہے کہ آپ شادی کرلیں۔" ڈاکٹر ناصر لطیف نے میر زمان سے کہا۔ میر زمان ڈاکٹر کے سامنے کرسی پر بے چینی سے اپنی کہنی دائیں رخ سے ہٹاتے ہوئے اپنی گود میں رکھ کر بولا۔ "لیکن ڈاکٹر! میں بتا چکا ہوں کہ مجھے عورت ذات پر اب اعتبار نہیں رہا۔ یہ دھوکے باز ہوتی ہے۔"

"ہر خاتون ایسی نہیں ہوتی زمان صاحب!" ڈاکٹر نے کہا۔

"ہوتی ہے ڈاکٹر صاحب! ہوتی ہے۔" زمان نے اصرار بھرے لہجے میں کہا۔

"زمان صاحب! آپ ایک مرتبہ آزما کر دیکھئے۔ گھر میں خانہ آبادی کے بعد زندگی میں تبدیلی کا احساس محسوس کریں گے اور پھر آپ کی تنہائی ہی آپ کے اس پرابلم کی اصل وجہ ہے۔"

"نہیں ڈاکٹر صاحب! میں اپنی تنزیلا سے ہی شادی کر سکتا تھا۔ اس کے بعد ہر عورت میرے لئے پرائی پرائی لگتی ہے۔ وہی ایک عورت تھی میری زندگی کی۔ میری محبت تھی وہ۔"

"لیکن وہ اب آپ کی زندگی کا حصہ نہیں ہے زمان صاحب! اس لئے آپ ایک نئی زندگی کا آغاز کیجیے۔ ماضی بیت گیا۔ آپ یوں سمجھئے کہ وہ آپ کی زندگی کی ایک میٹھی یاد تھی اور یادیں انسان کو آگے بڑھانے کے لئے ہوں تب تو ٹھیک ہیں لیکن اگر یادیں انسان کو کھانے لگ جائیں تب بالکل انہیں اپنے دل و دماغ سے کھرچ دینا چاہئے۔" پھر ڈاکٹر نے اپنے سامنے میز پر رکھے کاغذ پر کچھ لکھتے ہوئے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ آپ کی حالت پہلے سے بہت زیادہ بہتر ہے اور مجھے خوشی ہے کہ آپ جیسا سمجھ دار آدمی زندگی جیسی نعمت کو بخوبی قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور اسے ضائع نہیں ہونے دے گا۔ میرے مشورے پر غور کیجیے گا زمان صاحب! آپ تنہائیوں سے بچیں۔ مسکرانا کی عادت ڈال لیجیے زندگی آپ کو واپس اپنی بانہوں میں لے لے گی۔"

☆.....☆.....☆

"بھاڑ میں جاؤ..... تیری دوائیاں..... اور تیرے مشورے..... شادی کرنے کا اتنا شوق ہے تو تو خود ہی شادیاں کرتا جا..... کہنا آسان ہے کرنا مشکل۔" میر زمان خان مقامی پارک کے ایک بینچ پر بیٹھا خود کلامی میں مشغول تھا۔ اسے ڈاکٹر ناصر لطیف پر شدید غصہ آ رہا تھا۔ اگر زندگی میں اس نے کسی کو اپنا دل دیا تھا تو وہ تنزیلا تھی۔

"تنزیلا!" زمان نے اپنے سامنے خلاؤں میں گھورتے ہوئے ہولے سے پکارا۔ "کہاں ہو تنزیلا تم؟"

"تم مجھے چھوڑ کر کہاں چلی گئیں؟"

"تم سن رہی ہو.....؟ تنزیلا تم ہی نے تو کہا تھا کہ ہم ایک دوجے کا ہمیشہ کے لئے سہارا بنیں گے ایک دوسرے کے لئے جئیں مریں گے لیکن!" اچانک وہ اپنا سر دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر بیٹھ گیا۔

"پھر عمران بیچ میں کہاں سے آ گیا تھا؟"

"تم اس کے ساتھ..... نہیں! یہ یکا یک کیسے ہو گیا؟ تم نے اس سے شادی کر لی اور مجھے یوں زندگی کے بھنور میں تن تنہا چھوڑ دیا نہیں! نہیں..... عورت بے وفا ہوتی ہے یہ..... یہ قابل وفا نہیں ہوتی۔ میں..... میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گا تنزیلا! میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گا۔"

"ایکسکیوزمی سر!" پاس سے زمان کو ایک نوجوان کی آواز سنائی دی۔ اس نے دونوں ہاتھوں کو سر سے نوچتے ہٹایا اور واپس اپنے اوسان بحال کرنے کی کوشش کرتے ہوئے حقیقی دنیا میں واپس لوٹ آیا۔ ایک نوجوان اس کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ انتہائی نفیس مغربی لباس میں ملبوس تھا۔ نہایت خوبرو نوجوان دکھتا تھا وہ۔

"سر.....! آپ ٹھیک تو ہیں..... میں آپ کی کچھ مدد کر سکوں تو حکم کیجیے۔" اس نے نہایت شائستگی بھرے انداز سے زمان کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا تھا۔

زمان کو اپنے رویئے کا احساس ہوا وہ دل ہی دل میں شرمندگی محسوس کر رہا تھا اس نے اپنے چہرے کے تاثرات پر مکمل قبضہ جماتے ہوئے سپاٹ انداز میں نوجوان کو جواب دیا۔ "نو..... تھینک یو۔ یہ مین! میں ٹھیک ہوں!" اور یہ کہتے ہوئے اسے ڈاکٹر ناصر لطیف کی وہ بات یاد آ گئی جو اس نے آخر میں بطور نصیحت اس سے کہی تھی۔ اس نے کہا تھا۔ "مسکرایا کیجیے مسکرانے کی عادت ڈال لیجیے۔" اور زمان نے اپنے لبوں پر ایک جبری مسکراہٹ قائم کر لی۔

"اگر آپ برا نہ منائیں تو میں آپ کی تنہائی میں مخل ہو سکتا ہوں؟" نوجوان نے نہایت ادب سے پوچھا تھا۔ زمان کو کیا اعتراض ہوتا۔ اس نے مثبت انداز

میں سر ہلاتے ہوئے اسے اجازت دے دی۔

"آج میرا برتھ ڈے ہے۔" وہ نوجوان بولا۔

"میرا نام قیصر ہے۔"

"ہاؤس ٹو میٹ یو! قیصر!" زمان نے جبری مسکراہٹ چہرے پر برقرار رکھتے ہوئے کہا۔ "اینڈ ہیپی برتھ ڈے۔"

"شکریہ سر! میں نفسیات کا طالب علم ہوں۔ پی ایچ ڈی کر رہا ہوں! خودکشی کے موضوع پر!" قیصر نے بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"اوہ..... خودکشی!" زمان کے منہ سے فقط یہ نکلا وہ پھر سوچ میں ڈوب گیا تھا۔ "خودکشی!" کہنے کو تو محض ایک لفظ لیکن کرنے کو مشکل اور تکلیف دہ۔

"جی ہاں سر! ڈپریشن کے مریض بالآخر خودکشی میں ہی مکمل راحت و سکون محسوس کرتے ہیں۔ خودکشی کی موت ہی ان کی آخری پناہ گاہ ثابت ہوتی ہے۔ اور اس کے بعد ابدی نیند اور سکون.....! انہیں اس کے سوا کوئی راہ نہیں ملتی۔ بس! مرنے کے طریقے آسان ہوں تو موت بہت آسان ہو جاتی ہے ورنہ آخری لمحات اذیت ناک۔" وہ کہتا رہا۔ زمان اسے سنتا رہا۔

"آسان طریقہ ہے کوئی مرنے کا اس دنیا میں؟" زمان نے گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے سوال کیا۔ یہ مفہوم اس کے مطلب کا تھا۔ وہ کب سے خودکشی کے متعلق سوچ رہا تھا لیکن اس کی ڈرپوک فطرت اسے اس جانب جانے نہ دے رہی تھی۔

"دنیا میں خودکشی کرنے کے بیسیوں طریقے ہیں سر!" نوجوان نے کہا۔

"لیکن سب خوف ناک اور تکلیف دہ ہیں۔" زمان نے اس کی بات پر لقمہ دیا۔

"جی ہاں سر! لیکن میں نے ایک طریقہ ایسا دریافت کر لیا ہے جس میں مرنے والے کو تکلیف نہیں ہوتی بس جیسے ہی اسے اونگھ آتی ہے وہ موت کی وادیوں میں داخل ہو جاتا ہے اور اپنی ساری مصیبتوں، پریشانیوں اور امراض کی تکلیف سے نجات حاصل کر لیتا ہے۔" قیصر نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "کیا آپ جاننا چاہتے ہیں کہ وہ کون سا طریقہ ہے؟"

"ہاں..... کیوں نہیں! میرے علم میں اضافہ ہوگا۔ مجھے تمہاری تحقیق جان کر خوشی ہوگی۔" زمان نے اس مرتبہ دل چسپی لیتے ہوئے کہا وہ بغور اس نوجوان کو دیکھ رہا تھا نوجوان نے اپنے بیگ سے ایک بالشت برابر ڈبی نکالی اور اپنے اور زمان کے درمیان میں بینچ پر رکھ دی۔

"اس میں ایک ایسا زہر ہے جو انجکشن کی مدد سے انسان کے جسم میں ڈالا جائے تو 24 گھنٹوں میں وہ جب بھی نیند آنے کی صورت میں سو جائے گا تو درحقیقت نیند کے دوران ہی اس کی موت واقع ہو جائے گی اور اسے ذرہ بھر احساس نہیں ہوگا۔ نو پین نو ٹینشن۔ نہ تکلیف! نہ کوئی کھچاؤ۔"

"یہ تو بہت زبردست تحقیق ہے تمہاری!"

"یس سر! اور مجھے یقین ہے کہ میڈیکل کی دنیا میں مجھے اس تحقیق کی بدولت کافی پذیرائی حاصل ہوگی۔"

"واہ بنگ مین! مجھے بھی یقین ہے کہ تم زندگی میں کافی ترقی کرو گے۔ میری نیک تمنائیں تمہارے ساتھ ہیں۔" زمان نے مصنوعی مسکراہٹ چہرے پر سجاتے ہوئے کہا۔ اسے قیصر نامی اس جوان سے کوئی غرض نہ تھی وہ تو للچائی نظروں سے اس ڈبی کی جانب دیکھ رہا تھا جو اس کے اور نوجوان کے درمیان بینچ پر رکھی تھی کاش! ایک انجکشن کی شیشی اس ڈبی سے وہ حاصل کر سکتا۔" پھر اس کے ذہن میں ایک ترکیب سوجھی لیکن اس سے پہلے کہ وہ اپنی ترکیب پر عمل کرتا نوجوان بینچ سے خود ہی اٹھ کر سامنے آتی ایک لڑکی کی جانب بڑھ گیا۔

"اوہ ہائے شیلا!" وہ ہاتھ لہراتے ہوئے اس لڑکی کی جانب بڑھا اور بیس فٹ کے فاصلے پر دونوں پھر ایک دوسرے سے محو گفتگو ہو گئے تھے۔ لڑکے کی پیٹھ زمان کی جانب تھی یہ موقع غنیمت جان کر زمان نے فوراً ڈبی کھولی وہاں چھوٹی چھوٹی انجکشن کی مدد سے انسانی جسم میں داخل کرنے والی زہر کی دس شیشیاں موجود تھیں۔ اس نے ایک شیشی نکال کر فوراً اپنی بغلی جیب میں اڑس لی اور ڈبی کو بند کر کے ویسے ہی بینچ پر واپس رکھ دیا قیصر کچھ دیر مزید اپنی

آنے والی دوست شیلا سے باتیں کرتا رہا اور پھر جب وہ رخصت ہوگئی تو وہ واپس زمان کے پاس بینچ پر آ کر بیٹھ گیا۔

"سوری سر! یہ میری سابقہ کلاس فیلو تھی۔"

"کوئی بات نہیں! پرانے دوست بھی انسان کا اثاثہ ہوتے ہیں۔" زمان نے جبری مسکراہٹ چہرے پر قائم رکھتے ہوئے جواب دیا۔

"سر! اجازت دیجیے۔ میں چلتا ہوں۔" وہ اپنا بیگ کاندھے پر رکھتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

"اپنی تحقیق اپنے ہمراہ نہیں لوگے جوان!" زمان نے انگلی سے ڈبی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"اوہ..... بہت بہت شکریہ سر میں تو بھول ہی گیا۔" اس نے فوراً ڈبی اپنے بیگ میں اڑس لی تھی۔

☆.....☆.....☆

اس رات میر زمان بہت مطمئن تھا۔

"آج زندگی سے نجات کا لمحہ ہے۔ ایسی زندگی جس میں تم نہیں ہو تنہا۔ عمران نے میرے ساتھ اچھا نہیں کیا وہ تمہیں بہکا کر مجھ سے دور لے گیا ہے جانے کہاں؟ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ وہ اس وقت کہاں ہے تو میں....." زمان نے دانت بھینچے۔ "میں اس کے ٹکڑے ٹکڑے کروا کر بوری میں بند کر کے کہیں پھینکوا دیتا۔ اور مجھ پر بات بھی نہ آتی لوگ اسے معمول کی دہشت گردی کا نام دیتے۔ میں صاف صاف بچ جاتا اور پھر دوبارہ تمہیں حاصل کر لیتا لیکن! اوہ..... خبیث ڈرپوک تمہیں نہ جانے کہاں لے گیا؟ چھپا کہیں کا!" اور پھر اس نے اپنی کوٹ کی جیب سے وہ زہریلی شیشی نکالی ایک ٹیکے کی مدد سے اپنے بازو میں لگالی دوا دھیرے دھیرے اس کے وجود میں اترتی چلی گئی اور اب وہ اس شیشی اور ٹیکے کو جیب میں ڈالے کوڑا کرکٹ کے ڈبے میں اس نے لاپرواہی کے ساتھ اس خالی شیشی اور ٹیکے کو پھینکا۔ "لو جی! اب میں آزاد ہوں۔"

"الوداع! اے خبیث اور تکلیف دہ زندگی! ہمیشہ کے لئے الوداع!" وہ اپنی دھن میں کوئی فلمی گیت گنگناتا ہوا چلا جا رہا تھا اس کی منزل نزدیکی شہر کا سب سے بڑا اسپتال تھا جس سے ملحقہ پارک میں اسے ایک بینچ پر سو جانا تھا۔

اور یہی طے کر کے وہ اپنے گھر سے نکلا تھا۔ بینچ پر سونا اور ابدی نیند سو جانا اب یہی اس کی منزل تھی۔

☆.....☆.....☆

لوگوں کی بھیڑ سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اسپتال کے ملحقہ پارک میں کچھ ہوا ہے مقامی پولیس بھی وہاں پہنچ چکی تھی لوگوں کو وہاں سے ہٹا کر اس شخص کی لاش کو وہاں سے اٹھایا جا رہا تھا۔

"اسے مرے ہوئے کتنے گھنٹے ہوئے ہوں گے ڈاکٹر؟" تھانیدار نے اس ڈاکٹر سے پوچھا تھا جس نے زمان کی لاش کا معائنہ کر کے تصدیق کی تھی کہ وہ مر چکا ہے۔

"میرا خیال ہے اسے مرے کچھ زیادہ ٹائم نہیں ہوا چند گھنٹے ہوئے ہوں گے۔ اصل حقیقت تو پوسٹ مارٹم کی رپورٹ پر ہی معلوم ہو سکتی ہے۔"

"یہ کیا بکواس کر رہے ہو تم لوگ! اے..... اے..... دیکھو! میں زندہ ہوں..... یہ..... یہ..... میں اپنا آپ کو ہلا، کیوں نہیں سکتا؟" زمان نے قدرے چیختے ہوئے کہا لیکن اسے یہ محسوس ہوا کہ اس کی آواز اس کے وجود میں ہی کہیں رہ گئی تھی یہ باقی سب دنیا والے اس کی جانب متوجہ نہیں ہو رہے تھے۔ پھر زمان نے دائیں جانب سر کو گھمانے کی کوشش کی لیکن وہ ناکام رہا۔ اس نے اپنے آپ کو ہر طور سے حرکت کرنے کی سعی کی لیکن ناکام رہا۔

"یہ میں اب حرکت کیوں نہیں کر پا رہا! اوئے! ڈاکٹر!" اس نے ڈاکٹر کو آواز دی ڈاکٹر نے ایک میڈیکل ہیلپر سے مخاطب ہو کر کہا۔ "لاش کو فوری سرد خانے میں پہنچا دو۔ دو گھنٹے بعد ڈاکٹر احمد آئیں گے پھر ان کو دکھانا ہے۔"

"جی سر!" ہیلپر کی آواز زمان کے کانوں میں گونجی۔ "چل بھئی۔ ہاتھ سیدھے پر رکھ لے اور تیار ہو جا....." زمان کو محسوس ہوا کہ کسی نے اس کے ہاتھ اس کے سینے پر رکھ دیئے ہیں۔

"اوئے ہیلپر کے بچے! میں زندہ ہوں۔ دیکھ! میں مر نہیں ہوں۔" زمان خان اچانک خوف سے چونک گیا تھا۔ انسپکٹر کا مکروہ چہرہ اس کی کھلی ہوئی آنکھوں کے

سامنے یک دم ظاہر ہوا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "اس کی آنکھیں تو کھلی ہیں انہیں بند نہیں کرنا کیا؟"

"نو..... ایسے ہی رہنے دیں۔ فائدہ کوئی نہیں ہے۔ ہم بند کرتے رہیں گے یہ پھر سے کھلتی رہیں گی۔" ڈاکٹر کی آواز سنائی دی تھیں۔

"دیکھ انسپکٹر..... میں مرا نہیں ہوں۔ میں زندہ ہوں۔ میرا علاج کرو۔ میں ہوش میں آ سکتا ہوں۔ سنا تم نے کہ نہیں.....؟ اے..... اے..... میری بات سنو..... یہ مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟"

ہیلپر کی آواز سنائی دی۔ "ہاں..... ہاں..... یہاں سے پکڑ کر بس جب میں تین کہوں تو اسٹریچر پر رکھ دینا۔ ایک..... دو..... تین!" زمان خان کو محسوس ہوا کہ کاندھوں اور ٹانگوں کی جانب کسی نے اسے ہوا میں اچھال کر لوہے کے سترپر پٹخ دیا ہو۔

"آہ..... تمہاری ایسی تیسی خبیثوں! مجھے اذیت مت دو۔ میں زندہ ہوں۔ مجھے تکلیف ہو رہی ہے میں مرا نہیں تمہاری مانند ایک جیتا جاگتا انسان ہوں۔" زمان کو جب انہوں نے اسٹریچر پر پٹخا تو اسے اپنے عقبی وجود میں شدید درد کا احساس ہوا پھر یکا یک اسے یوں محسوس ہوا کہ کوئی اس کے اسٹریچر کو گھسیٹتا ہوا لے جا رہا ہے اس کی آنکھیں کھلی تھیں۔ وہ یک ٹک سیدھا آسمان کی جانب دیکھ رہا تھا۔ پھر کسی نے سفید رنگ کے کپڑے سے اس کا چہرہ ڈھانپ دیا۔ تھوڑی دیر یونہی اسٹریچر چلتا رہا۔ وہ حیرت میں ڈوبا یوں چت لیٹا ہوا تھا لوگوں کی نظروں میں وہ ایک "لاش" تھا۔ "اسلم لیہ کیا ہے؟" اچانک ایک نسوانی آواز سنائی دی۔

"ڈاکٹر صاحبہ! پارک میں پڑی لاش سرد خانے لے جا رہا ہوں۔"

"اوہ..... جانے کون بے چارہ رات کے وقت چل بسا۔" اور پھر زمان کو نسوانی آواز قریب ہوتی محسوس ہوئی۔

"ذرا چہرہ تو دکھاؤ اس کا۔" نسوانی آواز پھر سنائی دی لیکن اس مرتبہ بہت نزدیک سے۔ چادر زمان کے چہرے سے ہٹتی چلی گئی وہ پھر سے اوپر چھت کی جانب دیکھنے کے قابل ہو گیا تھا۔ "ارے! یہ تو اسپتال ہے۔ اور یہ کون؟" لیڈی ڈاکٹر کا چہرہ تھوڑی دیر کے لئے اس کے سامنے ہوا اور دوبارہ ہٹ گیا۔ "ڈاکٹر صاحبہ! میری بات سنیں۔ میں زندہ ہوں۔ یہ لوگ مجھے مردہ سمجھ رہے ہیں پلیز! ڈاکٹر پلیز! میری سن لو۔ کوئی تو سنو!" لیکن میر زمان خان کو وہاں سننے والا کوئی نہ تھا۔

"بے چارہ! اس کی شناخت ہوئی؟" نسوانی آواز نے پوچھا۔

"نہیں ڈاکٹر صاحبہ! اس کی جیبیں بھی خالی تھیں اور کوئی ایسی شناخت بھی نہیں کہ اس کو کوئی نام پتا دیا جاتا۔"

"چلو! پولیس اپنا کام کر رہی ہوگی۔ جلد یا بدیر معلوم پڑ جائے گا۔"

"جی ڈاکٹر صاحبہ!" کہہ کر اسلم نے دوبارہ سے کپڑا زمان کی لاش کے چہرے پر رکھ دیا۔

یکا یک ایک بھاری دروازہ کھلنے کی آواز آئی دروازے کا سراز ور سے اسٹریچر سے ٹکرایا تھا۔

"اوئے ظالمو! احتیاط کرو۔ مجھے اذیت مت دو، یہ کیا؟ اتنی ٹھنڈک! مجھے سردی کا احساس ہو رہا ہے یہ مجھے تم کہاں لے آئے ہو؟ اے..... اے بات سنو میری! میں کہاں ہوں؟" زمان نے چیخنا چلانا شروع کر دیا لیکن انسانی دنیا میں کوئی بھی اس کی صدا سننے والا نہ تھا۔ وہ اپنے تئیں روتا دھوتا رہ گیا۔ وہ بچوں کی مانند رو رہا تھا ابھی یوں سرد خانے میں پڑے ہوئے تھوڑی دیر ہی ہوئی تھی کہ ایک سیاہ خالی ہاتھ اس کے چہرے پر آن ٹکا۔

"ہاں تو! یہ ہے نیا مرغا!" کمرے میں ایک مردانہ آواز ابھری۔

"لاشوں کی توہین مت کیا کرو ڈاکٹر انور! تمہیں کچھ تو شرم محسوس ہونی چاہئے۔" یہ نسوانی آواز تھی اس کا مطلب یہ تھا کہ کمرے میں دو لوگ تھے ایک مرد اور دوسری عورت۔

"اس میں توہین کیسی ڈاکٹر ثمینہ۔ یہ کون سا میری بات کو سن رہا ہے؟" ڈاکٹر انور نے کہا۔ اور پھر میر زمان خان کے چہرے کے بالکل سامنے اپنا چہرہ کر کے بولا۔

"آنکھیں تو یوں کھول رکھی ہیں تم نے مرغے جیسے

تو حیرت سے مرگیا ہے۔"

"بکواس بند کرڈاکٹر! میں مرا نہیں ہوں میں زندہ ہوں۔ تم لوگوں کو کیا ہوگیا ہے؟ سمجھنے کی کوشش کرو۔ میں زندہ ہوں زندہ، خدا کے لئے مجھے مردہ نہ سمجھو۔" زمان نے اب اپنے اندر ہی اندر رونا شروع کردیا۔

"بس! ڈاکٹر احمد کو آنے دے مرغے۔! پھر تیری چیر پھاڑ کرتا ہوں۔" ڈاکٹر انور منہ میں چیونگم چباتے ہوئے بولا۔

"ڈاکٹر بس کرو! میرے دادا جان کہا کرتے تھے کہ مرنے کے بعد بھی انسان سب سنتا ہے۔" ڈاکٹر ثمینہ نے ڈاکٹر انور کے ساتھ کھڑے ہوکر کہا تھا۔

"کافی تو ہم پرست قسم کے دادا تھے تمہارے ڈاکٹر ثمینہ!"

"بس! دادا تو سب کے ایسے ہی ہوتے ہیں۔"

"دادا ہی نہیں!، دادیاں تو سونے پر سہاگہ ہوا کرتی ہیں۔" ڈاکٹر انور نے چیونگم دانتوں میں دبا کر دانت نکالتے ہوئے ڈاکٹر ثمینہ کی طرف دیکھا۔

"اب بس بھی کرو۔ پہلے اس کے کپڑے اتارنے ہیں اور اچھی طرح سے چیک اپ کرنا ہے کہ جسم کے کسی حصے میں تشدد کے آثار نہ ہوں۔"

"ہونہہ! مجھے تو اب بھی لگتا ہے کہ یہ شخص حیرت سے مرگیا ہے۔"

"بھلا کوئی حیرت سے مرسکتا ہے؟ مذاق بند کرو اب!" ڈاکٹر ثمینہ نے برا سا منہ بنا کر ڈاکٹر انور کو کہنی سے ٹہوکا دیا۔

"میرا مذاق مت اڑاؤ..... پلیز سمجھنے کی کوشش کرو، لیکن ابھی بھی تمہیں سن سکتا ہوں۔ تمہیں دیکھ سکتا ہوں۔ تم لوگ اتنے سنگ دل کیوں ہو؟ خدا کے لئے میرا علاج کرواؤ۔ مجھے واپس ہوش میں لے کر آؤ۔ میں زندہ ہوں پلیز! میں ابھی بھی زندہ ہوں۔" زمان نے پھر سے ملتجیانہ انداز میں چیختے ہوئے کہا تھا مگر وہ دونوں ڈاکٹر اس کی بات سنے بغیر کمرے سے باہر نکل گئے تھے۔ میر زمان خان اسٹریچر پر دیگر مردوں کے ہمراہ اس سرد خانے میں بے حس وحرکت پڑا تھا۔

☆.....☆.....☆

نماز جنازہ سے فارغ ہوکر امام مسجد نے تمام احباب سے اعلان کے سے انداز میں کہا۔ "جن احباب نے آخری دیدار کرنا ہے وہ کرلیں۔" اور پھر لوگ قطار در قطار میر زمان خان کے جنازے کے گرد چلتے ہوئے ایک جانب سے ہوکر آگے بڑھنے لگے۔

"کتنا تر و تازہ چہرہ ہے!" کسی نے کہا۔

"واہ ماشاءاللہ۔" ایک اور آواز آئی۔

"یہ تو بالکل بھی مردہ شخص نہیں معلوم ہوتا۔" ایک بوڑھے کی آواز آئی۔

"ظالموں..... یوں مت کرو..... مجھے زندہ مت دفن کرو۔ میں مردہ نہیں ہوں۔ میں زندہ ہوں خدایا! میری مدد کر! یہ مجھے زندہ درگور کررہے ہیں مجھے یوں زندہ درگور مت کرو۔" اور زمان خان نے پھر سے رونا شروع کردیا۔

تھوڑی دیر بعد اسے محسوس ہوا کہ اسے کاندھوں پر اٹھا کر ہوا میں معلق کیا جارہا ہے۔

"اب مجھے کہاں لئے جارہے ہو؟" وہ اپنے آپ سے گویا ہوا۔ "نہیں! یہ نہیں ہوسکتا۔ نہیں..... نہیں!"

مگر لوگ جنازہ لئے قبرستان کی جانب رواں دواں تھے۔

قبر کو بند کردیا گیا تھا، میر زمان کی قبر پر مٹی ڈال کر لوگ واپس گھروں کی جانب چل دیئے تھے۔ انہی لوگوں میں قیصر اور عمران بھی شامل تھے دونوں قبر سے کافی دور جا کر رکے۔ عمران نے جیب سے ایک تھیلے میں لپٹا لفافہ قیصر کو تھماتے ہوئے کہا۔

"ویل ڈن! بیک مین! تمہاری دوا نے کام کردکھایا۔ اب بہتر گھنٹے کے بعد زہر کا اثر ٹوٹے گا۔ رفتہ رفتہ تب تک اصل کام تمام ہوچکا ہوگا۔" قیصر لفافے میں موجود رقم کو لالچائی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اور عمران کے چہرے پر دلکش مسکراہٹ تھی۔

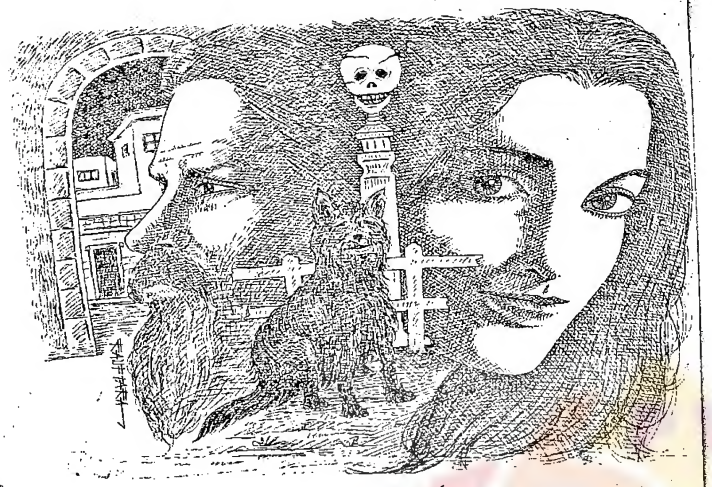

روح کا شکنجہ

اقراء قریشی-راولاکوٹ

کمرے میں اچانک ایک ہیولا نمودار ہوا تو اسے دیکھ کر نوجوان کی گھگھی بندھ گئی کہ پھر ہیولا کا فلک شگاف قہقہہ سنائی دیا تو نوجوان اپنی جگہ دہل کر رہ گیا اور پھر نوجوان فضا میں معلق ہوگیا۔

ایک روح کا لرزہ خیز ہی نہیں بلکہ دل ودماغ پر سکتہ طاری کرتا عجیب وغریب شاخسانہ

علی، علینہ، مریم اور عابد بہت گہرے دوست تھے ان سب کو گھومنے پھرنے کا بہت شوق تھا ان چاروں نے مل کر سیر کرنے کا پلان بنایا اور فیصلہ ہوا کہ اس مرتبہ چھٹیاں وہ علی کے ابو کے فارم ہاؤس میں گزاریں گے سب اس پر راضی ہوگئے ابھی ان کی چھٹیوں میں کچھ دن باقی تھے۔ پروگرام فائنل ہونے کے بعد وہ بہت بے چین ہوگئے ایسا لگنے لگا کہ کل چھوڑ آج ہی وہ سب آنکھ جھپکتے ہی فارم ہاؤس پہنچ جائیں۔

آخر کار وہ دن بھی آ گیا جس دن ان سب نے اپنے سفر کا آغاز کرنا تھا۔ سب نے ضروری سامان باندھا اور سفر پر خوشی خوشی روانہ ہوگئے، وہ سب پورے چار سال بعد فارم ہاؤس جارہے تھے، ان سب کی خوشی دیدنی تھی، علی گاڑی چلا رہا تھا تمام دوست خوش گپیوں میں مصروف تھے۔

وہ چاروں چار سال پہلے رونما ہونے والے واقعہ کو بھول چکے تھے مگر وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ وہ ناقابل برداشت جان لیوا خطرے کی طرف بڑھ رہے ہیں۔

گاڑی منزل کی جانب رواں دواں تھی فارم ہاؤس شہر سے دور ایک پرفضا اور پرسکون جگہ پر بنا ہوا تھا، فارم ہاؤس پر چاروں دوست چار سال پہلے اکثر جایا کرتے تھے لیکن ایک واقعہ کے باعث وہ چار سالوں سے فارم ہاؤس کے قریب بھی نہیں گئے تھے۔

دوپہر ہو چکی تھی سب کو بھوک لگ رہی تھی علینہ اور مریم نے علی کو کسی ہوٹل پر گاڑی روکنے کا کہا، تھوڑی دور جا کر ایک ہوٹل نظر آیا علی نے گاڑی روک دی۔ چاروں گاڑی سے اترے مضافاتی علاقہ تھا وہ سب کے سب ہوٹل کے چھپر تلے موجود تخت پر بیٹھ گئے۔ تو ایک نوجوان تیزی سے آیا اور مخاطب ہوا۔ "جی صاحب کیا لاؤں۔"

انہوں نے اپنی مطلوبہ چیزیں منگوائیں، چند منٹ میں تمام چیزیں آ گئیں تو وہ کھانے میں مصروف ہو گئے، کھانے سے فراغت کے بعد پیسے دیئے اور گاڑی میں بیٹھ کر آگے کو چل پڑے۔

علی نے عابد سے کہا۔ "یار! لگتا ہے ہمیں پہنچتے پہنچتے شام ہو جائے گی آج تو بس جا کر آرام کریں گے۔"

علی بولا۔ "ٹھیک ہے۔ ویسے بھی آج بہت تھک چکے ہیں۔" علینہ اور مریم نے بھی ان کی ہاں میں ہاں ملائی۔

شام کے سائے ہر طرف پھیل رہے تھے۔ سب کے سب اپنے آپ میں مگن تھے اور ایک دوسرے کو چھیڑ چھاڑ میں لگے تھے کہ مریم بولی۔ "اور کتنا سفر باقی ہے؟"

علی بولا۔ "بس پندرہ بیس منٹ بعد ہم پہنچ جائیں گے۔"

وجہ یہ تھی کہ سب کے سب بہت تھک چکے تھے کئی گھنٹے کی سفر کی وجہ سے اب سب کو فارم ہاؤس میں پہنچنے کی جلدی تھی اور پھر کوئی بیس منٹ گزرے تھے کہ انہیں فارم ہاؤس کی چھت نظر آنے لگی تو سب نے شکر ادا کیا۔ علی نے گاڑی فارم ہاؤس کے گیٹ کے پاس روکی، سب نے اپنا اپنا سامان اٹھایا اور گاڑی سے اتر آئے۔ علی اور عابد آگے چل رہے تھے جبکہ مریم اور علینہ پیچھے پیچھے۔

علی نے آگے بڑھ کر دروازے پر لگا تالا کھول دیا کیونکہ اس وقت گیٹ کے دروازے پر تالا لگا تھا۔ ویسے تو فارم ہاؤس کی دیکھ بھال کے لئے ایک ملازم رحمت بابا موجود رہتا تھا، فارم ہاؤس کے ایک کونے میں دو کمروں پر مشتمل ایک کوارٹر تھا جس میں وہ اپنی جواں سال بیٹی رضیہ کے ساتھ رہتا تھا اس کی بیوی دو سال ہوئے بیماری کی وجہ سے انتقال کر چکی تھی۔ رضیہ وقتاً فوقتاً فارم ہاؤس کے کمروں کی صفائی ستھرائی کرتی رہتی تھی، ویسے رحمت بابا فارم ہاؤس کا چوکیدار تھا۔

فارم ہاؤس میں بہت اندھیرا تھا عابد نے ٹارچ جلائی۔ ٹارچ کی مدد سے عابد نے لائٹ کا بٹن آن کر دیا تو فوراً ہی ہر چیز روشن ہو گئی تو سب نے سکون کا سانس لیا اور آرام سے بیٹھ گئے۔ فارم ہاؤس میں تین کمرے تھے کمرے دائیں طرف جبکہ کچن بائیں طرف تھا اور ٹی وی لاؤنج بھیم فارم ہاؤس میں ضرورت کی ہر چیز موجود تھی علی اور عابد فریش ہونے کے لئے کمرے کی طرف چل دیئے۔ جبکہ علینہ اور مریم دونوں لاؤنج میں رہ گئیں، علینہ نے مریم سے کہا۔ "میرے خیال میں تیسرا کمرہ ہمارے لئے ٹھیک رہے گا۔"

مریم بولی۔ "جیسے تمہاری مرضی۔" اور دونوں کمرے میں آ گئیں۔ کمرے میں دو بیڈ تھے۔ الماریاں دیوار کے ساتھ بنی ہوئیں تھیں دو کرسیاں اور ایک چھوٹی میز موجود تھی۔ اور اٹیچ باتھ بھی موجود تھا۔

علی اور عابد فریش ہونے کے بعد لاؤنج میں بیٹھ کر ٹی وی دیکھنے لگے جبکہ مریم اور علینہ کھانا بنانے کچن میں چلی گئیں آدھے گھنٹے میں وہ کھانا تیار کر کے لے آئیں کھانا مزے مزے سے کھایا گیا۔ اور کھانے کے بعد سب اپنے اپنے کمروں میں سونے چلے گئے سب اتنے تھکے ہوئے تھے کہ فوراً ہی نیند کی وادیوں میں کھو گئے۔

☆.....☆.....☆

رات کا نجانے کون سا پہر تھا کہ علینہ کی آنکھ تیز ہوا کے جھونکے سے کھل گئی علینہ فوراً اٹھ بیٹھی اور ٹیبل کے سائیڈ پر پڑے لیمپ کا بٹن آن کیا۔ اس کی نظر کھڑکی کی طرف گئی تو دیکھا کھڑکی بند تھی وہ حیران رہ گئی کیونکہ اس یخ ہوا کے ٹھنڈے جھونکے کی وجہ سے اٹھنا پڑا تھا۔ پہلے تو اس نے مریم کو جگانے کا سوچا پھر اسے اپنا وہم سمجھ کر واپس لیٹ کر سونے کی کوشش کرنے لگی، تھوڑی دیر بعد وہ گہری نیند میں تھی۔ پھر پوری رات کچھ نہ ہوا اور رات خاموشی سے گزر گئی۔

صبح اٹھ کر سب نے ناشتہ کیا اور پھر علی نے سب سے پوچھا۔ "آج کا کیا پلان ہے؟"

علینہ بولی۔ "جھیل کی سیر کو چلتے ہیں۔" لیکن عابد اس بات پر متفق نہ ہوا۔

مریم بولی۔ "آج پہاڑوں کی سیر پر چلتے ہیں۔"

عابد بولا۔ "آج قریبی بازار چلتے ہیں اور ضروری اشیاء خرید لاتے ہیں۔"

خیر سب عابد کی بات پر متفق ہو گئے کیونکہ کھانے پینے کا جو سامان وہ ساتھ لائے تھے وہ تھوڑا رہ گیا تھا۔ علی نے گاڑی اسٹارٹ کی اور سب گاڑی میں بیٹھ گئے۔ سب کے بیٹھ جانے کے بعد علی نے گاڑی آگے کو دوڑا دی تھوڑی ہی دیر بعد وہ بازار میں موجود تھے۔ انہوں نے کھانے پینے کی اشیاء خریدیں۔ پھر مریم اور علینہ آگے چل دیں انہوں نے اپنی من پسند اشیاء خریدیں اور سب واپس فارم ہاؤس آ گئے۔ فارم ہاؤس پہنچ کر سب نے چائے پی اور آرام کی غرض سے اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔

لیکن مریم لاؤنج میں بیٹھ کر ٹی وی دیکھنے لگی اسے ٹی وی دیکھتے تھوڑی ہی دیر گزری ہو گی کہ اسے اچانک محسوس ہوا کہ اس کے پیچھے کوئی ہے وہ فوراً پیچھے مڑی لیکن وہاں کچھ بھی نہ تھا وہ اسے اپنا وہم سمجھ کر پھر سے ٹی وی دیکھنے لگی اچانک ہی اس کی نظر کھڑکی پر پڑی تو وہ خوف زدہ ہو کر چیخ پڑی۔

علی، عابد اور علینہ فوراً نیند سے جاگ اٹھے اور بھاگتے ہوئے لاؤنج میں پہنچے۔ انہوں نے دیکھا کہ مریم کھڑکی کی جانب دیکھ کر چیخ رہی ہے۔ سب نے کھڑکی کی جانب دیکھا لیکن وہاں انہیں کچھ نظر نہ آیا، علینہ نے فوراً ہی مریم کو جھنجھوڑا تو مریم اس سے لپٹ کر رونے لگی۔

علینہ نے مریم سے پوچھا۔ "ایسے کیوں رو رہی ہو؟ کیا دیکھ لیا کھڑکی میں؟"

عابد اور علی بھی اس کے جواب کے انتظار میں کھڑے تھے۔

مریم نے روتے ہوئے بتایا کہ۔ "رضیہ کھڑکی میں خنجر لئے مجھے گھور رہی تھی۔"

"رضیہ۔" کا نام سن کر سب نے خوف سے جھرجھری لی۔ علی نے مریم کی طرف دیکھا اور کہا۔ "رضیہ کیسے یہاں آ سکتی ہے وہ تو مر چکی ہے؟" لیکن مریم اپنی بات پر بضد رہی۔ پھر سب نے مریم کی بات کو وہم قرار دیا اور اپنی باتوں میں مشغول ہو گئے لیکن مریم کے دل میں انجانا سا خوف بیٹھ گیا تھا۔

علینہ بھی رات میں ہونے والے واقعہ کو سوچے گئی لیکن کسی سے ذکر نہ کیا کہ اس کی بات سن کر سب اور نہ ڈر جائیں۔

رات کے کھانے کے بعد سب ٹی وی دیکھ رہے تھے۔ جبکہ عابد کمرے میں جلد ہی سونے چلا گیا تھا کیونکہ اس کی طبیعت خراب تھی، عابد اپنے بستر پر لیٹا تھا کہ کمرے میں اچانک ہی سرد ہوا کا جھونکا آیا تو وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ اس نے دیکھا کہ کمرے کی کھڑکی کھلی تھی۔ اسے یاد آیا کہ کھڑکی تو وہ بند کر کے سویا تھا۔ لیکن کھڑکی کھلی تھی۔ وہ بیڈ سے اٹھا اور کھڑکی کی جانب بڑھا لیکن کھڑکی میں مجسم رضیہ کو دیکھ کر خوف زدہ ہو گیا، رضیہ کے بال کھلے ہوئے تھے اور آنکھیں سرخ انگارہ ہو رہی تھیں اس کے سر سے خون بہہ رہا تھا یہ سب دیکھ کر عابد کی گھگھی بندھ گئی، رضیہ آہستہ آہستہ اس کی جانب بڑھ رہی تھی عابد کی خوف سے آنکھیں پھٹی جا رہی تھیں اس کے منہ سے

آواز تک نہیں نکل رہی تھی وہ چلانا چاہتا تھا لیکن لگتا تھا جیسے اس کی آواز حلق میں پھنس گئی ہو، رضیہ اس کے قریب پہنچ گئی اور اس نے ہاتھ کا اشارہ عابد کی طرف کیا تو وہ بیڈ سے کئی فٹ اوپر ہوا میں معلق ہوگیا اور پھر دھڑام سے فرش پر جا گرا۔

رضیہ نے اسی طرح پھر اس کو ہوا میں معلق کیا اور اس کو فرش پر لا پٹخا۔

عابد کے سر، ناک اور منہ سے گاڑھا گاڑھا خون بہنے لگا وہ بن مچھلی کی طرح تڑپنے لگا اور لڑکھڑاتے الفاظ سے وہ رضیہ سے معافی مانگ رہا تھا لیکن رضیہ اس کی معافی کو خاطر میں نہیں لا رہی تھی، رضیہ نے پھنکارتی ہوئی آواز میں بولا۔ ”مجھے مارنے سے پہلے سوچا تھا جو میں تجھے چھوڑ دوں، آج تیرا آخری وقت ہے۔ آج میں تجھے نہیں چھوڑوں گی تیرے سارے ساتھیوں سے بدلہ لوں گی تجھ سمیت سب میری موت کے ذمہ دار ہیں۔ اب تم میں سے کوئی نہیں بچ پائے گا۔ تم سب مرو گے۔“ اور ساتھ ہی رضیہ نے ہاتھ سے اشارہ کیا تو میز پر پڑا وزنی گلدان اڑتا ہوا آیا اور عابد کے سر پر لگا، ضرب اتنی شدید تھی کہ عابد تلملا کر رہ گیا، اور بھل بھل خون بہنے لگا، اس پر غنودگی طاری ہونے لگی آنکھیں پتھرا گئیں اور پھر اس کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔

سب لاؤنج میں ٹی وی دیکھنے میں اتنے مشغول تھے کہ کسی کو عابد کی موت کا پتہ نہ چلا، علینہ نے گھڑی کی جانب دیکھا تو رات کے بارہ بج رہے تھے۔ سب اٹھے اور سونے کے لئے چلے گئے۔

☆.....☆.....☆

مریم اور علینہ گہری نیند سو رہی تھیں کہ مریم کو لگا جیسے کوئی اس کے وجود پر کسی نے کوئی بھاری چیز رکھ دی ہو۔ خوف کے مارے اس کی آنکھ کھل گئی دن والا واقعہ اس کی آنکھوں میں گھوم گیا۔ خوف سے وہ کپکپانے لگی۔ اس سے پہلے کہ وہ علینہ کو جگاتی اس کی نظر کمرے کی کھڑکی کی طرف گئی اور مریم خوف سے کپکپانے لگی۔

کیونکہ کھڑکی کے پاس کھڑی ہوئی رضیہ اسے کھا جانے والی نظروں سے گھور رہی تھی، مریم کو لگا کہ اس کا وجود منوں بھاری ہوگیا ہے اس سے اٹھا نہیں جا رہا تھا رضیہ کو دیکھ کر دہشت سے وہ علینہ کو جگانا بھول گئی۔

رضیہ اس کی جانب بڑھتی جا رہی تھی مریم اس سے معافیاں مانگنے لگی لیکن رضیہ پر کوئی اثر نہ ہوا اس پر صرف اور صرف انتقام کی آگ سوار تھی وہ کسی بھی صورت میں اپنے قاتلوں سے بدلہ لینا چاہتی تھی۔

مریم کے بالکل قریب رضیہ پہنچ گئی اور دونوں ہاتھ اس کی گردن پر رکھ دیئے، مریم خود کو چھڑانے کی کوشش کرنے لگی لیکن رضیہ کی گرفت اتنی مضبوط تھی کہ مریم کی دونوں آنکھیں باہر کو ابل پڑیں، آہستہ آہستہ مریم کی مزاحمت ڈھیلی پڑنے لگی اور اس کی روح اس کے جسم کا ساتھ چھوڑ گئی۔

رضیہ نے اپنے دو قاتلوں سے بدلہ لے لیا اب اسے علی اور علینہ سے بدلہ لینا تھا۔ علی اور علینہ خواب خرگوش کے مزے لے رہے تھے انہیں یہ نہیں معلوم تھا کہ ان کے دونوں دوست ان کا ساتھ چھوڑ کر جا چکے ہیں۔

علینہ حسب معمول اٹھی اور واش روم کی جانب بڑھ گئی منہ ہاتھ دھو کر وہ آئی تو دیکھا مریم منہ پر کمبل تانے اب تک سو رہی تھی وہ اس کو جگانے کے لئے آگے بڑھی اور اس کے منہ سے کمبل ہٹایا اور سامنے کا منظر دیکھ کر اس کی چیخیں نکل گئیں۔

علی اس کی چیخوں کو سن کر گھبرا گیا اور کمرے سے بھاگتا ہوا ان کے کمرے میں داخل ہوا۔ لیکن اندر کا منظر دیکھ کر اس کا دل دہل گیا کیونکہ مریم کی آنکھیں باہر کو ابلی پڑی تھیں اور اس کا جسم اکڑ چکا تھا۔

علینہ سکتے کے عالم میں بیٹھی یک ٹک مریم کو دیکھ رہی تھی اور آنکھوں سے آنسو ساون بھادوں کی طرح بہہ رہے تھے، علی کی حالت بھی غیر ہو رہی تھی اس کی ٹانگیں کپکپا رہی تھیں آنکھیں پتھرا گئی تھیں۔ پھر علی کو جیسے اچانک ہوش آ گیا وہ علینہ کو تسلی

دینے لگا اب انہیں مریم کی بات پر یقین آنے لگا کہ مریم حقیقت میں سچ کہہ رہی تھی اتنے میں دونوں نے محسوس کیا کہ عابد ابھی تک باہر نہیں آیا، دونوں عابد کے کمرے کی جانب بڑھے اور دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگئے۔ لیکن ان کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں، جب انہوں نے دیکھا کہ مریم کی طرح عابد کا جسم بھی اکڑ چکا تھا۔ عابد کے کپڑے خون سے بھرے پڑے تھے۔

علینہ دھاڑیں مارنے لگی چہرا فق ہو چکا تھا اسے فرش پر کھڑا رہنا محال ہو رہا تھا ڈر اور خوف نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا اس کی حالت بہت غیر تھی۔

علی کے جھنجھوڑنے پر علینہ بولی۔ ”علی! ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہئے ورنہ رضیہ ہم کو بھی مار ڈالے گی۔“

علی بھی اثبات میں سر ہلانے لگا، اسے بھی خوف محسوس ہو رہا تھا، رات دیر سے سونے کی وجہ سے ان کی آنکھ دیر سے کھلی تھی گھڑی دن کے دو بجا رہی تھی ان دونوں نے جلدی سے سامان اٹھایا اور گاڑی میں بیٹھ گئے۔

علی نے گاڑی اسٹارٹ کی اور گاڑی سڑک کی جانب رواں ہوگئی، علینہ زار و قطار رو رہی تھی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس کے عزیز دوست اب اس دنیا میں نہیں رہے۔

آدھا راستہ گزر چکا تھا سورج غروب ہو رہا تھا علی جلد سے جلد اپنے شہر پہنچنا چاہتا تھا۔ لیکن ابھی کچھ سفر باقی تھا کہ دیکھتے ہی دیکھتے ہر سو اندھیرا پھیل گیا۔ اس وقت ویران سڑک پر گاڑی ایک جھٹکے سے رک گئی تو علینہ پریشان ہو کر علی کی طرف دیکھنے لگی، علی خود بھی حیران تھا کہ ابھی تو گاڑی بالکل صحیح چل رہی تھی پھر اچانک کیسے رک گئی۔

سڑک ویران تھی اور دور دور تک کسی گاڑی کے آنے جانے کے آثار نظر نہیں آ رہے تھے علی علینہ سے کہنے لگا۔ ”رکو میں دیکھتا ہوں کہ کیا مسئلہ ہوا ہے۔“

علینہ اسے روکنا چاہتی تھی لیکن زبان سے کچھ نہ کہہ سکی علی نے اپنے سامان سے ٹارچ نکالی اور دروازہ کھول کر گاڑی سے باہر نکل آیا اس نے گاڑی کو چیک کیا بظاہر کوئی خرابی نظر نہ آئی اب وہ بھی پریشان ہوگیا وہ واپس گاڑی میں بیٹھ گیا اور کسی گاڑی کے آنے کا انتظار کرنے لگا۔

اچانک ہی علینہ کو محسوس ہوا کہ کوئی اس کا گلا دبا رہا ہو۔ اس نے چیخنا شروع کر دیا۔ علی کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ علینہ کے ساتھ کیا ہو رہا ہے کیونکہ اسے کوئی بھی وجود نظر نہیں آ رہا تھا۔ علینہ نے اپنے دونوں ہاتھ اپنی گردن پر رکھے تھے اور خود کو نادیدہ وجود سے اپنے آپ کو چھڑانے کی بھرپور کوشش کر رہی تھی لیکن اس کا دم گھٹتا جا رہا تھا، اتنے میں علی نے بلند آواز میں قرآنی آیات کا ورد کرنا شروع کر دیا اور علینہ کی طرف پھونک ماری تو جھٹکے سے علینہ کا سانس بحال ہوا اور وہ اپنا گلا پکڑے چیخنے لگی۔

علی نے اسے تسلی دی اور کہا۔ ”حوصلہ رکھو گھبراؤ نہیں، ہم اس مصیبت سے ضرور نکل جائیں گے۔“

علی کی دیکھا دیکھی اب علینہ بھی قرآنی آیات کا ورد کرنے لگی تھی قرآنی آیات پڑھنے سے اسے کچھ حوصلہ ہوا اور اس پر جو کپکپی طاری تھی اس میں فرق پڑا وہ سہمی پڑی تھی پھر علی سے سے گویا ہوئی۔ ”علی اللہ کا نام

اقوام متحدہ

جہاں ایک چھوٹی اور بڑی قوم کا مسئلہ جائے تو چھوٹی غائب ہوجاتی ہے۔ جہاں دو چھوٹی قوموں کا مسئلہ جائے تو مسئلہ غائب ہوجاتا ہے اور اگر بڑی قوموں کا مسئلہ جائے تو اقوام متحدہ غائب ہوجاتی ہے۔

(مہک عرفان۔ کراچی)

لے کر گاڑی اسٹارٹ کرو۔"

علی نے بسم اللہ پڑھ کر گاڑی کی چابی گھمائی تو گاڑی فوراً اسٹارٹ ہوگئی اور فراٹے بھرنے لگی، گاڑی کو علی بہت تیز چلا رہا تھا اور ساتھ ہی ساتھ قرآنی آیات کا ورد بھی کرتا جا رہا تھا، تھوڑی دیر بعد وہ گھر پہنچ گئے۔

گھر پہنچتے ہی علی کے ابو نے دونوں سے پوچھا "اتنی جلدی گھر کیوں آ گئے؟ عابد اور مریم کہاں ہیں؟"

یہ سننا تھا کہ علینہ نے پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا، علی کے ابو پریشان ہوگئے اور علی کی جانب دیکھا۔ علی نے فارم ہاؤس میں ہونے والے سارے واقعات کے بارے میں انہیں صاف صاف بتا دیا، یہ سن کر اس کے ابو پریشان ہوگئے اور کہنے لگے۔

"میرے ایک جاننے والے بزرگ ہیں میں کل ہی ان سے ملاقات کرتا ہوں۔" لیکن سب سے ضروری ہے کہ ان دونوں کے مردہ جسم کو لانا ہوگا۔" خیر اس کے بعد جو ہونا تھا وہ سب کچھ ہوگیا، مریم اور عابد کے گھروں میں صف ماتم بچھ گئی اور سب کے سب رو دھو کر خاموش ہوگئے۔

☆.....☆.....☆

علی کے ابو نے بزرگ سے رابطہ کیا تو بزرگ نے کہا "علی اور علینہ کو آپ میرے پاس لے آئیں تاکہ اصل حقیقت کا پتہ ان کی زبانی چل سکے۔"

اس بات کے دوسرے روز ناشتہ کرنے کے بعد علینہ، علی اور علی کے ابو بزرگ کے آستانے پر پہنچ گئے۔ آستانے پر عقیدت مندوں کا بہت زیادہ رش تھا تینوں بیٹھ کر اپنی باری کا انتظار کرنے لگے۔

تقریباً 3 گھنٹے بعد ان کی باری آئی وہ بابا جی کے کمرے میں گئے بابا جی کا چہرہ بہت روشن تھا۔ سر اور ڈاڑھی کے بال سفید تھے سب نے ان کو سلام کیا اور بیٹھ گئے۔ انہوں نے پورا واقعہ بابا جی کو سنایا، بابا جی نے کچھ زیر لب پڑھتے ہوئے اپنی گردن جھکا لی پھر چند منٹ کے بعد جب اپنا سر اوپر کو اٹھایا تو ان کا چہرہ پر جلال تھا اور آنکھیں سرخ ہوگئی تھیں۔

بابا جی نے غصے سے علینہ اور علی کی جانب دیکھا تو دونوں رو کر بابا جی سے معافی مانگنے لگے، بابا جی نے ان سے کہا۔ "تم نے اس معصوم لڑکی کے ساتھ بہت غلط کیا ہے اب وہ تم سے اپنا بدلہ لینا چاہتی ہے۔"

علی کے ابو نے پوچھا "کون میرے بچوں سے بدلہ لینا چاہتی ہے؟"

بابا جی بولے۔ "آپ کو نہیں معلوم آپ کے بچوں نے ایک معصوم لڑکی کی جان لی ہے۔" علی کے ابو حیران ہوگئے اتنے میں بابا جی نے دروازہ بند کیا تو کمرے میں اندھیرا چھا گیا، بابا جی کچھ پڑھتے ہوئے ہاتھ کا اشارہ کیا تو سامنے کی دیوار روشن ہوگئی اور دیوار پر آڑی ترچھی لکیریں نظر آنے لگیں چند لمحے بعد لکیریں واضح ہوئیں اور دیوار پر ہر چیز واضح نظر آنے لگی ایک تحریر نظر آئی۔ چار سال پہلے۔

پھر نظر آیا فارم ہاؤس کے گیٹ پر گاڑی رکی گاڑی سے علی، عابد، علینہ اور مریم نیچے اترے انہوں نے اپنے اپنے سامان اٹھائے اور آگے کو چلنے لگے، گیٹ پر پہنچ کر علی نے اپنی جیب سے چابی نکالی اور گیٹ کا تالا کھولا، تالا کھولنے کے بعد چاروں اندر داخل ہوگئے ایک کمرہ کے دروازے پر پہنچے۔

علی نے چابی سے دروازہ کھولا اور کمرے میں سب داخل ہوئے، کمرے میں پہنچ کر سب نے سامان ایک طرف رکھا اور آرام سے صوفے پر بیٹھ گئے۔

علی کمرے میں موجود لائٹ آن کر چکا تھا ابھی چند منٹ ہی گزرے تھے کہ ایک عمر رسیدہ شخص کمرے میں داخل ہوا وہ فارم ہاؤس کا چوکیدار رحمت تھا۔ رحمت باادب کھڑا تھا پھر وہ گویا ہوا۔ "علی صاحب میں نے کمرے میں لائٹ دیکھ کر بھاگا بھاگا آیا ہوں، لائٹ دیکھتے ہی میں سمجھ گیا تھا کہ صاحب لوگ آ گئے ہیں۔

آپ حکم کریں میں رضیہ کو بلا کر لاتا ہوں اور کھانے پینے کا انتظام کرتا ہوں۔"

یہ سن کر علی بولا۔ "رحمت بابا فکر کی کوئی بات نہیں آپ اپنے کوارٹر میں جا کر آرام کریں، ضرورت کی چیزیں ہمارے پاس ہیں، علینہ اور مریم سارا انتظام کر لیں گی اور اگر ضرورت ہوئی تو میں آپ کو بلا لوں گا۔"

یہ سنتے ہی رحمت نے سب کو سلام کیا اور کمرے سے نکلتے چلا گیا رحمت اپنے کوارٹر میں پہنچ گیا کمرے میں وہاں رضیہ رحمت کا انتظار کر رہی تھی۔ رضیہ رحمت کی جواں سال بیٹی تھی رحمت کی بیوی کا ایک سال پہلے انتقال ہو چکا تھا رحمت نے رضیہ کو بتایا کہ علی بابو اپنے چند دوستوں کے ساتھ آئے ہیں کئی دن یہاں رہ کر سیر وغیرہ کرنے کے بعد واپس چلے جائیں گے۔

رضیہ تم نے کل اچھی طرح کمروں کی صفائی ستھرائی کر دینا اور ہاں سارے کام ذرا دھیان سے کرنا انہیں کوئی شکایت نہ ہونے پائے اور میں کل صبح نو بجے کے قریب تیری خالہ کو دیکھنے چلا جاؤں گا اس کی طبیعت بہت زیادہ خراب ہے ایک دن کی بات ہے دوسرے روز میں آ جاؤں گا تو ایسا کرنا کہ علینہ اور مریم بی بی کے کمرے میں سو جانا، پتر تو ڈرتی زیادہ ہے اور تیرا یہ ڈر خوف مجھے چین نہیں لینے دیتا۔"

یہ سن کر رضیہ بولی۔ "ابا کیا میں خود سے ڈرتی ہوں اب میں کیا کروں میرے اندر ڈر بیٹھ چکا ہے۔"

خیر صبح کے وقت رحمت آیا اور علی کو بول کر دوسرے گاؤں چلا گیا۔

رضیہ دن بھر کام کاج میں لگی رہی اور جان توڑ محنت کر کے سب کو خوش کر دیا، شام ہوئی اور شام کے بعد رات نے ڈیرہ ڈال دیا۔

ادھر علینہ، عابد، مریم اور علی نے پروگرام بنایا کہ آج رات کیوں نا رضیہ کو ڈرا کر مزہ لیا جائے اور حسب پروگرام رات کے دس بجے رضیہ کو ایک کمرے میں اکیلا چھوڑ کر وہ باہر نکل گئے اور بتایا کہ ہم آدھا گھنٹہ میں آتے ہیں۔

اور پھر پروگرام کے مطابق اچانک لائٹ بند کر دی اب پورے فارم ہاؤس میں گھپ اندھیرا پھیل چکا تھا اور ڈر سے رضیہ کے جسم کو کاٹو تو لہو نہیں، رضیہ سہم کر اپنی جگہ بیٹھ گئی اس پر لرزہ طاری ہو چکا تھا۔

ادھر پروگرام کے مطابق چاروں نے عجیب وغریب آوازیں نکالتے ہوئے رضیہ کو ڈرانے لگے اور پھر اچانک رضیہ کی فلک شگاف چیخ سنائی دی اس کے بعد خاموشی طاری ہوگئی مگر پھر بھی وہ اپنے تئیں اسے ڈراتے رہے مگر رضیہ پر خاموشی نے اپنا تسلط جما لیا تھا، کافی دیر تک جب رضیہ کی کسی قسم کی آواز سنائی نہ دی تو علی نے سوئچ آن کر دیا۔

سوئچ کے آن ہوتے ہی کمرہ روشنی سے جگمگا اٹھا۔

مگر رضیہ پر نظر پڑتے ہی چاروں کی نگاہیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

رضیہ کمرے کے فرش پر آڑی ترچھی بے سدھ پڑی تھی۔

یہ دیکھتے ہی وہ رضیہ کے قریب پہنچے، رضیہ کی آنکھیں باہر کو ابلی پڑی تھیں رضیہ ساکت تھی۔

علی نے رضیہ کا ہاتھ پکڑ کر ہلایا تو..... اس کے منہ سے نکلا۔

"ارے۔ یہ تو مر گئی۔"

اب کیا تھا وہ چاروں سر پکڑ کر بیٹھ گئے، کافی دیر تک بدحواسی کے عالم میں بیٹھے رہے اور جب ان کے ہوش بحال ہوئے تو علی بولا۔ "اب کیا کریں؟"

خیر کافی دیر سوچتے رہے پھر سب کا متفقہ فیصلہ ہوا کہ اسے اٹھا کر کوارٹر میں پہنچا دیتے ہیں اور صبح کے وقت جب بابا آئیں گے اور پوچھنے پر انہیں بتا دیں گے کہ رات اس نے ضد کی کہ میں کوارٹر میں آرام سے سو جاؤں گی اور پھر یہ کوارٹر میں چلی گئی، پھر ہمیں کیا پتہ کہ کیا ہوا، لیکن ہم نے اپنے آپ پر قابو رکھنا ہے ذرا سی بھی ہماری غلطی ہمیں پھانسی کے پھندے تک لے جا سکتی ہے۔

اس کے بعد سب نے مصمم ارادہ کیا کہ کسی صورت بھی وہ زبان کو قابو میں رکھیں گے، پھر انہوں نے

رضیہ کے مردہ جسم کو اٹھایا اور اسے کوارٹر میں پہنچا کر بستر پر لٹادیا اور واپس آگئے۔

علی اُسی صبح رحمت آ گیا اور جب کوارٹر میں گیا تو حواس باختہ ہوگیا، خیر اس کے بعد جو ہونا تھا وہ رودھو کر ہوگیا، رحمت بابا نے قسمت کا لکھا سمجھ کر خاموش ہو رہا۔

علی نے رحمت کے ہاتھ پر دس ہزار روپے رکھے اسے تسلی دی اور چاروں واپس فارم ہاؤس سے آگئے۔

اور چار سال تک دوبارہ فارم ہاؤس نہیں گئے اور جب گئے تو......

علی کے ابو حیرانی سے یہ سب دیکھ رہے تھے اب اسکرین غائب ہو چکی تھی وہ باباجی سے بولے۔

"میرے بچوں سے یہ سب غلطی سے ہوا انہوں نے شرارت کی ان کا اصل مقصد رضیہ کو ڈرا کر لطف اندوز ہونا تھا انہیں یہ تو پتہ نہ تھا کہ رضیہ مرجائے گی۔ انہیں معاف کردیں۔"

باباجی بولے۔ "معافی تو ان کو رضیہ کی روح سے مانگنی چاہیے۔"

علی کے ابو بولے۔ "باباجی کسی طرح میرے بچوں کو اس پریشانی سے نکال دیں۔"

باباجی کچھ دیر سوچتے رہے پھر انہوں نے دو تعویز دیئے پھر علی اور علینہ سے کہا۔ "اسے اپنے پاس ہمیشہ رکھنا اور اسے گلے میں باندھ لیں، اس طرح رضیہ کی روح ان کو کچھ نہیں کہہ سکے گی۔" یہ سن کر ان دونوں نے تعویز لیا اور گھر پہنچ گئے۔

☆......☆......☆

ایک مہینہ گزر گیا اور کوئی غیر معمولی واقعہ پیش نہ آیا علینہ اور علی اپنے آپ میں مگن ہوگئے۔

علینہ نے سوچا۔ "اب رضیہ کی روح جا چکی ہے لیکن یہ اس کی غلط فہمی تھی علینہ نے آج اپنے دوستوں کے ہاں ایک پارٹی میں جانا تھا وہ خوب دل لگا کر تیار ہوئی اور خود کو آئینے میں دیکھنے لگی اس کی نظر تعویز پر پڑی تو اس نے سوچا۔ "سب دیکھیں گے تو کتنا عجیب لگے گا۔" اس نے تعویز گلے سے اتار دیا۔

رضیہ کی روح اسی انتظار میں تھی، علینہ نے تعویز اتار کر سونے کی چین اٹھائی اور گلے میں ڈال لی، اچانک ہی سونے کی چین اس کی گردن میں فٹ ہو کر ٹائٹ ہوگئی، چین اتنی ٹائٹ ہوگئی تھی کہ علینہ کے منہ سے آواز بھی نہیں نکل رہی تھی، اچانک ہی اس کی نظر سامنے پڑی اور خوف سے وہ کانپنے لگی اس کی گردن پر دباؤ بڑھتا جارہا تھا لیکن وہ کچھ نہیں کر پارہی تھی پھر علینہ کا سانس رک گیا اور وہ دھڑام سے زمین پر گر پڑی، وہ مرچکی تھی، رضیہ نے اپنا انتقام پورا کرلیا۔

اب علی سے بدلہ لینا باقی تھا۔

علی اپنے دوستوں کے ساتھ کسی ٹرپ پر جارہا تھا۔ علی صبح اٹھا اور نہانے کے لئے باتھ روم میں چلا گیا اور اپنا تعویز اتار کر باہر میز پر رکھ گیا، وہ بھول چکا تھا کہ باباجی نے تعویز اتارنے سے منع کیا تھا، جیسے ہی وہ باتھ روم میں گیا دروازہ خود بخود بند ہوگیا وہ ڈر گیا کہ دروازہ کیسے بند ہوسکتا ہے اس نے دروازے کو کھولنا چاہا لیکن دروازہ نہ کھل سکا۔

اچانک ہی ہر طرف سے قہقہے کی آواز آنے لگی آواز سن کر اسے رضیہ یاد آ گئی کیونکہ وہ رضیہ کی آواز اچھی طرح پہچانتا تھا، وہ ڈر کر رضیہ سے معافی مانگنے لگا، وہ گڑگڑا رہا تھا لیکن رضیہ کی روح پر کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔

پھر اچانک ہی علی کا جسم ہوا میں معلق ہوا اور پھر دھڑام سے زمین پر گرا۔ جوں ہی اس کا سر ٹائلوں سے ٹکرایا اس کے سر سے خون کا فوارہ ابل پڑا اور ہر طرف فرش پر خون ہی خون نظر آنے لگا۔ اور پھر رضیہ کی گرفت کا شکنجہ، علی کی گردن پر سخت سے سخت تر ہوتا گیا، علی کا جسم چند سیکنڈ میں ہی ڈھیلا پڑ گیا۔

علی مرچکا تھا اور رضیہ کی روح قہقہہ لگاتے ہوئے وہاں سے غائب ہوگئی۔ کیونکہ اس کا انتقام پورا ہو چکا تھا۔

آتما کا سایہ

گلاب خان سولنگی - راولپنڈی

رات کا اندھیرا ہر سو مسلط تھا، پورے گاؤں پر موت کا سکوت طاری تھا، سب لوگ خواب خرگوش کے مزے لے رہے تھے کہ اچانک ایک دلدوز چیخ سنائی دی تو سوئے ہوئے لوگوں کی سٹی گم ہوگئی اور پھر......

بقول لوگوں کے اس آتما نے سب کی زندگی اجیرن کرکے رکھ دی تھی، حقیقت کہانی میں پنہاں ہے

یہ واقعہ تقسیم ہند سے پہلے کا ہے برٹش سرکار نے اپنے تار میں مجھ سے انسانیت کے نام پر اپیل کی کہ میں فوری طور پر ہندوستان کی ریاست چھتیس گڑھ کے ایک نواحی قصبے پریم نگر روانہ ہوجاؤں اور وہاں کے باشندوں کو اس بلائے بے درماں سے نجات دلاؤں جو ایک آدم خور چیتے کی شکل میں ان پر نازل ہوگئی ہے۔ میں نے اپنے کیمپ کا سازوسامان اسی روز اپنے ملازموں کے ہمراہ پریم نگر روانہ کردیا اور پھر میں خود بھی پریم نگر پہنچ گیا۔ پریم نگر پہنچ کر ابھی میں اپنے گھوڑے کی پیٹھ سے اترنے بھی نہ پایا تھا کہ رونے پیٹنے کی بلند اور رنجیدہ صداؤں نے میری توجہ اپنی طرف مبذول کرالی۔ پریم نگر جنوبی ہندوستان چھتیس گڑھ کی ویران اور بنجر سی پہاڑیوں کے دامن میں ایک چھوٹا سا گاؤں تھا ان پہاڑیوں پر جابجا کانٹے دار جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں

پر اسی قسم کے کچھ اور بھی دیہات تھے جن میں کچے مکانات تھے بلکہ زیادہ تر گھاس اور بانس سے بنائی ہوئی جھونپڑیاں تھیں ان دیہات میں زیادہ تر ہندو لوگ آباد تھے جو تمام تر ان پڑھ اور تہذیب وتمدن سے ناآشنا چھوٹی ذات کے ہندو تھے یہ لوگ بھیڑ بکریوں کے ریوڑ رکھتے یا معمولی کھیتی باڑی کر کے اپنا پیٹ پالتے تھے۔

میرے دریافت کرنے پر میرے ملازمین نے مجھے بتایا کہ آج صبح یہاں سے کوئی ایک میل دور بکریاں چرانے والی ایک بیوہ عورت کے دس بارہ سالہ بچے کو ایک چیتا اٹھا کر لے گیا اور ابھی تک اس کا کوئی پتہ نہیں چل سکا۔ میں نے گھوڑے کو یوں ہی چھوڑا اور اسی وقت گاڑی کے اندر چلا گیا۔ وہاں مرد عورتیں اور بچوں کا ایک ہجوم جمع تھا اور یہ سب لوگ بے اختیار رو رہے تھے۔ ان میں سب سے بلند رونے کی آواز اس عورت کی تھی جو چیتے کا شکار ہونے والے لڑکے کی ماں تھی میرے وہاں پہنچتے ہی ان لوگوں نے مجھے گھیر لیا اور مجھ سے فریاد کی کہ میں اس آدم خور چیتے کا کھوج لگا کر اسے اپنی گولی کا نشانہ بناڈالوں۔ میں نے ان لوگوں سے کہا کہ وہ پہلے رونا دھونا بند کردیں اور پھر مجھے بتائیں کہ یہ واقعہ کب اور کیسے رونما ہوا۔ میری ہدایت پر وہ لوگ چپ ہوگئے لیکن لڑکے کی ماں پھر بھی رو رہی تھی اور کسی طرح خاموش ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔

اس غم ناک حادثے کا عینی شاہد اسی گاؤں کا ایک سولہ سترہ سال کا ایک نوجوان تھا جو اس لڑکے کے ہمراہ خود بھی بکریاں چرا رہا تھا اس نے بتایا کہ میں اور وہ لڑکا آج صبح یہاں سے ایک میل پرے بکریاں چرانے کے لئے گئے، ہم لوگ بکریاں چرا رہے تھے کہ لڑکے کو پیاس محسوس ہوئی اور وہاں سے چند قدم کے فاصلے پر واقع تالاب سے پانی پینے کے لئے چلا گیا۔ اچانک میں نے دیکھا کہ قریبی جھاڑیوں میں سے ایک چیتا نکلا اور بکریوں کے ریوڑ میں سے گزرتا ہوا لڑکے کی طرف بڑھا۔

میرا ابھی تک یہ خیال تھا کہ وہ بکری اٹھائے گا لڑکے کی طرف بڑھتا چلا گیا میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس نے لڑکے پر چھلانگ لگادی جو حالات سے بے خبر تالاب کے کنارے پر، بیٹھا ہوا پانی پینے میں مصروف تھا، اس کی گردن پکڑی اور لڑکے کو گھسیٹتا ہوا جس طرف سے آیا تھا اسی طرف جھاڑیوں میں گھس گیا۔ یہ واقعہ کچھ اتنی تیزی سے پیش آیا کہ میں گھبراہٹ میں لڑکے کو اس خطرے سے خبردار بھی نہ کرسکا اور پھر مارے ڈر کے وہاں سے گاؤں میں بھاگ آیا۔

لوگوں نے مجھے مزید بتایا کہ اس درندے نے تین ماہ کے عرصے میں پندرہ کے قریب مردوں عورتوں اور بچوں کو اپنا نشانہ بنایا ہے اس کے حملوں کا زیادہ تر نشانہ وہ لوگ بنے جو رات کو اپنے کھیتوں میں سوئے ہوئے ہوتے تھے یا پھر جن کے مکان اور جھونپڑیاں جنگل کے کنارے واقع تھیں۔ چیتا اب تک حملے رات کی تاریکی میں کرتا تھا یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے دن کے اجالے میں ان حالات کو سن کر اپنے کیمپ میں واپس آ گیا۔ مجھے گاؤں والوں کا غیر ہمدردانہ اور بزدلانہ رویہ دیکھ کر بے حد افسوس ہوا کیونکہ ان میں سے کوئی بھی اب تک لڑکے کی لاش کی تلاش میں نہیں نکلا تھا۔ دوسری طرف مجھے ان کی بے بسی پر ترس بھی آرہا تھا، میں نے وہ پوری رات سوچ کر گزار دی۔ اگلے دن صبح کو میں ٹہلتا ہوا جنگل کے قریب واقع فاریسٹ آفیسر کے دفتر پہنچ گیا، میں نے باہر بیٹھے چپراسی سے پوچھا "اندر فاریسٹ آفیسر موجود ہیں؟"

اس نے فوراً مجھے سلام کیا اور بتایا کہ "فاریسٹ آفیسر اپنے دفتر میں موجود ہیں۔" میں اندر چلا گیا۔ دفتر کیا تھا ایک ہال نما کمرہ تھا جو نہایت ہی خستہ حال اور پرانی لکڑی کے تختوں سے بنا ہوا تھا وہاں پر موجود فاریسٹ آفیسر نے بڑی گرم جوشی سے میری آؤ بھگت کی۔ "میں ہوں وجے کمار، اس علاقے کا

اسسٹنٹ آفیسر۔"

اس نے ہاتھ ملاتے ہوئے اپنا تعارف کرایا لیکن میرے چہرے پر ناگواری کے تاثرعیاں تھے۔

"مسٹروجے کمار! حد ہوگئی چشم پوشی کی!"

وہ میرے الفاظ پر چونکتے ہوئے بولا۔

"انگلش بابو! میں سمجھا نہیں، آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں؟" میں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"مسٹروجے آپ یہاں کے فاریسٹ آفیسر ہیں اور آپ برٹش سرکار سے اس کی تنخواہ بھی لے رہے ہیں۔ یہ پچھلے کچھ ماہ سے اس آدم خور چیتے نے جو یہاں کی تباہی کی ہے وہ آپ کو نظر نہیں آرہی، اسی لئے مجھے چیتے کو مارنے کے لئے لندن سے بلایا گیا ہے اور ویسے بھی آپ کو میرے یہاں آنے کا مقصد تو پتہ چل گیا ہوگا۔"

"انگلش بابو مجھے آپ کے آنے کا پتہ چل گیا تھا۔" وجے نے مختصر جواب دیا اور اپنی کرسی پر جا بیٹھا۔

"دیکھو مسٹروجے! یہ معاملہ بہت ہی سنگین ہے اور اسے لے کر برٹش گورنمنٹ بھی شدید پریشان ہے اس آدم خور چیتے نے کتنے لوگوں کو مارا ہے اور کتنوں کو گھائل کیا ہے اور اس عرصے میں آپ کے ڈپارٹمنٹ نے کیا ایکشن لیا ہے؟ میں چاہوں گا کہ آپ تفصیل سے مجھے بریف کریں۔"

اس نے چپراسی سے چائے لانے کے لئے کہا اور بڑے ہی مہذب انداز میں مجھے سمجھانے لگا۔

"دیکھئے انگلش بابو! مجھے یہاں کا چارج لئے چند ماہ ہوئے ہیں، جب میں یہاں نیا نیا پوسٹنگ آیا تھا تو مجھے بھی گاؤں والوں سے چیتے کی کہانیاں سننے کو ملی تھیں اور ہمارے ڈپارٹمنٹ نے ان شکایات کا ازالہ بھی کیا اور ہمیں چیتے کو زندہ پکڑنے کا آرڈر ملا بعد ازاں ہم نے ایک چھوٹی سی ٹیم بنائی اور جان جوکھم میں ڈال کر اس چیتے کو زندہ پکڑ لیا اور برٹش سرکار کے کہنے پر اس چیتے کو ہم نے دہلی کے چڑیا گھر بھجوادیا، یہ جو گاؤں والے اب جس آدم خور چیتے کی بات کرتے ہیں وہ حقیقت کم اور افسانہ زیادہ لگتا ہے۔"

"حیرت ہے! لیکن گاؤں والے تو....."

اس نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "دیکھئے! گاؤں والے تو کچھ اور بھی کہتے ہیں جس کا شاید آپ کو علم نہیں ہے۔"

"ایسی کون سی بات ہے جو گاؤں والے مجھ سے چھپا رہے ہیں؟"

مجھے حیرت زدہ دیکھ کر وہ زیرلب مسکرایا۔ "چھوڑیئے انگریز بابو! آپ کو ایسی باتوں پر یقین نہیں آئے گا۔"

"چلو بتا بھی دو۔" میرے حیرت اور تجسس کے ملے جلے اصرار پر وہ گویا ہوا۔

"صاحب جی! گاؤں والوں کے مطابق یہ جو نیا آدم خور چیتا ہے اس پر کسی آتما کا سایہ ہے۔"

"What" میرا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ "آتما..... کس کی آتما؟"

"دیکھئے صاحب وہ تو مجھے پتہ نہیں ہے لیکن گاؤں والے کہتے ہیں کہ چند ماہ پہلے اس چیتے نے ایک ایسی عورت کو کھایا تھا جس پر آسیب کا سایہ تھا اور اب اس عورت کی آتما اس چیتے پر قابض ہے اسی لئے وہ آدم خور بن گیا ہے۔"

"کیا آپ نے بھی اس عورت کی لاش دیکھی تھی؟" میرے سوال پر وہ چونک گیا اور کہنے لگا۔ "لاش تو میں نے بھی دیکھی تھی اس عورت کی لاش دور جنگل میں پائی گئی تھی اور وہ لاش بری طرح سے مسخ شدہ تھی لیکن کوئی بھی یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ اسے چیتے نے مارا ہے یا کسی اور درندے نے۔"

"مسٹروجے یہ آپ نے کن باتوں میں مجھے الجھادیا، اس آتما کے چکر سے نکلو اور مجھے بتاؤ کہ کس طرح آپ نے اس چیتے کو زندہ پکڑا تھا میرا مطلب ہے کہ میں بھی ماہر شکاریات ہوں جانتا ہوں کہ ایسے درندوں کو زندہ پکڑنا کتنا مشکل اور جان جوکھم والا کام ہوتا ہے شاید آپ کے تجربے سے مجھے بھی فائدہ حاصل

سامنے رکھ دی، میں نے چائے کا کپ اٹھایا اور وجے کمار کے جواب کا انتظار کرنے لگا میری دلچسپی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''ارے چھوڑیئے سر! بڑی لمبی کہانی ہے اور آپ کا وقت بہت قیمتی ہے۔''

''مسٹر وجے میرے پاس وقت ہی وقت ہے، آپ چیتے کو زندہ پکڑنے کی کہانی شروع کیجیے۔'' اس نے چائے کا کپ نیچے رکھا اور اپنی آپ بیتی سنانے لگا۔

''جیسا کہ میں پہلے آپ سے ذکر کر چکا ہوں کہ آج سے کوئی پانچ ماہ پہلے میں یہاں پر بطور فاریسٹ آفیسر تعینات ہوا تھا اس وقت بھی ایک چیتے نے پریم نگر میں تباہی مچا رکھی تھی اور آئے دن بھیڑ بکریوں کے ساتھ ساتھ گاؤں والوں کو بھی اپنا نشانہ بنا تا رہتا تھا لوگوں نے تنگ آ کر برٹش سرکار کو عرضی دی چونکہ ان دنوں جنگلی حیوت بچانے کی ایک مہم چل رہی تھی سو برٹش سرکار نے ہمیں اس چیتے کو گولی مارنے کے بجائے زندہ پکڑنے کا آرڈر دیا وقتی طور پر تو گاؤں والوں کو یہ فیصلہ پسند نہیں آیا لیکن میرے سمجھانے پر وہ خاموش ہو گئے میں نے انہیں تسلی دی اور کہا کہ ''آپ لوگ کسی بھی جنگلی حیوت کو نہیں مار سکتے، جنگلی جانوروں کا تحفظ ہم سب پر فرض ہے۔ باقی رہا وہ چیتا، تو اس کو پکڑنا ہمارا کام ہے، آپ پریشان نہ ہوں، میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کو اس چیتے سے بہت جلد نجات دلاؤں گا۔'' میری اس بات پر گاؤں والے مطمئن ہو گئے۔

میں نے آفس آ کر سب سے پہلے اپنے بالا افسر کو اطلاع دی اور ان سے چیتے کو پکڑنے کا پلان بھی شیئر کیا چیتے کو پکڑنے کے لئے ہمیں کچھ سامان درکار تھا ان میں سے کچھ چیزیں پہلے ہی موجود تھیں جبکہ بقیہ چیزیں ہم نے بازار سے منگوائیں میں نے اپنے دفتر کے اسٹاف کو بلایا جو کہ 6 افراد پر مشتمل تھا۔

''ساتھیو! جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ ہمیں برٹش سرکار کی طرف سے چیتے کو زندہ پکڑنے کا حکم ملا ہے، ہمیں اسے مارنے کے بجائے زندہ پکڑنا ہوگا اور چیتے کے متعلق تو آپ لوگوں کو معلوم ہی ہوگا کہ اس نے کس طرح گاؤں والوں کا جانی اور مالی نقصان پہنچایا ہے اگر گاؤں والے اپنے طور پر ایک ایک کر کے ان جانوروں کو ماریں گے تو یہ پورا جنگل جنگلی حیوت سے خالی ہو جائے گا۔ سو ہمارا فرض ہے کہ جانوروں کے ساتھ ساتھ گاؤں والوں کا تحفظ بھی یقینی بنائیں۔

میرا پلان یہ ہے کہ کل دوپہر کو ہم سارے لوگ چیتے کو پکڑنے کا سامان لے کر جنگل کو جائیں، چاہے ہمیں کتنے ہی دن لگ جائیں مگر ہم خالی ہاتھ واپس نہیں آئیں گے اور اگر ہر چیز پلان کے مطابق ہوئی تو ہم ضرور کامیاب ہوں گے ابھی آپ لوگ تیاری کریں جب تک میں مطلوبہ سامان کا جائزہ لیتا ہوں۔'' ہمارے اسٹاف میں سارے افراد تعاون کرنے والے تھے اور وہ میری سربراہی میں اس خطرناک مہم پر جانے کے لئے تیار ہو گئے بعد ازاں میں نے سامان کا معائنہ کیا سامان میں لوہے کا ایک بڑا پنجرہ جس میں چیتا وغیرہ آسانی سے اندر سما سکتا تھا۔

چند مضبوط رسیاں کچھ ڈنڈے ٹارچ کھانے پینے کا سامان کپڑے لتے، ٹینٹ، گینتی، بیلچہ، چیتے کو پکڑنے کے لئے ایک بکری کا بچہ اور بھی ضرورت کا بہت سارا سامان ہم نے لیا اور ہاں اپنے تحفظ کے لئے کچھ بندوقیں بھی ساتھ رکھیں تا کہ کسی خطرے کی صورت میں ہم لوگ اپنی حفاظت بھی کر سکیں۔

دوسرے دن پلان کے مطابق ہم لوگ مطلوبہ سامان لے کر جنگل میں آ گئے، آگے آگے میں چل رہا تھا اور میرے پیچھے اسٹاف کے باقی لوگ، میرے علاوہ دو بندوں کے ہاتھ میں بندوقیں تھیں جب کہ چار بندے پنجرہ اور باقی سامان اٹھائے میرے پیچھے پیچھے آ رہے تھے جنگل میں چلتے چلتے شام ہو گئی تھی جنگل کافی گھنا اور خطرناک تھا، ہر طرف پرندوں اور جنگلی جانوروں کی آوازیں آ رہی تھیں ہم بڑی احتیاط سے چیتے کے ٹھکانے کو تلاش کر رہے تھے چونکہ وہ پہاڑی

جنگل تھا، اس لئے ہمیں یقین تھا کہ چیتا کسی چھوٹے موٹے غار میں ہی رہتا ہوگا۔

اندھیرا ہونے کو تھا اس لئے میں نے اپنے اسٹاف سے کہا کہ اندھیرا ہونے سے پہلے ہمیں اپنے رہنے کے لئے خیمے لگانے چاہئے باقی تلاش کا کام کل کریں گے۔'' میرے کہنے کے مطابق ایک جگہ کا انتخاب کیا گیا اور وہیں پر ٹینٹ لگانے شروع کر دیئے یہ جگہ جنگل کے بالکل درمیان میں تھی اور پاس ہی پانی کی ایک چھوٹی سی نہر بھی تھی کافی محنت کے بعد ہم نے ٹینٹ لگائے اور اپنا سامان وغیرہ سیٹ کر کے رات کے کھانے کی تیاری میں مصروف ہو گئے۔

چونکہ سردی کے دن تھے اس لئے ہم نے کافی سوکھی لکڑیاں اکٹھی کی ہوئی تھیں اور ان میں آگ لگا کر ہم لوگ اپنے اپنے ہاتھ تاپ رہے تھے سب نے گرم کپڑے پہن رکھے تھے رات کا کھانا کھا کر کافی دیر تک ہم لوگ آگ کے قریب بیٹھے رہے اور گپ شپ کرتے رہے ویسے اس قسم کی مہم سے ہمارا پہلی مرتبہ واسطہ پڑا تھا اور ویسے بھی ایسے مناظر فلموں میں ہی دیکھنے کو ملتے ہیں۔

رات کو جنگل اور بھی زیادہ خوفناک لگ رہا تھا دور سے الو کے چلانے اور گیدڑ کے چیخنے سے ماحول اور بھی وحشت ناک ہو گیا تھا جب تک آگ جلتی رہی ہم لوگ بھی بیٹھے رہے اور آگ کے بجھتے ہی ہم لوگ سونے کی تیاری میں لگ گئے۔ تین بندوں کو پہرہ دینے کے لئے منتخب کیا جو باری باری پہرہ دیتے رہے، رات دیر سے کس وقت آنکھ لگی، پتہ ہی نہیں چلا۔

صبح جب آنکھ کھلی تو جنگل کی صبح دیکھنے کے لائق تھی ہر طرف پرندوں کے چہچہانے کی آوازیں ایک مسحور کن کیفیت پیدا کر رہی تھیں، میں نے سب سے خیریت پوچھی اور ناشتہ کر کے پھر اپنی مہم کے لئے نکل پڑے۔ پورا دن تلاش کے بعد شام کو ہمیں کچھ جھاڑیوں کے درمیان ایک چھوٹا غار نما کھڈہ نظر آیا جس کے اندر اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ ہم لوگ وہاں رک گئے ،میں نے دیکھا کہ اس جگہ ہر طرف ہڈیاں ہی ہڈیاں بکھری پڑی تھیں ہم سب نے سوچا ہو نہ ہو یہ وہی جگہ ہے جس کی ہمیں تلاش ہے، ہم نے ذرا قریب جا کر دیکھا تو ہمیں کچھ پیروں کے نشان بھی نظر آئے جس سے ہمارا شک یقین میں بدل گیا کیوں کہ وہ نشان ہو بہو چیتے کے پاؤں کے تھے، میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ'' مجھے یقین ہے کہ چیتا اسی جگہ رہتا ہوگا اور وہ رات کو یہاں ضرور آئے گا، سو ہمیں اس کو قابو کرنے کے لئے اسی جگہ پنجرے کو رکھنا پڑے گا، آپ لوگوں کا کیا خیال ہے؟''

سب لوگوں نے میری تائید کی اور لوہے کا پنجرہ غار کے قریب ہی رکھوا دیا اور بکری کے بچے کو پنجرے کے اندر باندھ دیا۔ پھر ہم نے رسیوں سے پنجرے کے دروازے کو باندھا اور ان رسیوں کا ایک سرا جھاڑیوں میں چھپا دیا تا کہ جوں ہی چیتا اندر پنجرے میں داخل ہو تو ہم لوگ رسیوں کو کھینچ کر فوراً دروازہ بند کر دیں۔ شام

موت کی جھیل

دنیا بھر میں پانی سے ہونے والی اموات کی تعداد بہت ہے، یہ جانی نقصان پانی میں ڈوبنے کی وجہ سے ہوتا ہے مغربی افریقہ کے علاقے کیمرون میں ایک ایسی جھیل موجود ہے جس سے قدرتی طور پر زہریلی گیس کا اخراج ہوا ہے۔ اس وجہ سے یہ جھیل جس کا نام (NYOS) ہے دنیا میں سب سے زیادہ اموت کی ذمہ دار مانی جاتی ہے۔ جو پچھلے چند عشروں میں ہزاروں افراد کی جان لے چکی ہے۔ گست 1986ء کی ایک رات اس جھیل سے کاربن ڈائی آکسائیڈ گیس اتنی مقدار میں خارج ہوئی کہ تقریباً 1800 افراد بے شمار جانور ایک ہی رات میں مر گئے، اس لحاظ سے یہ اب تک کی سب سے زیادہ اموات کی ذمہ دار جھیل مانی جاتی ہے۔

(محسن عزیز حلیم۔ کوٹھا کلاں)

ہونے لگی تھی اور ہم نے بھی چیتے کو پکڑنے کا سامان اچھی طرح لگایا اور قریب ہی گھنی جھاڑیوں میں جا کر چھپ گئے میرے ہاتھ میں بندق تھی کہ اگر چیتا ہم پر حملہ کردے تو ہم لوگ اپنی حفاظت کے لئے گولی چلا سکیں۔

آہستہ آہستہ اندھیرا چھانے لگا اور ہم لوگ بھی الرٹ ہونے لگے ہم نے پنجرے کے پاس تھوڑی سی روشنی کا بھی بندوبست کیا تھا تاکہ ہمیں کچھ نظر آسکے وقت کے ساتھ ساتھ ہمارا تجسس بھی بڑھتا گیا ہمیں انتظار کرتے کافی وقت گزر گیا تھا کہ اچانک دور سے ہمیں چیتے کے دھاڑنے کی آواز آنے لگی۔ میں نے اپنے ساتھیوں کو خبردار کیا ہماری نگاہیں پنجرے کی طرف تھیں اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ چیتا ہمارے سامنے آگیا۔

چیتا جیسے ہی اپنے ٹھکانے کے قریب آیا تو اس کی نظر پنجرے میں موجود بکری کے بچے پر پڑی جو چیتے کو دیکھ کر زور زور سے چلانے لگا، چیتے کو ماحول میں تبدیلی کا اندازہ ہوگیا تھا لیکن وہ دن بھر کا بھوکا تھا اور بکری کے بچے کو دیکھ کر زور زور سے غرایا اور غصے سے ادھر ادھر دیکھنے لگا، ہم لوگ تو پہلے ہی سانسیں روکے بیٹھے تھے اور سوچ رہے تھے کہ اگر چیتے کو ہماری موجودگی کا شک ہوگیا تو ہماری خیر نہیں لیکن ہم ایک نیک مقصد کے لئے نکلے تھے اس لئے ہمارے حوصلے بلند تھے۔

چیتے نے پہلے چاروں طرف دیکھا اور پھر وہ آہستہ آہستہ پنجرے کی طرف بڑھنے لگا اور پھر وہ پنجرے میں داخل ہوگیا اس نے ایک ہی پنجے سے بکری کے بچے کا کام تمام کردیا۔ ہم لوگوں نے بھی فوراً رسیوں کو کھینچ کر پنجرے کا دروازہ بند کردیا پھر کیا تھا۔ پنجرے کا دروازہ بند ہوتے ہی چیتا زور زور سے پنجرے کی سلاخوں کو ٹکر مارنے لگا اور باہر نکلنے کی کوشش کرنے لگا لیکن اب بہت دیر ہوچکی تھی وہ پنجرے میں پھنس چکا تھا۔

ہم لوگ بھی جھاڑیوں سے باہر نکل آئے اور جلدی سے ایک بڑا تالا اس پنجرے کے دروازے پر لگا دیا، چیتا ہمیں دیکھ کر اور بھی زیادہ دہاڑنے لگا چیتے کو پنجرے میں دیکھ کر ہم لوگ بہت خوش ہوئے۔

آج پورے گاؤں میں جشن کا سماں تھا، چیتے کو دیکھنے سارا گاؤں امنڈ آیا تھا اور تو اور آس پاس کے دیہاتوں سے بھی لوگ چیتے کو دیکھنے آگئے تھے، برڈش سرکار نے اس چیتے کو دہلی کے چڑیا گھر میں بھجوادیا اور ہماری کامیابی پر ہمیں انعام واکرام سے بھی نوازا گیا۔

''اوہ ..... مسٹر وجے! واٹ اے گریٹ اسٹوری، آپ کی یہ کوشش واقعی قابل داد ہے۔ اس کا مطلب ہے یہ کوئی اور چیتا ہے جس نے پورے پریم نگر میں دہشت پھیلائی ہوئی ہے۔'' وجے کمار نے ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے کہا ''بھگوان جانے وہ چیتا ہے یا پھر آتما۔''

''یار تم بھی.....! اتنے بہادر آدمی ہوکر ایسی باتیں کرتے ہو، خیر وہ چیتا ہو یا آتما، لیکن میں آپ کی طرح اسے زندہ نہیں پکڑوں گا بلکہ ایک ہی گولی سے اس کا کام تمام کردوں گا۔''

''وش یو گڈ لک۔'' وجے نے مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے وش کیا اور میں واپس اپنے کیمپ میں آگیا۔

میں کافی دیر تک ان حالات پر سوچتا رہا، بار بار اس عورت کا روتا ہوا چہرہ میرے سامنے آجاتا تھا جس کے لڑکے کو وہ چیتا لے کر گیا تھا، میں نے اپنی رائفل سنبھالی اور گاؤں کے چھ سات دوسرے آدمیوں کو اپنے ہمراہ لے کر لڑکے کی لاش کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ لڑکے کی ماں نے بھی ساتھ چلنے کی ضد کی۔ ہم جلد ہی تالاب کے کنارے پہنچ گئے وہاں لڑکے کے گھسیٹے جانے کے آثار موجود تھے چنانچہ ان کی مدد سے ہمیں لڑکے کی لاش تک پہنچنے میں کوئی خاص دقت پیش نہ آئی۔ چیتے نے لڑکے کی لاش کو ایک خشک نالے میں ایک جھاڑی کے نیچے چھپا رکھا تھا اس نے لڑکے کی ٹانگ کا کچھ حصہ کھالیا تھا باقی لاش موجود تھی لیکن اس کا حلیہ بری طرح بگڑ چکا تھا۔

لاش کی حالت جیسی بھی تھی لیکن ماں کی ماری ماں نے اس کی کوئی پرواہ نہیں کی اور تیزی سے لاش کی طرف بڑھی پھر وہ گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی لاش کو اٹھا کر

اس نے اپنی گود میں رکھ لیا وہ دھاڑیں مار مار کر روتی رہی یہ دلدوز منظر دیکھ کر ہم سب متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور ہم سب کی آنکھوں میں آنسو آگئے بہرحال میں نے اس عورت کو صبر کی تلقین کی اور بڑی مشکل سے اسے خاموش کرایا۔

رات کے کھانے کے بعد جلد ہی میری آنکھ لگ گئی لیکن کوئی دو گھنٹے کے بعد ہی گیدڑوں کی مخصوص چیخ پکار نے مجھے جگا دیا گیدڑ یہ خوف زدہ آوازیں اس وقت نکالتے ہیں جب وہ کسی شیر یا چیتے کو جنگل میں چلتا پھرتا دیکھتے ہوں۔ میں اٹھ بیٹھا اپنی بندوق سنبھالی اور کیمپ کا چکر لگانے کے لئے باہر نکل گیا میں نے ماحول پر ایک نظر ڈالی، ملازمین کو ہوشیار رہنے کی تلقین کی اور واپس آکر سو گیا۔ رات بغیر کسی ناخوش گوار واقعہ کے گزر گئی، لیکن صبح میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ چیتا اس رات ایک دفعہ نہیں بلکہ دو دو دفعہ ہمارے کیمپ کے اردگرد پھر تا رہا لیکن خیریت رہی۔

لڑکے کی موت کے بعد چند دن تک علاقے میں امن رہا لیکن پاس والے گاؤں سے ایک دن یہ اطلاع موصول ہوئی کہ آدم خور چیتا پھر وہاں ایک آدمی کو اپنا نشانہ بنانے میں کامیاب ہوگیا ہے۔ اب تو میرے علاوہ باقی پورے گاؤں والوں کو یقین ہوگیا تھا کہ اس آدم خور چیتے پر کسی آتما کا سایہ ہے لیکن میری سوچ اس کے بالکل برعکس تھی میں چیزوں کو روایتی نہیں بلکہ سائنٹیفک طریقے سے سوچتا تھا، بلکہ وہ ایک آدم خور چیتا تھا جس کی زبان پر انسانی خون کا چسکا پڑ چکا تھا اسی لئے وہ عام بھیڑ بکریوں کو چھوڑ کر صرف اور صرف انسانوں کا شکار کرتا تھا اور اب وہ میری گولی کا شکار ہونے والا تھا۔

اس واقعہ کے دو روز بعد میں شام کو گھوڑے پر سوار چلا آرہا تھا کہ میرے ساتھی نے مجھے ایک چیتا دکھایا جو ہم سے کوئی دو سو گز پر ایک پہاڑی چٹان پر بیٹھا ہوا تھا میں نشانہ لے رہا تھا کہ چیتا اٹھ کھڑا ہوا شاید اس کا ارادہ ادھر ادھر چھلانگ لگانے کا تھا لیکن میری رائفل چل چکی تھی گولی اس کے سینے میں لگی اور وہ پلٹ کر پیچھے کی طرف گر پڑا۔ ہمارا خیال تھا کہ آج ہم نے آدم خور کو زیر کرلیا ہے لیکن جب ہم پہاڑی پر پہنچے تو معلوم ہوا یہ تو اوسط قد کی مادہ ہے جس کے متعلق پورے کیمپ کی رائے تھی کہ یہ ہرگز آدم خور نہیں ہے کیونکہ آدم خور جسمانی لحاظ سے بڑے قد و قامت کا بتایا گیا تھا، ابھی ہم اس معاملے پر غور ہی کررہے تھے کہ اگلے روز ہمیں یہ اطلاع موصول ہوئی کہ سلطان پور گاؤں سے ایک لڑکا گم ہوگیا ہے یہ لڑکا اپنے دوستوں کے ہمراہ جنگل میں سوکھی لکڑیاں چننے کے لئے گیا ہوا تھا کہ وہیں گم ہوگیا ہر چند اس کو تلاش کیا مگر اس کا کوئی نشان نہ ملا ہاں ایک جگہ کچھ خون ضرور پڑا ہوا ملا۔

لڑکے کے گم ہوجانے کی خبر مجھے اسی روز بعد از دوپہر مل گئی اور میں اپنے گھوڑے پر سوار ہوکر سلطان پور روانہ ہوگیا وہاں سے میں نے تین آدمی ہمراہ لئے جو مجھے اس جنگل میں لے گئے جہاں سے لڑکا گم ہوا تھا ہم اس مقام پر بھی گئے جہاں لڑکے کا خون پڑا ہوا ملا تھا لیکن جانبچا کانٹے دار جھاڑیوں کی وجہ سے یہ تعین کرنا مشکل ہوگیا تھا کہ درندہ لڑکے کی لاش کو کدھر لے گیا ہے۔ ہم پریشان ہوکر لوٹ رہے تھے کہ میں نے قریبی پہاڑی پر گدھوں کو چکر لگاتے دیکھا ان کی موجودگی سے میرا یہ شبہ قوی ہوگیا کہ ہونہ ہو لڑکے کی لاش یہاں کہیں پہاڑی پر موجود ہے چنانچہ ہم لوگ پہاڑی کی طرف روانہ ہوگئے۔

میں سب سے آگے پہاڑی پر چڑھ رہا تھا کہ مجھے کچھ پتھروں کے گرنے کی آواز آئی جونہی میں نے اس طرف دیکھا ایک چیتا بجلی کی طرح ایک چٹان سے کودا اور جھاڑیوں میں گم ہوگیا ہمیں چیتے کو دیکھ کر یہ یقین تو ہوگیا کہ اب ہم لڑکے کی لاش کے قریب آن پہنچے ہیں، لیکن آدمیوں کی نفری کم ہونے کی وجہ سے ہم اس وقت چیتے سے دو دو ہاتھ نہیں کرسکتے تھے۔ چنانچہ ہم نے لڑکے کی لاش کی تلاش جاری رکھی اور جلدی ہی اسے پالیا۔ لڑکے کا چہرہ صحیح وسالم تھا لیکن سینے میں ایک بڑا

...بہرحال یہ منظر بے حد دل خراش تھا لیکن ہمیں دیکھنا پڑا۔

میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا وہ لڑکے کی لاش کو اٹھالیں اور گاؤں چلیں کیونکہ اب سورج بھی غروب ہوا چاہتا تھا، تمام راستے میں یہی سوچتا رہا کہ اگر یہ صورتحال یونہی قائم رہی تو پھر سب گاؤں والے اس گاؤں کو چھوڑ کر کہیں اور چلے جائیں گے ظاہر ہے کہ ایسے اقدام سے حکومت کی بدنامی ہوتی تھی۔

اگلی صبح ایک تھانیدار جو ہندو تھا، ہمارے کیمپ میں آیا چونکہ پچھلے دنوں سے چیتے کے ہاتھوں کئی آدمی مارے جا چکے تھے اس لئے وہ پولیس رپورٹ تیار کرنے کے لئے وہیں جا رہا تھا مجھے اس سرکاری ملازم کی باتیں سن کر حیرت بھی ہوئی اور غصہ بھی آیا اس نے بتایا کہ ”یہ چیتا دراصل کوئی بدروح ہے جو چیتے کی شکل اختیار کرگئی ہے اس لئے مجھے چاہئے کہ میں اس کا بالکل پیچھا نہ کروں بلکہ واپس چلا جاؤں، ہوسکتا ہے کہ کل کلاں کو مجھے اس سے نقصان پہنچے یا میرا کوئی آدمی اس کے ہاتھوں مارا جائے۔“ تھانے دار کی بے ہودہ باتوں کا مجھ پر تو کیا اثر ہونا تھا۔

بہرحال وہ چلا گیا۔ ”پہلے مسٹر وجے کی آتما اور اب تھانے دار کی بدروح۔“ میں زیر لب مسکرایا۔

میرا کیمپ وہیں لگا رہا اور اگلا ہفتہ پورے کا پورا بغیر کسی حادثے کے خیریت سے گزر گیا۔ میں حیران تھا کہ چیتا کہاں گیا، ایک شام کو میں معمول کے مطابق سیر کو نہیں نکلا بلکہ کیمپ کے باہر ایک کتاب کے مطالعہ میں مصروف تھا کہ میرا سائیں ہانپتا کانپتا بھاگا ہوا میرے پاس آیا، اس نے بتایا کہ اس نے ایک چیتے کو ہمارے کیمپ سے کوئی سو گز کی دوری پر آموں کے درختوں کے جھنڈ سے گزر کر نالے کی طرف کی نشاندہی سائیں نے کی تھی۔ نالے کے کنارے پہنچ کر مجھے ایک مرتبہ تو کچھ نظر نہ آیا لیکن دوسرے لمحے میں نے دیکھا کہ نالے کے دوسرے کنارے کے پس پشت پہاڑی

...قدم رکھتا ہوا اوپر چڑھ رہا ہے اگرچہ اس نے مجھے دیکھ لیا تھا تاہم اس کے باوجود اس نے اپنی چال میں کوئی پھرتی یا تیزی نہیں دکھائی۔

خوش قسمتی سے اس کے آس پاس کوئی جھاڑی بھی نہیں تھی جہاں وہ پناہ لے سکتا۔ حالات بڑے ساز گار نظر آ رہے تھے اور میں محسوس کر رہا تھا کہ آج آدم خور چیتا مجھ سے بچ کر نہیں جاسکتا۔ میں نے بڑے اطمینان سے نشانہ لیا اور ٹریگر دبا دیا۔

میری خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ میرے فائر نے درندے کو گرا دیا اس کے ساتھ ہی میں نے ایک فائر اور کیا جس نے رہی سہی کسر بھی پوری کردی اور چیتا اب زمین پر بے حس وحرکت پڑا ہوا تھا۔

گولیوں کی آواز سنتے ہی گاؤں کے لوگ بھی دوڑتے ہوئے وہاں آ گئے۔ چیتے کو جا کر دیکھا تو سب کی یہ متفقہ رائے ہوئی کہ وہی آدم خور چیتا ہے جو اس علاقے کے لوگوں کے لئے وبال جان بنا ہوا تھا۔ بس اب کیا تھا، دیہاتیوں نے جوش ومسرت سے میری ”جے“ کے نعرے لگانے شروع کردیئے، یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پورے علاقے میں پھیل گئی اور چیتے کو دیکھنے دکھانے کا سلسلہ اگلے روز تک جاری رہا۔

روانہ ہونے سے پیشتر میں نے گاؤں کے نمبردار، فاریسٹ آفیسر وجے کمار اور سلطان پور کے تھانیدار کو آدم خور چیتے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”وہ رہی آپ کی آتما اور بدروح۔“ میرے طنزیہ جملے پر وہ زیر لب مسکرانے لگے، میں نے جاتے ہوئے ان کو اپنا لندن کا ایڈریس دیا اور کہا کہ۔ ”دوبارہ کوئی اور چیتا اگر آپ لوگوں کو تنگ کرے تو ایک عدد چٹھی ضرور لکھ دینا۔“ کافی عرصے بعد بھی کوئی چٹھی نہیں آئی تو مجھے بھی اطمینان ہوگیا کہ میرا نشانہ ٹھیک لگا تھا۔

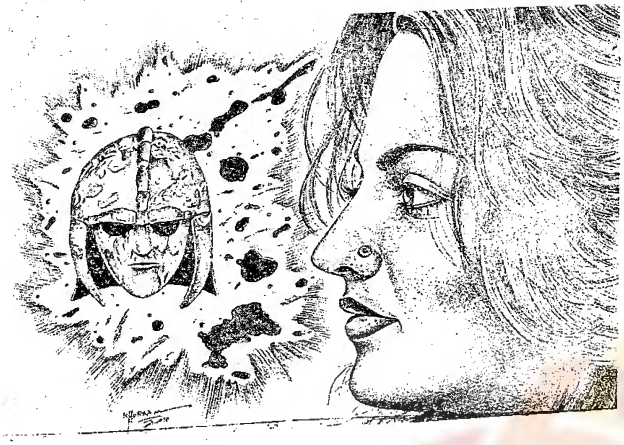

لٹ کا عاشق

نسرین رانا۔ کراچی

اچانک لڑکے کے منہ سے گرجدار، خوفناک اور دہشت ناک مردانہ آواز خارج ہوئی تو وہاں موجود سارے لوگوں پر دہشت سوار ہوگئی، اور پھر لڑکی خوفناک انداز میں آگے کو بڑھی تو اچانک......

لٹ الجھی سلجھا جارے بالم، اس جملے کو احاطہ کرتی ہوئی دلفریب اور دلکش کہانی

”اماں اماں! وہ اپنی قیصر باجی پر جن آ گیا ہے۔“ ببلو نے ماں کے پاس آ کر زور زور سے کہنا شروع کیا تو فاخرہ بیگم جھنجھلا کر بولیں۔ ”تیرا دماغ صحیح ہے، جن آ گیا؟ تجھے بہت معلوم ہے جن کے بارے میں۔“

اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور کہتیں پڑوسن خالہ رحمت آ گئیں۔

”فاخرہ او فاخرہ، ارے وہ اپنی قیصر ہے ناں اس پر جن آ گیا ہے سارا محلہ جمع ہے اور تو یہاں ہے۔“

”اتنی دیر سے کہہ رہا ہوں میں اماں کو کہ قیصر باجی پر جن آ گیا ہے۔“ ببلو منہ بناتے ہوئے بولا۔

فاخرہ بیگم جھٹ چادر اوڑھتے ہوئے۔ ”ارے صبح تک تو صحیح تھی شکر لینے آئی تھی اب اس وقت کیا ہوگیا۔“ وہ رحمت بی بی کے ساتھ گھر سے نکلتے ہوئے بولیں تو ببلو بھی ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

قیصر کے دونوں ہاتھ آٹے میں ہور ہے تھے اور وہ زور زور سے اپنا سر ہلا رہی تھی، کبھی ہاتھ ادھر مارتی تو کبھی ادھر، آنکھیں بہت زیادہ سرخ ہو کر باہر کو ابل پڑی تھیں۔

بیٹی کی حالت پر ہاجرہ روئے جا رہی تھیں کہ ایک عورت نے پوچھا۔ ”کیا ہوا تھا؟“

فاخرہ کھسک کر ہاجرہ کے قریب گئی۔ ”اے صبح تک تو صحیح تھی جب شکر لینے آئی تھی۔“

”ارے یہ تھوڑی دیر پہلے بھی صحیح تھی بس آٹا گوندتے گوندتے طبیعت خراب ہوگئی۔ وہ اپنے دوپٹے سے آنسو صاف کرتے ہوئے بولیں۔

منیرہ عرف منو خالہ قیصر کو سنبھالنے کی کوشش میں مصروف تھیں۔

پانی پلانا چاہا تو قیصر نے ہاتھ مار کر پانی گرا دیا۔

”ارے بہن کسی ڈاکٹر کو بلوالو یوں تماشہ دیکھتے رہو گے۔“ رحمت بی بی نے کہا تو منو خالہ نے انہیں دیکھتے ہوئے کہا۔

”یہ ڈاکٹر کا نہیں بلکہ مولوی کا مسئلہ ہے کسی ملا مولوی کو بلانا ہوگا۔“

”مجھے لگتا ہے کوئی جن ون آ گیا ہے۔“

”بڑی خوب صورت ہے ناں جو اس پر جن آ گیا۔“ سلمٰی منہ بناتے ہوئے بولی آہستگی سے جو پاس میں کھڑی ستارہ نے سن لیا۔

”ہاں جن تو خوبصورت لڑکیوں پر آتے ہیں یہ تو عام سی شکل کی ہے۔“ انہوں نے قیصر کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

قیصر کی حالت سے لگ رہا تھا کہ مزید اس کی خراب ہوگئی ہے، اس کے بالوں کی ایک موٹی لٹ اس کے چہرے پر جھول رہی تھی، عام دن میں تو وہ لٹ کو بار بار اپنے ہاتھوں سے ہٹاتی تھی مگر اس وقت تو اسے اپنا ہوش نہ تھا وہ لٹ کو کیا پیچھے کرتی۔

اس کی لٹ تھی بھی اچھی گھنگریالی کالی سیاہ، لٹ پر اور منو خالہ مسلسل قیصر کو سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھیں ساتھ ساتھ کچھ پڑھ بھی رہی تھیں۔

ہاجرہ بیگم اپنی بیٹی کی حالت پر حال سے بے حال ہو رہی تھیں بچے لڑکیاں عورتیں سب جمع تھیں، مرد حضرات باہر کھڑے پریشان تھے۔

”میری بیٹی ابھی تھوڑی دیر پہلے تو بالکل ٹھیک تھی سالن بنایا آٹا گوندتے گوندتے جانے کیا ہوگیا دیکھو آٹا گوندا بھی نہیں ہے پوری طرح سے کہ اس کی طبیعت خراب ہوگئی۔“ وہ سسکتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

”یہ لو انہیں یہ افسوس ہے کہ آٹا پوری طرح کیوں نہیں گوندا۔“ سلمٰی مسخرے پن سے ہنس کر بولی۔

”ارے آہستہ بولو، سب پریشان ہیں۔“ ستارہ نے ٹوکا تو وہ گھور کر رہ گئی۔

منو خالہ نے دم کیا ہوا پانی ہاتھ کے چلو میں لے کر قیصر پر چھینٹا مارا اور ساتھ ہی ساتھ وہ قرآنی آیات پڑھ رہی تھیں وہ پڑھ کر پھونک مارتی۔

ان کا یہ عمل کرنا تھا کہ قیصر نے چیخنا شروع کر دیا وہ جو سر نیچے کیے زور زور سے اپنا سر ہلا رہی تھی اور اس کے بالوں کی لٹ بار بار ہل رہی تھی اچانک اس کی حالت غیر ہوگئی اور پھر پانی کے چھینٹے سے ایک دم اس کی آواز بدل گئی۔ بھاری مردانہ آواز میں اس نے سر اٹھا کر منو اور رحمت بی بی کو سرخ انگارہ ہوتی آنکھوں سے گھورا۔

اور پھر منو خالہ پر جھپٹا مارنے والی تھی کہ وہ تیزی سے ایک طرف ہوگئیں۔

لوگ ادھر ادھر بھاگنے لگے کہ صورت حال بدلنے لگی تھی۔

منو خالہ سمجھ گئیں کہ اب معاملہ ان کے بس سے باہر ہے انہوں نے رحمت بی بی کو دیکھا پھر آہستگی سے کان میں کچھ کہا۔

”ہاں منو تم ٹھیک کہہ رہی ہو، پردہ پیسے بہت لیتے ہیں اور پھر گھر آنے کے تو کچھ زیادہ ہی لیں گے۔“

”بچی سے بڑھ کر نہیں ہیں، ہاجرہ نے مجھے پیسے دیے تو ٹھیک ہے ورنہ ہمیں تو کچھ کرنا ہی ہے، جوان بچی ہے کہ حالت اور بگڑ گئی تو۔“ وہ فکر مند ہو گئی تھیں۔

ویسے بھی منو جن کا نام منیرہ تھا مگر سب منو خالہ ہی کہتے تھے اور منو خالہ کو منو بوا بھی کہتے تھے انہیں سارے علاقے کی فکر رہتی تھی خاص کر پورے محلے کی ہمیشہ انہیں آگے آگے رکھا جاتا تھا۔ چاہے پیسوں کی مدد ہو یا گھر یلو ضرورت کے سامان کی کچن کے سامان کی یا ہاتھ پاؤں کی محنت۔ منو خالہ ہر طرح سے حاضر رہتی تھیں اور ایسے ہی ان کے شوہر جمعہ خان نیک دل انسان تھے اور جمعہ خان کے منہ بولے بھائی ستار بھی ان کے ساتھ کاموں میں حصہ لیتے تھے۔

”منو بوا نے بچے سے کہا۔“ جاؤ اپنے ابا کو اور چچا کو بلا لاؤ، کہنا امی بلا رہی ہیں۔“ انہوں نے اپنے بیٹے سلام سے کہا تو وہ۔ ”اچھا امی۔“ کہتا ہوا بھاگا۔

جمعہ خان اور ستار آئے تو عورتیں ایک طرف ہو کر کھڑی ہو گئیں۔

منو بوا نے تمام تفصیل بتائی اور کہا۔ ”جلدی سے عالم صاحب کو لے آؤ۔“

”پر بھابھی وہ پیسے بہت لیں گے گھر آنے کے تو زیادہ ہی۔“ ستار نے قیصر کی حالت کو دیکھتے ہوئے۔ ”ہاجرہ باجی سے پوچھ لیں۔“ وہ بولے۔

ہاجرہ نے سن لیا تھا اسی لئے وہ آ گئی۔ ”بھیا جو میرے پاس ہوگا وہ دوں گی، بس میری بچی ٹھیک ہو جائے۔“ وہ عاجزی سے بولیں۔

”اور جو ہوں گے وہ ہم ملا لیں گے، کیوں جی ٹھیک ہے ناں۔“ منو بوا نے اپنے شوہر جمعہ خان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہاں کیوں نہیں..... اب جلدی جاؤ۔“ جمعہ خان نے ستار کو دیکھتے ہوئے مضطرب ہوتے ہوئے کہا۔

”اچھا بھائی ابھی جاتا ہوں۔“ یہ بول کر وہ فوراً عالم صاحب کو لینے چلے گئے۔

قیصر کی حالت ویسے ہی تھی، زور زور سے سر ہلانے سے شاید اس کے سر میں درد ہو گیا تھا جبھی وہ تھوڑی دیر کے

بچوں کی اسلامی کتابیں

حضرت محمد ﷺ	اسلم راہی	25/-
حضرت آدم علیہ السلام	اسلم راہی	25/-
حضرت ایوب علیہ السلام	اسلم راہی	25/-
حضرت داؤد علیہ السلام	اسلم راہی	25/-
حضرت عیسیٰ علیہ السلام	اسلم راہی	25/-
حضرت ابراہیم علیہ السلام	اسلم راہی	25/-
حضرت اسماعیل علیہ السلام	اسلم راہی	25/-
حضرت لوط علیہ السلام	اسلم راہی	25/-
حضرت موسیٰ علیہ السلام	اسلم راہی	25/-
حضرت نوح علیہ السلام	اسلم راہی	25/-
حضرت سلیمان علیہ السلام	اسلم راہی	25/-
حضرت یوسف علیہ السلام	اسلم راہی	25/-
حضرت عزیر علیہ السلام	اسلم راہی	25/-
حضرت ہود علیہ السلام	اسلم راہی	25/-
حضرت الیاس علیہ السلام	اسلم راہی	25/-
حضرت یونس علیہ السلام	اسلم راہی	25/-
حضرت صالح علیہ السلام	اسلم راہی	25/-
حضرت شعیب علیہ السلام	اسلم راہی	25/-
حضرت زکریا علیہ السلام	اسلم راہی	25/-
حضرت یحییٰ علیہ السلام	اسلم راہی	25/-

دعا بک کارنر مشتی محلہ امین پور بازار گلی نمبر 5 فیصل آباد
فون نمبر: 041-2640013

سے خائف ہوئی تھی۔

اس کے بال کھل چکے تھے، وہ دونوں ہاتھ زمین پر جمائے سر جھکائے بیٹھی تھی اور اس کی موٹی لٹ جھول رہی تھی۔

وہ اپنی گھونگریالی کالی سیاہ لٹ کو آنکھیں پھاڑے غور سے دیکھ رہی تھی جیسے بہت ارمان ہو اس لٹ کو قریب سے دیکھنے کا۔

پھر ایک ہاتھ زمین سے ہٹا کر لٹ کو پکڑ کر غور سے دیکھتے ہوئے لٹ کر زور سے ہلایا اور ساتھ ہی مسکرائی۔

ایسے جیسے محبوب اپنی محبوبہ کی لٹ سے چھیڑ خانی کر رہا ہو۔

"عالم صاحب آگئے، عالم صاحب آگئے۔" آوازیں آنا شروع ہوگئیں، عورتوں کی اور وہ ادب احترام سے ایک طرف ہوگئیں۔

سفید کپڑوں میں عالم صاحب کا نورانی چہرہ تمتما رہا تھا وہ اندر آئے جہاں قیصر بیٹھی تھی۔

عالم صاحب کی آمد پر قیصر نے ایک دم نگاہیں اٹھا کر عالم صاحب کو غصے سے دیکھا اور "ہوں ہوں۔" کی آواز نکالنا شروع کر دی۔

وہ جو اپنی ہی لٹ کو پسندیدگی کی نظروں سے دیکھ رہی تھی اور لٹ کے ساتھ کھیل رہی تھی، عالم صاحب کی آمد اسے سخت ناگوار گزری تھی۔

اس کی حالت پھر سے بگڑ گئی۔

عالم صاحب اس کے سامنے تھوڑا سا فاصلہ رکھ کر بیٹھ گئے اور کچھ پڑھنے لگے پھر قیصر کے اور قریب ہوگئے مگر تھوڑا سا فاصلہ تھا وہاں بیٹھ کر اپنا حصار باندھا اور پڑھائی شروع کر دی۔

ان کا پڑھنا تھا کہ قیصر کا غراتا تھا وہ کبھی چیختی چلاتی تو کبھی غصے سے عالم صاحب کی طرف جھپٹا مارتی مگر انہیں چھو نہیں پا رہی تھی۔ اس کا چہرہ کرخت ہوگیا آنکھیں باہر کو ابل پڑیں، وہ غصے سے چیخنے اور چلانے لگی تھی مگر عالم صاحب پر اس کے چلانے کا کوئی بھی اثر نہیں ہو رہا تھا وہ اپنے دھن میں سورۃ جن پڑھنے میں مصروف تھے اور اس پڑھائی کا سلسلہ تقریباً دس پندرہ منٹ تک چلتا رہا۔

اور پھر عالم صاحب نے پانی پر کچھ پڑھ کر پانی کو قیصر پر پھینکا تو۔ قیصر کی آواز مردانہ ہوگئی اور پھر وہ غصے سے غراتے ہوئے بولی۔

"عالم چھوڑ دے مجھے مت تنگ کر۔"

"تو چھوڑ دے بچی کو کیوں تنگ کر رکھا ہے۔" عالم صاحب نے دبنگ آواز سے کہا۔

"میں نہیں چھوڑ سکتا، میں اسے اپنے ساتھ لے کر جاؤں گا۔" قیصر زور سے مردانہ آواز میں بولی۔

"تجھے اس کو چھوڑنا ہوگا اس نے تیرا کیا بگاڑا جو تو اسے تنگ کر رہا ہے۔" عالم صاحب نے اپنی تسبیح آگے کرتے ہوئے کہا۔

"ہٹ جا پیچھے۔" قیصر عالم صاحب سے دور ہوتے ہوئے۔ "میں اسے نہیں چھوڑ سکتا، میں اس کی خوب صورت لٹ پر عاشق ہوگیا ہوں۔" قیصر اپنی لٹ کو پکڑ کر۔ "میں اسے اپنے ساتھ لے کر جاؤں گا۔"

دونوں کی گفتگو سب لوگ غور سے سن رہے تھے۔

"لٹ پر عاشق کیسے ہوا؟"

"میں یہاں سے گزر رہا تھا، یہ صحن میں بیٹھی آٹا گوند رہی تھی اس کی گھنی گھنگریالی خوب صورت لٹ اس کے چہرے پر بار بار آ رہی تھی جسے یہ مسلسل انداز دلبرائی سے ہٹائے جا رہی تھی اور بس میرا دل اس کی لٹ پر آ گیا، اب میں اس کا عاشق ہوگیا ہوں اور میں اسے اپنے ساتھ لے کر جاؤں گا۔" قیصر اپنی لٹ کو چومتے ہوئے مردانہ آواز میں بولتے ہوئے مسکرائی۔

"تجھے اس کو چھوڑنا پڑے گا، تو جنات میں سے ہے اور یہ انسان اور ایک لٹ کی وجہ سے اسے مت تنگ کر، اگر تو اسے نہیں چھوڑے گا تو میں تجھے جلا دوں گا۔" عالم صاحب زوردار آواز میں غصے سے بولے۔

"تو اپنی پڑھائی کر، تو مجھے جلائے گا تو میں اس کو کہیں کا نہیں چھوڑوں گا، اس کی زندگی ختم کر دوں گا۔ اس لئے کہہ رہا ہوں کہ مجھے نہ چھیڑ۔"

عالم صاحب نے غور سے قیصر کو دیکھا۔

قیصر میں موجود جن اس کی خوب صورت لٹ کو دیکھ کر اسے اپنی انگلی میں لپیٹنے لگا۔

عالم صاحب نے پاس بیٹھے ستار کے کان میں کچھ کہا۔ تو وہ فوراً اٹھے اور ہاجرہ کے پاس جا کر بولے۔

"جلدی قینچی دو۔"

انہوں نے بھی تیزی دکھائی اور کمرے میں جا کر قینچی لا کر ستار کو دی جسے انہوں نے قیصر سے چھپاتے ہوئے عالم صاحب کے پاس لا کر رکھ دی۔

عالم صاحب اپنی پڑھائی کرتے ہوئے قینچی پکڑے قیصر کے قریب گئے اور قیصر پر پڑھ پڑھ کر پھونکیں ماریں۔

قیصر مردانہ آواز میں چیخی اور لٹ کو چھوڑ دیا، لٹ پھر سے اس کے چہرے پر جھولنے لگی۔

عالم صاحب مسلسل پڑھتے ہوئے ستار اور جمعہ خان کو اشارہ کیا۔

اشارہ پاتے ہی دونوں نے قیصر کے سر کو زور سے پکڑ لیا اور عالم صاحب نے جھٹ قینچی سے اس کی لٹ کو کاٹ دیا۔

قیصر زور زور سے چلائی۔ "عالم کے بچے میں تجھے چھوڑوں گا نہیں۔"

ستار اور جمعہ خان پیچھے ہٹ گئے عالم صاحب کے کہنے پر۔

"یہ تو نے اچھا نہیں کیا عالم، میں جس چیز پر عاشق تھا تو نے اسے کاٹ دیا۔" قیصر غم زدہ اور افسردگی کے عالم میں کٹی ہوئی لٹ کو دیکھ کر غصے سے، "میں تجھے نہیں چھوڑوں گا۔" وہ عالم صاحب پر حملہ کرنے کو تھی کہ عالم صاحب جو پہلے سے کچھ پڑھ رہے تھے اس پر پھونکا اور اپنی تسبیح کو قیصر پر تین بار مارا جس سے اس کی چیخیں نکل گئیں۔

"مت کر ظلم عالم، مت کر ظلم۔" قیصر زور سے چیخی۔

ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کے جسم میں آگ لگی ہو اور بہت تکلیف میں ہو، تکلیف قیصر کے چہرے پر صاف ظاہر تھی مگر وہ تکلیف قیصر کو نہیں اس میں موجود جن کو مل رہی تھی۔

"ظلم کی بات کر رہا ہے ظلم تو تو کر رہا ہے اس بے چاری معصوم لڑکی پر۔" عالم صاحب غصے سے بولے۔

"دیکھ میں تجھے ایک موقعہ دیتا ہوں تو قیصر کے جسم سے نکل جا ورنہ میں تجھے جلا کر بھسم کر دوں گا جا چلا جا اپنی دنیا میں۔"

قیصر کے ہاتھ سے لٹ گر گئی تھی اور وہ تکلیف سے بلبلا رہی تھی۔

"جا رہا ہوں، اب کیا رکھا ہے اس میں۔" یہ کہتے ہی قیصر ایک دم سے زمین پر گر گئی۔

سب خاموش تھے، عالم صاحب کچھ پڑھنے لگے تھے، آنکھیں بند کئے، چند منٹ میں انہوں نے آنکھیں کھولیں پھر پانی منگوایا پانی پر دم کیا، قیصر پر دم کیا اور تھوڑا سا پانی قیصر کے منہ پر چھینٹا مارا تو چہرہ پر پانی کا پڑنا تھا کہ قیصر نارمل انداز میں اٹھی اور حیرت سے چاروں طرف سب کو دیکھنے لگی۔

"اب وہ جن چلا گیا ہے، قیصر ٹھیک ہے اسے کمزوری ہے، خیال رکھنا اس کا، میرا دم کیا ہوا پانی اسے پلاتے رہنا۔" عالم صاحب نے جمعہ خان، ستار، منو بوا، ہاجرہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"مجھے کیا ہوا ہے سب کیوں آئے ہیں؟" قیصر، ادھر ادھر اپنا دوپٹہ ڈھونڈتے ہوئے بولی تو ہاجرہ جھٹ آگے بڑھیں اور دوپٹہ اٹھا کر اسے اوڑھایا۔

"کچھ نہیں بیٹا جاؤ اندر کمرے میں آرام کرو اور اپنے ہاتھ سے آٹا دھولو۔" عالم صاحب نے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے شفقت سے کہا۔

قیصر کے پاس جہاں لٹ پڑی تھی اس جگہ کو دیکھا تو عالم صاحب مسکراتے ہوئے بولے۔ "واہ ارے لٹ کا عاشق لٹ لے گیا۔"

لٹ غائب تھی، جن اپنے ساتھ اس کٹی لٹ کو لے گیا تھا۔

عالم صاحب نے اپنا سر اوپر کو کیا اور پھر دیکھتے ہوئے مسکرا دیئے۔ لٹ کا عاشق جن، لٹ لئے جا رہا تھا۔

ضدی ناگن

ملک این اے کاوش۔سلانوالی سرگودھا

قسط نمبر:4

نفسانی خواھشات کی بدولت خون کی ندیاں بھتی رھیں، ھر طرف ویرانی اور اداسی کا دور دورہ تھا، انا پرستی نے سب کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا، دل والے دل کے ھاتھوں بے چین تھے کہ اتنے میں حقیقت کھل کر سامنے آگئی، دل گرفتہ اور دل شکستہ داستان زندگی

خودغرضی،اور مطلب پرستی کی ناقابل یقین دل ودماغ کوتھرادینے والی خونی کہانی

جوگی بابا اپنے الو پر براجمان اس جگہ آن پہنچا، جس جگہ شمعان نے شنکر کو ابدی نیند سلایا تھا۔ جوگی بابا نے منہ ہی منہ میں پڑھ کر اس جگہ پھونک ماری تو اسے مردہ ناگ دکھائی دیا اور پلک جھپکتے ساتھ ہی وہ منظر اس کی نگاہوں کے سامنے سے غائب ہوگیا۔

جوگی بابا ساری بات کو سمجھ چکا تھا۔ وہ جان چکا تھا کہ اس کے شاگرد نے ناگ کو مار گرایا ہے لیکن اب ناگن اس کے سر پر ہوگی۔ وہ اسے جب تک ابدی نیند نہ سلالے گی اس کا پیچھا نہیں چھوڑے گی۔ اور یہی بات جوگی بابا کو پسند نہیں تھی۔

وہ بہر صورت شمعان کو بچانا چاہتا تھا کیونکہ شمعان ہی وہ انسان تھا جس کی وجہ سے وہ امر ہونے کا سپنا پورا کرسکتا تھا۔ اسے ابھی شمعان سے بہت سے کام نکلوانا تھے۔ ایک بار پھر جوگی بابا بھاگ کر الو پر سوار ہوگیا۔ اب کی بار الو اوپر ہی اوپر پہاڑ کی بلندی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ پہاڑ کی بلندی پر پہنچ کر جوگی بابا الو سے نیچے اتر آیا۔

جوگی بابا کی الو کی آنکھوں کی مانند گول سرخ انگاروں کے جیسے دہکتی آنکھیں ادھر ادھر پھڑ پھڑا رہی تھیں۔ وہ جلد سے جلد شمعان کو ڈھونڈھ لینا چاہتا تھا۔ جنگل بے شک بہت گھنا تھا لیکن یہ سب کچھ اس کی نگاہوں کے سامنے بے کار تھا۔ باوجود اس کے اس کی آنکھیں جنگل کے اندر زمین کے پرخچے اڑتے حشرات الارض تک کو دیکھ رہی تھیں۔

تبھی جوگی بابا کی نگاہیں ایک جگہ جم سی گئیں۔ اگلا منظر اس کے لیے بہت ہی حیرت ناک تھا۔ اسے یقین نہیں ہو رہا تھا کہ وہ جو کچھ دیکھ رہا تھا وہ سب کچھ حقیقت پر مبنی تھا۔

☆.....☆.....☆

صدام نے گلشن سے رابطہ کیا اور اسے فائیو سٹار ہوٹل میں بلایا اور بتایا کہ وہ اس سے نہایت ہی اہم بات کرنا چاہتا ہے۔

گلشن جانتی تھی کہ صدام اس سے کون سی ایسی خاص بات کرنے کا متمنی ہے۔ لیکن اس نے فی الوقت انکار کرنا بہتر نہ سمجھا۔

رابطہ منقطع ہونے کے بعد گلشن جلدی سے تیار ہوئی اور گھر والوں کو کہا کہ وہ مارکیٹ شاپنگ کرنے جارہی ہے۔ ڈرائیور کو گاڑی تیار رکھنے کا حکم مل گیا۔ گلشن فوراً ہی تیار ہوکر گاڑی میں براجمان ڈرائیور کے ساتھ فائیو سٹار ہوٹل کی طرف جارہی تھی۔

ڈرائیور جمیل احمد اور اس کے درمیان کافی زیادہ علیک سلیک ہوگئی تھی۔ دونوں نے ایک دوسرے سے اظہارِ محبت تک کردیا تھا۔ جمیل احمد جلد ہی اس نئی لوسٹوری کو اختتام تک پہنچانے کا متمنی تھا۔ لیکن گلشن کی خواہش تھی کہ وہ کسی طرح اپنے گھر والوں کو جمیل احمد کے لیے راضی کرے۔

دونوں کے درمیان راستے میں کوئی خاص بات نہ ہوسکی۔ فائیوسٹار ہوٹل کے سامنے پہنچ کر گلشن نے جمیل احمد کو وہیں انتظار کرنے کا کہا اور خود اندر داخل ہوگئی۔

''سالی کتیا تیرے نازنخرے تھوڑے دنوں کے لیے ہیں۔ جلد ہی تجھے بتاؤں گا کہ میری محبت کیسی محبت ہے۔'' گلشن کے ہوٹل میں داخل ہوتے ساتھ ہی جمیل احمد پیچھے سے غصے سے بڑبڑایا اور پھر ڈرائیونگ سیٹ پر براجمان ہوگیا۔

گلشن ہوٹل میں داخل ہوئی تو اسے جلد ہی وہ ٹیبل دکھائی پڑگیا جس کے پاس رکھی نشست پر براجمان صدام اس کا بے صبری سے انتظار کررہا تھا۔ گلشن پر نظر پڑتے ساتھ ہی صدام ایستادہ ہوگیا تھا۔ گلشن کو اس کا یہ انداز بہت ہی عجیب لگا تھا۔

ہوٹل میں براجمان ہرکس وناکس کی نگاہیں صدام پر مرکوز تھیں۔ کیونکہ وہ سب صدام کے بارے میں بہت اچھی طرح سے جانتے تھے۔ اس کا ہر ڈرامہ ہٹ ہورہا تھا۔ یہی نہیں آئے روز قومی اخبارات میں اس کے انٹرویوز شائع ہوتے رہتے تھے۔

''بہت دیر کردی تم نے آنے۔'' صدام نے گلشن کے بیٹھتے ساتھ ہی شکوہ کناں لہجے میں کہا۔

''اپنی طرف سے تو جس قدر ممکن ہوسکا تھا میں نے جلدی جلدی نکلنے کی سعی کی تھی۔'' گلشن نے جواب دیا۔

''اچھا ایسی بھی کیا خاص بات تھی کہ جو گھر آکر نہیں ہوسکتی تھی۔ اس کے لیے جناب نے یہاں ہوٹل میں بلوالیا؟''

گلشن کی بات سن کر صدام چنداں جھینپ سا گیا تھا۔ اسے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ وہ اپنی بات کا آغاز کرے تو کہاں سے کرے۔

''کیا ہوا؟''

صدام کو سوچوں کے بھنور میں مبتلا دیکھ کر گلشن نے اسے پکارا۔ صدام چونک سا گیا۔ اس نے سر کو جھٹکا اور زیرِلب مسکرادیا۔

''میں تم سے یہ کہنا چاہتا تھا کہ میں نے اپنے والدین سے بات کرلی ہے۔ جلد ہی وہ تمہارے گھر آئیں گے۔'' بالآخر صدام نے تمام تر ہمت یکجا کرکے کہا۔

اس کی بات سن کر گلشن حیرت کے سمندر میں غوطہ زن ہوگئی۔ وہ جو کچھ سارے راستے سوچتی آئی تھی۔ وہی بات سامنے آئی تھی۔

''کیا ہوا تم اتنی پریشان کیوں ہوگئی ہو؟''

صدام نے گلشن کے چہرے پر اڑتی ہوائیاں دیکھ لی تھیں۔ اسے حیرت ہورہی تھی کہ اس کی بات سن کر خوش ہونے کی بجائے گلشن الٹا پریشان ہی ہوگئی تھی۔ صدام کو اس کا یہ رویہ بالکل عجیب سا لگ رہا تھا۔

''میں کچھ سمجھی نہیں؟'' بالآخر گلشن نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔

''کیا نہیں سمجھی؟'' صدام نے چڑتے ہوئے پوچھا۔ ''میں نے جو کچھ بھی کہا ہے نہایت ہی آسان زبان میں کہا ہے۔ اور ایسی کوئی بات تو نہیں کی جو تمہاری سمجھ سے بالاتر ہو۔''

''صدام تم غلط سمجھ رہے ہو۔'' گلشن نے دھیمے سے لہجے میں کہا۔

صدام نے پہلے سے ہی دو آئسکریم کا آرڈر دے دیا تھا۔ اور ویٹر کو بتادیا تھا کہ جیسے ہی اس کا مہمان پہنچے وہ دو آئسکریم کے کپ لے آئے۔ ویٹر آئسکریم کے کپ رکھ کر چلتا بنا۔ اتنی دیر تک دونوں کے درمیان خاموشی طاری رہی۔ ویٹر کے جاتے ساتھ ہی صدام نے گفتگو کا آغاز کیا۔

''تم کہنا کیا چاہتی ہو؟'' صدام جو گلشن کی بات سن کر حیران وششدر رہ گیا تھا۔ اس نے کھا جانے والی آنکھوں سے گلشن کو تکتے ہوئے پوچھا۔

اس نے اپنی زندگی میں کبھی ''نہیں'' کا لفظ نہیں

سنا تھا۔ اس کی ہر جائز وناجائز کے سامنے سرِ تسلیم خم کیا جاتا تھا۔ لیکن اس نے تازیست جسے سب سے زیادہ چاہا تھا آج وہی ''نہیں'' کا لفظ استعمال کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ اور یہی بات اسے گوارہ نہ تھی۔

''میں کسی اور میں انٹرسٹڈ ہوں۔'' گلشن نے تمام تر ہمت یکجا کرکے جواب دیا۔ ''میں اسے بہت چاہتی ہوں اور جو تم سمجھ رہے ہو میرے دل میں تمہارے لیے ایسے جذبات کبھی پیدا نہ ہوئے تھے۔''

اس کی بات سن کر صدام غصے سے پیچ وتاب کھا کر رہ گیا۔ اس کا من چاہ رہا تھا کہ گلشن کو جان سے مار ڈالے۔

''ایسا کیسے ممکن ہے؟'' صدام نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ ''تم اچھے سے جانتی ہو کہ ہمارے گھر والوں کی بھی یہی خواہش ہے کہ ہم ایک ہوجائیں۔''

صدام کی بات سن کر گلشن نے اسے گھورا۔ ''کسی کے چاہنے سے کیا ہوتا ہے۔ بات تو اپنے دل کے چاہنے کی ہوتی ہے۔ زبردستی کے رشتے کبھی پروان نہیں چڑھتے اور میں ایسے رشتوں کو قطعاً قبول نہیں کرتی جو زبردستی مالا میں پرودیئے جائیں۔'' گلشن نے جواباً نہایت ہی اطمینان سے جواب دیا۔

''اور رہی بات تمہارے گھر والوں کی وہ ہمیشہ آئیں، لیکن میرے رشتے کے لیے انہیں قطعاً نہ بھیجنا۔''

گلشن کے لہجے میں حکم بھی تھا اور التجا بھی۔ اپنی بات مکمل کرنے کے بعد گلشن ٹیبل پر رکھا اپنا پرس اٹھا کر چلتی بنی جبکہ صدام اسے جاتا ہوا دیکھتا رہ گیا۔ اسے اپنی سماعت پر وشواس نہیں ہورہا تھا کہ جس لڑکی وہ جان سے زیادہ چاہتا تھا۔ وہ اس کی چاہت کا یہ صلہ دے گی۔ اس کی آنکھوں میں نمی عود کر آئی تھی۔

وہ جانتا تھا کہ ہوٹل میں براجمان کتنے ہی لوگوں کی نگاہیں اسی پر مرکوز ہیں۔ وہ آنسو بہا کر خود کو ان کے سامنے بے مول نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ اپنی نشست سے اٹھا اور تھکے تھکے انداز میں چلتا ہوا مین کاؤنٹر پر جا کر ایستادہ ہوگیا۔ بل ادا کرتا ہوا آکر وہ اپنی گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پر براجمان ہوگیا۔

☆......☆......☆

زریاب جس جگہ پر ایستادہ تھا اس سے تھوڑے ہی فاصلے پر دیگچی میں اسے کوئی چیز ابلتی ہوئی دکھائی دی۔ اس کے اندر بھوک سے دوڑتے چوہوں نے کلبلانا شروع کردیا تھا۔ اس کی بھوک میں مزید اضافہ ہوگیا تھا۔

زریاب نے چہار سمت نگاہ دوڑائی۔ اس کے علاوہ وہاں کوئی نہ تھا۔ اس نے جلدی سے آگے بڑھ کر چھوٹی چھوٹی لکڑیوں کے سہارے دیگچی کو آگ سے اتارا اور زمین پر رکھا۔ پاس ہی پڑے جگ میں تھوڑا سا بچا ہوا پانی پڑا تھا۔

یہ سب اس بات کا منہ بولتا ثبوت تھے کہ اس جنگل میں اس کے علاوہ بھی کوئی موجود ہے۔ وہ جو کوئی بھی ہے۔ زریاب کو اس کی کوئی چنتا نہ تھی اسے فی الوقت اپنی بھوک وپیاس مٹانے کی پڑی ہوئی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے زریاب گرما گرم بوٹیوں کو نکال نکال کر کھا گیا۔ اس نے باقی ماندہ شوربے کو جگ میں انڈیلا۔ جگ میں رکھا پانی اس نے زمین پر انڈیل دیا تھا۔

شوربے کو جگ میں اچھی طرح سے ہلا کر اس نے خوب ٹھنڈا کیا اور پھر دوسرے ہی سمے ایک ہی گھونٹ میں وہ سارا شوربہ پی گیا۔ جیسے ہی اس نے جگ زمین پر رکھا اس کے سامنے کا منظر ہی تبدیل ہونے لگا تھا۔

اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اس کی نگاہیں زمین کی گہرائیوں میں چھپی چیزوں کو بھی دیکھنے کی طاقت رکھنے لگ گئی تھیں۔ اس کی آنکھوں کی بینائی میں اضافہ ہوچکا تھا۔

تبھی اس کی سماعت سے پولیس کی گاڑیوں کے ہارن کی آواز سنائی دی۔ وہ خود میں ایک نئی توانائی محسوس کررہا تھا۔ ایک بار پھر اس نے مخالف سمت دوڑنا شروع کردیا تھا۔ جلد ہی وہ جنگل سے باہر نکل آیا۔ اب اس کی نگاہوں کے سامنے ایک پختہ سڑک تھی۔ جس پر اسے چلتی ٹریفک بھی دکھائی پڑ گئی تھی۔

وہ سرعت سے سڑک پر آن کھڑا ہوا اور جلد ہی اس

www.pdfbooksfree.pk

...سے لی تھی۔

☆......☆......☆

راجہ مہندرناتھ پرتاب سنگھ نے شیطانی راستے پر ایسا چلا کہ اسے اپنے پرائے کی پہچان ہی بھول گئی۔ جلد ہی اس نے اپنی فیملی کو بھی شیطان کے چرنوں میں بھینٹ چڑھا دیا تھا۔

کوئی نہیں جانتا تھا کہ راجہ مہندرناتھ پرتاب سنگھ کے اہل وعیال کہاں چلے گئے ہیں۔ انہیں زمین نگل گئی ہے یا پھر آسمان کھا گیا ہے۔

ایک پنڈت پروہت تھا جو سب کچھ جانتا تھا۔ راجہ مہندرناتھ کو بھی پنڈت پروہت کی طرح امر ہونے کی چنتا لگ گئی۔ جس کام کو پنڈت پروہت اپنی زندگی مین پورا نہ کر پایا تھا۔ اسے پایۂ تکمیل تک پہنچانے کو اس نے اپنا فرض سمجھ لیا تھا۔

اگر پنڈت پروہت اپنی زندگی میں امر ہونے کا سپنا پورا نہ کر پایا تھا تو وہ بھی پنڈت پروہت کی طرح اس سپنے کو سپنا نہیں بنانا چاہتا تھا۔ بلکہ وہ بہرصورت اس سپنے کو حقیقت کا روپ دینا چاہتا تھا۔ چاہے اس کے لیے اسے خون کی ندیاں ہی کیوں نہ بہانی پڑ جائیں۔

پنڈت پروہت نے اسے بتایا کہ اگر وہ ایک رات کا خونی عمل کرلے تو اسے پتہ چل سکتا ہے کہ وہ کس طرح امر ہونے کے سپنے کو پورا کرسکتا ہے۔ لیکن وہ عمل اتنا خطرناک عمل ہے کہ تھوڑی سی کوتاہی بھی اس کی موت لینے کی وجہ بن سکتی ہے۔

راجہ مہندرناتھ پرتاب سنگھ پر امر ہونے کا بھوت سوار ہو چکا تھا۔ اور وہ بہرصورت امر ہونا چاہتا تھا۔ اسے موت کے نام سے بھی نفرت ہوگئی تھی۔

پنڈت پروہت نے اسے مزید بتایا کہ اس خونی عمل کے لیے اسے ایک جواں لڑکی کی ضرورت ہوگی۔ جس کو کبھی کسی دوسرے نے چھوا تک نہ ہو۔ عمل مکمل ہونے کے بعد اس لڑکی کے خون سے پہلے راجہ مہندرناتھ پرتاب سنگھ کو خود غسل کرنا ہوگا۔ پھر شیطان کے دیوقامت بت کو غسل دینا ہوگا۔ لیکن یہ سب کچھ اسی صورت میں ممکن ہوگا اگر عمل مکمل ہوگیا۔

☆......☆......☆

گلشن کو صدام کی بات سے خدشہ لاحق ہونے لگا کہ کہیں اس کی شادی زبردستی صدام سے نہ کردی جائے۔ لہٰذا اس نے راستے میں جمیل احمد کو کہا کہ آج رات وہ اس کے ساتھ بھاگنے کے لیے تیار ہے۔

یہاں سے بھاگتے ساتھ ہی ان دونوں کو نکاح کرنا ہوگا۔ اس کی بات سن کر جمیل احمد کے من میں لڈو پھوٹنے لگے تھے۔ اندھے کو اور کیا چاہیے دو آنکھیں کے مترادف اس نے فوراً رضامندی ظاہر کی۔

رات کے پچھلے پہر جب ہر کس وناکس خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہے تھے۔ گلشن جمیل احمد کے ساتھ گھر کا سب کچھ سمیٹ کر نو دو گیارہ ہوگئی۔ جاتے سمے اس نے گھر والوں کے نام ایک لیٹر لکھ دیا تھا۔ جس میں اس نے کھل کر ساری بات بتادی تھی کہ وہ اپنے ڈرائیور کے ساتھ گھر سے بھاگ رہی ہے۔

وہ اور اس کا ڈرائیور ایک دوسرے کو چاہتے ہیں لیکن اس بات کو بھی جانتے ہیں کہ ان کے یکجا ہونے کی کوئی امید نہیں لیکن دونوں ایک دوسرے کے بنا جینے کا تصور بھی نہیں کرسکتے۔ جس کی وجہ سے وہ کورٹ میرج کررہے ہیں۔

یہ ایک ایسی بری خبر تھی جس نے کمشنر آصف اور اس کی فیملی کے پیروں تلے زمین کھینچ لی تھی۔ صبح ہی صبح جب گلشن کو اس کے کمرے میں نہ پایا گیا اور لیٹر ملا تو سب حیران وششدر رہ گئے۔ انہیں گلشن سے اس سب کی توقع نہ تھی۔

کمشنر آصف اور اس کی فیملی کی عزت کو گلشن نے پیروں تلے روند دیا تھا۔ سب گھر والے سر پکڑ کر رہ گئے تھے۔ انہیں یقین نہیں ہورہا تھا کہ گلشن جسے سب گھر والے بے انتہا محبت کرتے ہیں۔ وہ ان کی محبت کا یوں جنازہ نکالے گی۔

دوسری طرف جمیل احمد گلشن کو لیے اپنے ایک دوست کے ہاں جا پہنچا۔ اس نے دوست کو اکیلے میں

بتایا کہ اس نے بہت بڑا ہاتھ مارا ہے۔ کمشنر کی بیٹی کو بھگا کر لایا ہے۔ اس کا دوست جو اس کے بروں کاموں میں اس کی معاونت کرتا تھا۔ اس کی بات سن کر خوشی سے نہال ہوگیا۔

گلشن کو جمیل احمد کا دوست ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ گلشن متواتر بضد تھی کہ جمیل احمد اس سے نکاح کرے لیکن جمیل احمد ایک ہی رٹ لگائے ہوئے تھا کہ اس کے باپ نے شہر بھر میں ناکے لگا رکھے ہیں۔ اگر دونوں پکڑے گئے تو وہ ان کی تکہ بوٹی ایک کرکے رکھ دیں گے۔

دوسری طرف جمیل احمد نے اس کی عزت کی دھجیاں اڑانا شروع کردیں۔ پہلے پہل تو گلشن نے منع کیا لیکن جمیل احمد نے یہ ڈرامہ رچایا کہ اگر کوئی یہاں تک پہنچ بھی گیا تو وہ ہمیں کچھ نہیں کہے گا۔ جب انہیں پتہ چلے گا کہ تم پریگنٹ ہو تو وہ بھی ہتھیار ڈال دیں گے۔

دن پر لگا کے گزرتے چلے گئے اور ایک سال بعد گلشن نے ایک بیٹی کو جنم دیا۔ جس کا نام صائمہ رکھا گیا۔ اس بیٹی کے بعد دونوں دوستوں نے اس کی عزت کی دھجیاں اڑانا شروع کردیں۔ گلشن اپنے کیے پر بہت افسردہ تھی۔ اسے سمجھ آچکی تھی کہ اس نے ایک غلط انسان کا انتخاب کیا تھا۔

گلشن کے آنسو نہ تھمتے تھے۔ اسے رہ رہ کر اپنے گھر والوں کی یاد آتی تھی لیکن سوائے پچھتاوے کے اس کے پاس کچھ بچا ہی کہاں تھا۔ دن پر لگا کے گزرتے رہے اور اس کے ہاں ایک اور بیٹی نے جنم لیا۔ جس کا نام اس نے مہوش رکھا۔

جس دن اس کے ہاں بیٹی ہوئی اسی شام جمیل احمد ایک اور لڑکی کو ورغلا کرلے آیا۔ تب جاکر اس پر یہ بات آشکار ہوئی کہ جمیل احمد اور اس کے دوست کا یہ مشغلہ ہے۔ وہ نوجوان لڑکیوں کو ورغلا کر نہ صرف ان کی عزتوں کی دھجیاں اڑاتے ہیں بلکہ ان کے مال واسباب پر قابض ہوجاتے ہیں۔

وہ لڑکی بھی کسی کھاتے پیتے گھرانے کی تھی اور اپنے ساتھ کافی کچھ لائی تھی۔ گلشن نے موقع دیکھ کر جب دونوں دوست اس لڑکی کے ساتھ مل کر کہیں گئے تھے۔ اس نے ایک لوہے کے ڈنڈے سے اس الماری کا تالہ توڑ دیا جس کے اندر دونوں دوست معصوم اور نوجوان لڑکیوں سے لوٹا ہوا مال واسباب جمع کرکے رکھتے تھے۔

تالہ کھلنے کی دیر تھی کہ اگلا منظر دیکھ کر گلشن حیران وششدر رہ گئی۔ وہ الماری پیسوں کی گڈیوں اور سونے چاندی کے زیورات سے لبالب بھری ہوئی تھی۔ گلشن نے ایک جلدی سے جاکر ایک تکیے کا کپڑا اتارا اور اس کے اندر جتنا کچھ بھر سکتی تھی بھر لیا۔

خاص کرنوٹوں کی تو اس نے ایک گڈی تک نہ چھوڑی تھی۔ باقی سونے چاندی کے زیورات اس نے اتنے بھر لیے تھے کہ تازیست وہ بیٹھ کر دونوں ہاتھوں سے بھی لٹاتی تو ختم نہ ہوتے۔

گلشن نے دونوں بیٹی ان کو اٹھایا اور گھر سے باہر نکل آئی۔ اس کی قسمت اچھی تھی کہ گھر سے نکلتے ساتھ ہی اسے ایک خالی رکشہ مل گیا۔ وہ سرعت سے اس پر سوار ہوگئی۔ ابھی رکشہ تھوڑی ہی دور گیا ہوگا کہ گلشن کو ویرانے میں ایک چھوٹی سی بچی دکھائی دی۔

اس نے رکشہ رکوایا اور باہر نکل آئی۔ اس نے بچی کو اٹھایا اور اسے بھی پاس بٹھالیا۔ رکشے والے نے اس کو بغور دیکھا۔

”پریشان مت ہو بھائی۔ یہ ویرانے میں بھٹکتی کسی کی بیٹی ہے۔ میں بھی دو بیٹیوں کی ماں ہوں۔ جب تک اس کے والدین کا کوئی اتہ پتہ نہیں لگتا اسے میں ایک ماں کی طرح اپنے پاس رکھوں گی۔“ گلشن نے رکشہ ڈرائیور کو گھورتے دیکھ کر کہا۔

”بہن آپ بہت اچھی ہو۔ آپ جیسی عورتیں قسمت کی بہت دھنی ہوتی ہیں۔“ رکشے والا اس کی تعریف کرتے ہوئے بولا۔

”کاش کہ ایسی ہی بات ہوتی۔“ گلشن نم آلود لہجے میں بولی۔

”بہن کوئی مسئلہ ہے کیا؟“ رکشے والے نے

موڑ کاٹتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں بھائی۔ مجھے ایک رہنے کے لیے مکان چاہیے تھا۔ میں اس شہر میں نئی ہوں لیکن سمجھ نہیں آ رہی کہاں جاؤں۔" گلشن نے بے چارگی کے عالم میں جواب دیا۔

"بہن اگر برا نہ مانو تو شہر سے تھوڑے باہر آپ جا کر مکان کرائے پر لو۔ وہاں آپ کو سستے داموں مکان مل جائے گا۔ یہاں تو کرائے آسمان سے باتیں کر رہے ہیں۔" رکشے والے نے مشورہ دیا۔

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔ لیکن کسی محفوظ جگہ پر ہو۔ تم تو جانتے ہی ہو بھائی کہ اکیلی عورت پر ہر کوئی انگلی اٹھانے والا ہوتا ہے۔" گلشن نے دھیمے سے لہجے میں کہا۔

"ٹھیک ہے بہن میرا ایک جاننے والا ہے اس کے دو چار مکان ہیں وہاں پر۔ امید ہے اس کا کوئی نہ کوئی مکان خالی ہوگا۔" رکشے والے نے کہا۔

گلشن نے اس کی بات کے جواب میں سر ہلا دیا۔ پھر رکشے والے نے رکشے کی مزید اسپیڈ بڑھا دی۔ اور جلد ہی وہ شہر سے باہر ایک متوسط آبادی میں داخل ہوگئے۔

تھوڑی ہی دیر بعد ایک گندے پانی سے بھری گلی کی نکر پر ایک گھر کے سامنے جا کر رکشہ رک گیا۔

"میرے ساتھ آؤ بہن۔" رکشے والا رکشے سے اتر کر بولا۔

تو اس گلشن اس کی بات کا جواب دیئے بنا اتر گئی۔ رکشے والے نے اس گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا تو اندر سے پوچھا گیا "کون ہے؟"

رکشے والے نے اپنا تعارف کروایا اور پھر انہیں اندر بلایا گیا۔ دونوں اندر چلے گئے۔ گلشن نے تکیے کے اس لحاف کو اچھی طرح سے سنبھال رکھا تھا۔ حالانکہ اس نے دو بچیوں کو اٹھا رکھا تھا اور تیسری بچی ساتھ چل رہی تھی۔

☆......☆......☆

رکشے والے نے اپنے ایک عزیز سے بات چیت کر کے گلشن کو مکان لے کر دے دیا۔ گلشن اپنی دونوں بچیوں اور ملنے والی بچی کے ساتھ اس گھر میں رہنے لگی۔ گلشن نے اپنے ساتھ لائی نقدی سے گھر کے استعمال کی کچھ چیزیں خرید لیں۔

دو ماہ تک وہ اس مکان میں کرائے پر رہتی رہی اور دو ماہ کے بعد جب اسے یقین ہوگیا کہ اس محلے میں اسے کسی قسم کی کوئی پریشانی لاحق ہونے کا اندیشہ نہیں ہے تو اس نے مالک مکان سے بات چیت کر کے مکان خود خرید لیا۔

ملنے والی بچی جو بولنا جانتی تھی اس نے اپنا نام اسے زرین بتایا تھا۔ یہ بھی بتایا تھا کہ اس کے والد کا نام مہتاب خان ہے۔ لیکن اس سے زیادہ وہ کچھ نہ جانتی تھی۔ گلشن سے جس حد تک ممکن تھا اس کے والدین تلاش کرنے میں اس نے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا تھا۔

یکے بعد دیگرے اس نے زیورات بیچ ڈالے۔ گھر کے اخراجات اس نے انہی سے پورے کرنے شروع کر دیئے تھے۔ گھریلو استعمال کی تمام اشیاء اس نے خرید لی تھیں۔ باقی ماندہ رقم اس نے گھر کے اندر ہی چھپا دی تھی۔ وہ کسی پر کچھ بھی عیاں نہیں کرنا چاہتی تھی۔

وہ جانتی تھی کہ اگر کسی کو بھنک بھی پڑ گئی تو پلک جھپکتے میں سب کچھ اس سے چھین کر لے جائیں گے۔ گزرتے وقت کے ساتھ اس کی بچیاں جوان ہوگئیں۔ اس نے بچیوں کی کی تعلیم و تربیت پر کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا تھا۔

"امی۔" گلشن جو ماضی کی یادوں میں کھوئی ہوئی تھی اس کی سماعت سے اس کی بیٹی مہوش کی آواز ٹکرائی تو اس نے چونک کر اسے دیکھا۔

"امی آپ رو رہی ہیں؟"

گلشن اپنی بیٹی سے اپنے آنسو پوشیدہ نہ رکھ پائی تھی۔ وہ اسے کیسے اور کیا بتاتی کہ اس کی زندگی میں کیسے کیسے نشیب و فراز آئے ہیں۔ جن حالات کا اس نے سامنا کیا ہے۔ اگر اس کی اولاد کو اس کا پتہ چل جائے تو وہ

شاید اس سے نفرت ہی کرنے لگیں۔ اگر انہیں معلوم ہو جائے کہ وہ دونوں اس کی ناجائز بیٹیاں ہیں۔ پھر تو شاید وہ اس سے شدید نفرت کرنے لگ جائیں۔ لیکن نجانے کب تک وہ اس حقیقت کو اپنی بیٹیوں سے پوشیدہ رکھ پائے گی۔

مہوش بار بار اسے پکار رہی تھی لیکن وہ اس کی بات کا کیا جواب دیتی۔ اس نے آنسو صاف کیے اور چپ چاپ وہیل چیئر سے اٹھ کر باہر رکھی چارپائی پر جا کر براجمان ہوگئی جہاں اس کی سلائی مشین رکھی ہوئی تھی۔

☆......☆......☆

مظہر اقبال اور صائمہ کے درمیان یونیورسٹی میں پیار محبت شروع ہوگیا تھا۔ اس بات سے زریں آشنا تھی اور اس نے کئی بار صائمہ کو منع بھی کیا اور سمجھایا کہ اگر امی کو اس بات کی بھنک بھی پڑ گئی تو ان پر کیا بیتے گی۔

لیکن یہ عشق تو ہوتا ہی اندھا ہے۔ ایک بزدل انسان کو بھی نڈر بنا دیتا ہے۔ صائمہ نے بھی مصمم ارادہ کیا ہوا تھا کہ جو ہونا ہوگا، ہو جائے گا۔ آخر ایک نہ ایک دن تو امی کو پتہ لگنا ہی ہے۔

زریں جانتی تھی کہ اگر عشق وشق کا یہ چلتا سلسلہ طول پکڑ لے گا تو اس کا نقصان دونوں کی تعلیم پر ہوگا۔ وہ چاہتی تھی کہ پہلے دونوں اپنی تعلیم پوری کر لیں۔ اس کے بعد دونوں اپنے گھر والوں کو حقیقت سے آشنا کر دیں۔ فیصلہ والدین پہ چھوڑ دیں۔ والدین کبھی بھی اولاد کے بارے میں غلط فیصلہ نہیں کرتے۔ لیکن مجال ہے ان دونوں کے کانوں پر جوں تک رینگی ہو۔ وہ دونوں تو دن چڑھنے سے پہلے ایک ہونے کے سپنے دیکھتے تھے۔

زریں کو یہی فکر لاحق رہتی تھی کہ کہیں دونوں کوئی ایسا قدم نہ اٹھائیں جس سے دونوں کے خاندان کی بے عزتی ہو۔ لیکن زریں کی وہ سنتے ہی کب تھے۔

☆......☆......☆

ناگنی نے شمعان کو حکم دیا۔ شمعان اس بات سے بے خبر کہ درخت کی ٹہنی پر ناگنی ناگن کے روپ میں چمٹی بیٹھی تھی۔ وہ دھیرے دھیرے قدم رکھتا آگے ہی آگے بڑھ رہا تھا جب ناگنی نے آناً فاناً اس کی گردن میں اپنے دانت گاڑھ دیئے۔

شمعان کے لیے اب سوچنے سمجھنے کے تمام راستے ختم ہو چکے تھے۔ اس کے ہاتھ میں پکڑی بین کو ناگنی نے زور سے دم مار کر دور پھینک دیا تھا۔

شمعان کے پورے وجود میں زہر تیزی سے پھیلتا جا رہا تھا۔ ناگنی کو شمعان پر شدید غصہ تھا۔ اس نے گرگرماہی بے آب کی مانند تڑپتے شمعان کے شریر میں مزید چار پانچ جگہ پر کاٹ کر مختلف جگہوں سے اس کے شریر میں اپنا زہر اتارا۔

زہر اتنا زہریلا تھا کہ شمعان کو پورا جسم پیلا پڑنے لگ گیا اور دوسرے ہی سمے اس کے جسم نے پانی کا روپ اختیار کرنا شروع کر دیا۔ تھوڑی ہی دیر میں شمعان کا وجود پانی کی طرح بہہ گیا تھا۔ حتیٰ کہ اس کی ہڈیاں بھی پانی بن گئیں۔

ناگنی جلدی سے رینگتی ہوئی اس جگہ پہنچی جہاں اس ظالم نے اس کی محبت کے ٹکڑے کر کے اسے دیگچی میں پانی بھر کر گڑھا کھود کر اس میں آگ جلا کر اس پر رکھ دیا تھا۔

جب ناگنی مطلوبہ جگہ پہنچی تو اگلا منظر دیکھ کر اس کے پیروں تلے سے زمین کھسک گئی۔ خالی دیگچی الٹی زمین پر پڑی تھی۔ گویا کسی اور نے اس کے شنکر کو کھا لیا تھا۔ چاہے وہ کوئی انسان تھا یا کوئی درندہ۔

ناگنی کی آنکھیں نم آلود ہوگئی تھیں۔ اچانک اس کی نگاہ ایک طرف کٹے ہوئے شنکر کے سر پر پڑی۔ وہ رینگتی ہوئی شنکر کے سر کے پاس پہنچی۔ پلک جھپکتے میں اس نے انسانی روپ دھار لیا۔ شنکر کا سر اٹھا کر اس نے اسے چومنا شروع کر دیا اور ساتھ ہی ساتھ دھواں دھار رونا بھی شروع کر دیا۔

"میں اس وقت تک واپس اپنی دنیا میں نہیں جاؤں گی جب تک ظلم کی دہکتی اس آگ کو ٹھنڈا نہ کر لوں..... تم نے میری ضد کی خاطر اور میری محبت کی خاطر اپنی جان

کاندرانہ پیش کیا ہے..... اس جنم میں نہ سہی اگلے جنم میں ہم ضرور ایک ہو جائیں گے۔" ناگنی نے بار بار ناگ کے سر کو چومتے ہوئے کہا۔

اس کی بے نور آنکھوں میں ناگنی کو ایک ہی پرچھائی دکھائی دے رہی تھی۔ اور وہ تھی شمعان کی پرچھائی۔ لیکن ناگنی کو سمجھ نہیں آرہی تھی کہ اس کے ناگ کے شریر کو کس نے کھایا ہے۔ وہ جو کوئی بھی ہے ایک بار اس کے سامنے آجائے تو وہ اسے زندہ نگل جائے گی۔

ناگنی نے آسمان کی طرف منہ کر کے زور زور سے رونا شروع کر دیا تھا۔ وہ بار بار شنکر کو بلا رہی تھی لیکن شنکر کو نہ آنا تھا نہ وہ آسکتا تھا۔

☆.....☆.....☆

جوگی بابا نے ناگن کو دیکھ لیا تھا۔ اس نے یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ ناگن نے کس طرح شمعان کے وجود میں اپنا زہر انڈیلا تھا اور اس کا وجود کس طرح پانی بن کر بہہ گیا تھا۔

جوگی بابا کو ناگن پر شدید غصہ آرہا تھا۔ اس نے اس کی برسوں کی محنت پر پانی پھیر دیا تھا۔ جوگی بابا کی آنکھوں کے سامنے شمعان کا شریر پانی بن کر بہہ نکلا تھا۔

جوگی بابا چاہتا تو پلک جھپکتے میں ناگنی کو وہیں جلا کر بھسم کر دیتا لیکن اس طرح اس کے دل میں جو ناگنی کے لیے نفرت پیدا ہو چکی تھی وہ ختم نہ ہو پاتی۔

ناگنی جو دنیا و مافیا سے بے نیاز اوپر ہی اوپر چڑھتی چلی آرہی تھی۔ یکبارگی اپنے سامنے ایک سن رسیدہ انسان کو دیکھ کر اس کی حیرت ہویدہ رہ گئی۔

اس سن رسیدہ بوڑھے کی آنکھوں میں نہ جانے کیا کشش تھی کہ ناگنی اس کی آنکھوں کی تاب نہ لاتے ہوئے آنکھیں جھکا گئی۔

"چنتامت کرو بے شک میں تمہاری اصلیت سے آشنا ہو چکا ہوں لیکن میں تمہارے لیے خطرے کا باعث نہیں ہوں۔ اگر تم سمجھو تو میں تمہاری ہر طرح سے مدد کر سکتا ہوں۔" جوگی بابا نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔

"کیسی مدد جب سب کچھ ختم ہو کر رہ گیا ہے۔" ناگنی نے ناامیدی سے کہا۔

اس کے چہرے کی سرخی ماند پڑنے لگی تھی۔ جوگی بابا کی سفاک نگاہیں اس کے شریر کے انگ انگ پر مرکوز تھیں۔ وہ جانتا تھا کہ اگر ایک بار یہ ناگن اس کے چنگل سے بھاگنے میں کامیاب ہو گئی تو دوبارہ کبھی اس کے چنگل میں نہیں آپائے گی۔

"ابھی کچھ بھی نہیں گیا اگر تم چاہو تو سب کچھ واپس لا سکتی ہو۔ تمہارا ناگ واپس آسکتا ہے۔ زندہ ہو سکتا ہے بس تمہیں تھوڑی سی محنت کرنا ہوگی۔ دیکھنا یہ میرا وعدہ ہے کہ اگر تم تھوڑی سی محنت کرو گی تو ابھی کچھ بھی نہیں گیا۔" جوگی بابا نے تیر خلا میں چھوڑتے ہوئے کہا۔

تیر سیدھا نشانے پر لگا تھا۔ ناگنی اس کی بات سن کر حیرت کے سمندر میں غوطہ زن ہو گئی تھی۔ اسے یقین نہیں ہو رہا تھا کہ ایسا ممکن ہو سکتا ہے۔

"یہ کیسے ممکن ہے کہ مرنے والا دوبارہ زندہ ہو سکے؟" ناگنی نے محو حیرت سے جوگی بابا کو گھورتے ہوئے پوچھا۔

"اس دنیا میں کیا ممکن نہیں ہے۔" جوگی بابا نے سرزنش کرتے ہوئے کہا۔

"کچھ بھی ممکن نہیں ہے۔ بس انسان اگر چاہے تو اس کے لیے کچھ بھی ممکن نہیں ہے۔ یاد رکھنا ہمت اور حوصلے سے ہمیشہ انسان منزل پالیتا ہے۔"

جوگی بابا نے اس کی ڈھارس بندھائی۔ ناگنی کو جوگی بابا کی باتوں میں دم دکھائی دیا تھا۔ نجانے کیوں اسے یقین ہو چکا تھا کہ یہ بوڑھا جھوٹ نہیں بول رہا۔

ناگنی جوگی بابا کی باتیں سن کر خیالوں میں اپنے شنکر کو زندہ اپنے سامنے دیکھ رہی تھی۔ اس کا دل ایک بار پھر شنکر کی یاد میں خون کے آنسو رونے لگا تھا۔ اس نے ہاتھ میں پکڑا ہوا شنکر کا کٹا ہوا سر ہونٹوں سے لگا لیا تھا۔

☆.....☆.....☆

زریاب جب سے واپس آیا تھا غنی بھائی اور وریام کو اس میں بہت سی تبدیلیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ انہوں نے بارہا چاہا کہ زریاب سے اس بارے میں بات کریں لیکن نجانے کیوں وہ اس بارے میں اس سے بات نہ کر پا رہے تھے۔

زریاب کی نگاہیں اب زیادہ تر زمین پر مرکوز رہتی تھیں۔ جبکہ پہلے وہ ہر وقت ہنستا کھیلتا اور ہر وقت ہی نئے نئے پلان بناتا رہتا تھا۔

دوسری طرف زریاب کی آنکھوں کے سامنے سے جیسے ہر پردہ اٹھ گیا تھا۔ زمین کی تہوں میں پنہاں خزانے اس کی آنکھوں سے پنہاں نہ تھے۔

ایک صبح تینوں باہر صحن میں براجمان چائے پی رہے تھے کہ یکبارگی زریاب گویا ہوا:

"غنی بھائی آپ جس جگہ پر براجمان ہیں۔ اس جگہ زمین کے اندر کوئی پندرہ سولہ فٹ کی گہرائی میں ایک خزانہ دفن ہے۔"

زریاب کی بات سن کر جہاں غنی بھائی حیرت کے سمندر میں غوطہ زن ہو گیا تھا وہیں وریام بھی حیرت کا مجسمہ بنا زریاب کو تکنے لگا تھا۔

"تم جاگتے میں خواب کب سے دیکھنے لگے ہو؟" وریام نے اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔

"میں غلط نہیں کہہ رہا۔ بے شک اس جگہ کی کھدوائی کروا کے دیکھ لو۔" زریاب نے اپنی بات پر ڈٹے رہتے ہوئے کہا۔

"تمہیں کیسے معلوم کہ میں جس جگہ بیٹھا ہوں اس جگہ خزانہ دفن ہے؟" غنی بھائی نے سوالیہ آنکھوں سے زریاب کو گھورتے ہوئے پوچھا۔

"یہ میں بھی نہیں جانتا غنی بھائی لیکن ایک واقعے کے بعد یہ سب کچھ میرے ساتھ پیش آرہا ہے۔" زریاب نے مضطرب لہجے میں جواب دیا۔

پھر اس نے لفظ بلفظ ساری روداد رانا اقبال کو قتل کرنے سے لے کر واپس آنے تک سنائی۔ اس کی ہر بات دونوں کو حیران و ششدر کرنے کے لیے کافی تھی۔ دونوں کو اس کی بات پر ابھی تک یقین نہیں ہو رہا تھا۔ اس کے ساتھ اتنے حادثات پیش آئے تھے لیکن اس نے کسی کو بھی نہ بتایا تھا۔

جب زریاب نے اپنی بات مکمل کر لی تو غنی بھائی نے وریام کو مخاطب کیا۔

"ایسا کرو اس جگہ کی کھدوائی کروا دو اور زریاب سے پوچھتے رہنا جب یہ کہے کھدوائی روکو اکسر کو بھیج دینا اور اس کے بعد کی کھدوائی تم خود کرنا معلوم کرو کہ کیا زریاب کی بات میں حقیقت ہے یا نہیں۔"

زریاب غنی بھائی کی بات سن کر بیچ و تاب کھا کر رہ گیا تھا۔ لیکن اس نے اندرونی کیفیت کو ان پر عیاں نہ ہونے دیا تھا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اس وقت تک اس کی کسی بات پر کوئی یقین نہیں کرے گا جب تک کوئی عملی نمونہ سامنے نہ آجائے۔

☆.....☆.....☆

ظفر اقبال کو اپنی چچازاد کزن کائنات سے یک لخت ہی محبت ہو گئی تھی۔ حالانکہ کائنات عمر میں اس سے کم و بیش چار سے پانچ سال بڑی تھی۔

ظفر ایف ایس سی سیکنڈ ایئر میں تھا جبکہ کائنات ایم ایس سی فزکس فرسٹ ایئر میں تھی۔ ظفر کو کچھ سمجھ نہیں آرہی تھی کہ اسے یک لخت اپنی کزن سے محبت کیسے ہو گئی تھی۔ حالانکہ اس کے دل میں اس کے لیے ایسے کوئی جذبات نہ تھے۔

وہ اپنے والدین کو بتانے میں بھی جھجک محسوس کر رہا تھا جبکہ دوسری طرف وہ اپنی کزن سے بے پناہ محبت کرنے لگا تھا۔ اسے کچھ سمجھ نہ آرہی تھی کہ وہ کرے تو کیا کرے۔

اس شام حفیظ سلطان اور اقصیٰ دونوں کسی پارٹی میں گئے ہوئے تھے اور سرِشام ہی لوٹ آئے تھے۔ دونوں کو خوش گوار موڈ میں دیکھ کر ظفر نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ ان سے کائنات کے بارے میں بات کرے گا۔

اس وقت سب گھر والے ٹی لاؤنج میں اکٹھے تھے۔ اور وہ سب کے سامنے یہ بات کرنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ اپنے کمرے میں ٹہل رہا تھا جب کسی کام سے اس کی والدہ اوپر اس کے کمرے میں آئیں۔

"ارے تم یہ اوپر کیا کر رہے ہو؟" اقصیٰ نے اسے

رہے ہو خیریت تو ہے ناں؟"

ماں کی بات سن کر پہلے تو ظفر جھینپ سا گیا لیکن پھر اس نے سوچا کہ یہی بہتر طریقہ ہے بات کرنے کا۔ اگر اس کی ماں راضی ہوگئی تو وہ اس کے والد کو خود ہی منالیں گی۔

اس کی ماں کی سوالیہ آنکھیں ابھی تک اس پر مرکوز تھیں۔

"امی..... وہ..... وہ میں آپ سے..... کچھ کہنا چاہتا تھا۔" ظفر نے بمشکل تمام اپنا فقرہ مکمل کیا۔

"ایسی بھی کیا بات ہے جو تم اس طرح سے ہچکچا رہے ہو؟" اقصیٰ نے پوچھا۔

"امی یہاں بیٹھیں ناں پلیز۔" ظفر نے بیڈ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

جواباً اقصیٰ حیرت کے سمندر میں غوطہ زن چپ چاپ بیڈ پر بیٹھ گئیں۔ وہ اپنے بیٹے کے اس انداز پر حیران و ششدر تھیں۔ کیونکہ اس سے پہلے انہوں نے کبھی ظفر کو ایسے انداز میں نہ دیکھا تھا۔

ظفر شروع سے ہی تھوڑا موڈی اور چڑچڑے پن کا ظاہر ہوا تھا۔ لیکن آج جو اس کا روپ اس کی ماں کے سامنے تھا وہ حقیقت میں اس کی حیرت ہویدا کیے ہوئے تھا۔

"امی وہ..... کائنات ہے ناں۔"

اس کا فقرہ مکمل ہونے سے پہلے ہی اس کی والدہ نے اسے ٹوکا۔

"کیا ہوا اسے؟" اقصیٰ کے لہجے میں اضطرابیت عیاں تھی۔

"اسے کچھ نہیں ہوا امی۔" ظفر نے بتایا۔

"تو پھر؟" اقصیٰ نے سوالیہ آنکھوں سے ظفر اقبال کو گھورا۔

"امی میں اس سے بہت..... پیار کرتا ہوں۔" ظفر نے لفظ چباتے ہوئے ادا کیے۔

اپنی بات مکمل کرنے کے بعد ظفر جو ماں کے قدموں میں برا جمان تھا۔ اس نے نگاہیں جھکالیں۔

"یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ تم سے بڑی ہے؟" اقصیٰ نے سوال داغا۔

"جی ہاں۔" ظفر نے اس کی تصدیق کرتے ہوئے کہا۔

اس کی بات سن کر اقصیٰ نے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیریں۔ ظفر نے نگاہیں اٹھا کر ماں کی طرف سوالیہ انداز میں دیکھا۔ تو اس کی ماں نے سر ہلا کر اس کی بات سے اتفاق کیا۔ ان کے لبوں پر مسکراہٹ عیاں ہوگئی۔

"امی آپ بہت اچھی ہیں۔" اس نے ماں کی خوشامد کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں لیکن تمہارے پاپا اتنے اچھے نہیں ہیں۔ میرے ہاں ناں کرنے سے کیا ہوگا اصل فیصلہ تو وہ کریں گے۔" اس کی ماں نے متواتر اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے جواب دیا۔

"امی اگر آپ چاہیں تو پاپا مان جائیں گے۔" ظفر نے مایوسانہ لہجے میں کہا۔

جب اقصیٰ نے دیکھا کہ بیٹے کے چہرے پر سے ساری رونق مفقود پڑنے لگی ہے تو ان سے رہا نہ گیا۔

"تم فکر مت کرو۔ بھلا وہ کیوں نہ مانیں گے۔" اقصیٰ نے اس کی ڈھارس بندھاتے ہوئے کہا تو جواباً ظفر نے سرماں کے گھٹنوں پر رکھ دیا جبکہ اقصیٰ متواتر اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتی رہیں۔

☆.....☆.....☆

زریاب اس وقت وریام کے ساتھ بمعہ وصول کرنے آیا تھا۔ ان کے ساتھ آئے چیلے چاروں طرف پھیل گئے تھے۔ جبکہ زریاب اور وریام دونوں گاڑی میں موجود تھے۔

زریاب گاڑی سے نکلا اور ڈرائیونگ سیٹ سے پچھلے دروازے کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑا ہوگیا۔ اس نے جیب سے سگریٹ کی ڈبی نکالی اور ایک سگریٹ نکال کر ہونٹوں میں دبالی۔

پھر جینز کی دوسری جیب سے لائٹر نکالا اور سگریٹ سلگا کر اس کا دھواں ہوا میں چھوڑا۔ لائٹر جیب میں ڈال کر سگریٹ اس نے دائیں ہاتھ کی انگلیوں میں دبائی۔ تبھی اس کی نگاہ صائمہ اور زریں پر پڑی۔

زریں اور صائمہ کی نگاہیں بھی اسی کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ وریام نے انہیں نہیں دیکھا تھا کیونکہ وہ زریاب کی طرف پشت کیے ہوئے تھا اور اپنے چیلوں کو بھتہ وصول کرتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ مارکیٹ کی ہر دکان پر غنی بھائی کے نام کا بورڈ چسپاں تھا۔

زریاب نے ایک سرسری نگاہ ان دونوں پر ڈالی اور نگاہیں پھیر لیں۔ پھر سگریٹ کا کش لگاتے ہوئے اس نے کن انکھیوں سے زریں کو دیکھا تھا۔ نجانے اس میں ایسی کون سی کشش تھی کہ اس کی نگاہیں نہ چاہتے ہوئے بھی اس سے ہٹ نہ پاتی تھیں۔

دوسری طرف زریں اور صائمہ کو خدشہ تھا کہ زریاب کوئی نیا مسئلہ نہ پیدا کردے لیکن اگلا منظر دیکھ کر ان کی حیرت ہویدا رہ گئی تھی۔ زریاب نے انہیں دیکھ کر آنکھیں پھیر لی تھیں۔ یہ سب کچھ ان کی سوچ سے بالاتر تھا۔ انہیں یقین نہیں ہو رہا تھا کہ ایک غنڈہ اپنی بے عزتی کا بدلہ لینے کی بجائے انہیں معاف کردے گا۔

انہوں نے کسی سے گزشتہ واقعہ کا تذکرہ نہ کیا تھا۔ لیکن ان کے قلب و ذہن میں یہ بات ثبت ہو چکی تھی کہ زریاب ایک مایہ ناز غنڈہ ہے اور وہ اپنی بے عزتی کا بدلہ ضرور لے گا۔

زریں کو زریاب کا یہ روکھا پن اچھا نہیں لگا تھا۔ نجانے کیوں اس کا من چاہ رہا تھا کہ آج زریاب پھر اس کا راستہ روکے اور پھر وہ سب کے سامنے اس سے معافی مانگے لیکن اس نے ایسا نہیں کیا تھا۔ اسے اپنا آپ بہت چھوٹا لگنے لگا تھا۔

اسے یوں لگ رہا تھا جیسے زریاب نے اس کی بے عزتی کردی ہو۔ یونیورسٹی کے اندر داخل ہونے تک وہ چپ رہی۔

"مجھے بالکل یقین ہی نہیں ہو رہا کہ یہ ایسے شریف بن جائے گا۔" صائمہ نے یونیورسٹی کا گیٹ عبور کرنے کے بعد کہا۔

"میں نے کہا تھا ناں کہ ایسے غنڈوں کا یہ ہی حل ہوتا ہے۔ اگر ان کو روکا نہ جائے تو کل کو کوئی نیا مسئلہ پیدا کردیتے ہیں۔ اور قبل اس کے کہ بات زیادہ طول پکڑے سانپ کا سر ہی کچل دیا جائے تو بہتر ہوتا ہے۔" زریں نے صائمہ کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

"ایک بات کہوں۔" صائمہ بولی لیکن اس نے زریں کی طرف دیکھا نہیں تھا بلکہ اس کی نگاہیں سامنے مرکوز تھیں جہاں سارے طلباء و طالبات گپ شپ میں مصروف تھے۔

"ہاں۔" زریں نے مختصر جواب دیا۔

"یہ غنڈہ لگتا نہیں ہے۔" اب کی بار صائمہ نے رک کر بات کی تو زریں کو بھی رکنا پڑا۔

"بے شک اس کا انداز، اس کا طریقہ ٹھیک نہیں تھا۔ لیکن اس میں اس کی کوئی غلطی نہیں ہے۔ وہ حقیقت میں تم سے بہت پیار کرتا ہے۔ اگر اسے تم سے محبت نہ ہوتی تو تمہاری اس حرکت پر تمہیں ٹکڑے ٹکڑے کردیتا۔ جانتی ہو وہ کتنا بڑا غنڈہ ہے اس کے نام سے تو پولیس والے بھی خوف کھاتے ہیں۔ پھر میں اور تم کس باغ کی مولی ہیں۔"

صائمہ اپنی بات مکمل کر کے چلتی بنی جبکہ زریں اپنی جگہ پر کھڑے اسے جاتا دیکھتی رہ گئی۔ نجانے کیوں اسے صائمہ کی باتوں میں حقیقت پنہاں دکھائی دی۔ اس کا من چاہا کہ ابھی جا کر زریاب کے قدموں میں گر کر گڑگڑا کر معافی مانگ لے۔

☆.....☆.....☆

جس جگہ کے بارے میں زریاب نے بتایا تھا۔ اس کی کھدوائی کی گئی تو واقعی وہاں سے پرانے زمانے کے سونے کے سکے اور کچھ ہیرے جواہرات ملے جو بہت ہی نایاب تھے۔ انہیں دیکھ کر غنی بھائی کی آنکھوں کی پتلیاں جیسے جامد ہو کر رہ گئی تھیں۔

غنی بھائی کے اشارے پر وریام نے فوراً اس سارے خزانے کو غنی بھائی کے روم میں پہنچا دیا تھا۔ غنی

بھائی اورزریاب بھی وہیں آگئے۔ پہلے چیلوں کوگھر سے باہرنکال دیا گیا تھا۔بعدمیں انہیں بلواکراس گڑھے کوبندکرنے کاحکم دے کروریام دوبارہ غنی بھائی کے کمرے میں آگیا تھا۔

وہ اپنے کسی چیلےکوبھی کسی رازمیں ہم رازدار بنانے کے متمنی نہ تھے۔اس وقت تینوں غنی بھائی کے روم میں براجمان تھے اوران کے سامنے پرانے زمانے کے سکوں کاانبارلگاہوا تھا۔یہی نہیں اس خزانے کے اندر سے کچھ قیمتی زیورات بھی ملے تھے جن پرہیرے جڑے گئے تھے۔

ایسے نایاب زیورات کاآج کے دورمیں ملنانا ممکنات میں سے تھا۔غنی بھائی اوروریام حیرت کے سمندرمیں غوطہ زن اس خزانے کودیکھے جارہے تھے۔جوتانبے کی بنی ایک بڑی سی دس پندرہ کلوکی دیگ میں بندکیے ہوئے تھے۔اس دیگ کامنہ بھی تانبے کی چادررکھ کرلوہے کی تاروں سے بندکیاگیا تھا۔

یہ خزانہ کسی پرانے زمانے کی نشاندہی کررہا تھا۔جوابھی تک اپنی اصلی حالت میں تھا۔ایک ایک چیزبالکل ٹھیک اوردرست حالت میں تھی۔رتی برابربھی کسی چیزمیں نقصان دکھائی نہ پڑرہاتھا۔

"یادرکھنازریاب کسی اورکے سامنے اپنی اس نئی تبدیلی کاذکرمت کرناورنہ تمہاراجینادوبھرکر دیاجائے گا۔"غنی بھائی نے ناصحانہ لہجے میں کہا۔

اس بات میں کوئی شک نہ تھاکہ زریاب اوروریام کوغنی بھائی نے بیٹوں کی طرح پالاتھا۔یہ الگ بات تھی کہ ان کی پرورش اس نے ایسے ماحول میں کی تھی جس کی ہرپگڈنڈی موت کی طرف جاتی تھی۔لیکن اس میں اس کااپنابھی توکوئی قصورنہ تھا۔ اس کے ساتھ جوکچھ ہوچکاتھا۔اس کے بعداس کے اندررحم اوراحساس نام کی ہرچیزختم ہوکررہ گئی تھی۔

اگرکوئی چیزباقی بچ گئی تھی تووہ تھی صرف اورصرف درندگی۔اس درندگی اورسفاکی کووہ کبھی بھی چھوڑنانہیں چاہتاتھا۔اس نے شرافت کالبادہ جب سے اتاراتھااس کے بعدکبھی کوئی ایساکام نہ کیاتھا۔جس کی وجہ سے اسے اچھےلفظوں میں یادکیاجاسکتا۔

"یہ جوکچھ بھی ہے سب کچھ تم دونوں کاہے۔میری زندگی کی ڈورتم لوگوں سے بندھی ہوئی ہے۔مجھے ان چیزوں سے کوئی محبت نہیں ہے۔یہی وجہ ہے کہ میں نے اپنے خاص لاکراورتجوری تک کی چابیاں تم دونوں کے سپردکی ہوئی ہیں تاکہ جب اورجس وقت جوکچھ بھی تم لوگوں کودرکارہو۔تم لوگ لے سکو۔یہ سب کچھ تم لوگ ہی لاتے ہو۔اوران سب کے مالک بھی تم ہی ہو۔بس ایک بات یادرکھناتم لوگوں کواب میں کھونانہیں چاہتا۔مزیدکچھ کھونے کی میرے اندرسکت نہیں ہے۔"

بات کرتے کرتے غنی بھائی کالہجہ گلوگیرہوگیا تھا۔وریام اورزریاب دونوں اٹھ کرغنی بھائی کے قدموں سے چمٹ گئے تھے۔

"آپ ہمارے محسن ہیں غنی بھائی۔آپ نے ہمیں اس وقت سہارہ دیاجب ہم سے ہرسہارہ چھین لیاگیاتھا۔آپ نے ہمیں ہروہ پیاردیاجس کے ہم طلبگاررتھے۔"وریام نے نم آلود لہجے میں کہا۔

"غنی بھائی اگرمجھے آپ پراعتمادنہ ہوتااورآپ کواپناسب کچھ نہ گرداناتوکبھی بھی یہ بھیدآپ لوگوں پرعیاں نہ ہونے دیتا۔"زریاب نے اب کی بارلقمہ دیا۔

"میں تم دونوں کواپنی اولادسے بڑھ کرچاہتا ہوں۔جومحبت میں اپنی اولادکونہ دے سکااس سے تمہیں محروم نہیں رکھناچاہتا۔تم دونوں میرے لیے دو بازوؤں کی مانندہو۔تم میں سے کسی ایک کوبھی آنچ آئے تومجھے اپناایک بازوبے کاردکھائی پڑنے لگ جاتاہے۔"غنی بھائی نے دونوں کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔

"آپ کے یہ دونوں بازوکبھی بھی ناتواں نہیں ہوں گے۔"زریاب نے غنی بھائی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"میری ایک ہی خواہش ہے کہ میری میت کو کندھاتم دونوں ضروردو۔"غنی بھائی نے دائیں ہاتھ کے کف سے آنکھیں صاف کرتے ہوئے کہا۔

غنی بھائی کی بات سن کروریام نے غنی بھائی کے

چندرادیوی

ایم۔الیاس

"میں چاہوں توان سب کوایک لمحے میں بھسم کردوں۔" چندرادیوی نے کہا۔"لیکن میں انہیں سزائے موت دینانہیں چاہتی...... اس لئے کہ یہ چندلمحوں میں موت کے منہ میں چلی جائیں گی۔میں انہیں ایسی سزادوں گی کہ یہ ساری زندگی اورآخری سانس تک دکھ،اذیت اورتکلیف اٹھاتی رہیں...... سرسوتی ماسی کواندھی،لولی اورلنگڑی...... اس کے بیٹے رام چندرکواپاہج،ان جادوگرنیوں کادل ودماغ ایسامعطل کردوں گی کہ یہ اپناساراجادوبھول جائیں گی اورانہیں سداکابیمار،کمزوراورلاغرکردوں گی۔ چندرادیوی واقعی ایک بہت بڑی جادوگرنی اوربلاکی حسین تھی،لوگ اسے دیکھتے ہی اس کے گرویدہ ہوجاتے تھے۔رگ وپے میں سرایت کرتادل ودماغ کو مبہوت کرتاایک منفرداورانوکھاناول۔

قیمت-/500روپے

دُعابک کارنر منشی محلہ گلی نمبر5 امین پوربازار فیصل آباد

PH:041,2640013

لبوں پر انگلی رکھ دی۔

"غنی بھائی۔" وریام نے غنی بھائی کو مخاطب کیا اور دوسرے ہی لمحے اس کی آنکھوں سے اشک ابر نیساں کی مانند گرنے لگے۔

"دوبارہ کبھی بھی...... ایسے الفاظ کو...... اپنی زبان پر مت لانا۔"

وریام نے بمشکل تمام اپنا فقرہ مکمل کیا۔ غنی بھائی نے دونوں کو خود سے چمٹالیا تھا۔ تینوں کی آنکھیں ساون بھادوں بن چکی تھیں۔ غنی بھائی اپنی جگہ اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھ رہا تھا کہ اسے وریام اور زریاب جیسے وفادار ساتھی ملے تھے۔ جو اس کی خاطر جان تک دینے کو مستعد رہتے تھے۔

جبکہ زریاب اور وریام اپنی جگہ خوش تھے کہ انہیں غنی بھائی جیسا مشفق انسان ملا تھا جس نے انہیں ماں باپ کے جیسے محبت دی تھی بلکہ شاید اتنی محبت ماں باپ بھی اولاد سے نہ کرتے ہوں جتنی محبت غنی بھائی ان سے کرتا تھا۔

☆......☆......☆

حنا مکمل طور پر صحت یاب ہو چکی تھی۔ ڈاکٹر نے اس کے والدین کو اجازت دے دی تھی کہ وہ اسے گھر لے جاسکتے ہیں۔ یوں پورے ڈیڑھ ماہ کے بعد حنا مکمل طور پر صحت یاب ہو کر اپنے گھر واپس آئی۔

ایک لمبا عرصہ ہسپتال میں گزارنے کی وجہ سے وہ اکتا سی گئی تھی۔ گھر کے ماحول میں آکر اسے کچھ سکون میسر آیا تھا۔ اس نے سکھ کا سانس لیا تھا۔

شہزاد کے بارے میں اس نے اپنے والدین کو خود ہی بتا دیا تھا۔ شہزاد روزانہ دن میں کئی کئی بار اس کا پتہ کرنے آتا تھا۔ پہلے پہل تو اس کے والدین نے اعتراض کیا تھا لیکن جب حنا نے اپنے والدین کو شہزاد مجید اور اپنے متعلق سب کچھ بتایا تو چار و ناچار انہیں سب کچھ برداشت کرنا پڑا تھا۔

ڈاکٹرز کا بھی کہنا تھا کہ حنا کو کسی بھی قسم کا دکھ نہ دیا جائے بلکہ جتنا ہو سکے اسے خوش رکھا جائے اسی طرح حنا جلد ہی اپنے پیروں پر کھڑی ہو پائے گی۔ یوں اس کے والدین کے متفقہ فیصلہ پر شہزاد کو بلوا کر انہوں نے اس سے کہا کہ وہ بھی اس کی دیکھ بھال کرے اور اسے جس قدر ہو سکے سہارہ دے۔ تا کہ وہ جلد اپنے پیروں پر کھڑی ہو سکے۔

عالیہ کبھی خود آتی اور کبھی فون پر حنا سے گھنٹوں باتیں کیا کرتی تھی۔ اس نے حنا سے معافی مانگی تھی۔ حنا نے پچھلی باتوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اسے معاف کر دیا تھا۔ یوں ایک بار پھر دونوں کی دوستی ہو گئی تھی۔

حنا کے والدین اسے گھر کیا لائے شہزاد کے گھر والے فوراً ہی اس کا ہاتھ مانگنے چلے آئے۔ بھلا انہیں کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ وہ اتنے دنوں میں شہزاد کو اچھی طرح سے جان چکے تھے کہ وہ ایک اچھا لڑکا ہے۔

یوں حنا کے والدین نے ہاں کر دی۔ ایک ساتھ دو دو خوشیاں گھر کے آنگن میں اتر آئی تھیں۔ حنا بہت خوش تھی۔ اس نے اپنی خوشیوں میں عالیہ کو بھی شامل کرنے کا ارادہ کیا۔ پھر اسے فون کیا کہ فوراً اس کے گھر آئے۔ عالیہ نے بہت چاہا کہ وہ اسے فون پر بتائے لیکن اس نے کہا کہ وہ اس کے گھر آئے پھر بتائے گی۔

☆......☆......☆

سدرہ بی بی بازار سے سودا سلف لینے آئی تھیں۔ شروع سے وہ خود ہی بازار سے سودا سلف لینے آتی تھیں۔ اس وقت وہ سبزی کی دکان سے سبزی لے کر مڑی ہی تھیں کہ ان کی آنکھوں نے ایک ناقابل یقین منظر دیکھا۔

غنی بھائی اس وقت زریاب اور وریام کے علاوہ اپنے چیلوں کے ساتھ گاڑیوں پر وہاں سے گزرا۔ جس جگہ وہ کھڑی تھیں اس سے چند گز کے فاصلے پر سڑک تھی۔ انہوں نے بغور غنی بھائی کو دیکھا تھا۔

انہیں اپنی قوت بینائی پر یقین نہیں ہو رہا تھا۔ غنی بھائی ایک رعب دار انسان کے روپ میں تھا۔ لیکن جس انسان کو وہ جانتی تھیں وہ تو بہت ہی سادہ اور شریف انسان تھا۔ غنی بھائی کے ساتھ درجنوں شوٹرز تھے جبکہ جس انسان کو وہ جانتی تھیں اس کی تو کسی سے دشمنی بھی نہیں تھی۔

سدرہ بی بی کی نگاہیں اس وقت تک گاڑیوں پر گڑی رہیں جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہ ہو گئیں۔ انہیں یقین نہیں ہو رہا تھا کہ یہ وہی انسان ہے جو کبھی ان کی زندگی کا ایک حصہ تھا۔ جس کی نشانی کو آج بھی انہوں نے ہتھیلی کے آبلے کی طرح رکھا ہوا تھا۔

☆......☆......☆

کمشنر آصف کے بالوں میں سفیدی کی جھلک دکھائی دینے لگ گئی تھی۔ کمشنر آصف کو اپنی بیٹی سے بے انتہا محبت تھی۔ وہ ہمہ وقت اسے یاد کرتا تھا۔ اس کی تلاش میں اس نے دن رات ایک کر دیا تھا۔ حتیٰ کہ جمیل اور اس کے دوست کو بھی گرفتار کر لیا تھا۔

ان سے بھی پوچھ تاچھ کی گئی۔ انہوں نے یہی بتایا کہ وہ ان کے پاس سے سب کچھ لے کر بھاگ گئی تھی۔ لیکن ان کا بائیو ڈیٹا نکلوانے پر کمشنر آصف یہی سمجھنے لگا تھا کہ ان ظالموں نے اس کی بیٹی کو مار دیا تھا۔ دوسری طرف اس کا دل اس بات کو ماننے کے لیے قطعاً تیار نہ تھا۔

گلشن کو اس گھر سے گئے بائیس برس ہو چکے تھے۔ ان بائیس برسوں کے اندر بہت ساری تبدیلیاں رونما ہو چکی تھیں لیکن کمشنر آصف اور ڈاکٹر ثمرین خان کسی طور بھی اپنی بیٹی کو بھلا نہ پائے تھے۔

کمشنر آصف کے پوتے پوتیاں بھی اب تو جوانی کی دہلیز کو چھو چکے تھے۔ اس کے بڑے بیٹے اشتیاق احمد کی بیٹی کائنات ایم ایس سی فزکس کر رہی تھی۔ جبکہ حفیظ سلطان کے دو بیٹے تھے۔ ظفر اقبال ایف ایس سی فرسٹ ایئر جبکہ مظہر اقبال ایم بی بی ایس کر کے ہوم جاب کمپلیٹ کر کے ڈیوٹی کر رہا تھا۔

ارسلان احمد کی بھی صرف ایک ہی بیٹی تھی۔ جس کا نام فضا رکھا گیا تھا۔ کمشنر آصف کے سارے بیٹے اسی ایک چھت کے نیچے اپنے والدین کے ساتھ رہتے تھے۔

کمشنر آصف کے گھرانے میں جہاں خوشیاں پر پھیلائے ہوئی تھیں وہیں ایک ہی دکھ گہرے گھاؤ کی طرح اسے اذیت دیے جا رہا تھا۔

اس وقت بھی کمشنر آصف [illegible] کے بھنور میں مبتلا تھا جب حفیظ اور اقصیٰ دونوں آکر اس کے سامنے بیٹھے۔

"ابو جان۔" اقصیٰ نے کمشنر آصف کو پکارا تو وہ چونک اٹھا۔ اس نے چونک کر ان دونوں کو دیکھا۔

"ہوں۔" کمشنر آصف چونک کر بولا۔

"کیا بات ہے بیٹا کوئی کام ہے کیا؟"

کمشنر نے دونوں کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "ابو جان آپ سے ایک ضروری بات کرنی تھی۔"

اب کی بار حفیظ سلطان نے لقمہ دیا۔

"کیا بات کرنی ہے بیٹا کھل کے کرو۔" کمشنر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور دونوں کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ "کوئی پریشانی کی بات تو نہیں ہے؟"

"نہیں ابو جان" حفیظ بولا۔

"اصل میں بات یہ ہے کہ ظفر بضد ہے کہ اسے اپنی کزن کائنات سے شادی کرنی ہے۔ ہم نے کہا کہ اگر آپ سے مشورہ کر لیں تو......" حفیظ نے بمشکل تمام بات مکمل کی لیکن پھر بھی فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"ایکچوئلی ابو جان وہ کائنات سے بہت پیار کرتا ہے۔" اقصیٰ، حفیظ کو فقرہ ادھورا چھوڑتے دیکھ کر فوراً بولی۔

"ارے واہ یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے۔" کمشنر چہک کر بولا۔ "ارے کہاں ہے ہمارا پوتا ہم اس کے اس فیصلے پر اسے سینے سے لگائیں گے۔"

کمشنر کی بات سن کر دونوں کے چہرے کھل اٹھے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ جب تک گھر کا فیصلہ کمشنر نہیں کریں گے تب تک کوئی فیصلہ ممکن ہی نہیں ہے۔

"وہ کالج گیا ہے۔" اقصیٰ نے جواب دیا۔

"بیٹا تم جاؤ اور اشتیاق اور زرین کو بلا کر لاؤ۔" کمشنر نے تحکمانہ لہجے میں حفیظ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو وہ فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔

"اپنی ماں کو بھی بلاتے آنا۔"

"اچھا ابو جان۔" حفیظ خوشی سے پھولے نہ سماتے ہوئے بولا اور جلدی سے گھر کے اندر داخل ہوگیا۔

ہسپتال کی طرف سے ایک خصوصی میٹنگ کا انعقاد شہر کے مشہور ہوٹل میں کیا گیا تھا۔ جہاں ہسپتال کے عملے سمیت آنے والے مہمانوں کے لیے بھی انتظامات کیے گئے تھے۔

فضا اسی ہسپتال میں بطور ایل ایچ وی جاب کررہی تھی۔ اسے بھی انویٹیشن کارڈ موصول ہوگیا تھا۔ ساتھ میں ڈاکٹر عمر زمان نے کال بھی کردی تھی کہ کل کی میٹنگ میں لازمی شرکت کرنا ہوگی۔

اس میٹنگ کا مقصد شہر میں پھیلتی نئی نئی بیماریوں کی روک تھام تھا۔ اس میٹنگ میں شہر کے دیگر بڑے ہسپتالوں کے ڈاکٹر صاحبان اور لیڈی ڈاکٹرز کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔ علاوہ ازیں شہر کی چند مشہور شخصیات کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔

ملک اظہار اس ہوٹل کا منیجر تھا۔ اس نے تمام تر انتظامات مکمل کرنے کے بعد ڈاکٹر عمر زمان کو بلوا کر چیک کروایا تھا۔ ڈاکٹر عمر زمان سارے انتظامات دیکھ کر بہت خوش ہوا تھا۔

ملک اظہار، زریاب کا سگا بھائی تھا۔ زریاب سب سے چھوٹا تھا۔ ملک زوار احمد جو ہائی اسکول کے مشہور ٹیچر تھے۔ زریاب ان کا بیٹا تھا۔ ملک زوار احمد کی اہلیہ ریحانہ زوار ہاؤس وائف تھی۔

ملک زوار احمد کے تین بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ ملک عیاب (بڑا بیٹا) جو کہ اسی سکول میں کلرک کی جاب کررہا تھا جہاں ملک زوار احمد ٹیچر تھا۔ اس سے چھوٹا ملک اظہار تھا جو کہ ہوٹل منیجر تھا۔ دو بھائی کے بعد ان کی اکلوتی بہن عالیہ تھی۔ جو ہیڈ مسٹریس کی جاب کررہی تھی۔

سب سے چھوٹا زریاب تھا جسے غلط فہمی کی بنیاد پر ملک زوار احمد نے بچپن میں ہی گھر سے نکال دیا تھا۔ یہی نہیں اسے عاق بھی کردیا تھا۔

ملک اظہار نے اپنے عملے کو مستعد کردیا تھا۔ مہمانوں کی آمد و رفت شروع ہوچکی تھی۔ انہیں ویلکم کہنے کے لیے عملہ مستعد تھا۔ جیسے جیسے مہمان آرہے تھے۔ انہیں ویلکم کہنے کے لیے ایک ایک گلاب کا پھول دیا جارہا تھا۔

اس وقت ملک اظہار اپنے عملے کو ضروری ہدایات دے رہا تھا جب اچانک نئی سفوری فضا ارسلان ہوٹل میں داخل ہوئی۔ ملک اظہار کی جیسے ہی اس پر نظر پڑی مبہوت ہوکر رہ گیا۔

فضا ارسلان ایک پری پیکر دکھائی دے رہی تھی۔ ملک اظہار آنکھیں جھپکانا تک بھول گیا تھا۔ فضا ارسلان نے ایک طائرانہ نگاہ ملک اظہار پر ڈالی تھی اور اپنی دھن میں مگن زینہ عبور کرنا چاہتی تھی مگر ملک اظہار ہاتھ میں پھول پکڑے اس کے سامنے آگیا۔

"موسٹ ویلکم" ملک اظہار نے پھول دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر فضا ارسلان کی طرف کیا جسے اس نے فوراً ہی پکڑ لیا۔

"ویری تھینکس۔" فضا ارسلان پھول سونگھتے ہوئے بولی۔

"معذرت چاہتا ہوں لیکن میڈم آپ بہت خوبصورت دکھائی دے رہی ہیں۔" ملک اظہار نے دھیمے لہجے میں کہا۔

اس نے اتنے دھیمے لہجے میں کہا تھا کہ اس سے تھوڑے فاصلے پر کھڑے اس کے عملے کے کسی نوجوان تک اس کی بازگشت نہ گئی تھی لیکن فضا ارسلان کی سماعت سے مترشح ٹکرائی تھی۔ فضا ارسلان اس کی بات سن کر زیرلب مسکرادی تھی۔

"تھینکس۔" فضا ارسلان اس کا شکریہ ادا کرتی ہوئی زینہ چڑھنے لگی جبکہ ملک اظہار وہیں کھڑا اسے دیکھتا رہ گیا۔

آخری سیڑھی چڑھنے سے قبل اس نے ملک اظہار کی طرف مڑ کر دیکھا اور ایک بار پھر مسکرادی۔ ملک اظہار کے من میں لڈو پھوٹ چکے تھے۔ وہ جان چکا تھا کہ یہ پری پیکر حسن کی دیوی بھی شاید اس کی بات کا مطلب سمجھ چکی ہے۔ وہ اپنے عملے پر کچھ بھی ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔

اس نے جلدی سے ہدایات جاری کیں اور ان سب کو ادھر ادھر اپنے اپنے کاموں میں پھیلا دیا۔

میٹنگ شروع ہوچکی تھی۔ ڈاکٹر عمر زمان نے سختی سے ملک اظہار کو ہدایت کی تھی کہ اب کسی کو اوپر نہ آنے دیا جائے۔ ہاں اگر کوئی ضروری کام ہو تو بے شک وہ خود چلا آئے۔

ملک اظہار کا من بہت کررہا تھا کہ ایک بار پھر جاکر فضا ارسلان کو دیکھے۔ نجانے کیوں وہ اس کے دل میں کانٹے کی طرح چبھ سی گئی تھی۔ جس کو دیکھے بنا اس سے رہا نہیں جارہا تھا۔ اس کا من چاہ رہا تھا کہ فوراً جائے اور اس سے اظہار محبت کردے۔

وہ بار بار ادھر ادھر ٹہل رہا تھا۔ کبھی اپنی نشست پر براجمان ہوجاتا۔ کبھی ٹی وی چلا لیتا لیکن کچھ دیکھنے کو من نہیں چاہ رہا تھا۔ پھر اٹھ کر ٹہلنا شروع کردیتا۔

اس وقت ملک اظہار اپنی نشست پر براجمان تھا۔ جب اچانک اسے یوں لگا جیسے کوئی اسے اوپر سے دیکھ رہا ہے۔ اس نے جلدی سے نگاہ اٹھا کر دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔

فضا ارسلان کھڑی اسے تکے جارہی تھی۔ نگاہوں کا ملنا تھا کہ دھڑکنیں بے ترتیب ہونے لگی۔ عین اسی وقت کسی نے فضا ارسلان کو پکارا تو مسکراتی ہوئی جگہ سے ہٹ گئی۔

پھر تو جیسے ملک اظہار کی نگاہیں اسی جگہ ٹک سی گئی تھیں۔ اسے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ کرے تو کیا کرے۔

ڈاکٹر عمر زمان اس کے پاس آئے اور مہمانوں کے لیے کھانے کا پوچھا۔ جواباً اس نے بتایا کہ کھانے کا انتظام نیچے کردیا گیا ہے۔ بس مہمانوں کے آنے کی دیر ہے۔ باقی سب کچھ تیار ہے۔

مہمان یکے بعد دیگرے نیچے اترنے لگے۔ لیکن ملک اظہار کی نگاہیں فضا ارسلان کی متلاشی تھیں۔ بالآخر سب سے آخر میں فضا ارسلان دکھائی دی۔ فضا ارسلان جیسے جیسے زینہ عبور کررہی تھی ملک اظہار کے سینے میں ویسے ویسے دھڑکنیں بے ترتیب ہوتی جارہی تھیں۔

"اتنے غور سے آپ مجھے کیوں تکے جارہے ہیں؟" فضا ارسلان نے ملک اظہار کے پاس کھڑے ہوکر پوچھا۔

"کک..... کچھ نہیں۔" ملک اظہار نے جھینپتے ہوئے جواب دیا۔

"کیا واقعی کچھ نہیں؟" فضا ارسلان نے گہری آنکھوں سے ملک اظہار کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"سوچ لیجیے۔"

اتنا کہہ کر فضا ارسلان چلتی بنی اور ملک اظہار وہیں کھڑا اسے دیکھتا رہا۔

مہمان کھانا کھا رہے تھے۔ ملک اظہار اپنے عملے کو ہدایات بھی دے رہا تھا اور ہر ٹیبل پر چیک بھی کررہا تھا کہ کسی کے پاس کوئی چیز کم تو نہیں ہے۔ اچانک اس کی نگاہ ایک سائیڈ ٹیبل پر پڑی۔ جس کے پاس کرسی پر براجمان فضا ارسلان اسے پیہم تکے جارہی تھی۔

ہر ٹیبل پر آٹھ آدمیوں کا ارینجمنٹ تھا۔ فضا ارسلان کے ساتھ مزید سات لیڈی ڈاکٹرز براجمان تھیں۔ ان میں سے دو ایل ایچ وی تھیں۔ فضا ارسلان نے ایک ٹشو اٹھا کر اس سے منہ صاف کیا پھر اسے نیچے کرکے اس پر اپنا نمبر لکھا۔

یہ سب کچھ اس نے اتنی مہارت سے کیا کہ ساتھ بیٹھی لیڈیز کو بھی بھنک نہ پڑ سکی۔ پھر اس نے ٹشو کو مزید ایک تہہ لگائی اور ایک بار پھر اس سے اپنی پیشانی صاف کی۔ تبھی ملک اظہار کی نگاہ اس کی طرف اٹھی اور اس نے اسے دکھاتے ہوئے ٹشو زمین پر آگے کی طرف اچھال دیا۔

ملک اظہار ہر ٹیبل چیک کرتا ہوا اس جگہ آیا اور سب سے نگاہیں بچاتا ہوا اس ٹشو کو اٹھا کر چلتا بنا اور سیدھا جاکر اپنی نشست پر براجمان ہوگیا۔

ملک اظہار نے جیسے ہی ٹشو کی گئی تہہ کو کھولا اگلا منظر دیکھ کر اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ اس کی خوشی دیدنی تھی۔ وہ اس بات کو فراموش کرچکا تھا کہ اسے عملے کو چیک

کرنا ہے کوئی خرابی نہ پیدا ہو جائے۔اس نے سر کو کرسی کے ساتھ ٹکایا اور خیالوں میں خود کو فضا ارسلان کے ساتھ دیکھنے لگا۔

☆......☆......☆

جوگی بابا نے اسی جگہ اپنا مسکن بنایا تھا۔اس نے پہاڑ کے اندر ایک غار تلاش کیا اور پھر اپنے جادو کے زور پر پتہ لگایا کہ اس غار میں کسی قسم کا کوئی مسئلہ تو نہیں ہے۔جب اسے اچھی طرح سے یقین ہو گیا کہ اس غار میں اس سے پہلے کسی کا آنے کا اتفاق نہیں ہوا تو وہ ناگنی کو لیے اس غار میں داخل ہو گیا۔

غار کافی کشادہ تھا۔بس اس کا دہانہ تھوڑا تنگ تھا۔ناگنی نے ناگن کا روپ دھارا اور آرام سے رینگتی ہوئی جوگی بابا کے پیچھے پیچھے اس غار میں داخل ہو گئی۔

جوگی بابا نے جادو کے زور پر اس غار کو اندر سے صاف کر دیا تھا۔اور نجانے کہاں سے اس غار میں روشنی پھوٹنا شروع ہو گئی تھی۔ناگنی کے دیکھتے ہی دیکھتے غار کے اندر جیسے سورج طلوع ہو گیا تھا۔ناگنی محو حیرت سے یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔

جوگی بابا ایک جگہ آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔جوگی بابا نے اونچی آواز میں کوئی منتر پڑھنا شروع کر دیا۔ناگنی کو یوں لگا جیسے غار کے اندر زلزلہ آ گیا ہو۔ ناگنی اب انسانی روپ میں تھی۔ اس کی نگاہوں کے سامنے غار ادھر ادھر جھول رہا تھا۔

پھر اس کی آنکھوں نے ایک عجیب ہی منظر دیکھا۔جس جگہ جوگی بابا بیٹھا منتر آلاپ رہا تھا آناً فاناً اس کے سامنے ایک دیوقامت بت آن وارد ہوا۔اس بت کی لمبی زبان باہر کو نکلی ہوئی تھی۔اس کی بڑی بڑی سرخ آنکھوں میں بلا کی وحشت تھی۔یہی نہیں اس کے بڑے بڑے دانت جبڑوں کے اندر مترشح دکھائی دے رہے تھے۔

"شیطان دیوتا کے چرنوں میں سجدہ کروائے ناگن۔" جوگی بابا نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

جواباً ناگنی نے آگے بڑھ کر شیطان دیوتا کے چرنوں میں سجدہ کیا۔عین اس وقت جب ناگنی شیطان کے دیوقامت بت کے چرنوں میں سجدہ ریز تھی اس بت کی بے نور پتلیوں میں جامد آنکھوں میں نہ صرف چمک پیدا ہوئی بلکہ ان پتلیوں میں زندگی کی لہر دوڑ گئی۔

"شیطان دیوتا یہ ناگن آج سے آپ کی نئی پوجارن ہے۔شماں کیجیے اس پر۔یہ اپنے ناگ کو کھو چکی ہے۔اسے دوبارہ زندہ کرنے کی متمنی ہے۔" جوگی بابا نے دیوقامت بت کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"ہم اس کا سواگت کرتے ہیں۔" شیطان کے بت کے لب ہلے۔

یوں لگا تھا جیسے دور کسی گہرے کنویں سے آواز آئی ہو۔جوگی بابا کے کہنے پر ناگنی نے سر اٹھایا۔

"میں سوگند کھاتی ہوں ناگ دیوتا کی کہ آج سے شیطان دیوتا ہی میرے دیوتا ہیں۔میں شکتی شالی بننا چاہتی ہوں۔اگر مجھے شیطان دیوتا شکتیوں سے نوازنے کا وعدہ کرتے ہیں تو میں شیطان دیوتا کی پجارن ہونے کا اعلان کرتی ہوں۔" ناگنی نے جوگی بابا کی بات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے دست بستہ ایستادہ ہو کر کہا۔

جوگی بابا نے اس کی بات سن کر محو حیرت سے اسے گھورا۔پھر شیطان دیوتا کی طرف دیکھا۔جس کی پتلیوں کے ڈیلے ناگنی پر مرتکز ہو گئے تھے۔

"ہم وعدہ کرتے ہیں کہ اگر تم ہماری پوجا پاٹ میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کرو گی۔اور انسانوں کی بھینٹ چڑھانے میں کوئی کسر روا نہ رکھو گی تو ہم تمہیں شکتی شالی بنا دیں گے۔" شیطان دیوتا کی ایک بار پھر بازگشت گونجی۔

اتنی بات کرنے کے بعد شیطان کے بت کی آنکھیں بے نور ہو گئیں۔پھر جوگی بابا ناگنی کی طرف متوجہ ہوا۔

"تمہیں کھانے پینے کے لیے کچھ چاہیے؟" جوگی بابا نے پوچھا۔

ناگنی نے جوگی بابا کی طرف بغور دیکھا۔"مجھے بہت زیادہ بھوک لگی ہے۔اگر کھانے کو کچھ مل جائے تو نوازش ہو گی۔"

ناگنی نے جوگی بابا کی بات سن کر منہ ہی منہ میں کوئی منتر پڑھا۔پلک جھپکتے میں لذیذ کھانوں کی مختلف ڈشیں اس کے سامنے حاضر ہو چکی تھیں۔

ناگنی بھوکی شیرنی کی طرح ان کھانوں پر ٹوٹ پڑی۔اور خوب سیر ہو کر اس نے کھانا کھایا۔جب اچھی طرح سے اس نے کھانا کھا لیا تو اس کی آنکھیں نیند کے خمار سے بوجھل ہونے لگیں۔

"تمہیں آرام کرنا چاہیے۔" جوگی بابا نے اسے مخاطب کیا۔

"طلب بھی ہو رہی ہے۔" ناگنی نے جواب دیا۔

"یہیں سو جاؤ میں فی الحال کہیں جا رہا ہوں اور میری اجازت کے بغیر اس غار سے باہر مت نکلنا۔ورنہ اپنے اچھے برے کی ذمہ دار تم خود ہی ہو گی۔"

جوگی بابا نے اسے ناصحانہ انداز میں کہا اور غار سے باہر نکل گیا۔

☆......☆......☆

زریں روزانہ گزرتی اور جب کبھی زریاب مارکیٹ میں دکھائی دیتا تو وہ اسے دیکھ کر رخ بدل لیتا۔زریں کو اپنے کیے پر بہت پچھتاوا تھا۔وہ اس کا مداوا کرنا چاہتی تھی لیکن اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ کس طرح اس کا مداوا کرے۔

بے شک اس نے ٹھیک نہیں کیا تھا لیکن جو طریقہ زریاب نے اپنایا تھا وہ بھی تو درست نہیں تھا۔اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اسے کیا ہوتا جا رہا ہے۔وہ کرے تو کیا کرے۔لیکن اسے اتنا معلوم ہو گیا تھا کہ اس کے دل میں زریاب کے لیے محبت پیدا ہونا شروع ہو گئی ہے۔

اس وقت بھی وہ اپنے کمرے میں موجود زریاب کے بارے میں ہی سوچ رہی تھی کہ صائمہ کمرے میں داخل ہوئی۔زریں کو سوچوں کے بھنور میں غرق دیکھ کر اسے تشویش ہوئی۔

"کیا بات ہے زریں؟" صائمہ نے زریں کو سوچوں کے بھنور میں غرق دیکھ کر پوچھا۔

ایک طائرانہ نگاہ صائمہ پر ڈالی اور دوبارہ چہرہ لٹکائے بیٹھ گئی۔صائمہ اس کے پاس ہی آ کر براجمان ہو گئی۔

"زریں خیریت تو ہے ناں؟"

صائمہ نے دوبارہ اس سے پوچھا۔

"ایک بات کہوں؟" زریں نے اس کی طرف دیکھتے بغیر کہا۔"مجھے اپنے کیے پر بہت پچھتاوا ہو رہا ہے۔جانتی ہو جب اسے دیکھتی ہوں تو بہت عجیب سا لگتا ہے۔"

زریں کی بات صائمہ سمجھ گئی تھی۔اس نے زریں کی گردن میں اپنی بانہیں حمائل کر دیں۔

"سیدھی طرح کیوں نہیں کہتی کہ تمہیں اس سے محبت ہو گئی ہے۔" صائمہ نے اسے بانہوں کے حصار میں جکڑتے ہوئے چھیڑنے والے انداز میں کہا تو جواباً زریں مسکرا دی۔

"میں نے کہا تھا ناں کہ بے شک وہ ایک غنڈہ ہے اور اس کا انداز بہتر نہ تھا لیکن وہ حقیقت میں تم پر فدا ہو گیا تھا۔اگر وہ تم پر فدا نہ ہوتا تو اپنی بے عزتی کا بدلہ ہم سے ضرور لیتا۔"

صائمہ کی بات سن کر جہاں زریں مسکرا دی تھی۔وہیں اس کی بات کے جواب میں اس نے سر ہلا دیا تھا۔گویا وہ اس کی بات کی تصدیق کر رہی تھی۔

"جانتی ہو نہ چاہتے ہوئے بھی خیالات کی رو اس کی طرح بہنا شروع ہو جاتی ہے۔" زریں نے صائمہ کو اپنی کیفیت سے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔

"کیا تم اس سے اپنے پیار کا اظہار کر سکتی ہو؟" صائمہ نے پوچھا۔

صائمہ کی بات سن زریں نے پریشان کن لہجے میں اس کی طرف دیکھا۔اس کے دیکھنے کے انداز سے بے بسی اور بے چارگی عیاں تھی۔اس کی پیشانی پر پریشانی کی سلوٹیں عیاں ہو چکی تھیں۔

"ایسا کسی صورت بھی ممکن نہیں ہے۔" زریں نے نہایت لاچارگی کے عالم میں جواب دیا۔"کاش کہ وہ

خودآ کر مجھے تھام لے۔ہمیشہ ہمیشہ کے لیے وہ میرا ہوجائے۔"

زریں کی بات پر صائمہ نے اس کی طرف دیکھا۔زریں کے لہجے سے اس کی بے بسی جہاں عیاں تھی۔وہیں نا امیدی کی پرچھائیاں بھی اس پر سایہ فگن تھیں۔

"تم فکر مت کرو اگر تمہارا پیار سچا ہوا تو وہ ضرور تمہارا بنے گا۔وہ خود تم سے اظہارِ محبت کرے گا۔" صائمہ نے اس کی ڈھارس بندھاتے ہوئے کہا۔

"ایسا کبھی ممکن نہیں ہوگا۔" زریں نے دوبارہ نا امیدی کے عالم میں جواب دیا۔

"نا امید نہیں ہونا چاہیے۔میں جتنا جانتی ہوں وہ اپنی بے عزتی کو انا کا مسئلہ نہیں بنائے گا۔اگر اس کے دل میں تمہارے لیے رتی برابر بھی پیار ہوا تو وہ خود تم سے اظہارِ محبت کرے گا۔" صائمہ نے زریں کی آنکھوں میں چمکتے گوہرہائے آبدار انگلیوں کے پوروں سے صاف کرتے ہوئے کہا۔

اس کی بات سن کر زریں اس کے گلے لگ گئی۔وہ اپنے آپ پر بمشکل قابو پا رہی تھی۔وہ رو دھو کر اپنی محبت کا ضیاع نہیں کرنا چاہتی تھی۔وہ جانتی تھی کہ جس چیز کے لیے اشک ریزی کی جائے اس کی فوقیت انسان کی زندگی میں ماند پڑنا شروع ہوجاتی ہے۔محبت بے شک غم دیتی ہے۔لیکن وہ ان غموں کو سہنا چاہتی تھی۔

محبت یقیناً بڑی حیران کن چیز ہے۔جو یاقوت وزمرد سے بھی زیادہ بیش قیمت ہے۔یہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو بازار میں لگی ہو اور اسے مال وزر کے عوض خرید لی جائے۔

یہ نہ رواجوں کو مانتی ہے نہ طبقوں میں منقسم معاشرے کا تجربہ کرکے محبوب کا انتخاب کرتی ہے۔یہ تو بس ہوجاتی ہے۔دل طبقوں کی پرواہ کرتا ہے اور نہ ہی کوئی طاقت اس کا راستہ روک سکتی ہے البتہ اسے آزمائشوں سے ضرور نبرد آزما ہونا پڑتا ہے۔زندگی کی بساط اور وقت کے دھارے سب قسمت کی باتیں اور مقدر کی چالیں ہیں۔کبھی بازی پلٹ جاتی ہے۔بیتا وقت لوٹ نہیں سکتا۔

☆......☆......☆

حنا بہت خوش تھی۔اس کے گھر والوں نے بلا چوں چراں اس کا رشتہ شہزاد کے ساتھ طے کردیا تھا۔وہ خود کو قسمت کی دھنی سمجھ رہی تھی۔

آج رات اس کی مہندی کی رات تھی۔کل کو وہ پیا گھر سدھارنے والی تھی۔وہ اس پل کا بے صبری سے انتظار کر رہی تھی جب وہ آنچل اور زیور کے بوجھ سے جھکی گردن کے ساتھ حجلۂ عروسی میں شہزاد کا انتظار کر رہی ہوگی۔

شہزاد آئے گا اور اس کا گھونگھٹ اٹھا کر اس سے پیار بھری باتیں کرے گا۔نجانے وہ اسے منہ دکھائی کا کیا تحفہ دے گا۔ممکن ہے سونے کی ایک انگوٹھی جیسے کہ رسم کے مطابق ہر دولہا دلہن کو دیتا ہے شہزاد بھی اسے دے۔یہ بھی ممکن ہے کوئی اور گفٹ دے۔نجانے خیالوں کی کتنی گرہیں تھیں جو سلجھانے پر بھی الجھتی جا رہی تھیں۔

دوسری طرف حنا کو عالیہ کا انتظار تھا کہ وہ جلدی آئے اور اسے تیار کرے۔اسے رہ رہ کر عالیہ پر تاؤ آرہا تھا کہ اسے تو صبح ہی آجانا چاہیے تھا اور اب سورج سوا نیزے پر آچکا تھا لیکن ابھی تک وہ نہ آئی تھی۔

اس کا دل کر رہا تھا کہ فون کرکے اسے خوب سنائے کہ اگر آنا ہے تو فوراً آئے نہیں تو بے شک نہ آئے۔ابھی وہ انہی سوچوں میں مبتلا تھی کہ عالیہ اس کے گھر میں داخل ہوئی۔عالیہ کو چھوڑنے اس کا بھائی آیا تھا۔جو اس کے کہنے کے باوجود بھی نہ رکا تھا اور شاید کسی کام کا بہانہ بنا کر پھر آنے کا کہہ کر چلتا بنا تھا۔

خیر اسے اس کے بھائی سے کیا لینا دینا تھا۔عالیہ آگئی تھی اسے مطلب بھی تو اسی سے تھا۔بس اسے آموں سے غرض تھی گٹھلیوں سے کیا لینا دینا۔عالیہ کو دیکھتے ہی وہ موڈ بنا کر بیٹھ گئی۔

"ارے ہماری دلہنیا کا موڈ کس لیے بگڑا ہوا ہے۔کہیں دولہے راجا سے کسی بات پر تو تو،میں میں تو نہیں ہوگئی؟" عالیہ نے اس کے پاس سنگل سیٹ پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

حنا سنگھار کے سامنے براجمان پھولے بیٹھی تھی۔اس کی حالت سے لگتا تھا جیسے وہ پلک جھپکتے میں عالیہ کو کچا چبا ڈالے گی لیکن عالیہ کی بات سن کر نہ چاہتے ہوئے بھی وہ ہنس دی۔

"تم اتنا لیٹ کیوں آئی؟" حنا نے شکوہ کناں لہجے میں پوچھا۔

"بس ایسے ہی۔" عالیہ نے جواب دیا۔

"اصل میں ڈریس تیار ہونے کو دیئے تھے۔وہ ابھی ملے ہیں۔پھر ایک پہن کے آگئی ہوں۔دوسرے شام کو امی لے آئیں گی۔"

عالیہ کی بات سن کر حنا نے اس کی طرف برخ موڑا۔عالیہ نے جسم پر ایک بڑی سی چادر لپیٹی ہوئی تھی۔گھر سے باہر نکلتے وقت وہ نقاب کرلیا کرتی تھی۔

"اچھا بھلا دکھاؤ تو کیسا ڈریس تیار کروایا ہے۔" حنا نے ہاتھ میں پکڑا ہوا کلپ سنگھار ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہا۔

اس کی بات سن کر عالیہ کھڑی ہوگئی اور اس نے اپنی چادر اتار کر پاس ہی بیڈ پر رکھ دی۔میرون پھولوں والے زرد سوٹ میں کالی گھنی پلکوں والی عالیہ......باریک نفیس ابرو،جیسے کسی خوش مذاق مصور کی قلم طرازی،نیلی نیلی خوبصورت آنکھیں،لمبی لمبی مجوب پلکیں اور آنکھوں کی نیل گول گہرائیاں......باغ میں کھلے سارے پھولوں سے زیادہ وہ شگفتہ لگ رہی تھی۔موسم کا جوبن اس پر ٹوٹ کر برسا تھا۔

"ارے واہ مجھے تو لگتا ہے میری نہیں تمہاری شادی ہے۔جو تم اس طرح بن سنور کے آئی ہو۔" حنا نے عالیہ کو چھیڑتے ہوئے کہا۔

"آخر میری پیاری سی دوست کی شادی ہے۔" عالیہ نے حنا کے گال پر چٹکی لیتے ہوئے کہا۔

"تم میری صرف دوست ہی نہیں بہن بھی ہو۔کیونکہ میری سگی بہن تو ہے کوئی نہیں۔تمہیں بہنوں سے زیادہ [illegible] ہیں۔"

عالیہ کی بات سن کر حنا نے اس کے گلے میں بانہیں حمائل کردیں۔

"میں بھی تمہیں اپنی سگی بہن سمجھتی ہوں۔" حنا نے اس کے گلے لگے ہوئے کہا۔

دونوں ایک دوسرے سے جدا ہوکر سنگھار کے سامنے براجمان ہوگئیں۔حنا نے بازار سے منگوایا ہوا سامان اس کے سامنے رکھا۔کپڑوں اور جوتیوں وغیرہ کی شاپنگ دونوں نے مل کر کی تھی۔دیگر سامان بھی دونوں اکٹھی جا کر لے آئی تھیں۔بس رسم حنا کے لیے سامان حنا نے اپنے بھائی سے منگوایا تھا۔

عالیہ نے ایک کون مہندی اٹھائی اور اس کا رنگ چیک کرنے لگی۔

"ہوں۔" عالیہ چہک اٹھی۔"اس مہندی کا رنگ خوب چڑھے گا۔دولہے راجہ کو بھی تو پتہ چلے کہ اس کی دلہنیا اس سے کتنا پیار کرتی ہے۔"

عالیہ کی بات سن کر حنا مسکرادی۔"کیا ابھی تک اسے محبت کا یقین دلانا باقی ہے؟" حنا نے کہا۔

"شاید۔" عالیہ نے ہونٹ سکیڑتے ہوئے کہا۔

"کیوں؟" حنا چڑ کر بولی۔

"ارے پگلی مذاق کر رہی ہوں۔" عالیہ نے سامان سنگھار ٹیبل پر جوڑتے ہوئے کہا۔"اچھا اب جلدی سے فریش ہوکر آجاؤ تاکہ میں تمہیں تیار کروں۔ابھی اور بھی بہت سے کام باقی ہیں۔آنٹی کے ساتھ بھی ہاتھ بٹوانا ہے بے چاری صبح سے کام کرتے کرتے تھکن سے چور ہوگئی ہوں گی۔"

عالیہ کی بات سن کر حنا چپ چاپ تولیہ اٹھائے غسل خانے کی طرف چل دی جبکہ عالیہ نے اٹھ کر سیف الماری سے اس کا تہہ کیا ہوا مہندی کا ڈریس نکالا اور اس کی سلوٹیں نکالنے کے لیے استری لینے نیچے چلی گئی۔

☆......☆......☆

سکندر ملک کو غنی بھائی کے ایک اڈے کا پتہ چل گیا تھا۔سکندر ملک کو یہ بھی خبر موصول ہوئی تھی کہ غنی بھائی

کے اس ڈیرے پر آج لاکھوں ڈالرز کا سامان لوڈ ہو کر آنے والا تھا۔

یہ سامان اپنے شہر سے جگسی موہن لال بھیج رہا تھا۔ جگسی موہن لال کے غنی بھائی کے ساتھ بہت قریبی سمبندھ بن چکے تھے۔ اس بات کا بھی سکندر ملک کو بہت غصہ تھا۔ پچھلے دنوں جب جگسی موہن لال آیا تو اس نے غنی بھائی کے ہاں قیام کیا تھا۔

اس سے قبل جب بھی وہ آتا تھا تو اس کا قیام سکندر ملک کے پاس ہوا کرتا تھا۔ یک لخت جگسی موہن لال کے اندر بہت سی تبدیلیاں رونما ہو چکی تھیں۔ اور ان سب کا ذمہ دار وہ غنی بھائی کو گردانے لگا تھا۔ اس کے خیال میں غنی بھائی جگسی موہن لال کو اس کے خلاف بھڑکا رہا تھا۔

اس بار جگسی موہن لال غنی بھائی اور اس کے مابین پیدا ہوئی ہر خلیج کو ختم کرنے آیا تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ غنی بھائی اور اس کے مابین پیدا ہونے والی کشیدگیوں کو باتوں کے ذریعے نمٹا لیا جائے گا لیکن وہ اس گھاؤ کو کیسے فراموش کر سکتا تھا۔ جو غنی بھائی اور اس کے چہیتوں نے اسے دیا تھا۔

اس کے لخت جگر کی اس کی نگاہوں کے سامنے تکہ بوٹی کر دی گئی تھی۔ وہ اس کے بچاؤ کے لیے کچھ بھی نہ کر پایا تھا۔ بھلا وہ کیسے ان سب باتوں کو بالائے طاق رکھ کر صلح کے لیے ہاں کر سکتا تھا۔

پھر اس نے تو ایک ہی شرط رکھی تھی کہ زریاب کو اس کے سپرد کر دیا جائے تو وہ غنی بھائی کے ساتھ ہر کشیدگی کو ختم کرنے کے لیے تیار ہے۔ لیکن اس کی کسی بات کو بھی فوقیت نہ دی گئی تھی۔

اس نے غنی بھائی کے ایک چیلے کو خرید لیا تھا۔ اسی نے مخبری کی تھی کہ غنی بھائی کے اڈے پر جگسی موہن لال کی طرف سے لاکھوں ڈالرز کا سامان لوڈ ہو کر آ رہا تھا۔ اس نے سارے انتظامات کر لیے تھے۔ اسے پورا یقین تھا کہ غنی بھائی، زریاب اور وریام بھی اسی اڈے پر موجود ہوں گے۔

مقررہ وقت سے کچھ دیر قبل وہ اپنے درجنوں چیلوں اور پولیس کی نفری کے ساتھ غنی بھائی کے اس اڈے سے تھوڑے فاصلے پر گاڑیوں میں براجمان لوڈ ہو کر آنے والے سامان کا انتظار کرنے لگے تھے۔

انہیں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا تھا۔ عین اس وقت جب اندھیرے کی چادر نے ہر چیز کو اپنی لپیٹ میں لینا شروع کر دیا۔ تین ٹرک انہیں آتے دکھائی دیئے تھے۔ سکندر کا اشارہ پاتے ساتھ ہی اس کے چیلے سرعت سے ادھر ادھر پھیل گئے تھے۔ غنی بھائی کے اس اڈے پر سکندر کے آدمیوں نے پہلے سے ہی بم فٹ کر دیئے تھے۔

ریموٹ کنٹرول بم جگہ جگہ نصب کر دیئے گئے تھے جبکہ ریموٹ سکندر ملک کے ہاتھ میں تھا۔ جس طرح اس کے بیٹے کو بم سے اڑایا گیا تھا۔ عین اسی طرح وہ بھی اپنے دشمنوں کے جسم کی بوٹیاں اڑتے ہوئے دیکھنا چاہتا تھا۔

لوڈ ٹرک ابھی تھوڑی دور تھے کہ سکندر کے چیلوں نے انہیں گھیر لیا۔ تینوں ٹرکوں کے اندر براجمان غنی بھائی کے چیلوں کو تار کر ان کے منہ میں کپڑے ٹھونس دیئے گئے۔ ان کے ہاتھ ان کی پشتوں پر باندھ دیئے گئے اور انہیں پولیس وینوں کے اندر بیٹھا دیا گیا۔

پولیس کی گاڑیاں غنی بھائی کے ڈیرے سے تھوڑی دور اس طرح کھڑی کی گئی تھیں کہ ڈھلوان کی وجہ سے وہ واضح طور پر دکھائی نہیں دے رہی تھیں۔

دوسری طرف غنی بھائی کو بھی مخبری ہو گئی کہ اس کے کسی چیلے نے اس کے مال کے بارے میں سکندر کو خبر کر دی تھی۔ سکندر نے پولیس نفری کے ساتھ مل کر اس کے اڈے پر دھاوا بول دیا تھا۔ نہ صرف اس کا مال رنگے ہاتھوں پکڑ لیا گیا تھا بلکہ اس کے چیلوں کو اندر قید کر کے پورے اڈے کو بم دھماکوں سے اڑا دیا گیا تھا۔

غنی بھائی کا غصے سے برا حال تھا۔ اسے یقین نہیں ہو رہا تھا کہ اس کے چیلوں میں سے کوئی ایسی نمک حرامی بھی کر سکتا تھا۔

اس وقت غنی بھائی صحن میں براجمان تھا۔ اس کے سامنے ٹیبل پر اس کا موبائل پڑا تھا۔ ساتھ تین بھری ہوئی

میگزینیں بھی پڑی تھیں۔

زریاب اور وریام اس وقت مارکیٹ کسی کام کی وجہ سے گئے تھے۔ انہیں غنی بھائی نے فوراً واپس آنے کا حکم دیا تھا۔ غنی بھائی کا حکم ملتے ہی دونوں کے چہروں پر ہوائیاں اڑنے لگی تھیں۔ انہیں محسوس ہو گیا تھا کہ ضرور دال میں کچھ کالا ہے وگرنہ غنی بھائی نے کبھی اتنے غصے میں انہیں نہ بلایا تھا۔

دونوں نے بنا دیر کیے فوراً واپس کی راہ لی۔ واپس آ کر دونوں سیدھے غنی بھائی کے پاس حاضر ہو گئے۔ غنی بھائی اس وقت آنکھیں موندھے چیئر سے ٹیک لگائے براجمان تھا۔ اس کے سامنے آدھا گلاس پانی کا پڑا تھا۔ جس کا مترشح مطلب یہی تھا کہ آدھا اس نے اپنے اندر کے غصے کو ٹھنڈا کرنے کے لیے حلق میں انڈیل لیا تھا۔

"بھائی۔" زریاب نے غنی بھائی کے سامنے کرسی پر براجمان ہوتے ہوئے اسے مخاطب کیا۔

غنی بھائی نے ادھ کھلی آنکھوں سے دونوں کو دیکھا پھر آنکھیں بند کر لیں۔

"بھائی خیریت تو ہے ناں آپ اتنے مضطرب کیوں دکھائی دے رہے ہیں۔ اور دیکھئے تو کتنا اندھیرا چھا چکا ہے۔ آپ ابھی تک یہاں براجمان ہیں؟" اب کی بار وریام نے غنی بھائی کو مخاطب کیا۔

"فوراً پتہ لگا کر بتاؤ کہ سکندر ملک کو ہمارے مال کی مخبری کس نے کی ہے؟" غنی بھائی نے آنکھیں کھولے بنا دونوں کے سوالوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے کہا۔

"کیا مطلب بھائی؟" زریاب نے حیرت سے پوچھا۔ "آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟"

زریاب کی بات سن کر غنی بھائی نے آنکھیں کھولیں اور سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ اس کی نیلگوں آنکھوں میں غصہ چمک رہا تھا۔ اس کی آنکھیں انگاروں کی مانند دہک رہی تھیں۔

نیلی آنکھوں میں غصہ ایسے چمکتا ہے گویا آسمان کی نیلگوں گہرائیوں کے تلاطم میں کہیں آفتاب شعلہ فگن ہے۔ پھر اس پر بادل گھر آتے ہیں اور کس نادر سے بجلیاں چمکتی ہیں۔ پھر شاید چند بوندیں بھی ٹپک پڑتی ہیں اور پھر سورج اپنا رخ تاباں بے نقاب کرتا ہے۔

"کسی نے سکندر ملک کو جگسی موہن لال کی طرف سے آنے والے مال کی مخبری کر دی تھی۔" غنی بھائی نے بمشکل تمام اپنا فقرہ مکمل کیا اور پھر گلاس میں باقی ماندہ پانی کو حلق میں انڈیلا۔

ایک لمبا سانس لینے کے بعد اس نے دوبارہ اپنی بات کو آگے بڑھانا شروع کیا

"سکندر ملک نے پولیس کی معاونت سے نہ صرف ہمارے مال پر قبضہ کر لیا ہے۔ بلکہ وہاں موجود سارے لوگوں کو اندر قید کر دیا۔ اس کے چیلوں نے وہاں بم نصب کیے اور جاتے جاتے انہوں نے نہ صرف ہمارے اس ڈیرے کو بھس نہس کر کے رکھ دیا ہے بلکہ کتنے ہی بے گناہ اس کے ظلم کی بھینٹ چڑھ گئے ہیں۔

اس نے شاید اپنے بیٹے کی موت کا انتقام لیا ہے۔ لیکن یہ اس کی خام خیالی ہے۔ میرا نام بھی غنی بھائی ہے۔ غنی بھائی یعنی موت کا دوسرا نام۔ میں موت کی طرح پرچھائی بن کر اس کے سر پر سوار ہو جاؤں گا لیکن اس سے قبل مجھے وہ شخص چاہیئے جس نے مخبری کر کے یہ سب کروایا ہے۔"

غنی بھائی نے وضاحت سے ساری بات انہیں بتا دی جسے سن کر وہ دونوں بھی سٹ پٹا ہو گئے تھے۔ انہیں یقین نہیں ہو رہا تھا کہ ان کے درمیان کوئی ایسا انسان بھی ہے جس نے آستین کا سانپ بن کر انہیں ڈسنا چاہا ہے۔

"تم جاؤ اور سب کو یہاں لے کر آؤ۔"

غنی بھائی نے زریاب کی طرف دیکھتے ہوئے تحکمانہ لہجے میں کہا تو زریاب غصے سے پیچ و تاب کھاتا وہاں سے اٹھ کر اندر کی طرف چل پڑا۔

"یاد رکھنا ظالم کو ایسی موت مارو کہ اس کے پچھلے بھی سبق حاصل کر لیں۔ اگر ظالم کو چھوٹ دو گے تو ایک دن وہ معاشرے کے لیے بھی ناسور بن جائے گا۔ چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر مجھے سکندر ملک چاہیے زندہ یا مردہ کسی بھی حالت میں۔"

زریاب کے جانے کے بعد غنی بھائی نے دریام کی طرف دیکھتے ہوئے غصے سے پیچ وتاب کھا کر کہا۔

"غنی بھائی ہم نے آپ کا نمک کھایا ہے اور آپ نے جس محبت اور شفقت سے ہمیں پالا پوسا ہے آپ کے ایک اشارے پر ہماری جان بھی آپ پر قربان ہے۔ آپ چوبیس گھنٹے کی بات کررہے ہیں۔ صبح کا سورج طلوع ہونے سے قبل سکندر ملک آپ کے قدموں میں ہوگا۔ اگر صبح کا سورج طلوع ہونے سے پہلے ہم سکندر ملک کو لانے میں کامیاب نہ ہو سکے تو کبھی بھی آپ کے سامنے نہیں آئیں گے۔" دریام نے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں چٹخاتے ہوئے کہا۔

قبل اس کے کہ دونوں میں سے کوئی ایک سلسلہ کلام کو مزید طول دیتا زریاب غنی بھائی کے سارے کارندوں کو لیے حاضر ہوگیا۔ سکندر ملک نے ایک نگاہ سب پر ڈالی۔ سب کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ انہیں سمجھ نہیں آرہی تھی کہ غنی بھائی نے ایک ساتھ سب کو نجانے کیوں ایسے اکٹھے بلوالیا ہے۔

اس سے قبل تبھی بھی ایسا کوئی واقعہ رونما نہ ہوا تھا۔ علاوہ ازیں جس غصے سے زریاب نے ان سب کو فوراً چلنے کا حکم دیا تھا۔ اسی سے سب نے اندازہ لگالیا تھا کہ دال میں ضرور کچھ کالا ہے۔

"باقی سب پیچھے ہٹ جاؤ لیکن صرف وہی نمک حرام اپنی جگہ پر کھڑا رہے جس نے سکندر ملک کو آنے والے مال کی مخبری کی ہے۔" غنی بھائی نے تحکمانہ لہجے میں پسٹل اٹھا کر اس کی نالی میں پھونک مارتے ہوئے کہا۔

"یاد رکھنا اگر وہ خود میرے سامنے پیش نہ ہوا تو میرا نام بھی غنی بھائی ہے۔ میرے پسٹل کی گولی نے آج تک کسی بے گناہ انسان کو ابدی نیند نہیں سلایا۔ اس خام خیالی کو ذہن سے نکال کر وہ خود ہی سامنے آجائے۔"

غنی بھائی کا اتنا کہنا تھا کہ اس کا ایک کارندہ جلدی سے اس مجمع سے نکلا اور غنی بھائی کے پیروں سے لپٹ گیا۔

"مجھے معاف کردیجیے غنی بھائی۔" اس کارندے نے دھواں دھار روتے ہوئے کہا۔ "مجھ سے بہت بڑی غلطی سرزد ہوگئی ہے۔ میں آپ کو بتانا چاہتا تھا لیکن ڈر گیا تھا کہ اگر آپ کو بتایا تو ممکن ہے آپ مجھے ختم کردیں۔ موت کے خوف کے باعث کچھ بتا نہ پایا۔"

اس کی بات سن کر غنی بھائی نے اسے بالوں سے پکڑا اور کھڑا ہوگیا۔

"تو تو کیا سمجھ رہا ہے کہ اب میں تجھے زندہ چھوڑ دوں گا۔" غنی بھائی نے دانت پیستے ہوئے کہا اور دوسرے ہی لمحے ایک ساتھ چھ گولیاں اس کے سینے میں پیوست کردیں۔

اسے تڑپنے کا موقع بھی میسر نہ آسکا۔ گرتے ہی اس کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کرگئی۔ غنی بھائی نے مرے ہوئے اس کارندے کے منہ پر تھوکا اور پھر باقی ماندہ کارندوں کی طرف متوجہ ہوا۔

"میں نے کبھی بھی تم لوگوں کے ساتھ کوئی فرق نہیں رکھا۔ تم لوگوں کو زریاب اور دریام کی طرح عزیز رکھا لیکن اس کے باوجود اگر تم لوگ میرے ساتھ نمک حرامی کرو گے تو مجھے غصہ تو آئے گا ناں۔" غنی بھائی شیر کی طرح دھاڑ رہا تھا۔ پھر یکدم ہی اس کا لہجہ ٹھنڈا ہوگیا۔

وہ تقریباً اپنی کرسی پر ڈھے سا گیا۔

"مجھے اس بات کا قطعاً ملال نہیں ہے کہ میرا لاکھوں کا مال اس کمینے نے لوٹ لیا ہے۔ مال تو پھر بھی حاصل کیا جاسکتا ہے۔ مگر مجھے افسوس ہے تو ان درجنوں بے گناہ لوگوں کی موت کا جو اس ایک نمک حرام کی نمک حرامی کی وجہ سے موت کی لپیٹ میں آگئے۔"

"جاؤ اور صبح کا سورج طلوع ہونے سے پہلے اس خبیث انسان کو میرے روبرو پیش کرو، ورنہ تم میں سے کوئی بھی میرے سامنے اپنا چہرہ اٹھا کر آنے کی ہمت نہ کرے۔"

غنی بھائی کا حکم ملتے ساتھ ہی جیسے سب نیند سے بیدار ہوئے۔ زریاب کے اشارے پر غنی بھائی کے تین کارندوں نے خون میں لت پت اس کارندے کی لاش کو اٹھالیا جس کو تھوڑی دیر قبل غنی بھائی نے ابدی نیند سلادیا تھا۔

(جاری ہے)

بارہ برس بعد

مریم شاہ بخاری۔ سرگودھا

نوجوان چانک کسی بازی گر کی طرح اچھلا اور بجلی کے تار کو پکڑ کر جھولنے لگا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے تاروں پر چلنے لگا، تاروں میں ہائی ایکسٹینشن بجلی موجود تھی اور پھر وہ ہوگیا جو کہ.....

دماغ پر خوف کا غلبہ کرتی اور دل کو مسوستی رائٹر کے زورِ قلم کی انوکھی شاہکار کہانی

دلاور بہت خوبرو نوجوان تھا نہ صرف خوبرو بلکہ اپنے علاقے میں سب سے زیادہ بہادر اور جنگجو بھی مشہور تھا۔ اس کا باپ لوہے کا کاروبار کرتا تھا وہ چاہتا تھا کہ دلاور کاروبار میں اس کا ہاتھ بٹائے، اپنی ذہانت سے کاروبار کو مزید وسعت دے لیکن اس کے برعکس دلاور کو کاروبار سے کوئی دلچسپی نہیں تھی وہ سیر وسیاحت اور شکار کرنے کا دلدادہ تھا، وہ ساتھ ہی ماہر نشانے باز بھی مانا جاتا تھا، اپنے دوستوں کے ہمراہ وہ اکثر شکار کی غرض سے دور دراز مقامات پر چلا جاتا اور کئی کئی روز واپس نہ آتا، اس کے ماں باپ بہت پریشان رہتے تھے کیونکہ وہ ان کی اکلوتی اولاد تھا انہیں دلاور سے بہت امیدیں وابستہ تھیں جو فی الحال پوری ہوتی نظر نہیں آرہی تھیں۔

نواز خان شام کو گھر لوٹا تو دلاور اپنی ماں کی گود میں سر رکھے لاڈ اٹھواتا نظر آیا، نواز کے ہونٹوں پر پدرانہ مسکراہٹ بکھر گئی، دلاور نے باپ کو دیکھا تو فوراً سیدھا ہوگیا اور سلام کیا۔

"السلام علیکم ابا جی....." وہ مودب سا تھا۔

"وعلیکم السلام..... جیتے رہو۔ کب لوٹے برخوردار؟"

"ہونہہ...... ٹھیک ہے میں ذرا کپڑے بدل لوں پھر تم سے ضروری بات کرنی ہے باہر مت نکل جانا۔" نواز خان نے اپنے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے اسے تنبیہ کی جبکہ دلاور نے سر ہلا کر "جی" کہا۔ کچھ ہی دیر میں دونوں باپ بیٹا آمنے سامنے بیٹھے تھے جبکہ صفیہ بیگم ان کے لئے چائے بنا کر لے آئی تھیں۔

چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے نواز خان نے دلاور کو دیکھا جو آج خلاف معمول خاصا سنجیدہ نظر آرہا تھا۔

"کیسا رہا تمہارا شمالی علاقہ جات کا دورہ۔" انہوں نے اسے مخاطب کیا تھا۔

"اچھا رہا بابا...... مزہ آیا۔" دلاور نے مسکراتے ہوئے کہا اور پھر انہیں تفصیل سے آگاہ کرنے لگا۔

"اچھی بات ہے بیٹا مگر......" وہ رکے۔

"مگر کیا......؟" وہ الجھا۔

"میں چاہتا ہوں کہ اب تم کاروبار کی ذمہ داری بھی اٹھاؤ، میں بوڑھا ہو چکا ہوں اب مزید بوجھ نہیں اٹھا سکتا تم میرے بیٹے ہو...... میرے بازو...... تم میرا سہارا نہ بنو گے تو پھر کون بنے گا۔ اس عمر میں تو لوگ "اللہ اللہ" کرتے ہیں اور ایک میں ہوں جو دن رات بس پیسہ بنانے کے چکر میں ہی الجھا رہتا تھا ہوں، بس کاروبار میں زیادہ سے زیادہ منافع کماؤں یہی فکر رہتی ہے۔ بیٹا اب میں کچھ آخرت کی فکر بھی کرنا چاہتا ہوں، میری خواہش ہے کہ یہ ذمہ داری اب تم اٹھاؤ۔" نواز خان یہ بول کر خاموش ہوئے تو دلاور نے نہایت سنجیدگی سے باپ کو دیکھا۔

"بابا آپ بے فکر ہو جائیں...... انشاء اللہ میں ایک دو روز تک ساری ذمہ داری سنبھال لوں گا۔"

نواز خان نے مسکرا کر بیٹے کو دیکھا انہیں توقع نہیں تھی کہ وہ اتنی آسانی سے مان جائے گا ورنہ وہ تو ہنس کر ٹال جاتا تھا۔

انہوں نے مسکراہٹ چھپا کر دلاور سے کہا۔ "بیٹا دو دن کیوں؟ کل سے کیوں نہیں؟"

"بابا دو دن تو انجوائے کرنے دیں ناں...... اب اتنی جلدی آزادی تو نہ چھینیں مجھ سے۔" دلاور نے شوخی سے کہا۔

تو نواز خان بے اختیار قہقہہ لگا کر ہنس پڑے صفیہ بیگم نے بھی ہنس کر دلاور کے سر پر ہاتھ پھیرا جبکہ وہ ماں باپ کو خوش دیکھ کر مطمئن ہو گیا۔

دو دن بعد دلاور نے حقیقت میں اپنا کہا سچ کر دکھایا لاابالی پن اور شوخی کی جگہ سنجیدگی نے لے لی۔ نواز خان اس تبدیلی پر حیران تھے اور خوش بھی۔ دلاور نے کاروباری معاملات کو اتنی تیزی سے سنبھالا تھا کہ خود نواز خان بھی دنگ رہ گئے تھے کہ اس میں کاروباری شخص کہاں چھپا بیٹھا تھا؟ محض دو ماہ کے اندر دلاور نے پہلے سے کئی گنا منافع کما کر باپ کو خوش کر دیا، نواز خان کی آنکھوں میں خوشی کی چمک تھی۔

☆......☆......☆

نواز خان کے قدموں نے جیسے ہی اپنی آبائی سرزمین کو چھوا۔ ان کے اندر ہلچل سی مچ گئی ان کی نظروں میں اپنا بچپن، لڑکپن اور پھر جوانی کے حسین دور گردش کرنے لگے۔ کئی خوب صورت یادوں نے ان کا آگے بڑھ کر استقبال کیا تھا وہی گلیاں اور وہی راستے تھے مگر وقت تبدیل ہو چکا تھا اس چھوٹے سے گاؤں میں انہوں نے آنکھ کھولی تھی یہ جگہ ان کے ماں باپ کی آخری آرام گاہ تھی، کتنا زور لگایا تھا انہوں نے کہ وہ شہر میں ان کے ساتھ چل کر رہیں مگر مان کر ہی نہ دیئے وہ اپنی زمین چھوڑنے پر راضی نہ ہوئے تھے۔

نواز خان کی آنکھیں بھیگنے لگی تھیں ان کے ساتھ بیٹھی صفیہ بیگم نے شوہر کی کیفیت کو سمجھتے ہوئے دھیرے سے اپنا ہاتھ ان کے کندھے پر رکھ دیا تو نواز خان نے ہولے سے مسکرا کر آنسو پونچھ لئے جبکہ دلاور نہایت دلچسپی سے اردگرد کے مناظر دیکھنے میں محو تھا۔

وہ تینوں نواز خان کے چچازاد بھائی مہروز کی دعوت پر آئے تھے اس کی بیٹی کی شادی تھی، مہروز نے بہت اصرار کر کے انہیں شادی سے تین دن پہلے ہی مدعو کر لیا تھا وہ انکار نہ کر سکے تھے، ان کی شاندار کرولا گاڑی مختلف راستوں

سے ہوتی ہوئی ایک چھوٹی مگر پرشکوہ حویلی کے سامنے رکی، حویلی کے تمام افراد نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔

دلاور اپنے ددھیالی رشتے داروں کی اس قدر چاہت دیکھ کر بہت مسرور نظر آرہا تھا کچھ دیر آرام کرنے کے بعد رات کو سب نے خوب محفل جمائی، ماضی کی خوش گوار یادیں تروتازہ ہو گئی تھیں، نواز خان ماں باپ کے دنیا سے چلے جانے کے تقریباً بارہ برس بعد یہاں آئے تھے، وہ خود کو اپنوں کے درمیان بہت محفوظ اور مضبوط سمجھ رہے تھے، دل ہی دل میں شرمندہ بھی تھے آخر وہ اتنا عرصہ اپنوں سے دور کیوں رہے۔

چھوٹے سے واقعہ نے سب بدل کر رکھ دیا تھا بھلا وہ کیوں خوفزدہ ہو کر یہاں سے چلے گئے تھے، وہ ماضی میں گم ہونے لگے تھے، ماضی کی یادیں انہیں اپنی آغوش میں لے چکی تھیں۔

☆......☆......☆

نواز کا خان عالم شباب کا زمانہ تھا عام نوجوانوں کی طرح کھلنڈرا لاپرواہ سا، ہمہ وقت کچھ نیا کرنے کی جستجو میں رہتا...... اپنے شریر و شوخ دوستوں کے ہمراہ ایسے ایسے کارنامے سرانجام دیتا کہ عقل دنگ رہ جاتی، آج کل اسے نشانہ بازی سیکھنے کا نشہ چڑھا ہوا تھا اپنے والد سے ضد کر کے اس نے بندوق بھی خرید لی تھی، وہ اکثر اوقات نشانے کی مشق کے لئے گاؤں سے باہر کھلے میدان میں چلا جاتا اور کئی کئی گھنٹے نشانہ بازی کی مشق کرتا۔

اس کھلے میدان اور اس میں موجود قدیم بڑے سے برگد کے درخت کے ساتھ عجیب و غریب سی داستانیں جڑی ہوئی تھیں مثلاً کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ یہاں بھوت پریت کا بسیرا ہے جبکہ کچھ کا خیال تھا کہ کسی نیک بزرگ جن کا خاندان یہاں رہائش رکھتے ہیں۔

الغرض جتنے منہ اتنی باتیں، نواز خان کبھی ایسی باتوں پر یقین نہیں رکھتا تھا، آج بھی وہ شام ہوتے ہی میدان کی طرف چلا آیا تھا اس کا ارادہ تھا کہ وہ مغرب سے پہلے گھر روانہ ہو جائے گا، اس نے بندوق لوڈ کی اور درخت کے تنے کا نشانہ باندھا، ابھی اس نے انگلی ٹریگر پر ہی رکھی تھی کہ اس کی نظر برگد کے درخت پر بیٹھے ہوئے دو خوبصورت پرندوں پر پڑی جو اردگرد سے بے خبر ایک دوسرے میں گم تھے۔

نواز خان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی اس نے بندوق کا رخ ان کی طرف کر دیا ایک کے بعد دوسرا دھماکہ ہوا دونوں پرندے تڑپتے ہوئے زمین پر گرے اور ساکت ہو گئے۔

نواز خان کامیابی کے نشے میں سرشار درخت کے نیچے آن کھڑا ہوا اور جھک کر ان پرندوں کو اٹھانا چاہا مگر اگلے ہی لمحے اسے جھٹکا لگا کیونکہ وہ دونوں غائب ہو چکے تھے، وہ بھی اس کی آنکھوں کے سامنے۔

اب زمین پر صرف خون ہی خون تھا۔

اسے کچھ انہونی کا احساس ہوا تو وہ خوف سے کانپ گیا۔ وہ تیزی سے برگد کے درخت سے دور ہوتا چلا گیا۔ اس کی آنکھوں نے جو آخری منظر دیکھا تھا کہ برگد کا درخت جڑ سمیت زمین سے نکل کر چل رہا ہے اس کے پتوں سے خون کے قطرے اور آگ کے شعلے لپک رہے تھے وہ تیورا کر زمین پر گر پڑا۔ نواز خان ہوش سے بیگانہ ہو گیا۔

دو دن بعد اسے ہوش آیا تھا وہ بے یقین نظروں سے اپنے اردگرد دیکھ رہا تھا اسے ہوش میں آتا دیکھ کر اس کے ماں باپ تیزی سے اس کی طرف لپکے۔ "نواز پتر...... تو ٹھیک ہے ناں......" اس کی ماں بے قراری سے بولی۔

"مجھے یہاں کون لے کر آیا تھا اماں میں تو......" نواز خان نے نقاہت زدہ لہجے میں بولتے ہوئے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"تجھے رمضو ماچھی لے کر آیا تھا کھلے میدان سے...... وہ ادھر سے اپنی بکریاں لے کر گزر رہا تھا، اس نے تجھے زمین پر گرتے دیکھا تو فوراً تیری طرف دوڑا تو تو بے ہوش ہو چکا تھا۔" اس کی ماں نے اپنے دوپٹے سے نواز کا چہرہ صاف کرتے ہوئے کہا۔

"نواز کے ابا باتیں بعد میں کر لینا...... پہلے حکیم صاحب اور امام صاحب کو بھی بلا لاؤ۔"

"ارے میں بھی کن سوچوں میں الجھ گیا۔ ابھی

آتا ہوں۔" نواز کے ابا فوراً باہر کو لپکے کچھ ہی دیر میں حکیم صاحب، امام صاحب اور رمضو ماچھی بھی آن پہنچا۔ حکیم صاحب نے نواز کا معائنہ کیا۔ "اب یہ بالکل ٹھیک ہے خطرے والی کوئی بات نہیں۔" حکیم صاحب کی بات پر نواز کی والدہ نے فوراً اللہ کا شکر ادا کیا۔

حکیم صاحب کے جانے کے بعد امام صاحب نواز کی طرف متوجہ ہوئے۔ "ہاں نواز بیٹا...... بولو کھلے میدان میں تم نے ایسا کیا دیکھ لیا تھا۔"

نواز پہلے تو چپ رہا پھر آہستہ آہستہ ان کو پوری تفصیل سے واقعہ سنا دیا۔ جسے سن کر آہستہ آہستہ امام صاحب کے چہرے کا رنگ بدلتا جا رہا تھا۔

"ہونہہ......! تو یہ بات ہے۔" امام صاحب نے کاغذ قلم سنبھالا اس پر چند آڑی ترچھی لکیریں کھینچیں پھر اپنی گردن جھکا کر بیٹھ گئے، وہ منہ ہی منہ میں کچھ پڑھ بھی رہے تھے، پھر انہوں نے اپنی گردن اوپر اٹھائی اور ایک نقش تیار کر کے نواز کو دے دیا۔

"یہ گلے میں پہن لو...... یہ تمہیں ان شیطانی جنات سے محفوظ رکھے گا۔ خوش قسمت ہو کہ ابھی تک انہوں نے کوئی کارروائی نہیں کی شاید کوئی نیکی تمہارے کام آ گئی جو رمضو وہاں پہنچ گیا ورنہ۔"

"امام صاحب کچھ تفصیل سے آگاہ کیجیے۔ آخر میرے وہ دشمن کیوں بن گئے؟" نواز حیرت سے انہیں دیکھ رہا تھا۔

"بیٹا...... تم نے انجانے میں ان کے دو سرداروں کو مار ڈالا ہے جو کہ دو خوبصورت پرندوں کے روپ میں تھے، اس وقت وہ انتہائی طیش اور غصے میں ہیں اپنے سرداروں کی آخری رسومات میں مصروف نظر آ رہے ہیں ورنہ اب تک کچھ نہ کچھ ہو چکا ہوتا، بہرحال اللہ کا کرم ہے کہ تم صحیح سالم ہمارے سامنے ہو۔ اس سے پہلے کہ وہ شیطانی جنات انتقامی کارروائی کریں، میں اس درخت کے گرد حصار کھینچ دیتا ہوں تا کہ وہ اس حصار سے باہر نہ نکل پائیں، وہیں قید رہیں۔" امام صاحب نے کہا تو نواز فکر مندی سے بولا۔

"یہ حصار کب تک قائم رہے گا؟ کیا اس سے نقصان نہ ہوگا۔"

"بیٹا حصار قائم ہی حفاظت کے لئے کیا جاتا ہے اس سے کچھ نقصان نہیں ہوتا...... اور یہ حصار اس وقت تک قائم رہے گا جب تک اسے توڑنے کی کوشش نہ کی جائے۔"

"ٹھیک ہے امام صاحب۔ آپ یہ نیک کام آج ہی کر دیجیے دیر مت کیجیے، میں آپ کو معاوضہ بھی دینے کو تیار ہوں۔" نواز کے ابو بولے۔

امام صاحب ہنس دیئے۔ "میں روپے پیسے کا لالچی نہیں ہوں۔ میں یہ کام لوگوں کی بھلائی کے لئے فی سبیل اللہ ہی کرتا ہوں، آج رات عشاء کے بعد حصار کھینچ دیا جائے گا، بس تم لوگ محتاط رہنا اور کھلے میدان کی طرف دوپہر کے وقت جانے سے گریز کرنا۔"

امام صاحب کی نصیحتوں پر نواز سر ہلانے لگا تھا، امام صاحب چلے گئے تو رمضو بھی کچھ دیر ان کے پاس بیٹھ کر چلا گیا۔

بے شک نواز اوپر سے مطمئن ہو گیا تھا مگر اندر ہی اندر وہ بے چینی کا شکار تھا ساری رات وہ ٹھیک سے سو نہ پایا۔

امام صاحب نے اپنے کہے پر عمل کر دیا تھا لیکن نواز ذہنی طور پر خوف زدہ ہو چکا تھا، اس نے گاؤں چھوڑ کر شہر جانے کا فیصلہ کر لیا اس کے والدین نے اسے سمجھانے کی بہت کوشش کی مگر اس کی ذہنی کیفیت کو بھانپ کر اسے اجازت دے دی۔

مگر ساتھ ہی اس کی شادی اپنے مرحوم بھائی کی بیٹی صفیہ سے کر دی، یوں وہ اپنی بیوی کو لے کر شہر آ گیا اور آج پورے بارہ برس گزر جانے کے بعد وہ پھر اسی گاؤں میں موجود تھا، اس کے دل و دماغ سے یہ واقعہ کب سے مٹ چکا تھا لیکن باتوں باتوں میں کھلے میدان کا ذکر آتے ہی تمام واقعہ پھر سے اس کے دماغ میں تازہ ہو گیا تھا۔ وہ اپنے دل سے تمام خدشات اور واہمات کو نکال چکا تھا، امام صاحب کا دیا ہوا تعویز بھی بارہ برس میں نہ جانے کہاں گم ہو گیا تھا۔

☆......☆......☆

"یار اپنے بڑوں سے سنا ہے کہ یہ برگد کا درخت کئی

سال پرانا ہے شاید سو سے بھی زیادہ۔ انتہائی پراسرار اور خوف ناک بھی۔ خاص طور پر تاریک راتوں میں تو اس سے عجیب سی روشنی نکلتی ہے۔ اس کے پتے عام برگد کے درخت کے پتوں سے کہیں بڑے اور چوڑے ہیں، کہتے ہیں کہ بعض اوقات ان سے سرخ خون اور آگ کے شعلے بھی نکلتے تھے، نواز چچا کے ساتھ پیش آنے والے واقعہ کے بعد اس کے گرد حصار قائم کر دیا گیا تھا۔ سمجھو کہ جنات اس درخت پر قید کر دیئے گئے ہیں۔" زاہد نے اپنے ساتھ آنے والے کزنز کو تفصیل سے آگاہ کیا۔

یہ سب مہندی کی رات سے قبل گاؤں کی سیر کو نکلے تھے کہ پھر وقت ملے یا نہ ملے، اس وقت سب کھلے میدان میں جمع تھے جہاں اس درخت سے جڑی کہانیاں زیر بحث تھیں۔

دلاور خاموشی سے درخت کا جائزہ لے رہا تھا۔ زاہد کی بتائی گئی باتیں اس کے سر کے اوپر سے گزر گئی تھیں۔ وہ بھوت پریت کا بالکل قائل نہیں تھا اس کے خیال میں یہ سب ماورائی کہانیاں تھیں۔ جو ابھی تک لوگوں کے ذہن سے محو نہیں ہو پائی تھیں۔

نواز خان نے دلاور کو اپنے ساتھ پیش آنے والا واقعہ بھی بتایا تھا جسے وہ ماننے سے انکار کر گیا، اس کے خیال میں یہ سب اس کے والد کی آنکھوں کا دھوکہ تھا یا پھر اندرونی خوف جو اسے یہ سب دکھائی دیا تھا۔

بہرحال اس وقت وہ اس قدیم درخت کے پاس کھڑے تھے جو سب کی توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا، شام کے دھندلکے گہرے ہو رہے تھے ایسے میں دیو قامت درخت عجیب ہی وحشت کا سماں پیدا کر رہا تھا، وہ سب واپسی کے لئے پرتولنے لگے تو دلاور نے ان سے کہا۔

"اب آ ہی گئے ہیں تو کیوں ناں اس درخت کے نیچے چلیں اور چل کر محسوس تو کریں اس کی پراسراریت کو۔"

"توبہ کرو میں تو ہرگز نہیں جاؤں گا......" فیصل نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔ "دیکھو تو سہی ایسے لگ رہا ہے جیسے کوئی خون آشام بلا ہو، جو ہمیں دبوچنے کے لئے بے قرار ہے۔"

"ارے میں تو جاؤں گا اور اسے چھو کر محسوس کروں

کا۔ دلاور سے [illegible]

جانا چاہتے تو مت جاؤ۔" اس سے پہلے کہ اسے کوئی روکتا وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا برگد کے درخت کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر درخت کے تنے کو چھوا۔ "ارے یہ کتنا ملائم......" ابھی یہ لفظ اس کے ہونٹوں سے ادا بھی نہ ہوئے تھے کہ ایک دم جیسے بھونچال سا آ گیا۔ درخت ادھر سے ادھر جھکنے لگا شائیں شائیں کی آوازیں پیدا ہونے لگیں جیسے سخت طوفان آیا ہو۔

درخت پر بیٹھے عجیب قسم کے پرندے انتہائی ڈراؤنی آوازیں نکالتے فضا میں گم ہو گئے تھے۔

دلاور سہم کر درخت سے دور ہٹا، اس کے کانوں میں بین کرنے کی آوازیں گونجنے لگیں بہت غم زدہ سی چیخیں آہیں بلند ہو رہی تھیں اس سے پہلے کہ دلاور کے حواس ساتھ چھوڑتے وہ تیزی سے واپسی کے لئے مڑا۔

زاہد، فیصل اور باقی سب ہی حیرت اور خوف سے بت بنے کھڑے تھے، وہ جیسے تیسے ان تک پہنچا، چند قدم کا فاصلہ اس نے گھنٹوں میں طے کیا تھا۔ "جلدی نکلو۔" وہ پھولی سانسوں کے ساتھ بولا۔ اڑی رنگت، تیز سانسیں اور حواس باختہ دلاور انتہائی خوف زدہ تھا۔

سب نے گاؤں کی جانب دوڑ لگائی اور حویلی پہنچ کر دم لیا۔

"شکر ہے کہ کسی کا سامنا نہیں ہوا ورنہ۔" سب کے سوالوں کا کیا جواب دیتے۔

ان کے بڑوں نے انہیں سختی سے وہاں جانے سے منع کیا تھا لیکن اپنے تجسس اور لاشعور کی ضد پر وہ وہاں جا پہنچے تھے سب صحیح سالم گھر پہنچنے پر شکر ادا کرتے آئندہ وہاں جانے سے توبہ کر چکے تھے۔

☆......☆......☆

نواز خان رات کو سوئے تو ایک دم ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے صفیہ بیگم ان کے پہلو میں تھیں، وہ بھی جلدی سے اٹھ بیٹھیں۔ "کیا ہوا؟" شوہر کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

نواز خان پسینے میں تر بتر تھے اور رنگت بھی زرد تھی۔ "پپ پپ پا...... پانی دو۔" وہ اٹکتے ہوئے بولے۔

توصفیہ بیگم نے جلدی سے ٹیبل پر پڑا ہوا جگ اٹھا کر گلاس میں پانی انڈیلا اور شوہر کی طرف بڑھا دیا۔

نواز خان نے ایک ہی سانس میں سارا پانی پی لیا۔ صفیہ پریشانی سے شوہر کو دیکھ رہی تھیں، گلاس ٹیبل پر رکھ کر وہ دوبارہ شوہر کو دیکھنے لگیں۔ ”بولئے ناں...... کیا ہوا؟“

نواز خان نے صفیہ کو خوف زدہ نظروں سے دیکھا۔

”صفیہ...... جنات آزاد ہو چکے ہیں۔“

”کک...... کیا مطلب......؟“ وہ الجھیں۔

”برگد کے درخت کا حصار ٹوٹ چکا ہے۔“ نواز خان نے کہا۔

”مگر ایسے کیسے ٹوٹ سکتا ہے؟ اور آپ کو کیسے پتہ چلا؟“ وہ پریشانی سے بولیں۔

”میں نے خواب دیکھا ہے...... عجیب سا خواب تھا۔ کوئی شخص تھا عجیب الخلقت...... دیو قامت...... بڑے بڑے ہاتھوں والا اور سیاہ آنکھیں جن میں لال ڈورے تھے، وہ مجھے تنبیہ کر رہا تھا کہ ”حصار ٹوٹ گیا ہے محتاط ہو جاؤ، بارہ برس قید میں رہ کر انتقام کی آگ مزید سلگی ہے خیر مناؤ اپنی۔“ وہ بلند دہشت ناک سا قہقہہ لگاتا ہوا آسمان کی طرف اڑ گیا۔“

نواز خان خاموش ہوئے تو صفیہ بیگم نے تسلی دینے والے انداز میں شوہر کے کندھے پر ہاتھ رکھے دیے۔ ”یہ خواب تھا...... خواب سمجھ کر بھول جایئے خود پر طاری مت کریں آپ جب سے آئے ہیں اس واقعہ کو ہزار بار یاد کر چکے ہیں، یہ سب اسی وجہ سے ہے، بے فکر ہو جائیں حصار ایسے کیسے ٹوٹ سکتا ہے بھلا......؟ پر سکون رہیں اور اس کو دل و دماغ سے نکال دیں۔“ بیوی کے کہنے پر نواز خان نے سر تو ہلا دیا، پر اندر سے بے چین ہو چکے تھے۔

☆......☆......☆

مہروز کی بیٹی کی مہندی کی رات تھی سب لڑکے اپنے اپنے ذمہ لئے کاموں میں مصروف تھے جبکہ دلاور، فیصل پر برس رہا تھا۔ ”یار...... یہ کیا شادی والا گھر ہے...... نہ ڈھولک نہ گانا نہ ڈانس...... کوئی میوزک چلاؤ۔“

”یار دلاور تم مجھ پر کیوں برس رہے ہو...... جا کر لان میں تو دیکھو سب انتظام ہو چکا ہے باہر نکلو تو تمہیں پتہ چلے ناں۔“ فیصل نے برا سا منہ بناتے ہوئے کہا تو دلاور مسکرا دیا۔

”سوری یار...... میں تو صبح سے کمرے میں تھا۔ مجھے علم نہیں تھا۔“

”کوئی بات نہیں...... تم سناؤ طبیعت کیسی ہے اب؟“

”ٹھیک ہوں...... پہلے سے کافی بہتر محسوس کر رہا ہوں۔“

”چلو پھر جلدی سے فریش ہو کر لان میں آجاؤ اور اپنی پسند کا میوزک چلاؤ۔“ فیصل نے کہا تو وہ سر ہلاتا ہوا غسل خانے کی طرف بڑھ گیا۔

دلاور کی طبیعت کچھ ناساز ہو گئی تھی جس کی وجہ سے شادی کے کاموں سے بری الذمہ قرار دیا گیا تھا جبکہ وہ خاصا شرمندہ تھا سب ہی کزنز کاموں میں لگے ہوئے تھے اور وہ خود بیمار بن کر آرام کر رہا تھا۔ نہا دھو کر کپڑے تبدیل کئے اور لان میں آ گیا جہاں اچھی خاصی رونق لگی تھی۔ بہت سے مہمان آ چکے تھے اور کچھ آنے والے تھے، دلہن کو تیار کرنے کے لئے گاؤں میں موجود ایک بیوٹی پارلر لے کر گئے ہوئے تھے۔

ابھی مہندی کا پروگرام شروع ہونے میں خاصا وقت تھا، دلاور چلتا ہوا ایک سائیڈ پر سیٹ کئے ہوئے ڈیک کی طرف بڑھ گیا، ایک ایک کر کے تمام کیسٹیں چیک کرنے لگا اسے کچھ بھی پسند نہیں آ رہا تھا اس نے ایک اور کیسٹ چلائی تو وہ دھمال تھی، اس نے ناگواری سے اس کیسٹ کو باہر نکالنے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو اس کے بدن کو زبردست قسم کا جھٹکا لگا، وہ حیران سا رہ گیا۔

ابھی حیرت دور نہ ہوئی تھی کہ اس کے بدن نے خود بخود تھرکنا شروع کر دیا۔ وہ خود پر قابو پانا چاہتا تھا، پر بے بس ہو کر رہ گیا کیونکہ کوئی انجانی طاقت اس کے بدن پر تسلط جما چکی تھی، آس پاس والے حیرت سے دلاور کو دیکھ رہے تھے وہ عجیب انداز میں رقص کر رہا تھا، پیروں کی ایڑیوں کے بل وہ گھومتا جا رہا تھا، سب لان میں جمع ہو کر تماشہ دیکھ رہے تھے۔

خود نواز خان اور اس کی فیملی والے گنگ کھڑے تھے جیسے جیسے دھمال کے سر تال مدھم یا تیز ہوتے اسی انداز میں دلاور کا بدن بھی حرکت کرتا، پھر سب نے ایک حیرت انگیز منظر دیکھا۔

دلاور نے بازی گروں کی طرح کرتب دکھانے شروع کر دیئے اپنے بدن کو توڑ موڑ کر عجیب عجیب سی شکلیں بناتا تو کبھی سر کے بل کھڑا ہو جاتا، ایسے معلوم ہوتا جیسے اس کا جسم موم ہو جیسے چاہو موڑ توڑ کر نئی شکل دے ڈالو۔

دلاور نے اچانک ایک جست لگائی اور حویلی کے اوپر سے گزرنے والے بجلی کے تار کو پکڑ کر لٹک گیا۔

نواز خان پاگلوں کی طرح چیخ چیخ کر اسے آوازیں دے رہے تھے مگر دلاور اس وقت ہوش میں کہاں تھا، وہ بجلی کے تار پر چلنے لگا پھر ہوا میں اڑ کر ادھر سے ادھر جانے لگا۔

مہروز خان سمجھ گیا کہ دلاور ضرور کسی ہوائی چیز کے زیر اثر ہے، اس نے فوراً زاہد کو مسجد کی طرف دوڑایا کہ امام صاحب کو بلا لاؤ۔“

یہ امام صاحب اسی امام صاحب کے پوتے تھے جنہوں نے نواز خان کو نقش بنا کر دیا تھا۔

صفیہ بیگم دلہن کے ہمراہ گئی ہوئی تھیں ورنہ وہ اپنے جوان بیٹے کو اس حال میں دیکھ کر ضرور بے ہوش ہو جاتیں۔

امام مسجد نے آ کر فوراً ڈیک بند کروایا اور حصار کھینچ کر بیٹھ گئے اور پڑھائی کرنے لگے۔

فضاء میں پرواز کرتا دلاور زور زور سے چیخنے لگا۔

”چھوڑو مجھے، چھوڑو مجھے!“ وہ کسی ان دیکھی قوت سے اپنے آپ کو بچاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

امام صاحب مسلسل پڑھائی کر رہے تھے، آخر کسی قوت نے دلاور کو امام صاحب کے پاس لا پٹخا، دلاور اس وقت سخت طیش میں امام صاحب کو گھور رہا تھا اس کی بڑی بڑی آنکھیں لہو رنگ ہو رہی تھیں۔

امام صاحب نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

”بولو کون ہو تم......“ جلالی انداز میں پوچھا۔

تو نواز خان کو جھٹکا لگا کیونکہ یہ آواز دلاور کی نہیں تھی، یہ آواز تو وہ خواب میں سن چکے تھے۔ ”حصار ٹوٹ چکا ہے بارہ برس بعد ہاہاہا۔“

نواز خان دہشت زدہ سا ساکت رہ گئے ان کا رنگ ہلدی کے مانند زرد ہو رہا تھا۔

”نواز خان ہمیں پہچانتا ہے ہم وہی بازی گر جنات ہیں جن کے سرداروں کو اس نے مار ڈالا تھا۔“

”مگر نواز خان نے جان بوجھ کر انہیں مارا تھا۔“ امام صاحب نے کہا۔

”ہاں...... لیکن ہم قسم کھا چکے تھے اور پھر تمہارے دادا نے ہمیں وہاں قید کر دیا تھا ورنہ بارہ برس سے بھی بہت پہلے ہم اپنی قسم پوری کر چکے ہوتے...... ہم نہیں جائیں گے۔“

”دیکھو...... اس معصوم کو تو چھوڑ دو۔“

”ہرگز نہیں...... یہی تو ذریعہ بنا ہے ہمیں آزاد کروانے کا، اسے تڑپا تڑپا کر ماریں گے، جب مر جائے گا پھر چھوڑیں گے...... آخر ہمارے سردار بھی تڑپ تڑپ کر مرے تھے۔“

”پر تمہارا حصار کیسے ٹوٹ گیا؟“ نواز چیخے۔

”تمہارا مجرم تو میں ہوں...... مجھے سزا دو...... میرے بیٹے کو چھوڑ دو۔“ نواز خان کی آواز پر دلاور کے اندر موجود جن نے گھور کر اسے دیکھا اور ایک دہاڑ ماری۔ جیسے کوئی شیر ہو۔ ”تم چپ رہو...... تمہیں بھی نہیں چھوڑیں گے۔“

”دیکھو...... اسے چھوڑ دو ورنہ تم لوگوں کو جلا کر خاک کر دوں گا۔“ امام صاحب جلالی انداز میں گویا ہوئے۔

”سارے حربے آزما لو...... ہم نہیں جائیں گے۔“ وہ ضدی لہجے میں بولا تو امام صاحب کو غصہ آ گیا انہوں نے وظیفہ پڑھنا شروع کر دیا۔

دلاور کے کپڑوں کو آگ لگ گئی۔ وہ زور زور سے چیخنے لگا۔ ”بچاؤ بچاؤ۔“ وہ تکلیف سے کراہ رہا تھا۔

”امام وظیفہ بند کر دو...... ورنہ اسے جلا کر بھسم کر دوں گا۔“ غصیلی آواز میں کہا گیا تو امام صاحب بے بس

ہولررہ گئے، وہ سمجھ گئے تھے کہ وہ ظالم دلاور کے جسم سے نکل چکا ہے اور یہ آگ دلاور کو ہی نقصان پہنچائے گی۔ انہوں نے وظیفہ بند کردیا۔

دلاور کے بدن کو زور سے جھٹکا لگا اور قلابازیاں کھانے لگا۔ یونہی قلابازیاں کھاتا ہوا نواز خان کو لیتا ہوا زمین پر گر پڑا۔

نواز خان نے ادھر ادھر اپنے بچاؤ کے لئے ہاتھ پاؤں چلانے لگے مگر گرفت مضبوط تھی..... نواز خان کی گردن پر دباؤ بڑھتا گیا..... سب لوگوں نے سہم کر آنکھیں بند کرلیں۔

مہروز نے آگے بڑھ کر نواز کی مدد کرنی چاہی لیکن امام صاحب نے روک دیا۔ ”نہیں..... اپنی جان سے جاؤ گے یہ بہت خطرناک ہیں..... پورا قبیلہ یہاں پر ہے۔ وہ تمہیں ماردیں گے۔“ مہروز خان بے بسی سے رو پڑا۔

سارے لوگ غم اور صدمے سے نڈھال تھے نواز خان کا مردہ وجود لان میں پڑا تھا، دلاور کو پھر جھٹکے لگنے شروع ہوگئے تھے اس کے ناک اور منہ سے خون نکلنے لگا تھا پھر آہستہ آہستہ اس کی آنکھوں سے بھی خون جاری ہوگیا، وہ تکلیف سے ادھر ادھر چکرا رہا تھا لیکن اسے کچھ دکھائی نہ دے رہا تھا۔ دلاور کے سینے میں درد اٹھا اور وہ نیچے گرا کر ٹھنڈا ہوگیا۔ قرب وجوار میں سناٹا چھا گیا۔

پھر شور..... اٹھا ”بارہ برس بعد..... بارہ برس بعد..... ہاہاہا“

امام صاحب نے سر جھکا دیا ان کی آنکھوں میں آنسو تھے انہوں نے اشارے سے مہروز کو بلایا۔

غم اور صدمے سے چور مہروز خان ان کے سامنے پھٹ پڑا۔ ”آخر یہ حصار کیسے ٹوٹ گیا امام صاحب وہ بھی ہر برس بعد۔ آپ کے دادا مرحوم نے تو کہا تھا۔ ”یہ نہیں ٹوٹے گا۔“

”ہاں مہروز خان کہا تھا۔ پر..... اس حصار کی خاص بات یہ تھی کہ اگر اماوس کی تاریک رات میں پیدا ہونے والا شخص..... اس درخت کو چھوتا تو یہ خود بہ خود ختم ہوجاتا..... ہر برس اس لئے خیریت سے گزر گئے کہ اس رات کو پیدا ہونے والا کوئی بھی شخص اسے نہیں چھو سکا۔ پر..... گزشتہ شام..... دلاور نے اس درخت کو چھوا تھا چونکہ وہ اماوس کی رات پیدا ہوا تھا اس لئے اس کے چھوتے ہی حصار ٹوٹ گیا۔“

”پر امام صاحب دلاور وہاں کیسے پہنچا۔“ مہروز خان حیران تھا۔

”یہ تو تم اپنے بچوں سے پوچھو۔“ انہوں نے فیصل اور زاہد پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔

مہروز خان نے فیصل کو دیکھا تو اس نے سر جھکا لیا اور آہستہ آہستہ سارا قصہ کہہ سنایا۔ ہر شخص غم کی تصویر بنا کھڑا تھا صفیہ بیگم پر تو قیامت ٹوٹ پڑی تھی، وہ ذہنی طور پر نیم پاگل سی ہوگئی تھیں۔

نواز خان اور دلاور خان کا جنازہ ایک ساتھ اٹھا تو بچے بوڑھے سب کی آنکھیں اشکبار ہوگئیں۔ نواز خان اور دلاور کی موت کے دو سال بعد صفیہ بیگم بھی انتقال کرگئیں۔

امام صاحب نے مشورہ دیا کہ برگد کے درخت کا قلع قمع کردیا جائے پر ہمت کون لاتا؟ برگد کا درخت کھلے میدان میں اپنی وحشت کے ساتھ قائم رہا۔

آخر چند برس مزید گزر گئے تو کھلے میدان میں آبادکاری کی نوبت آگئی، سب سے بڑا مسئلہ برگد کے درخت کا تھا۔

مہروز خان کے بڑے بیٹے زاہد نے ہر طرف اپنے ہرکارے دوڑا دیئے تاکہ وہ کسی عالم باعمل کا بندوبست کریں۔ آخر کار ایک عامل باکمال ”سید جمال شاہ“ مل ہی گئے۔ انہوں نے حصار کھینچ کر پڑھائی کی مگر انہیں کچھ محسوس نہ ہوا تو انہوں نے کہا کہ ”جنات جاچکے ہیں کوئی خطرہ نہیں۔“

سو وہ برگد کا پراسرار درخت نذر آتش کردیا گیا۔ کھلے میدان میں انسانی بستی بن گئی پر نواز خان اور دلاور کی قبریں آج بھی نشانی بنی ہوئی ہیں۔

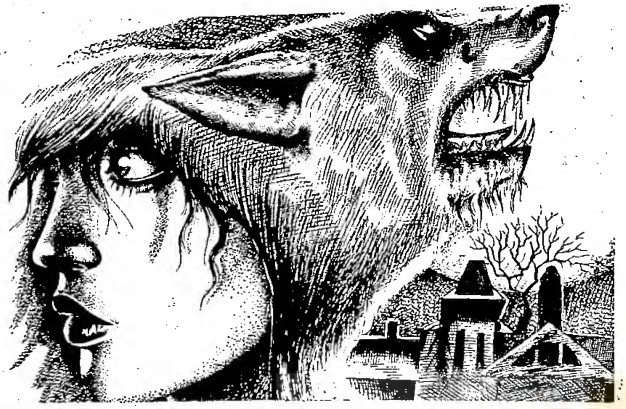

روح کی التجا

عروج سنبل۔ راولپنڈی

ہر سو ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دینے والا اندھیرا مسلط تھا اور جنگل کے درمیان خوبرو حسینہ کھڑی ”انصاف..... انصاف“ بابلند آواز میں نہ جانے کیوں یہ لفظ بول رہی تھی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ایک ہیولہ نمودار ہوا تو.....

رات کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں وہ بھی گھنا جنگل میں جنم لینے والی دل کو دہلاتی خونی کہانی

کھڑکی کے بلکے گرین رنگ کے شیشوں سے چھن کر چاندکی چاندنی کمرے میں آرہی تھی اور کمرے میں لگے بلب کی روشنی، چاندنی کو اور بھی زیادہ خوبصورت بنا رہی تھی۔ کمرے کے عین وسط میں ایک پلنگ تھا اور پلنگ کے ایک طرف لکڑی کا ایک ٹوٹا ہوا میز تھا اور میز پر پانی سے بھرا ہوا گلاس موجود تھا۔ کمرے کے ایک کونے میں ایک الماری رکھی تھی جس میں کچھ کوئے دبک رہے تھے اور دہکتے کوئلوں کی وجہ سے کمرے کا ماحول کافی گرم تھا۔

”ٹھک..... ٹھک..... ٹھک.....“ شیشوں پر دستک ہوئی فائل پر جھکی آورلیش ایک جھٹکے سے اٹھی اور دروازے کی طرف لپکی۔ دروازے کی کنڈی کھولی، پر باہر کوئی نہیں تھا۔ فوراً ہی اس کے دماغ میں آیا..... ”کون ہوسکتا ہے؟“ اور اس نے دروازہ بند کردیا۔ وہ

ٹھک...... ٹھک...... ٹھک......" دستک کی آواز ایک بار پھر سنائی دی تو آوریش چونکی اور اٹھ کر دروازے کی کنڈی کھولی۔

"اوہ...... مسٹر لوئس! مجھے نہیں پتہ تھا کہ آپ اس ڈپارٹمنٹ میں ہوکر بھی شرارتی ہوں گے۔"

"کیا مطلب......؟" لوئس نے بھنویں سکیڑتے ہوئے پوچھا۔

"مطلب یہ کہ ایک فاریسٹ اسسٹنٹ سے مذاق کرنا اور دروازے پر دستک دے کر تنگ کرتے ہوئے بھاگ جانا زیب نہیں دیتا۔ خیر چھوڑیں یہ دیکھیے اس جنگل کا نقشہ اور یہ ہے ان جانوروں کی تفصیل جو اس بلا کا نشانہ بن کر مر گئے ہیں۔" آوریش نے فائل مسٹر لوئس کے ہاتھ میں دے دی۔

"میم صاحبہ آپ جانتی ہیں کہ یہ کیس ایک معمہ بن کر رہ گیا ہے۔ آپ سے پہلے جتنے بھی فاریسٹ آفیسرز آئے سب اس بلا کے ہتھے چڑھ گئے۔ ہم تو یہ بھی نہیں جانتے کہ وہ ہے کیا؟" مسٹر لوئس نے فائل کھولے بنا کہا۔

"مسٹر لوئس ہمارے پاس ایک موقع ہے خود کو ثابت کرنے کا، کم از کم سب کو سمجھانا چاہیے۔" آوریش نے کہا اور فائل کھولی۔

"تو آپ کو کوئی سراغ ملا اس بلا کے بارے میں؟"

"آفیسر آوریش آپ جانتی ہیں کہ یہ کیس آپ نے کتنی سفارشات سے حاصل کیا۔ اس کیس کو کوئی بھی نہیں ہینڈل کرنا چاہتا جب سے علی، ابرار فائقہ اور اشتیاق کی ڈیتھ ہوئی ہے تو اوپر سے آفیسرز کے لئے یہ آرڈر آیا تھا کہ یہ کیس اب کسی کو نہ دیا جائے کیونکہ ہم نہیں چاہتے کہ اب کسی بھی فاریسٹ آفیسر کی جان جائے۔"

"آئی ایم سوری سر۔" آوریش نے فاریسٹ ڈائریکٹر کی بات کاٹی۔ "سر مجھے یہ سب پتہ ہے اور میں ...ن اور بہت مشکل ہے But do you know کہ ایک آواز ایک بلاوا جو مجھے اس کیس کی طرف کھینچ رہا تھا۔" آوریش نے خلاء میں گھورتے ہوئے کہا۔

"The Meeting is over,and i hope that۔ یہ بلاوا، یہ کشش اور یہ آواز آپ کی موت کی نہ ہو۔"

تمام آفیسرز کمرے سے باہر چلے گئے اور آوریش بھی اپنی فائل اٹھا کر گاڑی میں بیٹھ گئی، ڈرائیونگ کرتے ہوئے اس نے گاڑی کا رخ گاؤں کی طرف کر دیا۔ اور پھر چند منٹ میں ہی وہ گاؤں میں پہنچ کر اس جگہ گاڑی روکی جہاں کچھ لوگ کھڑے محو گفتگو تھے۔

"میم صاحبہ، میم صاحبہ!" سارے گاؤں والے آوریش کی گاڑی کی طرف آئے اور آوریش کو بغور دیکھنے لگے۔

"گاؤں والو......! میری بات غور سے سنو...... میں جو کچھ پوچھوں اس کا جواب نہایت سنجیدگی سے دینا کیونکہ میں آپ سب کی بھلائی چاہتی ہوں۔" آوریش اوپر کو اٹھی اور گاڑی کے بونٹ پر بیٹھ گئی۔

"کیا آپ لوگوں نے اس بلا کا چہرہ دیکھا ہے؟"

"ہاں میم صاحبہ میں نے ایک مرتبہ دیکھا تھا ...... وہ بلا بالکل جانور کی طرح نظر آتی ہے۔" ایک کمزور سا بوڑھا بولا۔

"ارے نہیں میم صاحبہ یہ جھوٹ بول رہا ہے یہ تو رات کو شراب میں دھت رہتا ہے، بھلا اسے کیا پتہ؟" ہجوم کے ایک کونے سے آواز آئی۔

"ارے چپ کر! یہ مجھے شرابی کہہ رہا ہے حالانکہ خود اندھا ہے۔" کمزور بوڑھے کی آواز میں کرنٹ آ گیا۔

آوریش بونٹ سے نیچے اتری اور گاڑی اسٹارٹ کر کے آگے کو بڑھا دی۔

☆......☆......☆

بیگ میں ٹارچ اور پانی کی بوتل رکھی ایک چھڑی ہاتھ میں پکڑی دروازہ کھول کر آوریش جنگل میں ایک طرف کو چل پڑی۔ جنگل میں داخل ہوتے ہی اس نے ٹارچ آن کی۔ گھنی کانٹے دار جھاڑیوں کے درمیان سے گزرتی ہوئی وہ آگے بڑھ رہی تھی کہ اچانک ایک زوردار آواز آئی وہ اس آواز کی طرف پلٹی اور فوراً ایک موٹے درخت کی آڑ میں چھپ گئی۔ کافی وقت گزر گیا لیکن آواز لگانے والا کوئی ذی روح نظر نہیں آیا تو تنگ ہوکر وہ درخت کی آڑ سے باہر آئی۔

"آوریش...... آوریش......" اور وہ لرز کر رہ گئی کیونکہ کوئی بھیانک آواز میں آوریش کو بلا رہا تھا آوریش پیچھے مڑی تو اس کے اوسان خطا ہو گئے، فاریسٹ اسسٹنٹ لوئس کی لاش ایک درخت سے لٹکی ہوئی تھی۔

☆......☆......☆

"سر! مجھے یہ یقین ہو گیا ہے کہ یہ کوئی جنگلی جانور نہیں ہے وجہ یہ کہ اگر یہ کوئی جانور ہے تو مجھے میرے نام سے آواز کیسے دی؟ بلکہ یہ کچھ اور ہے؟" آوریش نے الجھتے ہوئے الفاظ میں کہا۔

"اوہ، کم آن آفیسر...... یہ سب بند کریں۔ شکر کریں کہ لوئس کی موت کا ذمہ دار آپ کو نہیں ٹھہرایا گیا کیونکہ آپ جانتی ہیں کہ جب آپ جنگل میں گئیں تو مسٹر لوئس آپ کے پیچھے گئے، اور ایک اسسٹنٹ کا فرض ہے کہ ہر وقت اپنے باس یعنی اپنے افسر کے ساتھ رہے، جب اس کی موت ہوئی تو جنگل میں آپ کے علاوہ کوئی نہیں تھا اور یہ کون سی مخلوق کا ذکر کر رہی ہیں آپ؟ کیا ہے یہ؟ کیا کوئی بھوت؟ ویسے آپ آج کل ایک جدید دنیا کی بہادر آفیسر ہوکر ایسی باتوں پر یقین کرتی ہیں؟ الس اے ریڈیکولس۔" آفیسر نے مس آوریش سے بولا اور کمرے سے نکلتا چلا گیا۔

"کوئی مانے نہ مانے۔ میں جانتی ہوں ...... مجھے اس کیس کی تہہ تک پہنچنا ہے۔" آوریش خیالوں میں کھو گئی۔

☆......☆......☆

"ٹک...... ٹک...... ٹک۔" کھڑکیوں کے شیشوں پر مسلسل دستک ہو رہی تھی۔ آوریش نے کمبل سے منہ نکالا اور جھٹ سے کھڑکی کھولی۔ باہر کوئی نہیں تھا پھر اس نے کھڑکیاں بند کیں اچانک کھڑکی پھر کھٹکی......

"ٹک ٹک ٹک۔" اس بار آوریش نے دروازہ کھولنے کا سوچا پھر اس نے گن نکالی اور چپکے سے دروازہ کھولا دستک ابھی بھی ہو رہی تھی وہ دھیرے سے چلتی ہوئی آگے آئی کہ یک دم کوئی سایہ نظر آیا آوریش سائے کا پیچھا کرنے میں ناکام ہو گئی۔

وہ اس وقت تھکن سے چور تھی خیر واپس اپنے کمرے کی طرف آئی تو کمرے کی دہلیز پر ایک لفافہ پڑا تھا اس نے جلدی سے کنڈی لگائی اور لفافہ کھولا۔

"آوریش...... مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے تم جو کچھ کہہ رہی تھی بالکل ٹھیک تھا...... یہ کوئی جانور یا کوئی انسان نہیں بلکہ کوئی بدروح ہے۔ آوریش پلیز! کم ٹو مائی آفس I need your help" فاریسٹ ڈائریکٹر تھامس۔

"میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ آفیسر تھامس کے ہاتھ کوئی بہت بڑا ثبوت لگا ہے۔ اب اس قتل و غارت گری کا انجام بہت قریب ہے۔" آوریش خود سے باتیں کرتی ہوئی یونیفارم بدلنے لگی۔

پھر گاڑی اس نے اسٹارٹ کی اور آفیسر تھامس کے دفتر کی طرف دوڑائی کہ اچانک اس کا موبائل چیخ پڑا تو آوریش نے گاڑی روکی اور پاکٹ سے موبائل نکالا۔

"ہیلو......" آوریش بول رہی ہوں؟

دوسری جانب سے آواز آئی۔ "جی فرمائیں۔"

"آپ کون؟" آوریش نے پوچھا۔

"جی میں آفیسر تھامس کا نوکر بول رہا ہوں۔ دراصل آفیسر تھامس اور ان کی اہلیہ لوسی کی موت ہو گئی ہے۔"

"کیا......؟" آوریش کے ہاتھ سے موبائل

گرتے گرتے بچا۔

''یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ مطلب یہ کوئی انسان ہے جو اپنے خلاف ثبوت مٹا رہا ہے۔'' آوریش سوچوں میں ڈوبتی چلی گئی کہ پھر اچانک اس نے گاڑی اسٹارٹ کی اور تھامس کے آفس کی طرف دوڑائی۔ آفس کے قریب پہنچ کر وہ بھاگتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔

☆......☆......☆

''یار تو پرسکون ہوجا...... چل یہ بتا کہ ایسا کیا دیکھ لیا؟'' سنبل نے آوریش کو پانی پلایا۔

''سنبل تو سوچ بھی نہیں سکتی......''

''ہاں آوریش میں سچ بتا رہی ہوں۔ مجھے کچھ نہیں پتہ کیونکہ تو نے بتایا ہی نہیں۔ یار تو مجھے سڑک کے کنارے گاڑی میں بے ہوش ملی تو میں تجھے اپنے گھر لے آئی۔ اب تو بتا۔'' سنبل نے کہا۔

''پتہ ہے...... اس رات مجھے ایک خط ملا جس میں مسٹر تھامس مجھے ہیلپ کے لئے بلا رہے تھے اور یہ بھی لکھا تھا کہ اس جنگل میں کوئی بدروح ہے جو سب کو مار رہی ہے۔ جب میں ان کے آفس جانے کے لئے نکلی تو راستے میں خبر آئی کہ وہ اور ان کی بیوی مر چکے ہیں، میں بھاگ کر ان کے آفس گئی تاکہ وہ ثبوت حاصل کرسکوں جس کی خاطر آفیسر تھامس بلا رہے تھے مجھے ثبوت تو نہیں ملا پر...... پر۔''

''پر کیا؟ آوریش۔'' سنبل نے پوچھا۔

''پر وہاں مجھے ایک سو کا نوٹ ملا، جس پر انہوں نے اپنے دستخط کئے ہوئے تھے۔''

''تو پھر؟'' سنبل نے آوریش کی آنکھوں میں بغور دیکھا۔

''جو لیٹر مجھے میرے کمرے میں ملا تھا وہ مسٹر تھامس کی لکھائی میں نہیں تھا۔ وہ لیٹر کسی اور نے لکھا تھا جس پر مسٹر تھامس کے نقلی دستخط تھے۔''

''مطلب یہ کہ وہ کوئی اور ہے جو میری مدد چاہتا ہے۔ لیکن یہ سمجھ نہیں آرہی کہ مسٹر تھامس کا قتل کس نے اور کیوں کیا؟ آوریش گھمبیر لہجے میں بولی۔

''آوریش مجھے لگتا ہے کہ یہ قتل اسی نے کیا ہے جس نے لوئس کو قتل کیا؟''

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو سنبل، اب یہ کیس اور زیادہ پیچیدہ ہوگیا ہے پر مجھے ایک بات کا یقین ہے کہ قاتل اور جنگل والی بلا ان دونوں کا کچھ نہ کچھ آپس میں ضرور کنکشن ہے خیر اب میں گاؤں واپس جانا چاہتی ہوں تاکہ جلد از جلد سراغ نکال لوں۔'' آوریش نے کمبل اوڑھتے ہوئے کہا اور تھوڑی دیر میں ہی وہ نیند کی وادیوں میں چلی گئی۔

ٹن...... ٹن...... صبح ہوگئی تھی۔

''آوریش اٹھو یار تمہارا فون بج رہا ہے۔'' سنبل نے آوریش کو جگایا۔

''ہیلو...... ہیلو...... لگتا ہے بند ہوگیا۔'' آوریش نے فون سائیڈ پر رکھ دیا۔

''ہاں تو جب آدھا آدھا گھنٹہ تک بجے گا تو بند تو ہونا ہے۔ خیر اٹھ جاؤ میں ناشتہ بنانے جارہی ہوں۔'' سنبل بولی۔

سنبل ناشتہ بنانے کچن میں چلی گئی۔ اور آوریش کمبل منہ پر ڈال کر دوبارہ سوگئی۔

''یہ کیا پھر سوگئی؟ ارے بھئی اٹھو اور ڈیوٹی پر جاؤ، ہری اپ۔'' سنبل بولی۔

''یار...... اٹھ جاتی ہو بس......'' آوریش نے کمبل منہ سے ہٹایا تو دیکھا کہ سنبل سامنے کچن میں تھی۔

''سنبل کیا تم ابھی روم میں آئی تھی؟ مجھے جگانے۔'' آوریش نے آواز دی۔

''نہیں تو......'' سنبل نے آواز لگائی۔

''کیوں کیا ہوا؟''

''کچھ نہیں...... اس کا مطلب ہے کہ کوئی مجھے بلا رہا ہے۔ مجھے جانا چاہیے۔''

☆......☆......☆

آوریش نے کھانا کھایا اور کھانے سے فارغ ہوکر فائل نکالی کہ پھر موبائل کی آواز سنائی دی تو آوریش نے نہایت سکون سے موبائل اٹھایا اور اسپیکر آن کیا۔

''دیکھو......! میں جانتی ہوں کہ تم وہی ہو جس نے سارے قتل کیے۔ تم انسان ہو؟ حیوان ہو؟ یا کوئی بدروح ہو؟ میں تمہاری مدد کے لئے تیار ہوں۔ تم کیا چاہتی ہو؟ جنگل سے تمہارا کیا رشتہ ہے؟ بتاؤ مجھے، میں تمہاری پوری مدد کروں گی۔'' آوریش موبائل میں بول رہی تھی۔ ''حیرت کی بات یہ تھی کہ کال کے منٹس چل رہے تھے، مطلب کوئی تھا جو آوریش کی آواز کو سن رہا تھا۔

''بتاؤ مجھے......'' آوریش نے بولتے ہوئے کونے میں چھپی سنبل کو اشارہ کیا تو سنبل نے پاس رکھی ٹیپ ریکارڈ کا بٹن آن کردیا۔

اعوذ باللہ من الشطین الرجیم

بسمہ اللہ الرحمن الرحیم

یس والقرآن الحکیم ٹیپ کا بٹن جیسے ہی کھولا تو تلاوت قرآن پاک شروع ہوگئی۔ عین اسی وقت کال بند ہوگئی۔

سنبل اور آوریش ہکی بکی ہوکر ایک دوسرے کو دیکھنے لگیں اس کا ''مطلب ہے کہ یہ کوئی بدروح ہے......'' سنبل اور آوریش ایک زبان ہوکر بولیں۔

''مجھے تو پہلے ہی شک تھا۔ ایک بات کلیئر ہے کہ یہ ان دیکھی ہستی ہماری مدد چاہتی ہے۔'' آوریش بولی۔

''اگر یہ کوئی انسان یا جانور ہوتا تو اسے تلاوت سے کوئی فرق نہ پڑتا۔ سنبل اب ہمیں اور زیادہ احتیاط کرنی ہوگی۔ میرے پاس ایک آئیڈیا ہے، ہم دونوں کل رات جنگل میں جائیں گی۔ اور اس بلا کو بلائیں تاکہ ہم اس کے بارے میں پوری تفصیل جان سکیں۔ کیا خیال ہے تمہارا؟'' آوریش نے مسکراتے ہوئے سنبل کی طرف دیکھا۔

''دماغ خراب ہے تمہارا۔ پاگل ہوگئی ہو، یہ کام کسی عامل یا مولوی کا ہے جسے تم سرانجام دینے کا سوچ رہی ہو، اور ہاں میں اب اپنے گھر واپس جارہی ہو، اور تم جو کھیل کھیل رہی ہو وہ جان لیوا ثابت ہوسکتا ہے، بھلا ایک کمزور لڑکی کسی بدروح کا مقابلہ کیسے

نماز کی اہمیت

☆ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ ''جس نے دو رکعت نماز پڑھی اور اس کے دل میں کسی کا دنیاوی خیال نہیں آیا تو اس کے گزشتہ تمام گناہ بخش دیئے جاتے ہیں۔

☆ کریم رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''بندہ کے لئے نماز میں وہی کچھ ہے جسے وہ اچھی طرح سمجھتا ہے۔''

☆ حضرت عائشہؓ کا ارشاد ہے کہ میں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم آپس میں باتیں کرتے تھے جب نماز کا وقت آجاتا تو اللہ تعالیٰ کی عظمت کی وجہ سے ہم ایسے ہوجاتے جیسے ایک دوسرے کو پہچانتے بھی نہیں۔

☆ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ''اللہ تعالیٰ اس نمازی کی طرف نہیں دیکھتا جس میں انسان کا دل اس کے بدن کے ساتھ شامل عبادت نہیں ہوتا۔''

☆ جب نماز کا وقت آتا تو حضرت علیؓ کے چہرے کا رنگ متغیر ہوجاتا اور آپ پر لرزہ طاری ہوجاتا۔ پوچھا گیا اے امیر المومنین! آپ کو کیا ہوگیا ہے؟ آپ نے فرمایا۔ ''اللہ تعالیٰ کی اس امانت کی ادائیگی کا وقت آگیا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے آسمان و زمین اور پہاڑوں پر پیش کیا تھا مگر انہوں نے معذوری ظاہر کردی تھی اور اس میں نے اسے اٹھالیا۔''

☆ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ''آخیر زمانہ میں میری امت کے کچھ ایسے لوگ ہوں گے جو مسجدوں میں حلقہ بنا کر بیٹھیں گے دنیا اور دنیا کی محبت کا ذکر کرتے رہیں گے ان کی مجالس میں نہ بیٹھنا اللہ تعالیٰ کو ان کی کوئی ضرورت نہیں۔''

☆ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے کہ ''قیامت کے دن سب سے پہلے نماز کے متعلق پوچھا جائے گا اگر نمازیں پوری ہوں گی تو حساب آسان ہوجائے گا اگر نمازیں کچھ کم ہوں گی تو اللہ تعالیٰ فرشتوں سے فرمائے گا کہ اگر میرے بندے کے کچھ نوافل ہوں تو ان سے نمازوں کو پورا کردو۔''

(ناصر علی۔ بھولے دی جھوک۔ ساہیوال)

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

...ن ہے۔" ...ں بیڈ سے اترتے ہوئے بولی۔

"اچھا ٹھیک ہے۔ ہم پہلے کسی اللہ والے کے پاس چلتے ہیں۔" آوریش نے سنبل کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

تھوڑی ہی دیر میں وہ دونوں گاؤں میں موجود پیش امام کے پاس پہنچ گئیں، آوریش نے سلام دعا کے بعد سارا مدعا پیش امام صاحب سے بیان کردیا۔

آوریش کی بات سن کر پیش امام صاحب بولے۔

"بیٹی آرام سے بیٹھو۔ میں جانتا ہوں کہ تم دونوں کیا کہنے آئی ہو۔"

پیش امام صاحب کی باتیں سن کر آوریش اچنبھے میں پڑگئی اور بولی۔ "پیش امام صاحب آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ ہم دونوں کس مقصد سے آئے ہیں۔"

"بیٹی ان باتوں کو چھوڑو۔ اور کوشش کرو کہ جلد از جلد وہ بدروح اذیت سے نکل جائے۔ وہ ہم سب کی مدد کی طلب گار ہے۔" پیش امام صاحب نے آوریش اور سنبل کی طرف دیکھ کر کہا۔

"تو پیش امام صاحب آپ تو اس کی مدد کرسکتے ہیں پھر آپ نے کیوں نہ کی؟" سنبل بھی شش وپنج میں مبتلا تھی۔

"سنبل بیٹی میری پہنچ وہاں تک نہیں ہے جہاں آوریش بیٹی کی ہے۔" پیش امام صاحب مسکراتے ہوئے بولے۔

"مطلب۔" آوریش نے پوچھا۔

"تم کل رات میں بارہ بجے جنگل میں بیٹھ جانا اور بابلند آواز میں تم "انصاف ...... انصاف ...... انصاف" کہنا متواتر اس لفظ کی تکرار کرنا...... تو وہ بھٹکتی روح حاضر ہوکر تمہیں خود بتائے گی کہ تمہیں کیا کرنا ہے" اور پیش امام صاحب خاموش ہوگئے۔

پیش امام صاحب کی باتیں سن کر سنبل اور آوریش وہاں سے چلی آئیں۔

☆......☆......☆

دل کو لرزا دینے والی بھیانک تاریکی ہر سو چھائی ہوئی تھی، اور پورے جنگل پر پرہول پراسرار سناٹا دل کو دہلائے دے رہا تھا۔

آسمان سے باتیں کرتے دیوہیکل درخت بہت ہی ڈراؤنے لگ رہے تھے جنگل میں مقیم تمام جانور اپنی اپنی جائے رہائش میں دبکے پڑے تھے، خاموشی نے پورے جنگل کو اپنے شکنجے میں جکڑ رکھا تھا، ایسا لگتا تھا کہ پورے جنگل میں ایک بھی پرندہ نہیں، کیونکہ کسی پرندے تک کی بھی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ پورے جنگل میں وحشت کا راج تھا۔ جنگل کے وسط میں ایک کنواں تھا۔ جو کہ گہری تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا کنوئیں کے قریب ہی ایک بہت موٹا دیوہیکل درخت بھی تھا۔

کنوئیں کے قریب جھاڑیوں سے پاک جگہ تھی۔ آوریش نے اس جگہ اپنے کندھے سے اپنا بیگ اتارا اور سنبل کو پکڑایا تو سنبل بیگ لے کر کچھ فاصلے پر کھڑی گاڑی میں آکر بیٹھ گئی۔ جبکہ آوریش کنوئیں کے پاس صاف جگہ پر کھڑی ہوگئی۔

"انصاف...... انصاف...... انصاف......"

آوریش نے بابلند آواز زور سے بولنے لگی۔

اس کے بعد پھر بولی۔ "دیکھو! میں آگئی ہوں۔ آؤ...... انصاف کے لئے...... انصاف...... انصاف۔" آوریش نے چاروں طرف دیکھا۔ تقریباً آدھا گھنٹہ گزر گیا پر کچھ نہیں ہوا۔ "پھر بھی وہ ...... انصاف...... انصاف" کی آوازیں لگاتی رہی۔

"آوریش مجھے لگتا ہے چلنا چاہئے۔" سنبل گاڑی میں بیٹھی ہوئی بلند آواز سے بولی تاکہ آوریش سن لے۔

"ہاں چلتے ہیں۔" آوریش پیچھے مڑی۔

اچانک بادل زور سے گرجے اور تمام دیوہیکل درخت ایسے ہلے جیسے کہ زلزلے میں ایک چھوٹا سا درخت ہلتا ہے۔

"سنبھل مجھے لگتا ہے وہ بلا آگئی ہے۔ تم گاڑی

اسٹارٹ کرو جیسے ہی کوئی خطرہ محسوس ہوگا میں گاڑی میں آجاؤں گی۔" آوریش نے زور سے چلا کر کہا۔

اچانک کنوئیں کے قریب موجود دیوہیکل درخت کی شاخیں بہت زور سے ہلنے لگیں اور پھر کنوئیں میں سے نیلی روشنی ابھری اور ایک انسان نما سایہ نظر آیا، غور سے دیکھنے پر پتہ چلا کہ وہ کسی عورت کا سایہ تھا۔

وہ صاف نظر نہیں آرہی تھی اس کی کرخت آواز سنائی دی۔

"میرا نام دعا تھا...... میں ایک فاریسٹ آفیسر کی اسسٹنٹ تھی، اس فاریسٹ آفیسر کا نام تھامس تھا...... ڈرو نہیں میں تم دونوں کو کچھ نہیں کہوں گی...... میں تم دونوں سے مدد چاہتی ہوں۔" وہ بات کرتے ہوئے جیسے لہرا رہی تھی۔

"کیسی مدد؟ آفیسر تھامس اور ان کی وائف کا قتل تم نے کیا ہے؟ کیوں کیا؟ اور مزید ہمارے فاریسٹ ڈپارٹمنٹ کے افسروں کو تم نے مارا؟ بتاؤ مجھے" آوریش نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

روح کی آواز سنائی دی۔

"2003 میں میرا ٹرانسفر یہاں ہوا، یہاں مسٹر تھامس کی ڈیوٹی تھی جب میں یہاں آئی تو مسٹر تھامس نے میرے ساتھ بہت سختی برتی وہ چاہتا تھا کہ میں واپس چلی جاؤں۔ میں بھی ڈٹی رہی، آخر مسٹر تھامس ہار گیا، کچھ عرصے بعد مجھے پتہ چلا کہ جنگل سے قیمتی جانور کم ہوتے جارہے ہیں اس کے علاوہ قیمتی لکڑی بھی۔" میں نے اس کی خبر تھامس کو دی تو تھامس نے میری باتوں کو سیریس نہیں لیا۔

ایک رات میں تھامس کے ساتھ جنگل کا دورہ کررہی تھی کہ تھامس کے پاس کسی کا فون آیا، میں تھامس کے قریب تھی، پھر اس نے کہا۔ "تم دوسرے سائیڈ پر گشت کرو۔"

مجھے تھامس پر پہلے ہی شک ہوگیا تھا، تھامس کسی کو فون پر کہہ رہا تھا۔

"تمام جانوروں کی ڈیلوری کردی ہے اگلے ہفتے تک تمہارے ساحل پر مزید پہنچ جائیں گے۔"

تھامس نے مجھے دیکھ لیا کہ میں اس کے سارے بھید جان چکی ہوں۔ اس سے پہلے کہ میں اپنی جان بچاتی تھامس نے اپنی گن نکالی اور میرے سینے پر رکھ کر گولی چلادی۔ اس کے بعد اس نے میری لاش کو کنوئیں کے سامنے بڑے درخت کے پاس گڑھا کھود کر اس گڑھے میں دفن کردیا۔

اس کے بعد یہاں جتنے بھی آفیسر آئے، میں نے سب کو اپنی مدد کے لئے اشارے دیئے بلکہ بتایا بھی، اپنی کہانی سب کو سنائی اور جب وہ تھامس کے پاس جاکر حقیقت بیان کرتے تو تھامس نے سب کو قتل کردیتا میں بے بس ہوکر رہ گئی اور پھر تھک ہار کر میں گاؤں کے پیش امام صاحب کے پاس پہنچی اور انہوں نے میری مدد کی تو میں تھامس کے گھر پہنچی دونوں میاں بیوی کو مار دیا۔

پر میرا یقین کرو، میں ظالم نہیں بلکہ نیک روح ہوں۔ میں نے اپنا انتقام خود ہی لے لیا ہے۔ اب تم میری صرف اتنی مدد کردو کہ میری لاش کو اس جگہ سے نکال کر اسلامی طریقے سے دفنا دو۔" روح کی آواز آبدیدہ تھی۔

"وہ تو ہم کردیں گے۔ لیکن۔ یہ تو بتاؤ کہ اگر تم نیک روح ہو تو اس دن تلاوت قرآن پاک سے ڈر کیوں گئی؟" آوریش نے روح سے پوچھا۔

"کیا تمہیں پتہ ہے پہلے میں نیک تھی۔ میں نے کبھی کسی انسان کا خون نہیں کیا تھا، پر تھامس کی موت کے بعد میں بدروح بن گئی کیونکہ میں نے انسان کا خون پیا۔ سورج نکلنے والا ہے تم سے التجا ہے کہ ضرور میری مدد کرنا میں جارہی ہوں۔" سایہ دوبارہ وہاں سے غائب ہوگیا۔

☆......☆......☆

دوسرے دن صبح ہوئی تو آوریش نے اس جگہ کی کھدائی کرانے کا انتظام کیا، جس جگہ کی اس روح نے نشاندہی کی تھی، تین مزدوروں نے اس جگہ کی کھدائی

کرنی شروع کی۔

"میم صاحبہ یہاں کچھ ہے۔" ایک مزدور نے پیچھے کھڑی آوریش کو دیکھ کر کہا۔ آوریش آگے بڑھی۔

زمین میں کچھ ہڈیاں تھیں آوریش نے مزدوروں سے کہہ کر تمام ہڈیاں ایک جگہ جمع کرائی، گاؤں کے کچھ بزرگوں نے بھی مزدوروں کا ہاتھ بٹایا، اس کے بعد تمام ہڈیوں کو اسلامی طریقے سے نماز جنازہ کے بعد دفن کر دیا گیا، گاؤں کی مسجد کے پیش امام صاحب بھی پیش پیش تھے۔

آوریش نے اللہ کا شکر ادا کیا۔

رات کے تقریباً 12 بجے آوریش کے کمرے میں دعا کی روح نمودار ہوئی، اب وہ ایک بہت ہی خوب صورت لڑکی کے روپ میں تھی اسے دیکھ کر آوریش بولی۔

"دعا تم نے اپنی جان دے کر تمام فاریسٹ آفیسر کو نہیں بلکہ دوسروں کو بھی یہ احساس دلایا کہ ہمیں اپنے ملک سے کبھی غداری نہیں کرنی چاہئے۔" یہ سن کر دعا کی روح بولی۔

"آوریش تمہارا بہت بہت شکریہ کہ تم نے میری بھٹکتی ہوئی روح کو اذیت سے بچالیا، اب میں چلتی ہوں میرے جانے کا وقت ہو گیا تم اپنا خیال رکھنا۔"

اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ رقصاں تھی اس کے بعد وہ غائب ہو گئی۔

اب شاید وہ پرسکون تھی اس کے گلابی چہرے پر نور تھا۔ اور گلابی پنکھڑی جیسے ہونٹ مسکرا رہے تھے۔

صبح ہو گئی، سنبل نے ناشتہ تیار کیا اور ناشتہ کرنے کے بعد آوریش اپنی گاڑی میں بیٹھی گاڑی اسٹارٹ کرنے کے بعد تھامس کے دفتر کی طرف چل پڑی اور دفتر پہنچنے کے بعد آوریش نے چوکیدار کو اپنا فاریسٹ کارڈ دیا اور دفتر کے اندر داخل ہو گئی اس نے تھامس کے تمام کاغذات ٹٹولے اچانک اس کی نظر ایک الماری پر پڑی، اس الماری پر تالا پڑا تھا جس کی چابیاں دراز میں تھیں اس نے الماری کا تالا کھولا الماری کے اندر ایک بڑی ڈائری پڑی تھی آوریش نے ڈائری کھولی اور پڑھنا شروع کیا الماری میں مزید کچھ پیپرز بھی تھے۔

آوریش نے ڈائری اور پیپرز اپنے پرس میں ڈالے اور پھر الماری کو تالا لگا دیا۔ گاڑی میں بیٹھتے ہی آوریش نے نئے فاریسٹ ڈائریکٹر فرحان کی طرف گاڑی دوڑائی۔ تھوڑی دیر میں وہ فرحان کے بنگلے کے سامنے کھڑی تھی۔

"آوریش آپ نے بہت اچھا کیا۔ لیکن تھامس کو سزا تو پہلے ہی مل چکی پھر ان کا کوئی وارث بھی نہیں ہے انہوں نے کوئی وصیت بھی نہیں کی اس طرح ان کی پراپرٹی سیدھا سیدھا حکومت کے کھاتے میں جائے گی۔" آفیسر فرحان نے کہا۔

"سر تھامس نے ایک معصوم لڑکی کی جان لی جو کہ اس ڈائری میں صاف صاف لکھا ہے اور وہ ایک انٹیلی اسمگلر تھا اس کے علاوہ اپنے گناہوں پر شرمندہ بھی نہیں تھا۔

"سر ہمیں ان کی پراپرٹی دعا کی فیملی کے نام کرنی چاہئے اس کی فیملی غربت میں اپنا وقت گزار رہی ہے جبکہ اس گھرانے میں دعا واحد کمانے والی تھی، سر ہمارے اس فیصلے سے تھامس اور دعا دونوں کی روحوں کو سکون ملے گا۔" آوریش بولی۔

"ٹھیک ہے میں ایسے ہی کرتا ہوں لیکن اس بات کو راز میں رکھنا ہوگا۔" فرحان نے معنی خیز نظروں سے آوریش کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"آپ بے فکر رہیں۔ اس اچھے کام کے لئے اگر جھوٹ بول لیا جائے تو شاید ہمارے حق میں بہتر ہوگا، یعنی گناہ نہیں۔" اس کے بعد دونوں مسکرانے لگے۔

پھر آوریش فرحان سے مصافحہ کرنے کے بعد اپنی گاڑی میں بیٹھی، گاڑی کو اسٹارٹ کیا اور گاڑی کا رخ اپنے گھر کی طرف کر دیا۔

قوسِ قزح

قارئین کے بھیجے گئے پسندیدہ اشعار

دوست بھی کیا خوب چاہتوں کا صلہ دیتے ہیں
ہر ایک گام پہ پھر زخم نیا دیتے ہیں
آپ سے تو چند دنوں کی دوستی ہوئی
لوگ برسوں کی محبت کو بھلا دیتے ہیں
(محمد اسلم جاوید۔فیصل آباد)

آزمائش رشتوں میں ضرور ہوتی ہے
نہ مل پانا کسی کی مجبوری ہوتی ہے
یاد تو دور سے بھی کرسکتے ہیں لیکن
مل کے ہی دل کی حسرت پوری ہوتی ہے
(شرف الدین جیلانی۔ٹنڈوالہ یار)

اپنا تو چاہتوں میں یہی اک اصول ہے
جب تو قبول ہے تو تیرا سب قبول ہے
عمر بھر کا جاگنا بے کار ہی نہ جائے
گر تو نہیں ملی تو ریاضت فضول ہے
(ذیشان علی۔حیدرآباد)

عمل سے بھی مانگا دعا سے بھی مانگا
تجھے میں نے تیری رضا سے بھی مانگا
نہ کچھ ہوسکا تو دعا سے بھی مانگا
قسم ہے خدا کی خدا سے بھی مانگا
(عامر ملک۔ٹنڈوآدم)

چاہت کا اک دیا جلا درد جگائے شام ڈھلے
تیری یادیں آجاتی ہیں ہم کو رلانے شام ڈھلے
دن کے اجالوں میں تو مثالوں لاکھ جتن سے بہلالوں
لیکن دل کا پاگل پنچھی ایک نہ مانے شام ڈھلے
(محمد اسحاق انجم۔کنگن پور)

تم کو جان سے پیارا بنالیا
دل کو سکون آنکھوں کا تارا بنالیا
اب تم ساتھ دو یا نہ دو تمہاری مرضی
ہم نے تمہیں زندگی کا سہارا بنالیا
(فلک زاہد۔لاہور)

تو اپنی محبت کی قیمت بتا M
جان قربان کردوں تو کتنا بقایا ہوگا
(عبدالحلیم بھٹی۔کوٹھا کلاں)

وفا کر کے کچھ نہیں ملا بھول گئے لوگ ہم کو H
کاش ہم بے وفائی کرتے ہمیشہ کسی کو یاد بن کر تو آتے
(محسن عزیز حلیم۔کوٹھا کلاں)

چھوڑ دیں گے اک دن تم سے محبت کرنا یہ وعدہ ہے ہمارا
بس ذرا زندگی کا سانسوں سے رشتہ تو ٹوٹ جانے دو
(عبدالکریم عزیز منی۔کوٹھا کلاں)

سنو دوست وقت دکھائی نہیں دیتا پر
دکھا بہت کچھ دیتا ہے
(آصف روح الامین۔کوٹھا کلاں)

درد کی دنیا کو فتح کررہا ہوں رفتہ رفتہ
میں بھی آخر سکندر ہوجاؤں گا
جدائی میں گر یونہی بہتے رہے آنسو تو یقیناً
کسی روز آنسوؤں کا سمندر ہو ہی جاؤں گا
(ظہور احمد صائم۔لاہور)

کرنے کو جب کچھ نہیں ہوتا
تو ہم سونے چلے جاتے ہیں
(سنبل ماہین ط.....راولپنڈی)

کبھی تو سوچتا ہوں اپنے دل کو آگ لگا کر
دور کھڑے ہو کر صرف تماشا دیکھوں
(وقاص احمد.....راولپنڈی)

مجھے پڑھو تو ذرا احتیاط سے پڑھنا
خود اپنی ذات میں بکھری ہوئی کتاب ہوں میں
(ماہم بلوچ۔راولپنڈی)

جینا تو ہم بھی نہیں چاہتے اس درد بھری دنیا میں دوست
بس کوئی تو ہے جس کے انتظار میں زندگی گزر رہی ہے
(صدام حسین۔روڈ کھل)

آنکھوں میں رہا دل میں اتر کر نہیں دیکھا
صحرا کے مسافر نے سمندر نہیں دیکھا
پتھر مجھے کہتا ہے میرا چاہنے والا
میں موم ہوں اس نے مجھے چھو کر نہیں دیکھا
(کاشف حمید کاوش۔بٹ گرام)

☆☆

تھکے جو پاؤں مسافر تمام رونے لگے
کیا قیام تو منزل سے دور ہونے لگے
جو لوگ کر نہ سکے انتظار کی زحمت
دلوں میں اپنے وہ نفرت کے بیج بونے لگے
نجانے اس کی نگاہوں میں بھی کشش کیسی
جو بن سکا نہ ہمارا اس کے ہونے لگے
لہو کے آنسو برسنے لگے ان آنکھوں سے
وہ داغ خون کے جب پیرہن سے دھونے لگے
قدم قدم پہ مجھے دکھ جنہوں نے دان کیے
مری لحد پہ وہی لوگ آکے رونے لگے
یہ مرحلہ بھی محبت میں ہم پہ گزرا ہے
ابھی نہ پایا تھا جس کو اسے ہی کھونے لگے
کسی نے چھین لی آنکھوں سے روشنی میری
وہ ایک رات مرے رو برو جب رونے لگے
حکیم مجھ پہ خدا کا جب امتحان آیا
تمام دوست مرے مجھ سے دور ہونے لگے
(حکیم خان حکیم-کامل پور موسیٰ، اٹک)

تجھ سے تجھ کو مانگنے ایک جذبہ محکم لئے
ہم تیری محفل میں آئے دیدہ پرنم لئے
جو فراق انجام پر تھا ملاقات پر منحصر
آج تک ہیں ہم نگاہوں میں وہی عالم لئے
بحر غم سے ناتواں، کشتی نظر زیست
پھر بھی احسان ناخدا کے ہم نے کم سے کم لئے
میں مجسم درد غم ہوں کرب کی تصویر ہوں
دل کے ویرانے میں صدہا داستان غم لئے
اب مسرت کی طلب ایک خوب صورت پھول ہے
ساری دنیا جب ہے دامن میں فضائے غم لئے
کررہا ہے ابن آدم ابن آدم کا شکار
اب کلاشنکوف ہاتھوں میں اٹھائے ہم لئے
ہو رہی تھی دائمی تقسیم واجد جب روز ازل
ہم نے واجد شادمان کے بجائے غم لئے
(پروفیسر ڈاکٹر واجد نگینوی.....کراچی)

نظریں بدلی ہیں تو نے آنسوؤں کے چراغ جلتے ہیں
بچھڑ کے ہم سے جانے والے کب واپس آتے ہیں
کسی نے دیا ہے میری وفاؤں کا صلہ اشکوں میں
دل توڑ کے جانے والے کب پھر ساتھ چلتے ہیں
زمانے میں جو قسمیں کھاتے رہے ہمیشہ ساتھ نبھانے کی
آنکھ کھلتے ہی اپنے خواب پھر آنسوؤں میں ڈھلتے ہیں
جس نے کھائی تھی قسم ساتھ قدم ملا کے چلنے کی
چرائی ہیں ایسی نگاہیں ویرانے میں پھول کھلتے ہیں
مہکتے ہیں کسی کی یاد میں جب پھول زمانے میں جاوید
گزر رہی جائے گی اندھیری شب جیسے بچھڑ کے لوگ ملتے ہیں
(محمد اسلم جاوید-فیصل آباد)

میری ان بے زبان باتوں کو سمجھ سکو تو سمجھو
میرے ان خاموش جذباتوں کو سمجھ سکو تو سمجھو
مجھے تم سے پیار ہے لو یہ تم سے کہہ دیا
میرے چھپے ہوئے خلوص کو ان الفاظ میں سمجھ سکو تو سمجھو
بہانے بہانے سے تیرا دیدار کرنے کو جی میں آتا ہے
میری ان ملاقاتوں کو سمجھ سکو تو سمجھو
میں بات بے بات جو تیرے سامنے مسکراتا ہوں
میری ان مسکراہٹوں کو سمجھ سکو تو سمجھو
تجھے اگر کانٹا بھی چبھوئے تو درد سے میں بلک اٹھتا ہوں
میرے ان احساساتوں کو سمجھ سکو تو سمجھو
ترے بن شاہد اب کچھ تو اچھا نہیں لگتا
میرے دل کی ان باتوں کو سمجھ سکو تو سمجھو
(رابعہ امانت علی-لاہور)

وابستہ ہے ہماری مدینے سے زندگی
ہم نے لگا کے رکھی ہے سینے سے زندگی
خوشبو یونہی بسی نہیں دونوں جہاں میں

پائی ہے سب نے ان کے پسینے سے زندگی
طاری ہر ایک سمت پہ ہے موت کا سماں
آتی ہے ان کے پیار میں جینے سے زندگی
دست کرم سے ان کے بہت سہل ہوئی
ورنہ گزرتی کیسے اپنے سے زندگی
قمر دل میں شیرینی کا خیال ہے
بڑھ کر چمک رہی ہے نگینے سے زندگی
(چوہدری قمر علی جہاں پوری-ملتان)

جو چیز اچھی لگے اسے ہم چھوا نہیں کرتے
جیسے دکھتے ہیں لوگ ویسے ہوا نہیں کرتے
لوگ تو برے کو صرف برا ہی کہتے ہیں
اسے ہدایت کی لیکن کبھی دعا نہیں کرتے
زخم پر نمک چھڑکنے والے تو ملتے ہیں بہت
پر درد کی جانے لوگ کیوں دوا نہیں کرتے
مت کر یقین کسی کی باتوں پر اے ناداں
دغوے دار لوگ ہیں اکثر وفا نہیں کرتے
اب بھلا بھی دے کاشف اس بے درد کو
اتنا بھی کسی کو ٹوٹ کر چاہا نہیں کرتے
(کاشف حسینی-شکارپور)

ظرف ہے ساگروں سا پھر بھی بے قرار بہت
میری لہروں کو ساحلوں کا انتظار بہت
میری وحشت میری وسعت فریب ہے شاید
سوچتا ہوں نہیں سکون خلفشار بہت
پیاس آجائے تو رکنا نہیں آگے بڑھنا
راہ میں پیار کی اشکوں اشکبار بہت
ڈھونڈنے نکلا خدا کو جو زمانے کا ستا
جسم نے روکے کہا اس میں بھی آزار بہت
گلگلشن عشق میں کس طرح بہاریں آئیں
باغبان روٹھے ہیں تو بھنورے ستم گار بہت
کبھی سراہنا بھولے قصائی بن بیٹھے
حسن رسوائی کے زنداں میں شرمسار بہت
(ذیشان کاظمی-نارووال)

لٹایا ہم نے جن کے واسطے گھر بار اپنا
اس نے جینا یارو کردیا دشوار اپنا
بھنور میں پھنس گئی ہے آرزو کی ناؤ اپنی
کہاں پر کھوگیا ہے دیکھئے منجدھار اپنا
دیئے جاتا ہے ہم کو زخم ہنسی چپکے چپکے
نہ جانے کون دشمن ہے پس دیوار اپنا
سلامت تازگی ہر دم رہے اپنی وفا پر
کسی صورت نہ مرجھائے کبھی یہ پیار اپنا
ذرا سا دیکھنے سے مچل جاتا ہے وہ یارو
کبھی خالی گیا نہ آج تک کبھی وار اپنا
نہ ہرگز ہم کریں رانا کبھی نفرت کی باتیں
زمانے میں مثالی ہو یہی کردار اپنا
(شرف الدین جیلانی.....ٹھنڈو الہ یار)

سوال منزل جواب رستے اور بس سفر ہے
دل مسافر مان جا اب تو در بدر ہے
نہ کوئی ساتھی نہ کوئی اپنا ہے میری راہگزر میں
اس سفر میں فقط تنہائی میری راہبر ہے
راہ الفت میں کھو جانے والے پھر کہاں ہیں ملتے
کہا تھا تجھ سے دل ناداں یہ راہ پر خطر ہے
میں جس کی خاطر چھوڑ آئی ہوں معیار اپنا
اسے نہ جانے میری وفا سے پھر کیسا ڈر ہے
جہاں فریب یار میں سب اجڑ گیا
دل نامراد وہ شہر بنجر ہے
(شائستہ سحر.....راولپنڈی)

جو لکھ سکو تو یہ ساری کہانیاں لکھنا
یہاں پر لٹتی رہی ہیں جوانیاں لکھنا
غریب شہر کو ملتی نہیں ہے روٹی بھی
امیر شہر کی شطعہ بیانیاں لکھنا
دروغ گوئی کو ہم نے فروغ بخشا ہے
نشانیوں میں ہماری نشانیاں لکھنا
چمن میں تازہ گلابوں کی آنکھ میں آنسو
ملے ہیں درد دل کی یہ ترجمانیاں لکھنا

جہاں پہ اہل دل کی عیاشاں لکھو
وہیں غریب کی سب جاں فشانیاں لکھنا
ہمارے دور میں سب کچھ ہی ٹھیک چلتا ہے
ہمارے دور کی سب کامرانیاں لکھنا
ہمارے اہل سیاست کی بات بھی کرنا
اور ان کی قوم پر سب مہربانیاں لکھنا
(ریاض حسین قمر.....منگلا ڈیم)

کتنے حسین تیری یادوں کے سہارے ہوتے
جیسے چاندنی رات میں روشن ستارے ہوتے
آپ ہم سے ہی اگر محبت کرتے گلبدن
پھر کبھی نہ ہم دردِ فرقت کے مارے ہوتے
تم بھٹک گئی ہو چھوڑ کر ہمیں نہ سمجھ
ڈوبنے نہ دیتے ہم ساحل کنارے ہوتے
خاک میں مل جاؤ گی، دھندلی تصویر کی طرح
کاش تیری آنکھوں کے کچھ اور اشارے ہوتے
روک لیتے ہم بھی اپنے قدموں کو بے وفا
مگر تیرے عشق میں نہ مارے مارے ہوتے
(محمد اسحاق انجم.....کنگن پور)

نگاہیں راستہ دیکھیں تمہارا لوٹ آؤ نا
تمہارے بن نہیں ہوتا گزارا لوٹ آؤ نا
بچھڑ کے یار تجھ سے زندگی پل پل تڑپتی ہے
کہ تم بھی اب نہیں جینا گوارا لوٹ آؤ نا
مجھے ڈر ہے کہ ان تنہائیوں میں ٹوٹ جاؤں گا
ہے بس تیری محبت کا سہارا لوٹ آؤ نا
تم ہی تو زندگی ہو پیار ہو دنیا ہماری ہو
سوا تیرے نہیں کوئی ہمارا لوٹ آؤ نا
(صدام حسین.....روڈہ تھل)

قلم اداس ہے الفاظ مل نہیں پاتے
بیان حق جو کرے ہم وہ دل نہیں پاتے
ہمیں بھی شوق رفوگر کا ہو چلا تھا مگر
گریباں چاک ہوتے ہیں جو سل نہیں پاتے
اگرچہ آتے بہت بھی بہار کے موسم
چمن کے پھول مگر پھر بھی کھل نہیں پاتے
بتان رنگ و نسل ہم سجائے بیٹھے ہیں
ہم ایک ہو کے بھی آپس میں مل نہیں پاتے
صنم تراش سے شکوہ کریں تو کیا حاصل
کہ راز ہیں وہ مجسم جو ہل نہیں پاتے
(انتخاب: کاشف عبید کاوش.....بگرام)

وہ میرے دل کا قرار تھا، مجھے اس سے ہی پیار تھا
جسے دیکھتے ہی دل دھڑک اٹھا، کیا مصوری کا شاہکار تھا
اس لئے بھی محبت ہماری تادیر نہ ساتھ چل سکی
میرے پاس وفا کے سکے تھے، دولت اس کا معیار تھا
غم روزگار بھی تھا لاحق مجھے، غم یار کے ساتھ ساتھ
مجھے ڈوبنا تو تھا ہی، میں جو دو کشتیوں کا سوار تھا
اس کا ملنا مجھ کو ثمر، دیوانے کے خواب مانند تھا
میری کشتی میں سو چھید تھے، وہ دریا کے اس پار تھا
(ایم ایم ثمر.....ہری پور)

بکھرتی ریت پہ کس نقش کا آغاز رکھے گا
وہ مجھ کو یاد رکھے بھی تو کتنا یاد رکھے گا
اسے بنیاد رکھنی ہے اب دل میں محبت کی
مگر یہ پتھر سینے پر وہ میرے بعد رکھے گا
پلٹ کر بھی نہیں دیکھی تیری یہ بے رخی ہم نے
بھلادیں گے ایسا کہ تو بھی یاد رکھے گا
بھلادیا میری محبت کو خواب سمجھ کر
سوچ میرے بن کیسے دل اپنا شاد رکھے گا
باغبان کو ہے خود سے زیادہ فکر گلشن کی
جان دے کر بھی وہ گلستان کو آباد رکھے گا
وقت رخصت اس نے توڑ دیئے بھرم وفا کے
اب کس منہ سے نئے رشتے کی بنیاد رکھے گا
صائم تم بھی اب اپنے زور بازو پہ جینا سیکھ لو
آخر کب تک کوئی کسی کو اپنے گھر میں داماد رکھے گا
(ظہور احمد صائم.....مانگا منڈی۔لاہور)

☆☆

ستارے چھپ گئے سارے کچھ تو رحم کرو اے جاناں! اور جب وہ سوجاتا ہے
نظارے چھپ گئے سارے راتوں کی کیوں نیند اڑادی تو عجب سا درد ہوتا ہے
سفینہ کس طرح جائے (مہر پرویز احمد دولوسیاں چنوں) اگر وہ چھوڑ جائے گا
کنارے چھپ گئے سارے
وہ دیکھو یار مشکل میں عاشقوں نے ایک خواب دیکھا ہوگا میرا دل بھی توڑ جائے گا
ہمارے چھپ گئے سارے تب یہ تیرا شباب بنا ہوگا میرے دل کی حویلی میں پھر
اٹھا طوفان پھر ایسا نے کشوں نے دعا کی ہوگی اندھیرا ہی اندھیرا ہے
سہارے چھپ گئے سارے تب یہ کم سن حجاب بنا ہوگا راج اب اپنی قسمت کا
ہوا در بند کیا رانا آرزو موسموں کی ہوگی فیصلہ اس پر چھوڑا ہے
اشارے چھپ گئے سارے تب لبوں کا گلاب کھلا ہوا (سید عبادت راج۔ڈیرہ اسماعیل خان)
(قدیر رانا۔راولپنڈی)

اک دن تو پچھتائے گی تو نے انگڑائیاں لی ہوں گی وعدہ کرو تم ہم سے
جب یاد میری تمہیں آئے گی تب نشہ بے حساب بنا ہوگا ہم کو بھول تو نہیں جاؤ گے
کسی اور کو چاہا گر میں نے (احسان سحر۔سیانوالی) دور جا کے تم ہم سے
احساس تمہیں تب آئے گی عکس ہو اور خوش نگیں ہو تم بیتے لمحوں کو بھول تو نہیں جاؤ گے
چھوڑ دے اب اس بے رخی کو آئینے سے بہت حسیں ہو تم وعدہ کرو تم ہم سے
کب تک مجھ کو ستائے گی بھاتپ لیتی ہو میری نظروں کو وہ ہنستے مسکراتے چہرے
اک بات مجھے بتلادے تو کس قیامت کے نکتہ چیں ہو تم وہ اسکول ٹائم کی یادیں
کس کس کو پاگل بنائے گی دیکھ سکتا ہوں چھو نہیں سکتا ان لمحوں کو بھول تو نہیں جاؤ گے
مری بھول ہے یا حقیقت اویس کیا مرے خواب کے مکیں ہو تم وعدہ کرو تم ہم سے
اسے شاعری مری بھا جائے گی یہ ستارے یہ پھول اور یہ دھنک (رابعہ عباس۔بستی فتے والی)
(اویس نور گڈانی۔میر پور ماتھیلو) کچھ نہیں ہے اگر نہیں ہو تم
ورنہ میں کیا تھا، اک گمان تھا میں ہجوم بے درد کے ماروں کا
ورنہ تم کیا تھی، اب یقیں ہو تم قافلہ ہے آسمان پہ تاروں کا
گئے دنوں کی یاد بھلادی رنگ دل میں اتر جاتا ہے پاؤں تلے مسل دیتے ہیں پھول
یوں بھی خود کو میں نے سزا دی آخری پھول تو نہیں ہو تم حوصلہ ہے کتنا آج کل کے دلداروں کا
مانا تم ہو زر کے مالک خواب ہو یا خیال ہو ماہی پوچھ لیتا ہوں ہر مسافر سے
ظرف تیری اوقات دکھادی حسن مخملی ہو نازنیں ہو تم فاصلہ ہے کتنا گزرتی رہگزاروں کا
انا میری کو مجروح کرکے (محمد ندیم عباس میوانی۔چوکی) شام ہوتے ہی بجھ جاتے ہیں چراغ
محفل کی کیا شان بڑھادی کتنا فریب سہی رنگ ہے ان نظاروں کا
برسوں پرانے یارانے کی میرے دکھی حویلی میں زخمی ہے ہر ایک تمنا سلے ہیں ہونٹ بھی
پل بھر میں ہے خاک اڑادی بس ایک ہی شخص رہتا ہے کیسے ان سے پوچھوں حال میں بہاروں کا
مفلوک الحال ہو کر بھی میں بس وہی سنتا ہوں جاوید گزر رہی ہے زندگی آہستہ آہستہ
ہم نے رسم وفا نبھادی جو دلبر مجھ سے کہتا ہے چھوڑ آئے ہیں نشان راہ میں یادگاروں کا
(محمد اسلم جاوید۔فیصل آباد)

جن زادی

ضرغام محمود۔کراچی

دھان پان سی خوبرو دوشیزہ چارپائی پر بیٹھی تھی اور وہ اپنی انگارہ برستی خونخوار نگاھوں سے سب کو گھور رھی تھی کہ پھر وہ بپھرے ھوئے انداز سے اٹھی اور جھینپ کر سامنے موجود پھلوان نما جوان کی گردن پکڑلی اور پھر.....

دل ودماغ کوفرحت بخشتی اچھوتی، انوکھی دلکش، دل فریب رائٹر کے قلم کی شاہکار کہانی

وہ کسی سوکھے پتے کی طرح حالات کے تھپیڑے کھاتا ہوا دربدر بھٹک رہا تھا اس کا نام شریف احمد تھا، شریف احمد کے باپ نے شریف احمد کا نام رکھتے ہوئے کبھی یہ نہیں سوچا ہوگا کہ اس کا بیٹا اپنے نام کی طرح اتنا شریف اور ایماندار ہو جائے گا کہ اپنی شرافت اور سچائی سے ایک دنیا کو اپنا دشمن بنالے گا شریف اور ایماندار ہونا اچھی بات ہے مگر اس تک جب تک اپنا نقصان نہ ہوتا ہو اور جب اپنے نقصان کا اندیشہ ہو تو موجودہ زمانے میں شرافت میں ذلالت کی ملاوٹ بری بات نہیں سمجھی جاتی مگر وہ یہ بات نہیں سمجھتا تھا اور موقع بے موقع سچی بات کہہ کہہ کر اس نے سارے زمانے کو اپنا دشمن بنالیا تھا اسی واسطے سوکھے پتے کی طرح جگہ جگہ حالات کے تھپیڑے کھاتا جارہا تھا اور دربدر بھٹک رہا تھا۔

چلتے چلتے شریف احمد کی ٹانگیں تھک گئی تھیں وہ کئی دن کا بھوکا تھا اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا رہا تھا صحت اس کی پہلے ہی ایسی تھی کہ لگتا تھا کسی بانس کو کپڑے پہنا دیئے گئے ہوں، وہ پانی بھی پیتا تھا تو وہ پانی اس کے خالی پیٹ میں ہلتا ہوا محسوس ہوتا تھا اور اب تو کل سے اس کے حلق میں پانی کا ایک قطرہ بھی نہیں گیا تھا اس کے سوکھے حلق میں کانٹے چبھ رہے تھے اوپر سے سورج بھی اس کا ایمان آزما رہا تھا سورج کی تیز کرنیں اس کے سوکھے بدن میں برچھیوں کی طرح کھب رہی تھیں، شریف احمد کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا اور وہ لڑکھڑا کر زمین پر گر پڑا۔۔۔زمین پر گرتے ہوئے اسے حیرت ہوئی کینے آدمی کو گرنے کے لئے بہت جگہیں ملتی ہیں مگر شریف اور ایماندار آدمی کو گرنے کے لئے بھی پاک وصاف جگہ چاہیے ہوتی ہے۔۔۔

اسی لئے شریف احمد کو اپنے گرنے پر تعجب ہو رہا تھا وہ جہاں گرا تھا وہ ایک دروازہ تھا شریف احمد دروازہ پکڑ کر کھڑا ہو گیا اس نے سر اٹھا کر دروازے کی جانب دیکھا وہ دروازہ ایک مسجد کا تھا مگر اس دروازے پر بڑا سا تالا لگا ہوا تھا۔شریف احمد کی حالت بہت بری تھی بھوک کی وجہ سے اس کے پیٹ میں ٹیسیں اٹھ رہی تھیں ایسے وقت میں آدمی صرف اور صرف روٹی کا سوچتا ہے مگر وہ سچا اور شریف آدمی تھا پکا مسلمان تھا اس نے مسجد کے بند دروازے کو حیرت سے دیکھا اور سوچنے لگا۔

"یہ دروازہ کیوں بند ہے ظہر کی نماز کا وقت ہوا جاتا ہے نمازی کہاں ہیں۔۔۔" یہ تمام سوالات شریف احمد کے ذہن میں اٹھ رہے تھے اسی وقت کسی شخص نے شریف احمد کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"کون ہو بھائی۔۔۔"؟ اس شخص نے محبت بھرے انداز میں پوچھا۔

"اللہ کا ایک عاجز بندہ۔۔" شریف احمد نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے جواب دیا۔

"حلیے سے مولوی معلوم پڑتے ہو۔۔۔کیا تم نماز پڑھا سکتے ہو۔۔؟" اس آدمی نے پھر پوچھا۔

"نماز پڑھانا تو ایک سعادت کی بات ہے۔۔" شریف احمد نے آہستہ آواز میں جواب دیا بھوک کی شدت کی وجہ سے اس کی آواز اس کے اپنے حلق میں گھٹ رہی تھی۔

"کیا نام ہے تمہارا۔۔؟"

"شریف احمد۔۔۔"

"میرا نام خدا بخش ہے مسجد کے ساتھ والے مکان میں رہتا ہوں اور اس گوٹھ (گاؤں) کی پنچایت کا سرپنچ بھی ہوں۔" اس شخص نے اپنا تعارف کروایا۔

"اچھا نام ہے خدا بخش۔۔۔تو بھائی خدا بخش یہ مسجد کیوں بند ہے یہاں نماز کیوں نہیں ہو رہی ہے۔۔۔ظہر کا وقت ہوا چاہتا ہے۔" شریف احمد نے ایک ساتھ کئی سوال کر دیئے۔

"آہ۔۔۔کیا پوچھتے ہو مولوی صاحب۔۔۔۔ایک ہفتے سے مسجد بند ہے یہاں جو مولوی پہلے نماز پڑھاتا تھا وہ بدبخت ایک بچے کے ساتھ۔۔۔بس کیا بتاؤں۔۔۔کہتے بھی لاج آتی ہے۔۔شیطان بھی کیسے کیسے بہروپ بدلتا ہے۔۔" خدا بخش نے لاچارگی سے جواب دیا ساتھ ہی شریف احمد کو مولوی کا لقب بھی دے ڈالا۔

"شیطان بہت فریبی ہے نہ جانے کس کس روپ میں وار کر جائے۔۔۔۔" شریف احمد نے جواب دیا۔

"کیا آپ ہماری مسجد میں نماز پڑھا دیا کریں گے۔۔"؟ خدا بخش نے ایک بار پھر شریف احمد سے پوچھا۔

"ہاں۔۔ہاں ضرور۔۔۔آپ مجھے ایک گلاس پانی پلا دیجئے۔۔ظہر کا وقت ہوا جاتا ہے میں اذان دے کر نماز کا اعلان کرتا ہوں۔۔" شریف احمد نحیف آواز میں جواب دیا۔

"آپ کے چہرے سے لگ رہا ہے کہ آپ کئی روز کے بھوکے ہیں۔۔۔پہلے آپ روٹی شوٹی کھا لیجئے پھر اذان دیجئے گا۔۔" خدا بخش شریف احمد کے چہرے کی زردی دیکھتے ہوئے بولا۔

"نماز پڑھنے یا پڑھانے کے لئے روٹی کی نہیں ایمان کی ضرورت ہوتی ہے میں نماز پڑھانے کے بعد ہی روٹی کھاؤں گا۔۔"

"واہ کیا بات ہے۔۔۔آپ۔۔آپ فرشتہ ہیں۔۔" اتنا کہہ کے خدا بخش نے اپنی جیب سے ایک چابی نکالی اور مسجد کے دروازے پر لگے تالے کے سوراخ میں وہ چابی ڈالی اور گھمائی۔۔کٹک کی آواز کے ساتھ تالا کھل گیا تالا کھولنے کے بعد خدا بخش نے مسجد کا دروازہ کھولا

دروازہ کھولتے ہی شریف احمد مسجد میں داخل ہو گیا اتنی دیر میں خدا بخش ایک گلاس میں ٹھنڈا پانی لے آیا شریف احمد مسجد کے فرش پر بیٹھ گیا اور بسم اللہ کہہ کر گلاس منہ سے لگا لیا اور پانی پینے لگا ٹھنڈا پانی پینے سے شریف احمد کے خالی پیٹ میں اینٹھن ہونے لگی پانی ٹھنڈک تو پہنچا رہا تھا مگر بھوک نہیں مٹا رہا تھا نقاہت سے شریف احمد کی آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔

"بس نماز کے بعد تو روٹی مل جائے گی۔۔"

شریف احمد کے ذہن میں سوچ ابھری اپنی اس سوچ کے بارے میں سوچ کر شریف احمد گھبرا گیا اور توبہ توبہ کرنے لگا شریف احمد کو اپنی یہ سوچ بہت غلط محسوس ہوئی۔

توبہ کرنے کے بعد شریف احمد نے وضو کیا اور اذان دی۔۔اذان کی آواز جیسے ہی گاؤں میں گونجی گاؤں کے کئی مرد نماز پڑھنے مسجد کی جانب چلدیئے شریف احمد کی آواز میں ایک سوز تھا اس کی اذان گاؤں کے ہر شخص کے دل میں اترتی جا رہی تھی اذان ختم ہونے تک کئی نمازی مسجد کے صحن میں جمع ہو چکے تھے سب لوگوں نے نئے مولوی کی آمد پر خوشی کا اظہار کیا اور شریف احمد سے ہاتھ ملایا شریف احمد نے نہایت خوشدلی سے سب کے ساتھ مصافحہ کیا گاؤں کے لوگوں نے یہ بات خاص طور پر محسوس کی کہ نیا مولوی جوان ہے مگر بہت کمزور ہے کمزوری کی وجہ سے اس کا گورا رنگ ٹیالہ پڑ چکا ہے اس کی سیاہ داڑھی گرد آلود ہو رہی ہے جوان ہونے کے باوجود نئے مولوی کی آنکھ میں شرم ہے۔

نماز پڑھانے کے بعد خدا بخش خود اپنے گھر سے کھانا لے کر آیا اور شریف احمد کے سامنے کھانا رکھتے ہوئے بولا "مولوی صاحب۔۔آپ بھوکے ہیں پہلے مانی (کھانا) کھا لیجئے پھر باتیں ہونگی۔۔"

"آپ نے کھانا کھا لیا۔۔" شریف احمد نے خدا بخش سے پوچھا۔

"جی ہاں۔۔میں نے ہی نہیں میرے گھر والے بھی کھانا کھا چکے ہیں۔۔" خدا بخش نے جواب دیا۔

"بھائیں۔۔آپ لوگ میرے ساتھ کھانے میں ساتھ دیجئے۔۔۔" شریف احمد نے مسجد میں کھڑے دیگر افراد کو مخاطب کیا۔

"الحمدللہ۔۔ہم سب کھانا کھا چکے ہیں۔۔"

یہ سن کر شریف احمد نے بسم اللہ پڑھ کر کھانا شروع کیا کئی دن بعد اسے کھانا ملا تھا لہذا ہر نوالہ اس کے حلق میں پھنس رہا تھا شریف احمد نے نوالوں کو پانی کے گھونٹ سے پیٹ میں اتارنا شروع کیا۔

"مولوی صاحب۔۔۔مسجد کے ساتھ ایک کمرہ بنا ہوا ہے۔۔آپ وہاں رہائش اختیار کر سکتے ہے۔۔" کھانے کے بعد خدا بخش نے شریف احمد سے کہا۔

"میں مسجد میں نماز پڑھانے کے علاوہ بچوں کو قرآن بھی پڑھاؤنگا۔۔اور ان کو دنیاوی تعلیم بھی دونگا۔۔گاؤں والوں سے کہہ دینا کہ بچوں کو تعلیم کے لئے صبح مسجد بھیج دیں۔۔"

"ماشاء اللہ۔۔اللہ آپ کو جزا دے۔" خدا بخش نے جواب دیا پھر تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد بولا۔ "میرے ملازم نے کمرہ صاف کر دیا ہے آپ تھوڑی دیر آرام کر لیجئے۔۔۔پھر عصر میں آپ سے ملاقات ہو گی۔۔" خدا بخش نے کہا اور شریف احمد کو ساتھ لیکر مسجد سے ملحق کمرے میں گیا۔

کمرے میں پہنچ کر شریف احمد نے کمرے کا جائزہ لیا کمرہ کافی کشادہ تھا کمرے کے ایک جانب چارپائی پر صاف ستھرا بستر بچھا ہوا تھا بستر پر رنگ برنگی رلی (سندھی چادر) بچھی ہوئی تھی کمرے کے ایک کونے میں ایک مٹکا دھرا ہوا تھا مٹکا کے اوپر ایک گلاس بھی رکھا ہوا تھا۔ چارپائی کے نیچے ایک ٹین کا چھوٹا بکسا بھی رکھا ہوا تھا چارپائی کے سرہانے کتب رکھا ہوا تھا جس پر قلم دوات اور چند کاغذات رکھے ہوئے تھے۔

"ٹھیک ہے مولوی صاحب اب آپ آرام کیجئے۔۔" اتنا کہہ کر خدا بخش کمرے سے باہر چلا گیا خدا بخش کے جانے کے بعد شریف احمد نے دوبارہ کمرے کا جائزہ لیا کمرے میں مغرب کی جانب ایک کھڑکی تھی جو بند تھی شریف احمد کو بس محسوس ہوا تو اس نے آگے بڑھ کر بند کھڑکی کے پٹ کھولے اور باہر جھانکا باہر دیکھتے ہی شریف احمد کی نظریں بے اختیار جھک گئیں اس نے جلدی سے کھڑکی کے پٹ بند کر دیئے کیونکہ کھڑکی سے خدا بخش کے گھر کا صحن صاف نظر آ رہا تھا اور وہاں ایک جوان لڑکی صحن میں جھاڑو دے رہی تھی جیسے ہی شریف احمد نے کھڑکی کھولی تو اس کی نظریں اس لڑکی سے ٹکرا گئیں لہذا بوکھلا کر شریف احمد نے کھڑکی بند کر دی شریف احمد کی یہ حرکت لڑکی نے بھی دیکھ لی اور اس کے منہ سے ایک زوردار قہقہہ نکل گیا۔

شریف احمد کھڑکی بند کر کے بستر پر آ کر بیٹھ گیا اس کی آنکھیں بند ہو رہی تھیں وہ آرام سے بستر پر لیٹ گیا اور آنکھیں بند کر لیں مگر آنکھیں بند کرتے ہی شریف احمد بوکھلا کر اٹھ بیٹھا کیونکہ آنکھیں بند کرتے ہی وہ جھاڑو والی اس کے دماغ میں گھس آئی۔

"توبہ۔۔توبہ۔۔۔" شریف احمد نے اپنے گال پیٹ لئے پرائی بہو بیٹیوں کو دیکھنا بہت بڑی برائی ہے اور برائی سے گناہ ملتا ہے شریف احمد کو یہی سکھایا گیا تھا۔۔

...م دیتا انہیں دنیاوی علم بھی سکھاتا ... بچوں کو قرآن کی ایمان کی باتیں بتاتا چند ماہ میں ہی سارے گاؤں میں اس کی عزت ہونے لگی وہ جہاں سے گزرتا سب اسے جھک کر سلام کرتے گاؤں کی خواتین کو دیکھتے ہی شریف احمد کی نظریں جھک جاتیں وہ کبھی عورتوں کو نظر اٹھا کر نہیں دیکھتا گاؤں کی عورتیں سرگوشیاں کرتیں کہ نیا مولوی جوان ہے مگر نیت کا کھوٹا نہیں ہے پرائی بہو بیٹیوں کو آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتا شریف احمد کی بھی کوشش ہوتی کہ کسی عورت پر اس کی نظر نہ پڑے خدا بخش کی بیٹی اسے کبھی کبھی گاؤں کے کنویں پر نظر آتی وہ بہت شوخ لڑکی تھی اکثر شریف احمد اس کے مذاق کا نشانہ بنتا مگر شریف احمد نے کبھی اس کے کسی مذاق کا جواب نہیں دیا ورنہ اس کا دل اس لڑکی کی جانب کھینچ رہا تھا پہلے دن کے بعد شریف احمد نے اپنے کمرے کی کھڑکی دوبارہ نہیں کھولی وہ ساری ساری رات گرمی اور حبس میں گزار دیتا مگر کھڑکی نہ کھولتا۔۔۔۔لیکن وہ کھڑکی والی اتنی شریر تھی کہ شریف احمد کی آنکھیں بند ہوتے ہی اس کے سپنوں میں گھس آتی اور بے چارہ شریف احمد ہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھتا۔

ہر نماز کے بعد شریف احمد اللہ سے گڑ گڑا کر دعا مانگتا۔

"اے اللہ۔۔۔۔اے خالق کائنات۔۔۔اے تمام انسانوں کے پالن ہار۔۔۔تو۔۔۔تو جانتا ہے کہ میری نیت میں کوئی کھوٹ نہیں ہے میں نے زندگی کی تمام آسائشیں تیری خوشنودی کے لئے ترک کر دی ہیں۔۔۔مگر یہ منہ زور جوانی پیچھا نہیں چھوڑتی۔۔۔نفس مجھے بار بار بہکاتا ہے۔۔۔اے خدا۔۔۔جب تک میں کسی شریف زادی سے نکاح نہ کرلوں تو۔۔۔تو میری حفاظت فرما اور مجھے ہر قسم کے گناہ سے بچا میرے مولا۔۔۔۔میرے پالن ہار۔۔۔اے پروردگار تو میری مدد فرما۔۔۔میرے معبود۔۔۔" روتے روتے شریف کی داڑھی آنسوؤں سے تر ہو جاتی۔

...اکثر راتیں آنکھوں ہی آنکھوں میں کٹنے لگیں اسے آنکھیں بند کرنے سے ڈر لگنے لگا تھا۔

شریف احمد کو اس گاؤں میں رہتے چھ ماہ ہو گئے تھے اس گاؤں میں اسے کوئی تکلیف نہیں تھی سوائے اس جھاڑو والی کے جو ہر موقع بے موقع اس کے سپنوں میں آجاتی تھی گاؤں کے لوگ بہت نفیس اور مہربان تھے اور شریف احمد کی بہت عزت کرتے تھے خاص طور پر خدا بخش شریف احمد کی بہت عزت کرتا تھا آج بھی اکثر اوقات شریف احمد کا کھانا اسی کے گھر سے آتا تھا اس گاؤں میں رہتے ہوئے شریف احمد کو معلوم ہوا کہ وہ جھاڑو والی خدا بخش کی بیٹی ہے اس کے علاوہ خدا بخش کا ایک چھوٹا بیٹا بھی ہے خدا بخش کی تھوڑی بہت زمینداری ہے اور وہ اس گاؤں کی پنچائیت کا سرپنچ ہے۔ پنچائیت میں سرپنچ کی حیثیت سے وہ فیصلے پورے انصاف کے ساتھ کرتا ہے اسی لئے گاؤں والے اسے پسند کرتے ہیں اور وہ گاؤں میں کافی مقبول ہے۔

ایک دن عصر کی نماز کے بعد خدا بخش گھبرایا ہوا مسجد آیا، شریف احمد مسجد میں بیٹھا قرآن پاک کی تلاوت کر رہا تھا، خدا بخش شریف احمد کے قریب آیا اور ادب سے سلام کرنے کے بعد بولا۔

"مولوی بیٹا۔۔۔۔ذرا میرے بیٹے ہاشو کو دیکھ لو اس پر کوئی جن بھوت آ گیا ہے۔۔"

"جن بھوت۔۔۔" شریف احمد نے حیرت سے خدا بخش کا جملہ دہرایا۔

"ہاں کل رات کو ہاشم بخش جسے ہم لوگ پیار سے ہاشو کہتے ہیں ہاشو کل رات کو سکون سے سویا تھا مگر صبح جب اٹھا تو سر میں درد کی شکایت کر رہا تھا اس کی ماں نے تیل لگا کر اس کے سر کی مالش کی بس اس کے بعد سے ہاشو عجیب عجیب حرکتیں کرنے لگا اس نے گھر کا سارا سامان نکال کر باہر پھینک دیا پانی کی بھاری ٹنکی اس نے اپنے ہاتھوں میں اٹھا لی کبھی وہ دیواروں پر بغیر کسی سہارے کے چلنے لگتا ہے اور کبھی اپنا سر دیواروں سے ٹکرانے لگتا ہے اس کے منہ سے عجیب وغریب آوازیں

نکل رہی ہیں۔۔جلدی چلو مولوی بیٹا۔۔۔۔۔ہاشو کی ماں بے چاری بہت پریشان ہے اس نے تو رو رو کر اپنا حشر کر لیا ہے۔۔۔" خدا بخش نے جلدی جلدی ہاشو کی صورتحال سے شریف احمد کو آگاہ کیا تو شریف احمد نے قرآن پاک بند کیا اور اونچی جگہ پر رکھا پھر اپنے کمرے سے اپنا چرمی بیگ اٹھایا اور خدا بخش کے ساتھ اس کے گھر کی جانب چل دیا۔

خدا بخش کا گھر کافی بڑا تھا مگر پورا گھر مٹی کی دیواروں سے تعمیر کیا گیا تھا دروازے سے اندر داخل ہوتے ہی کچے صحن میں مرغیاں پھرتی نظر آئیں ایک کونے پر ایک بھوری بھینس لمبی سی رسی سے بندھی ہوئی تھی اس بھینس کے قریب اس کا نوزائیدہ بچہ کھڑا تھا وہ معصوم بچہ حیران حیران نظروں سے دنیا کو دیکھ رہا تھا شائد وہ دو یا تین دن کا بچہ تھا اسی وجہ سے خدا بخش نے اس بھینس کو گھر میں باندھا ہوا تھا بڑے سے آنگن کے پار تین کمرے بنے ہوئے تھے ان کمروں کی دیواریں بھی مٹی اور گارے سے بنی ہوئی تھی خدا بخش شریف احمد کو لیکر ان کمروں کی جانب بڑھا اور ان کمروں میں سے ایک کمرے میں داخل ہو گیا شریف احمد نے کمرے میں داخل ہو کر دیکھا کہ ایک چودہ پندرہ سال کا لڑکا چارپائی پر لیٹا ہے اس لڑکے کے ہاتھ پیر چارپائی کے ساتھ بندھے ہوئے ہیں یہ ہاشو ہے خدا بخش کا بیٹا ہاشو کے سرہانے اس کی ماں بیٹھی ہوئی ہے جبکہ ہاشو کی چارپائی کے پائینتی وہ کافر ادا کھڑی تھی جس نے شریف احمد کی راتوں کی نیند چھین لی تھی۔

"یہ ہاشو کی ماں ہے۔۔" کمرے میں داخل ہونے کے بعد خدا بخش نے شریف احمد کا تعارف چارپائی کے سرہانے بیٹھی بڑی عمر کی عورت سے کرایا تو شریف احمد نے سر جھکا کر اسے سلام کیا۔

"اور یہ میری بیٹی شریفاں ہے۔۔" خدا بخش نے چارپائی کے پائینتی کھڑی لڑکی کا تعارف کرایا لڑکی نے ادب سے شریف احمد کو سلام کیا شریف احمد نے ایک لمحے کو نظر اٹھا کر شریفاں کو دیکھا پھر جلدی سے اپنی نظریں نیچے کر لیں اس ایک نظر سے شریف احمد کو اپنے دل کی دنیا ڈولتی محسوس ہو رہی تھی شریف احمد دل ہی دل میں استغفار پڑھنے لگا۔

"آپ سب ہاشو سے دور ہو جائیں۔۔اور مجھے ایک صاف گلاس میں پانی لا دیں۔" شریف احمد نے کہا۔

"جا شریفاں۔۔۔گلاس دھو کر پانی لا۔۔" خدا بخش کی بیوی نے اپنی بیٹی سے کہا تو شریفاں کمرے سے باہر چلی گئی تھوڑی دیر بعد وہ واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں شیشے کا ایک گلاس تھا جو پانی سے بھرا ہوا تھا شریفاں نے پانی سے بھرا گلاس شریف احمد کو دیا شریف احمد نے نظریں جھکاتے ہوئے شریفاں کے ہاتھ سے گلاس لیا مگر اس جھکی نظروں نے بھی شریفاں کے گورے گورے ہاتھوں کو دیکھ لیا شریف احمد پھر دل ہی دل میں استغفار پڑھنے لگا۔

"آپ لوگ دیوار کے ساتھ کھڑے ہو جائیں اور کوئی میرے کام میں دخل نہیں دے گا۔۔" شریف احمد نے کہا تو خدا بخش اس کی بیوی اور شریفاں کمرے کی کچی دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑے ہو گئے۔

جب سب لوگ ہاشو کی چارپائی سے دور ہو گئے تو شریف احمد نے ہاشو کے ہاتھ پاؤں رسی سے آزاد کر دیئے پھر شریف احمد نے سورۃ جن کی ابتدائی آیات کی تلاوت شروع کی، شریف احمد تلاوت کرنے کے ساتھ ساتھ ہاشو کی چارپائی کے گرد چکر بھی لگانے لگا، ہاتھ پیر آزاد ہوتے ہی ہاشو چارپائی پر اٹھ کر بیٹھ گیا اس نے اپنا سر اپنے سینے میں جھکا رکھا تھا شریف احمد نے دو چکر ہاشو کی چارپائی کے گرد لگائے پھر گلاس میں سے پانی ہاتھ میں لیکر اس کا چھینٹا ہاشو پر مارا، پانی کے چھینٹے جیسے ہی ہاشو پر پڑے تو ہاشو نے ایک جھٹکے سے اپنی گردن اونچی کی۔اور شریف احمد کو گھورنے لگا۔

ہاشو کی آنکھیں سرخ انگارہ بنی ہوئی تھیں ایسا لگتا تھا جیسے ہاشو کی آنکھوں سے لہو ٹپک رہا ہو، ہاشو نے اپنی خون ابلتی آنکھوں سے شریف احمد کو گھورا وہ بغیر پلک

چھپکائے شریف احمد کو گھور رہا تھا اس کی آنکھوں سے شعلے سے نکل رہے تھے، شریف احمد نے با آواز بلند قرآن کی تلاوت شروع کر دی وہ بلند آواز سے قرآن پڑھ رہا تھا تھوڑی دیر تک ہاشو شریف احمد کو گھورتا رہا پھر آہستہ آہستہ ہلنے لگا پھر اس نے اپنے سر کو زور زور سے ہلانا شروع کر دیا، جیسے جیسے شریف احمد قرآن پاک کی تلاوت کرتا جاتا ہاشو اپنے سر کو گردش دیتا جاتا۔

شریف احمد نے سورۃ جن کی تلاوت ختم کی اور پانی کا چھینٹا ہاشو کے منہ پر مارا تو ہاشو کی منہ سے ایک بھیانک چیخ نکلی، چیخ میں اتنا درد تھا کہ خدا بخش اس کی بیوی اور شریفاں دہل کر رہ گئے ان کے کلیجے منہ کو آ رہے تھے سب سے زیادہ بے چین ہاشو کی ماں تھی وہ اپنے بیٹے کو اپنے آنچل میں چھپا لینا چاہتی تھی شریف احمد نے بھی یہ بات محسوس کر لی لہذا اس نے ہاتھ کے اشارے سے ہاشو کی ماں کو منع کیا شریف احمد مزید وظائف پڑھنے لگا۔۔۔وظیفہ پڑھتے ہوئے شریف احمد نے پانی کا ایک اور چھینٹا ہاشو کے منہ پر مارا تو ہاشو کی گردش کرتی ہوئی گردن رک گئی اس نے ایک جھٹکے سے اپنی گردن اونچی کی اور شریف احمد کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گھورنے لگا پھر ہاشو کی منہ سے ایک انجانی اور کرخت آواز نکلی۔

"کون ہے تو۔۔۔کیوں مجھے تنگ کر رہا ہے۔۔"

ہاشو کے منہ سے ایک انجانی آواز سن کے خدا بخش ہاشو کی ماں اور شریفاں حیران رہ گئے ہاشو کی ماں تو اپنا دوپٹہ منہ میں ڈال کر رونے لگی۔

"تو کون ہے اس اس معصوم بچے کو کیوں تنگ کر رہا ہے۔۔" شریف احمد نے انتہائی سرد آواز میں پوچھا۔

"میں شاکا جن ہوں۔۔"

"شاکا جن۔۔" شریف احمد بڑبڑایا ہاشو کے منہ سے شاکا جن کی آواز سن کر ہاشو کی ماں اور شریفاں بلند آواز سے رونے لگیں جبکہ ہاشو کا باپ خدا بخش بھی پریشان نظر آ رہا تھا۔

"بند کرو یہ رونے کی آوازیں۔۔۔۔مجھے یہ رونے کی آوازیں بری لگتی ہیں۔۔" جن زور سے دھاڑا۔

جن کی دھاڑ سن کر ہاشو کی ماں اور شریفاں نے اپنے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لئے ان دونوں نے رونا بند کر دیا مگر ان کی آنکھوں سے آنسو مسلسل جاری تھے وہ دونوں من ہی من میں بلک رہی تھیں۔

"تو نے اس معصوم بچے کے جسم پر قبضہ کیوں کیا ہے۔۔؟" شریف احمد نے جن سے پوچھا۔

"یہ اور معصوم۔۔۔" جن کے لہجے میں طنز تھا۔۔" یہ لڑکا اور اس کے دوست شیطان کے چیلے ہیں۔۔۔ان سب نے مل کر مجھے بہت تنگ کیا ہے۔۔"

"اس معصوم بچے نے تمہیں تنگ کیا ہے۔۔۔" شریف احمد نے حیرانگی سے پوچھا۔

"اس شیطان کے چیلے نے مجھے پتھر مار مار کر زخمی کیا ہے۔۔۔" جن دھاڑا۔

"ہاشم بخش نے تمہیں پتھر مارے۔۔۔یہ کیسے ممکن ہے۔۔" شریف احمد کی حیرانگی بڑھتی جا رہی تھی ہاشو کا باپ خدا بخش ہاشو کی ماں اور

اور ہاشو کی بہن شریفاں انتہائی حیرت سے جن کی باتیں سن رہے تھے۔

"ہاں اس نے مجھے مارا۔۔۔۔مجھ پر اتنے پتھر برسائے کے میری کمر زخمی ہو گئی۔۔۔۔۔میں اس کو نہیں چھوڑونگا پورا بدلہ لونگا اس۔۔۔۔۔شیطان کے چیلے سے۔۔۔۔یہ پکا شیطان ہے۔۔" جن نے اس طرح جواب دیا جیسے اسے وہ واقعات یاد کرتے ہوئے تکلیف ہو رہی ہو۔

"ہاشم بخش نے تمہیں کیسے زخمی کیا۔۔کب تم پر پتھر برسائے۔۔" شریف احمد کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

"کل صبح جب میں اس گاؤں سے گزر رہا تھا تو اس نے اپنے شیطان دوستوں کے ساتھ مل کر مجھے پتھر مارے۔۔اور اتنے پتھر مارے کے میری کمر سے خون

مجھے زخمی کرکے خوب ...

نکلنے لگا۔۔۔اور یہ

تھا۔۔" جن نے جواب دیا۔

"یہ معصوم بچہ تمہیں کیسے پتھر مار سکتا ہے۔۔۔یہ تو تمہاری صورت دیکھتے ہی بے ہوش ہو جائے گا۔۔"

شریف احمد جن کی بات سمجھنے سے قاصر تھا وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ ہاشو نے کس طرح پتھر مار کا جن کو زخمی کر دیا۔

"کل جب میں اس گاؤں سے گزر رہا تھا تو۔۔۔" جن کہتے کہتے رک گیا۔

"تو کیا۔۔؟" شریف احمد نے پوچھا۔

"اس وقت میں کتے کے روپ میں تھا جب اس نے اور اس کے شرارتی دوستوں نے مجھ پر پتھر برسائے تھے۔۔۔" جن نے بے چارگی سے جواب دیا تو شریف احمد کو ہنسی آ گئی مگر اس نے اپنی ہنسی کو ضبط کیا۔

"یقیناً۔۔۔ہاشم بخش نے بہت غلط حرکت کی ہے کسی بے زبان کو اس طرح تنگ نہیں کرنا چاہیے میں ہاشم بخش کی طرف سے تم سے معافی مانگتا ہوں اور یقین دلاتا ہوں کہ آئندہ ہاشم بخش کبھی کسی بے زبان کو تنگ نہیں کرے گا۔۔۔" شریف احمد نے کہا پھر تھوڑی دیر توقف کیا اور کہنے لگا۔

"ہاشم بخش کو کافی سزا مل چکی ہے مہربانی کر کے اب تم ہاشم بخش کو آزاد کر دو۔۔تمہیں حضرت سلیمان علیہ السلام کی قسم۔۔۔"

"قسم مت دو۔۔۔میں اسے ابھی اور سزا دونگا۔۔" جن زور سے گرجا ساتھ ہی ہاشو کا جسم زور سے ہوا میں اچھلا اور فضا ہی میں رک گیا اور فضا میں گردش کرنے لگا۔

"بچاؤ۔۔۔بچاؤ۔۔۔۔" ہاشو زور زور سے چیخنے لگا۔

"میرا بچہ۔۔۔۔" ہاشو کی ماں چلائی، شریف احمد بلند آواز کے ساتھ قرآن کی تلاوت کرنے لگا، قرانی آیات پڑھنے کے بعد شریف احمد نے گلاس میں بچا ہوا پانی گردش کرتے ہوئے ہاشم بخش پر پھینک دیا، جیسے ہی پانی ہاشم بخش کے جسم پر گرا ہاشم بخش کے منہ سے ایک

جلال الدین اکبر
چاند بی بی
نور الدین جہانگیر
نور جہاں
شاہ جہاں
اورنگ زیب عالم گیر
بہادر شاہ ظفر
سلطان حیدر علی
ٹیپو سلطان
احمد شاہ ابدالی
سکندر اعظم
قلوپطرہ
چنگیز خان
ہلاکو خان
ہیلن آف ٹرائے
نپولین بونا پاٹ
ایڈولف ہٹلر
حمورابی
سائرس اعظم
ہنی بال
قیمت فی کتاب -/40 روپے
Ph:32773302
شمع بک ایجنسی نوید اسکوائر اردو بازار کراچی

ح تڑپنے لگا جیسے وہ سخت اذیت میں ہو اس کے منہ سے دردناک چیخیں نکل رہی تھیں۔

"ہائے۔۔ہائے۔۔ظالم مار ڈالا۔۔ جلا ڈالا۔۔۔ اچھا نہیں کیا تو نے مولوی۔۔۔اچھا نہیں کیا۔۔۔" جن کی تکلیف دہ آواز سنائی دی "ابھی میں جارہا ہوں مگر پھر واپس آؤں گا۔ضرور آؤں گا۔۔لونگا اپنا بدلہ پورا بدلہ لونگا۔۔"

ان الفاظ کے ساتھ ہی ہاشو کا فضا میں گردش کرتا جسم دھڑام سے چارپائی پر گر پڑا ہاشو کے چارپائی پر گرتے ہی شریف احمد تیزی کے ساتھ اس کے جانب بڑھا اور اس نے ہاشو کا سر اپنے زانوں پر رکھ لیا اور پیار سے ہاشو کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگا۔

"کیسے ہو ہاشو بیٹا۔۔؟" شریف احمد نے ہاشو سے پوچھا۔

"ٹھیک ہوں مولوی صاحب۔۔۔" ہاشو کے منہ سے کمزور سی آواز نکلی۔

"میرا بچہ۔۔۔" ہاشو کی ماں بے قراری سے آگے بڑھی اور اس نے ہاشو کو اپنے سینے سے لگالیا۔

"اماں۔۔ابا۔۔ مجھے معاف کردیں۔۔۔آئندہ میں کسی جانور کو نہیں ستاؤں گا۔۔" ہاشو نے دھیمی لہجے میں معافی مانگی۔

"میرا لعل۔۔۔" ہاشو کی ماں ہاشو کو پیار کرنے لگی "اب یہ بالکل ٹھیک ہے۔۔۔۔وہ جن اس کو چھوڑ کر واپس چلا گیا۔۔۔" شریف احمد نے خدا بخش سے کہا۔

"بہت بہت شکریہ مولوی بیٹا۔۔۔۔تمہارا بہت بڑا احسان ہے ہم پر۔۔۔۔۔۔" خدا بخش نے شریف احمد سے کہا۔

"میں نے کوئی احسان وحسان نہیں کیا یہ تو اللہ کے پاک کلام کا اثر ہے اللہ کے پاک کلام میں بہت برکت ہے۔۔۔" شریف احمد نے جواب دیا پھر اپنا چرمی بیگ اٹھایا اور اسے کھولا اور اس بیگ میں سے سرسبز کا بنا ہوا قلم نکالا ساتھ ہی دوات کی شیشی بھی نکالی پھر ایک سفید چمکدار کاغذ بیگ سے نکالا تمام سامان نکالنے کے بعد شریف احمد نے دوات کی شیشی کھولی تو کمرے میں زعفران کی خوشبو پھیل گئی، شریف احمد نے قلم کو زعفران میں ڈبویا اور تعویز لکھنے لگا تعویز لکھنے کے بعد شریف احمد نے تعویز خدا بخش کے دائیں ہاتھ میں دیا اور کہا۔

"اس تعویز کو چمڑے میں لپیٹ کر ہاشم کے دائیں بازو پر باندھ دینا اور روزانہ عصر کی نماز کے بعد ہاشم بخش کے سرہانے سورۃ الفلق اور سورۃ الناس کے تلاوت کرتے رہنا، انشاءاللہ اب وہ جن کبھی اس گھر کا رخ نہیں کرے گا۔" اتنا کہہ کر شریف احمد نے قلم اور دوات بیگ میں رکھی اور بیگ بند کر کے جانے کے لئے کھڑا ہوگیا۔

"اب مجھے اجازت دیجئے۔۔" شریف احمد اپنا بیگ سنبھالتے ہوئے کہنے لگا۔

"ایسے کیسے جارہے ہو۔۔۔بیٹا۔۔مہمان ہو چائے پانی کرتے جاؤ۔۔" خدا بخش کی بیوی جلدی سے بول اٹھی پھر شریفاں کی جانب مڑتے ہوئے اس نے شریفاں سے کہا۔۔" جا جلدی سے چولھے پر چائے کا پانی رکھ دے۔۔"

"چائے بن رہی ہے اماں۔۔۔بس ابھی لاتی ہوں۔۔" شریفاں، شریف احمد کی جانب دیکھتے ہوئے بولی اور پھر کمرے سے باہر نکل گئی۔

"کل شام کو بیٹھے چاول بنا کر نیاز دلوا دینا۔۔۔" چائے پی کر واپس جاتے ہوئے شریف احمد نے خدا بخش سے کہا اور واپس مسجد کی جانب چل دیا۔

دوسرے دن عصر کی نماز کے بعد شریف احمد اپنے کمرے میں دری بچھائے زمین پر بیٹھا تھا اس کے ہاتھ میں ایک کتاب تھی جسے وہ پڑھ رہا تھا کہ اس کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا گیا۔

"کون ہے اندر آجاؤ دروازہ کھلا ہے۔۔" شریف احمد نے کتاب بند کرتے ہوئے زور سے کہا تو

دروازہ ایک جھٹکے سے کھل گیا اور شریفاں ہاتھ میں پلیٹ لئے کمرے میں داخل ہوئی، شریفاں کو اپنے کمرے میں دیکھ کر شریف احمد بوکھلا گیا اس نے جلدی سے اپنی نظریں جھکالیں اور ہکلاتے ہوئے کہنے لگا۔

"کک۔۔۔کیا بات ہے۔۔تت۔۔تم یہاں کیوں آئی ہو۔۔؟"

"اماں نے میٹھے چاول بنائے تھے وہ لائی ہوں۔۔" شریفاں نے جواب دیا۔

"اچھا رکھ دو۔۔" شریف احمد نے نظریں نیچی کرتے ہوئے کہا تو شریفاں میٹھے چاول کی پلیٹ شریف احمد کے سامنے رکھنے کے لئے نیچے جھکی، اسی وقت غیر ارادی طور پر شریف احمد کی نگاہ اوپر کو اٹھ گئی جیسے ہی شریف احمد کی نگاہ اوپر اٹھی وہ بوکھلا گیا اس نے زور سے لاحول پڑھی اور چیخ کر شریفاں کا نام لیا شریف احمد کا سارا جسم لمحے بھر میں پسینے میں نہا گیا وہ ہولے ہولے لرز رہا تھا اس کی آنکھیں جل رہی تھیں۔

شریف احمد کی یہ حالت دیکھ کر شریفاں کھلکھلا کر ہنس پڑی اس کی نقرئی ہنسی شریف احمد کے کانوں میں پڑی تو اس نے بے اختیار اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں۔

"مولوی تو بہت۔۔سٹھو (اچھا) بندہ ہے۔۔" شریفاں نے کھلکھلا کے ہنستے ہوئے کہا اور چھم چھم کرتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

جب شریف احمد کو یقین ہوگیا کہ شریفاں کمرے سے جاچکی ہے تو اس نے آہستہ سے اپنی آنکھیں کھول دیں، شریف احمد کے چہرے سے پسینہ ٹپک ٹپک کر دری کو گیلا کر رہا تھا اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اس کی کانوں کی لویں اتنی سرخ ہو رہی تھیں جیسے ان سے لہو ٹپک رہا ہو وہ ایسے ہانپ رہا تھا جیسے میلوں دوڑ کر آیا ہو اس کا رواں رواں کانپ رہا تھا شریف احمد ہمت کر کے اٹھا اور اپنے بستر پر گر پڑا وہ زور زور سے سانس لے رہا تھا شریف احمد نے اپنی آنکھیں بند کیں تاکہ کچھ دیر آرام کر سکے مگر جیسے ہی اس نے آنکھیں بند کی وہی منظر اس کی آنکھوں میں گھوم گیا جب شریفاں میٹھے چاول رکھنے زمین کی جانب جھکی تھی، شریف احمد نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں اور اٹھ کر بستر پر بیٹھ گیا شریف احمد بہت پریشان ہو رہا تھا وہ جس چیز سے پیچھا چھڑانا چاہتا تھا وہی منظر اس کے آنکھ بند کرتے ہی دماغ میں آرہا تھا شریف احمد نے پریشانی کے عالم میں اپنے ماتھے کو رگڑا اسے کمرے میں شریفاں کی نقرئی ہنسی سنائی دے رہی تھی شریف احمد کو کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے اس کے برسوں کی تپسیا بھنگ (ملیامیٹ) ہو رہی تھی۔

دو دن تک شریف احمد اپنے کمرے میں نہیں آیا وہ سارا وقت مسجد میں ہی بیٹھا رہا اور مسلسل یادِ الٰہی میں گم رہا اللہ کو یاد کرنے سے شریف

احمد کو بہت سکون مل رہا تھا، اب اس کی طبیعت کافی بہتر ہوگئی تھی مگر اپنے کمرے میں جاتے ہوئے اسے ابھی بھی ڈر لگ رہا تھا۔

تیسرے دن عصر کی نماز کے بعد جب شریف احمد مسجد میں بیٹھا یادِ الٰہی میں گم تھا کہ ہاشو بھاگتا ہوا شریف احمد کے پاس آیا اور نہایت ادب سے سلام کیا۔

"وعلیکم السلام۔۔۔کیسے ہو ہاشو بیٹا۔۔"

"ٹھیک ہوں مولوی صاحب۔۔مگر۔۔" ہاشو کہتے کہتے رک گیا۔

"مگر کیا۔۔" شریف احمد نے مسکرا کر پوچھا۔

"مولوی صاحب۔۔۔باجی پر جن آگیا ہے۔۔" ہاشو نے اٹکتے ہوئے کہا۔

"کون۔۔۔شریفاں پر۔۔" شریف احمد نے ہاشو سے تصدیق چاہی۔

"جی ہاں۔۔۔بابا سائیں نے آپ کو بلوایا ہے۔۔" ہاشو نے جواب دیا۔

"چل۔۔۔جلدی چل۔۔۔" شریف احمد نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا شریفاں پر جن آنے کا سن کر شریف احمد کا دل اچانک زور زور سے دھڑکنے لگا تھا وہ جلدی سے اپنے کمرے میں گیا اور وہاں سے اپنا چرمی بیگ اٹھایا اور تیز تیز قدموں سے ہاشو کے سنگ

...بیٹا۔۔۔میری دھی (بیٹی) پر بھی جن آگیا۔۔۔" شریف احمد کو دیکھ کر شریفاں کی ماں رونے لگی۔

"کیا ہوا۔۔۔" شریف احمد نے خدا بخش سے پوچھا جو فکر مندی کی عالم میں چارپائی پر بیٹھا تھا۔

"مولوی بیٹا۔۔۔نہ جانے کیوں ان جنوں بھوتوں نے میرا ہی گھر دیکھ لیا، پہلے ہاشو پر وہ جن آگیا تھا اور اب شریفاں پر بھی کوئی جن آگیا ہے۔۔" خدا بخش پریشانی کے عالم میں بولا۔

"ہوا کیا ہے۔۔کیسے معلوم ہوا کہ شریفاں پر کوئی جن آیا ہے۔۔" شریف احمد نے پوچھا۔

"شریفاں صبح جب سو کر اٹھی اس وقت سے عجیب عجیب حرکتیں کر رہی ہے۔۔۔۔پہلے ہاشو کو لکڑی سے مارا حالانکہ شریفاں ہاشو سے بہت پیار کرتی ہے اس کا ایک ہی تو بھائی ہے۔۔۔پھر بھوری بھینس کا سارا دودھ پی گئی کل گھر میں مٹھائی آئی تھی وہ بھی ساری چٹ کر گئی دوپہر کے سالن سے ساری بوٹیاں کھا کر ہانڈی گلی میں پھینک دی اور عجیب آواز میں سب کو پکار رہی ہے کہہ رہی ہے کہ۔۔۔۔۔۔۔" خدا بخش یہاں تک کہہ کر خاموش ہوگیا۔

"کیا کہہ رہی ہے۔۔۔" شریف احمد نے پوچھا۔

"شریفاں چیخ چیخ کر کہہ رہی ہے کہ وہ۔۔۔وہ سب کو جان سے مار ڈالے گی۔۔۔" خدا بخش نے اٹکتے ہوئے بتایا۔

"ہوں۔۔" شریف احمد نے ہنکارا بھرا اور کچھ سوچنے لگا پھر اس نے سر اوپر اٹھایا اور کہا۔۔"صاف گلاس میں پانی دینا۔۔"

شریفاں کی ماں شیشے کے صاف گلاس میں پانی لے آئی پانی کا گلاس ہاتھ میں پکڑ کر شریف احمد شریفاں کے کمرے کی جانب بڑھا اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا شریفاں کے کمرے کے دروازے کے ... شریف احمد رک گیا اور اس نے شریفاں کی ماں کو دروازہ کھولنے کا اشارہ کیا تو شریفاں کی ماں نے کمرے کا دروازہ کھولا دروازہ کھولتے ہی شریف احمد، خدا بخش اور شریفاں کی ماں ایک ساتھ کمرے میں داخل ہوئے۔کمرے میں داخل ہو کر شریف احمد نے دیکھا کہ شریفاں چارپائی پر سر جھکائے بیٹھی ہے اس کے سر کے بال اس کے چہرے پر پڑے ہیں کمرے کا اکثر سامان ٹوٹا ہوا ہے شریف احمد نے بغور چاروں طرف کا معائنہ کیا پھر شریفاں کی چارپائی کے پاس پہنچا اور بلند آواز سے وظیفہ پڑھنے لگا ساتھ ہی وہ چارپائی کے گرد چکر بھی لگاتا جارہا تھا

پہلا چکر ختم ہوتے ہی شریف احمد نے گلاس میں سے تھوڑا سا پانی ہاتھ میں لیا اور شریفاں کے سر پر ڈال دیا جیسے ہی پانی شریفاں کے سر پر پڑا شریفاں نے ایک جھٹکے سے اپنا سر اوپر اٹھایا شریفاں کی آنکھیں سرخ ہورہی تھیں اس کے سر کے گھنے بال اس کے چہرے پر پڑے ہوئے تھے وہ خونخوار نظروں سے شریف احمد کو گھورنے لگی۔

شریف احمد نے چارپائی کے گرد دوسرا چکر مکمل کیا اور پانی کا چھینٹا شریفاں کے چہرے پر مارا تو شریفاں بھیانک آواز میں چیخنے لگی ساتھ ہی وہ اپنی گردن کو زور زور سے گردش دینے لگی ساتھ ہی وہ بھیانک آواز میں بے معنی الفاظ بول رہی تھی۔

شریف احمد نے چارپائی کے گرد تیسرا چکر مکمل کیا اور پانی کا چھینٹا شریفاں کے منہ پر مارا تو شریفاں کی گردش کرتی گردن رک گئی اور وہ اپنی گردن کبھی دائیں اور کبھی بائیں جانب جھکا کر شریف احمد کو دیکھنے لگی شریفاں کی آنکھیں سرخ ہورہی تھیں اور وہ اپنی خون اگلتی آنکھوں سے شریف احمد کو گھور رہی تھی، شریف احمد نے وظیفہ پڑھتے ہوئے شریفاں کی چارپائی کے گرد چوتھا چکر مکمل کیا اور پانی کا چھینٹا شریفاں کے چہرے پر مارا تو شریفاں نے ایک بھیانک چیخ ماری اور انتہائی کرخت آواز میں چیخی۔

"کون ہے تو۔۔۔کیوں تنگ کر رہا ہے مجھے۔۔۔"

"تو کون ہے۔۔" شریف احمد نے ڈپٹ کر پوچھا۔

"میں جنگالی ہوں۔۔۔جن کی بیٹی۔۔۔میں جن زادی ہوں۔۔۔جن زادی۔۔" شریفاں کے منہ سے یہ بات سن کر خدا بخش اور شریفاں کی ماں پریشان ہوگئے۔

"تو نے اس لڑکی کے جسم پر کیوں قبضہ کیا ہے۔۔" شریف احمد نے پوچھا۔

"اس کے بھائی نے میرے باپ کو زخمی کیا تھا، میں اسے نہیں چھوڑونگی۔۔" جنگالی نے کرخت آواز میں کہا۔

"مگر زخمی تو اس کے بھائی نے کیا تھا اس بے چاری کا کیا قصور۔۔؟" شریف احمد نے پوچھا۔

"اس کے بھائی کے بازو پر تیرا تعویز بندھا ہے اس لئے میں اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی مگر اسے میں نہیں چھوڑونگی۔۔" اتنا کہہ کر شریفاں چارپائی سے نیچے اتری اور اپنا سر زور زور سے دیوار سے ٹکرانے لگی۔

شریف احمد نے اشارہ کیا تو خدا بخش اور شریفاں کی ماں نے آگے بڑھ کر شریفاں کو قابو کیا شریف احمد نے وظیفہ پڑھتے ہوئے گلاس میں بچا ہوا سارا پانی شریفاں کے سر پر ڈال دیا، پانی پڑتے ہی شریفاں کے منہ سے دردناک چیخیں نکلنے لگیں اور وہ زمین پر گر کر تڑپنے لگی، خدا بخش اور شریفاں کی ماں نے شریفاں کو اٹھا کر چارپائی پر ڈالا شریف احمد نے اپنا چرمی بیگ کھولا اور قلم اور دوات نکال کر تعویز لکھنے لگا تعویز لکھنے کے بعد اس نے تعویز خدا بخش کو دیا اور کہا۔۔"یہ تعویز چمڑے میں سی کر شریفاں کے دائیں بازو پر باندھ دینا جب تک یہ تعویز شریفاں کے بازو پر بندھا رہے گا جنگالی اسے تنگ نہیں کرے گی۔۔" شریف احمد نے کہا اور ایک اچٹتی ہو نظر شریفاں پر ڈالی شریفاں اب بے سدھ سو رہی تھی شریف احمد نے اپنا بیگ سنبھالا اور سلام کرتا ہوا خدا بخش کے گھر کے بیرونی دروازے کی جانب چل دیا۔

اس رات شریف احمد کو نیند نہیں آئی بار بار اس کے سامنے شریفاں کا لال بھبوکا چہرہ آرہا تھا، شریف احمد نے اس رات انتہائی خشوع اور خضوع کے ساتھ تہجد کی نماز ادا کی اور گڑگڑا کر اللہ تعالیٰ سے شریفاں کی صحت کے لئے دعا مانگی۔

اگلے دن شریف احمد بہت بے چین رہا خدا بخش بھی نماز پڑھنے کے لئے مسجد نہیں آیا کہ شریف احمد اس سے شریفاں کی طبیعت کے بارے میں معلومات حاصل کرتا، شریف احمد کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کس طرح شریفاں کی طبیعت کے بارے میں معلومات حاصل کرے وہ اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ ہاشو دوڑتا ہوا شریف احمد کے پاس آیا اور سلام کر کے کہنے لگا۔

"جلدی چلئے مولوی صاحب وہ جن زادی پھر آگئی ہے۔۔"

"کیا۔۔۔وہ جن زادی پھر آگئی۔۔۔؟" شریف احمد نے حیرانگی سے پوچھا۔

"ہاں۔۔اور اس مرتبہ وہ بہت غصے میں ہے۔۔اس نے گھر کا سارا سامان بھی توڑ دیا ہے۔۔" ہاشو جلدی جلدی بولا تو شریف احمد اٹھ کھڑا ہوا۔

"جو تعویز میں نے لکھ کر دیا تھا وہ باندھا تھا۔۔؟" چلتے چلتے شریف احمد نے ہاشو سے پوچھا۔

"پتا نہیں۔۔" ہاشو نے مختصر جواب دیا تو شریف احمد نے ہاشو کا ہاتھ پکڑا اور تیز تیز قدموں سے خدا بخش کے گھر کی جانب چل دیا۔

"السلام علیکم۔۔" گھر میں داخل ہوتے ہی شریف احمد نے باآوازِ بلند سلام کیا اور گھر کی دہلیز پار کر کے آنگن میں قدم رکھا مگر آنگن میں قدم رکھتے ہی وہاں کچھ نئے لوگوں کو دیکھ کر شریف احمد ٹھٹک کر رک گیا۔

"خدا بخش اور اس کی بیوی کے ساتھ ایک بڑی عمر کی عورت چارپائی پر بیٹھی تھی جبکہ چارپائی کے سرہانے ایک لڑکا کھڑا تھا لڑکے کا قد بمشکل پانچ فٹ تھا اور وہ

انتہائی دبلا پتلا تھا اس نے کھلتے سبز رنگ کا کرتا پہنا ہوا تھا اور لال رنگ کی دھوتی باندھی ہوئی تھی اس لڑکے کے تیل لگے لمبے لمبے بال بکھرے ہوئے تھے اور وہ اپنے ہاتھ پیر ایسے پھیلا کر کھڑا تھا جیسے کوئی بہت طاقتور پہلوان کھڑا ہو وہ لڑکا ہر دو منٹ بعد اپنی لمبی لمبی مونچھوں کو تاؤ دے رہا تھا اس کے چھوٹے سے بچکانہ چہرے پر لمبی لمبی مونچھیں کافی مضحکہ خیز لگ رہی تھیں۔

"آؤ۔۔آؤ مولوی بیٹا۔۔گھبراؤ نہیں۔۔یہ میری بہن ہے۔۔۔۔۔شریفاں کی طبیعت کا سن کر آئی ہے۔۔" خدا بخش نے شریف احمد کو دہلیز پر رکتا دیکھ کر جلدی سے کہا تو شریف احمد نے اپنے قدم آگے بڑھا دیئے اور چارپائی کے پاس پہنچ کر خدا بخش کی بہن کو ادب سے سلام کیا۔

"مولوی تو میری نوہ (بہو) کو اس جن زادی سے چھٹکارا دلا دے گا ناں۔۔۔۔" خدا بخش کی بہن نے شریف احمد کے سلام کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا تو شریف احمد نے سوالیہ نظروں سے خدا بخش کی جانب دیکھا۔

"یہ میری بڑی بہن ہے اور یہ میرا بھانجا جانو ہے شریفاں جانو کی منگ ہے ان کا رشتہ بچپن ہی میں طے ہو گیا تھا۔۔۔" خدا بخش نے شریف احمد کو بتایا تو شریف احمد نے بغور جانو کو دیکھا جانو کو دیکھنے کے بعد شریف احمد کے دل نے پہلی بار اللہ سے گلا کیا مگر پھر فوراً ہی اس نے دل ہی دل میں توبہ کی۔

"اللہ تعالیٰ کے پاک کلام کی برکت سے وہ جن زادی یقیناً شریفاں کا پیچھا چھوڑ دے گی۔۔" شریف احمد نے نرم لہجے میں جواب دیا۔

"اگر تیرے سے بات نہ بنے تو کہنا۔۔میرے پاس پیر صاحب کا دیا ایسا علم ہے کہ بڑے سے بڑا جن قابو میں آجاتا ہے یہ تو معمولی جن زادی ہے۔۔" اتنی دیر سے خاموش کھڑا جانو بول اٹھا، جانو کی آواز اس کے جسم کی طرح مہین اور باریک تھی ایسا لگتا تھا جیسے کوئی کم عمر بچہ بات کر رہا ہے جانو کے منہ سے دھمکی آمیز الفاظ سن کر شریف احمد کو ہنسی آگئی مگر اس نے اپنی ہنسی کو کھانسی میں تبدیل کر کے قابو پایا۔

"شریفاں کہاں ہے۔۔؟" تھوڑی دیر توقف کر کے شریف احمد نے پوچھا۔

"اپنے کمرے میں ہے۔۔ہم نے اسے چارپائی سے باندھ دیا ہے، وہ ڈنڈا ہاتھ میں لئے سب کو مارنے دوڑ رہی تھی اس لئے ہم نے اسے اس کی چارپائی سے باندھ دیا ہے۔۔۔" خدا بخش نے شریف احمد کو بتایا۔

"تعویز جو میں نے کل دیا تھا وہ شریفاں کے بازو پر باندھ دیا تھا؟" شریف احمد نے پھر پوچھا۔

"مولوی بیٹا۔۔میں نے رات ہی اس کے دائیں ہاتھ پر تعویز باندھ دیا تھا مگر صبح دیکھا تو تعویز اس کے بازو پر نہیں تھا شریفاں سے پوچھا تو اسے بھی نہیں معلوم کہ رات کے رات تعویز کہاں گیا۔۔" خدا بخش کی بیوی نے شریف احمد کو بتایا تو شریف احمد نے سر ہلا دیا۔

"چلیں دیکھیں کہ وہ جن زادی کیا چاہتی ہے۔۔؟" شریف احمد نے اپنے قدم بڑھاتے ہوئے کہا تو شریف احمد کے ساتھ خدا بخش اس کی بیوی جانو اور جانو کی ماں بھی چل دیئے شریفاں کے کمرے کے سامنے پہنچ کر شریف احمد نے اشارہ کیا تو خدا بخش کی بیوی نے آگے بڑھ کر شریفاں کے کمرے کا دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گئی اس کے پیچھے پیچھے سب شریفاں کے کمرے میں داخل ہو گئے کمرے میں داخل ہونے کے بعد شریف احمد نے دیکھا کہ شریفاں اپنی چارپائی پر سو رہی ہے اس کے ہاتھ اور پیر چارپائی کے ساتھ مضبوطی سے بندھے ہوئے ہیں شریفاں کے سیاہ چمکدار بال شریفاں کے گورے گورے چہرے پر پھیلے ہوئے تھے شریفاں کے ہاتھ پیر بندھے ہونے کے باوجود شریفاں کے چہرے پر تازگی تھی ایسا لگتا تھا جیسے وہ بہت پرسکون انداز میں سو رہی ہے۔

شریف احمد نے شریفاں کی ماں سے شریفاں کے ہاتھ پیر کھولنے کا کہا تو اس نے آگے بڑھ کر شریفاں کے ہاتھوں اور پیروں کی رسیاں کھول دیں رسیاں کھلتے

اچھی اور معیاری کتب کے لئے

دعا بک کارنر

جہاں پر افسانے، شاعری، ناول، بچوں کی کہانیاں، SMS بکس، سیرت، پکوان کی کتابیں، اسلامی بکس، میگزین، ڈائجسٹ، رسالے، ڈکشنریاں، نعت، اور بہت سے مختلف موضوعات پر مبنی کتابیں دستیاب ہیں۔

تمام کتابیں مناسب قیمت پر دستیاب ہیں۔

گلی نمبر 5 منشی محلہ امین پور بازار
فیصل آباد
PH:041-2640013

ہی شریفاں کی آنکھ بھی کھل گئی اور وہ چارپائی پر اٹھ کر بیٹھ گئی اور اپنی کلائیوں کو مسلنے لگی رسی باندھنے کی وجہ سے شریفاں کی گوری گوری کلائیوں پر نشان پڑ گئے تھے شریفاں اپنی کلائیاں مسلتے ہوئے خونخوار نظروں سے سب کو گھور رہی تھی۔

شریف احمد نے شریفاں کی چارپائی کے سرہانے کھڑے ہو کر بلند آواز میں سورۃ بقرہ کی آخری آیات کی تلاوت شروع کی جیسے ہی شریف احمد نے قران کی تلاوت شروع کی، چارپائی پر بیٹھی شریفاں ہلنے لگی وہ اس طرح ہل رہی تھی جیسے اسے وجد آ رہا ہو وہ مسلسل ہل رہی تھی۔

رفتہ رفتہ اس کے ہلنے کی رفتار بڑھتی جا رہی تھی شریف احمد نے قرآن کی تلاوت ختم کر کے شریفاں کے چہرے پر پھونک ماری جیسے ہی شریف احمد نے شریفاں کے چہرے پر پھونک ماری تو شریفاں نے ایک زوردار چیخ ماری اور چارپائی سے اتر کر نیچے کھڑی ہو گئی وہ سب کو انتہائی خونخوار نظروں سے گھور رہی تھی ساتھ ہی اس کے حلق سے ایسی غراہٹ نکل رہی تھی جیسے زخمی بھیڑے کے منہ سے نکلتی ہے۔

شریف احمد نے شریفاں کی یہ حالت دیکھی تو تسبیح کے دانوں پر وظیفہ پڑھنے لگا، جیسے جیسے شریف احمد وظیفہ پڑھتا جا رہا تھا ویسے ویسے شریفاں کا چہرہ سرخ ہوتا جا رہا تھا وظیفہ پڑھنے کے بعد شریف احمد نے تسبیح شریفاں کے چہرے پر ماری تو شریفاں نے زور سے ایک چیخ ماری اور شریفاں کے منہ سے جنگالی جن زادی کی آواز نکلی۔

"مولوی تو پھر آ گیا تنگ کرنے۔۔"

"تنگ تو، تو کر رہی ہے اس معصوم کو۔۔۔کیوں قبضہ کر رکھا ہے تو نے اس معصوم پر۔۔۔" شریف احمد نے پوچھا۔

"میری مرضی مولوی۔۔۔میں جو چاہوں کروں۔۔۔تو کون ہوتا ہے مجھ سے پوچھنے والا۔۔"

"دیکھ جنگالی۔۔۔تو جن زادی ہے عورت ہے اس لئے میں شرافت سے کہہ رہا ہوں کہ اسے چھوڑ دے اس کی شادی ہونے والی ہے۔۔۔اگر تو نے اسے نہ چھوڑا تو۔۔۔۔" شریف احمد نے جملہ ادھورا چھوڑا۔

"شادی اور اس کی۔۔۔" جنگالی نے ایک بھیانک قہقہہ لگایا۔۔"جو شخص اس لڑکی سے شادی کرے گا وہ شادی کی پہلی رات ہی دردناک موت سے ہمکنار ہو جائے گا یہ جنگالی کا عہد پتھر پر لکیر ہوتا ہے۔۔۔" جنگالی نے انتہائی دہشت ناک آواز میں کہا جنگالی کی دھمکی سن کر جانو اور اس کی ماں کے چہرہ کا رنگ سفید پڑ گیا ان کے چہروں پر ہوائیاں اڑنے لگیں وہ دونوں گم سم شریفاں کو دیکھ رہے تھے شریفاں اچانک اپنی جگہ سے چلتی ہوئی دیوار کی جانب بڑھی اور دیوار کے ساتھ رکھا لمبا سا بانس کا ڈنڈا اٹھایا اور جانو کے قریب پہنچی جانو کے پاس پہنچ کر شریفاں نے خونخوار نظروں سے جانو کو دیکھا شریفاں کے اس طرح دیکھنے سے جانو پر لرزا طاری ہو گیا اور وہ کانپنے لگا شریفاں تھوڑی دیر تک جانو کو گھورتی رہی پھر بولی۔۔"تو کرے گا شریفاں سے شادی۔۔" شریفاں کے جسم پر قابض جنگالی نے گرج کر پوچھا، جنگالی کی گرجدار آواز سن کر جانو کی حالت پتلی ہو گئی اور وہ منمنانے لگا اس کی ٹانگیں لرز رہی تھیں اس کا چہرہ سیاہ پڑنے لگا۔

"ہاں۔۔۔نن نہیں۔۔۔" جانو کے منہ سے بے ترتیب الفاظ نکلے، اسی وقت شریفاں نے ہاتھ میں پکڑا ڈنڈا زور سے جانو کی کمر پر مارا تو جانو کے منہ سے ایک دردناک چیخ نکلی اور وہ تکلیف سے تڑپنے لگا۔

"میرا بچہ۔۔۔میرا لعل۔۔۔" جانو کی ماں تڑپ کر جانو کے پاس آئی اور جانو کی کمر سہلانے لگی۔

"چنڈالنی۔۔۔ڈائن تو نے میرے معصوم بچے کو مارا۔۔" جانو کی ماں نے تڑپ کر شریفاں کو کہا اور شریفان کے ہاتھ سے ڈنڈا چھیننے کی کوشش کی مگر شریفاں میں بلا کی طاقت تھی اس نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑایا اور ایک زوردار ڈنڈا جانو کی ماں کو بھی رسید کر دیا اور ڈنڈا رسید کرتے ہوئے چیخی۔۔"جو بھی شریفاں

سے شادی کا سوچے گا۔۔۔میں اس کا ایسا ہی حشر کرونگی۔۔"

"بھاگ اماں۔۔۔یہ جن زادی ہمیں مار ڈالے گی۔۔" جانو چیخا اور کمرے سے نکل کر بھاگا، جانو کے پیچھے جانو کی ماں بھی کمرے سے نکل کر بھاگی اور ان دونوں کی پیچھے شریفاں ڈنڈا لئے بھاگی شریفاں کے پیچھے باقی گھر والے بھی بھاگے، شریف احمد نے حیرت سے یہ منظر دیکھا اور پھر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے کمرے سے باہر آ گیا، باہر آنگن میں عجیب ہی منظر تھا آگے آگے جانو اور اس کی ماں بھاگ رہے تھے اور پیچھے پیچھے ڈنڈا اٹھائے انہیں مارنے کے لئے شریفاں دوڑ رہی تھی اور شریفاں کے پیچھے شریفاں کے ماں باپ دوڑ رہے تھے۔ بھاگتے بھاگتے جانو کو ٹھوکر لگی تو وہ زمین پر گر پڑا اور جانو سے ٹکرا کر جانو کی ماں بھی جانو کے اوپر گر پڑی ان دونوں کے گرتے ہی شریفاں ان کے پاس پہنچ کر رک گئی اور پھر ڈنڈے سے ان کی تواضع کرنے لگی ہر ڈنڈے کے ساتھ جانو اور اس کی ماں کی چیخ بلند ہوتی تھوڑی دیر پٹائی کرنے کے بعد شریفاں نے ڈنڈا آنگن کے کونے میں پھینکا اور ہاتھ جھاڑتے ہوئے اپنے کمرے کی جانب بڑھی اپنے کمرے میں پہنچ کر شریفاں نے دروازہ بند کر لیا۔

"ہائے مار ڈالا۔۔۔ہائے کیسی چنڈالنی ہے ڈائن نے میرے معصوم بچے کو بھی نہیں چھوڑا۔۔" ادھر آنگن میں جانو اور اس کی ماں کا واویلا جاری تھا، خدا بخش نے اپنی بہن اور بھانجے کو زمین پر سے اٹھا کر چارپائی پر بٹھایا جانو کے منہ سے خون بہہ رہا تھا خدا بخش اس کا خون صاف کرنے لگا۔

"بھائی۔۔۔یہ جن زادی کسی کو زندہ نہیں چھوڑے گی مجھے معاف کرنا۔۔میں اپنے بیٹے کا رشتہ تیرے گھر سے توڑتی ہوں۔۔ارے جانو بیٹا واپس کر منگنی کی انگوٹھی۔۔۔" جانو کی ماں نے پہلے خدا بخش اور پھر اپنے بیٹے سے کہا۔

"ادی۔۔ادی (بہن)۔۔۔یہ بچپن کا رشتہ ہے ایسے کیسے توڑ سکتی ہو۔۔۔"

"ارے رشتہ نہیں توڑونگی تو وہ ڈائن میرے بچے کو مار ڈالے گی۔۔۔۔۔میرا ھکوں ھک ہی پٹھ (بیٹا) ہے۔۔۔میں نے اپنے سر کے سائیں (شوہر) کے مرنے کے بعد بڑے پیار سے اسے پالا ہے یہی تو میرے بڑھاپے کی لاٹھی ہے۔۔نہ بابا نہ۔۔میں اس چنڈالنی کو اپنی نوھ (بہو) نہیں بنا سکتی۔۔۔" جانو کی ماں نے ہاتھ نچا نچا کر کہا پھر جانو کی جانب متوجہ ہوئی اور بولی۔

ارے جانو انگوٹھی اتار۔۔" ماں کی بات سن کر جانو نے اپنی انگلی سے انگوٹھی اتاری اور ماں کے ہاتھ پر رکھ دی جانو کی ماں نے انگوٹھی خدا بخش کی ہتھیلی پر رکھی اور کہا۔

"ادا۔۔(بھائی)۔۔تو میرا ماں جایا ہے مگر میں مجبور ہوں۔۔۔میری جانب سے یہ رشتہ ختم۔۔باقی سامان کل بھیجوا دونگی۔۔" اتنا کہہ کر جانو کی ماں جانو کا سہارا لیکر خدا بخش کے گھر سے چلی گئی خدا بخش واپس کی ہوئی انگوٹھی ہاتھ میں پکڑے تھکا تھکا سا چارپائی پر بیٹھ گیا اس کے ساتھ اس کی بیوی بھی پریشان چہرے کے ساتھ چارپائی پر بیٹھ گئی ان دونوں کے ماتھے پر فکر کی گہری شکنیں تھیں۔شریف احمد نے تھوڑی دیر انتظار کیا پھر اپنا بیگ سنبھال کر سلام کرتا ہوا گھر سے باہر نکل گیا۔

شریف احمد رات بھر پریشان رہا اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ جنگالی جن زادی کتنی طاقتور ہے جو اس کے اتنے وظائف کے بعد بھی شریفاں پر قبضہ جمائے بیٹھی ہے شریف احمد کے جلالی وظیفے کا بھی اس جن زادی پر کوئی اثر نہیں ہوا، رات دیر تک شریف احمد یہ سب سوچتا ہوا سو گیا اگلی صبح جب شریف احمد بچوں کو قرآن پاک پڑھا رہا تھا اس وقت ہاشو بھاگتا ہوا شریف احمد کے پاس آیا۔

"مولوی صاحب۔۔۔جلدی چلئے۔۔۔"

"کیا ہوا۔۔؟" شریف احمد نے جلدی سے کھڑے ہوتے ہوئے پوچھا۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

...بابا سائیں نے آپ کو بلوایا ہے۔۔۔" ہاشو اپنی پھولی ہوئی سانس پر قابو پاتے ہوئے بولا اس کے منہ سے بے ترتیب جملے نکل رہے تھے۔

"چل جلدی چل۔۔۔" شریف احمد نے ایک بڑے بچے کو دیگر بچوں کو قرآن پڑھانے کا کہا اور خود ہاشو کے ساتھ چل دیا۔

جب شریف احمد خدا بخش کے گھر پہنچا تو اس نے دیکھا کہ شریفاں پورے آنگن میں جھوم جھوم کر ناچ رہی ہے اس کے ہاتھ میں ایک خوبصورت ستاروں کے کام والا دوپٹہ ہے جسے اس نے اوڑھ رکھا ہے اور وہ لہک لہک کر گانے بھی گا رہی ہے۔

"منجھو منجھو شادی آهي۔۔۔ منجھو منجھو شادي آهي"

"ما کملي کملي آهي۔۔۔ منجھو منجھو شادي آهي"

شریف احمد نے سوالیہ نظروں سے خدا بخش کی جانب دیکھا تو اس نے افسوس زدہ لہجے میں کہا "میری بہن نے سارا سامان واپس بھیجوا دیا ہے اور رشتہ بھی توڑ دیا ہے بس جب سے سامان واپس آیا ہے شریفاں اسی طرح ناچ رہی ہے۔۔"

شریفاں شریف احمد کو دیکھ کر دوپٹہ پھینک کر اپنے کمرے میں بھاگ گئی۔

"مولوی بیٹا۔ میری دھی (بیٹی) کب چنگی (ٹھیک) ہو گی یہ جن زادی کب اس کا پیچھا چھوڑے گی۔۔" شریفاں کی ماں نے پوچھا۔

"ماں جی۔۔ یہ جن وغیرہ بھی اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے ویسے یہ کافی شریف قسم کے ہوتے ہیں اور انسانوں سے ذرا دور ہی رہتے ہیں مگر کچھ جن ذرا شرارتی قسم کے ہوتے ہیں اور ان کو یہ حسد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو ان پر برتری کیوں دی اور انسان کو اللہ تعالیٰ نے اپنا نائب کیوں بنایا؟ بس اسی حسد کے جذبے کے تحت وہ انسان کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں۔۔ آپ فکر نہ کریں یہ جن زادی بھی جلد ہی شریفاں کا پیچھا چھوڑ دے گی۔۔" شریف احمد نے تفصیل سے جواب دیا۔

"اللہ تیری زبان مبارک کرے۔۔ میری بیٹی تو پورے گوٹھ (گاؤں) میں بدنام ہو گئی ہے اوپر سے اس کی پھوپھی نے رشتہ بھی توڑ دیا ہے۔۔ اب کون کرے گا میری دھی (بیٹی) سے شادی۔۔۔ اللہ رحم کرے۔۔" شریفاں کی ماں رونے لگی۔

"اماں آپ فکر نہ کریں اللہ بہتر کرے گا یہ رشتہ ختم ہو گیا ہے تو اللہ اس سے بہتر رشتہ بھیجے گا انشااللہ۔۔" شریف احمد نے شریفاں کی ماں کو دلاسا دیا۔

"اللہ کرے ایسا ہی ہو۔۔۔ جب میری شریفاں ٹھیک ہو جائے گی اور یہ جن زادی اس کا پیچھا چھوڑ دے گی تو میں بڑے پیر کے نام پر چالیس دن نیاز دلاؤ نگی۔۔" شریفاں کی ماں نے ہاتھ اٹھا کر منت مانگی۔

"اماں۔۔ آپ جا کر شریفاں کے کمرے کا دروازہ کھولیں آج میں ایسا جلالی وظیفہ کرونگا کہ وہ جن زادی چیختی ہوئی بھاگ جائے گی۔" شریف احمد نے کہا تو شریفاں کی ماں نے آگے بڑھ کر شریفاں کے کمرے کا دروازہ کھولا پھر شریف احمد خدا بخش اور شریفاں کی ماں تینوں کمرے میں داخل ہوئے کمرے میں داخل ہو کر شریف احمد نے دیکھا کہ شریفاں اپنی چارپائی پر بیٹھی ہے اور اس کے سر کے بال اس چہرے پر بکھرے پڑے ہے اور وہ دھیرے دھیرے ہل رہی ہے ساتھ ہی اس کے منہ سے حق اللہ حق اللہ کی آوازیں بلند ہو رہی ہیں۔

"آپ لوگ کمرے سے باہر چلے جائیں اور دروازہ بند کر دیں میں آج اس جن زادی کو جلا کو بھسم کر دونگا۔۔" شریف احمد نے کہا تو شریفاں کی ماں نے سوالیہ نظروں سے خدا بخش کی جانب دیکھا، خدا بخش نے اپنی گردن ہلا کر رضا مندی ظاہر کی تو شریفاں کی ماں اور خدا بخش کمرے سے باہر چلے گئے اور جاتے ہوئے انہوں نے کمرے کا دروازہ بھی بند کر دیا۔

جب خدا بخش اور شریفاں کی ماں کمرے سے باہر چلے گئے اور انہوں نے دروازہ بھی بند کر دیا تو شریف احمد آہستہ سے چلتا ہوا شریفاں کی چارپائی کے

قریب آیا شریفاں چارپائی پر بیٹھی ہل ہل کر حق اللہ کا ورد کر رہی تھی شریف احمد شریفاں کی چارپائی کے پاس پہنچ کر رک گیا اور تھوڑی دیر تک شریفاں کو دیکھتا رہا پھر آہستہ آواز میں بولا۔

"شریفاں یہ ناٹک بند کرو۔۔ تمہارے اوپر کوئی جن زادی نہیں ہے۔۔" شریف احمد کی بات سن کر شریفاں خاموش ہو گئی اور اس نے اپنا سر اوپر کیا اور اپنی سرخ سرخ آنکھوں سے شریف احمد کو گھورنے لگی۔

"میرے ساتھ یہ ڈرامہ بازی مت کرو۔۔" شریف احمد نے پھر کہا۔

"تجھے پتا چل گیا مولوی کہ میں ڈرامہ کر رہی ہوں۔۔" شریفاں نے اپنے سر کے بالوں کا جوڑا بناتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔۔" شریف احمد نے جواب دیا "تو نے اپنی آنکھیں کیسے سرخ کیں۔۔"

"گلیسرین ڈال کر۔۔" شریفاں نے جواب دیا۔

"اتنی تکلیفیں اٹھا کر یہ ناٹک کیوں کیا؟۔۔۔ تیرے اس ناٹک کی وجہ سے تیرے ماں باپ کتنے پریشان ہیں۔۔" شریف احمد نے کہا

"مجھے افسوس ہے مگر میں مجبور تھی۔۔۔" شریفاں نے جواب دیا۔

"کیا مجبوری تھی تجھے۔۔۔ اس ناٹک کی وجہ سے تیرا رشتہ بھی ٹوٹ گیا۔۔"

"رشتہ توڑنے کے لئے تو یہ ناٹک کیا تھا میں نے۔۔" شریفاں بولی۔

"کیوں تجھے یہ رشتہ منظور نہیں تھا۔۔" شریف احمد نے پوچھا۔

"نہیں بالکل نہیں۔۔۔ میرا اور اس کا کوئی جوڑ نہیں تھا وہ ٹھگنا بھوتنا سوکھے چھوہارے جیسا اس کا منہ ہے میں اس کے ساتھ شادی کرونگی کبھی نہیں۔۔" شریفاں نے نفرت سے ہونٹ سکوڑتے ہوئے کہا۔

"بری بات ہے کسی کی شکل کا مذاق نہیں اڑاتے شکل وصورت اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی ہوتی ہے۔۔" شریف احمد نے شریفاں کی سرزنش کی تو شریفاں شرافت سے اپنا سر ہلانے لگی۔

"اگر تجھے یہ رشتہ منظور نہیں تھا تو، تو سیدھے سیدھے انکار کر دیتی اتنا ناٹک کرنے کی کیا ضرورت تھی۔۔" تھوڑی دیر خاموش رہ کر شریف احمد نے پوچھا۔

"میرا رشتہ اس وقت ہوا تھا جب میں پنگوڑے (جھولے) میں تھی اور شادی کے وقت بھی مجھ سے نہیں پوچھا جاتا یہاں لڑکیوں کو گائے بھینس سمجھا جاتا ہے اس کھوٹے سے نکالا اس کھوٹے سے باندھ دیا۔۔ بس۔۔۔" شریفاں انگارے چباتے ہوئے بولی پھر تھوڑی دیر خاموش رہی پھر گویا ہوئی۔

"میں دہ درجہ (دس جماعتیں) پاس ہوں اور جانو پہلے دن ہی مدرسے سے بھاگ گیا تھا تو بتا کیا میرا اور جانو کا کوئی جوڑ ہے۔" شریفاں نے شریف احمد سے سوال کر ڈالا تو شریف احمد کی گردن نفی میں ہل گئی۔

"تو مولوی ہے۔۔ تو اسلام کو ہم گھوٹھ (گاؤں) والے سے زیادہ جانتا ہے تو بتا کیا اسلام لڑکیوں کو یہ حق نہیں دیتا کہ وہ رشتے میں اپنی پسند اور ناپسند کا اظہار کرے۔۔" شریفاں نے پھر سوال کیا۔

"یقیناً اسلام لڑکیوں کو اس بات کی مکمل آزادی دیتا ہے کہ وہ شادی بیاہ کے مسئلے میں کھل کر اپنی پسند کا اظہار کرے اور جو رشتہ اسے پسند نہ ہو وہاں اس کی شادی نہ کی جائے۔۔" شریف احمد نے شریفاں کی تائید کی۔

"پھر تو گوٹھ (گاؤں) والوں کو سمجھا کہ خاندان برادری کے نام پر لڑکیوں کو قربان نہ کریں، جو رشتہ ان کے جوڑ کا ہو وہاں اس کی شادی کریں۔۔" شریفاں نے کہا تو شریف احمد نے اقرار میں گردن ہلا دی۔

"اب تیرا کیا ہو گا۔۔۔ تجھ سے کون شادی کرے گا۔۔ آس پاس سب جگہ پر، تو آسیب زدہ مشہور ہو گئی ہے۔۔۔" شریف احمد نے کچھ دیر بعد سوچتے

پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

''مجھ سے شادی وہ کرے گا جسے معلوم ہے کہ کسی جن زادی نے میرے اوپر قبضہ نہیں کیا ہے۔۔۔'' شریفاں دھیرے دھیرے مسکرا رہی تھی۔

''کیا مطلب؟''

''مولوی یا تو، تو بہت معصوم ہے یا بن رہا ہے۔۔'' شریفاں نے شرارتی نظروں سے شریف احمد کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''کیا مطلب۔۔۔'' شریف احمد سب کچھ سمجھتے ہوئے بھی انجان بن رہا تھا۔

''مولوی جب میں نے تجھے پہلی بار دیکھا تھا جب ہی میں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ کنوار (دلہن) تو میں تیری ہی بنونگی۔۔ میں زال (بیوی) تیری ہی کہلاؤنگی'' شریفاں نے مسکرا کر جواب دیا۔

''سیانے صحیح کہتے ہیں کہ عورت کے مکر (فریب) سے اللہ بچائے۔۔'' شریف احمد نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا اس کا دل خوشی سے جھومنے لگا تھا۔

''اب تو فکر کر مولوی۔۔کیونکہ یہ عورت چھولھ (کچن) میں تیرے لئے روٹی پکائے گی۔۔'' شریفاں کا لہجہ بدستور شرارتی تھا شریفاں کی بات سن کر شریف احمد کو ہنسی آگئی شریف احمد نے ہنستے ہوئے اپنا بیگ سنبھالا اور سر پر رکھی ٹوپی صحیح کرتا ہوا کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

''کیا ہوا۔۔۔کیا جن زادی نے شریفاں کا پیچھا چھوڑ دیا۔۔'' خدا بخش نے شریف احمد کو کمرے سے نکلتا دیکھ کر پوچھا۔

''بہت جلد وہ جن زادی شریفاں کا پیچھا چھوڑ دے گی۔۔۔آپ لوگ ایسا کریں جلد از جلد شریفاں کی شادی کردیں۔۔''

''شریفاں کی شادی۔۔۔'' خدا بخش کے لہجے میں بے چارگی تھی۔۔''شریفاں کی پھوپھی نے تو رشتہ توڑ دیا اور آس پاس سب جگہ شریفاں پر جن زادی آنے کا قصہ مشہور ہو چکا ہے۔۔۔اور پھر جن زادی نے دھمکی بھی دی ہے کہ جو شریفاں سے شادی کرے گا وہ اس کو دردناک موت مار دے گی۔۔۔ایسے میں کون اپنی جان جوکھم میں ڈال کر میری بیٹی سے شادی کرے گا۔۔'' خدا بخش کے بے چارگی دیکھ کر شریف احمد کو افسوس ہونے لگا وہ کہنا چاہتا تھا کہ وہ شریفاں سے شادی کے لئے تیار ہے مگر خود سے کیسے کہہ سکتا تھا۔اسی وقت شریفاں کی ماں نے شریف احمد سے پوچھا۔

''بیٹا۔۔۔تجھے سب کچھ معلوم ہے اور تو چھڑو چھوکرو (کنوارا لڑکا) بھی ہے تو میری دھی (بیٹی) سے شادی کرلے۔۔''

یہ سن کر شریف احمد کا رواں رواں خوشی سے کھل اٹھا مگر اس نے سنجیدہ چہرہ بناتے ہوئے جواب دیا۔۔'' مجھے کوئی اعتراض نہیں۔۔۔مگر میں آپ کی برادری کا نہیں ہوں کہیں آپ کی برادری کے لوگ برا نہ مانیں۔۔'' شریف احمد نے خدشے کا اظہار کیا۔

''اس مشکل وقت میں میری برادری کون سا میرے کام آئی جو میں برادری کے برا ماننے کا سوچوں۔۔اور پھر تو مسلمان بندہ ہے اس ناطے تو میری برادری کا ہے۔۔'' خدا بخش نے جواب دیا۔

''اگر آپ کو کوئی اعتراض نہیں ہے تو میں راضی ہوں۔۔۔پرلے (اگلے) گاؤں میں میری خالہ رہتی ہے، میں سویرے جا کر اسے لے آؤنگا، آپ ان سے میری شادی کی بات کر لیجئے گا۔۔۔'' شریف احمد نے اپنی رضامندی ظاہر کرتے ہوئے جواب دیا تو خدا بخش نے شریف احمد کو گلے لگالیا۔

ادھر کمرے کے بند دروازے سے کان لگائے کھڑی شریفاں نے باہر کی ساری باتیں سن لی تھیں وہ خوشی سے جھوم اٹھی اور اپنا دوپٹہ لہرا کر گانے لگی۔

نجھو نجھو شادي آهي۔۔۔۔ منجھو منجھو شادي آهي
ما کملي کملي آهي ۔۔۔۔ منجھو منجھو شادي آهي

☠

WWW.PAKSOCIETY.COM

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk